ہمایوں

ایڈیٹر:- بشیر احمد، بی اے (آکسن) بیرسٹرایٹ لا
جائنٹ ایڈیٹر:- منصور احمد

جلد ۱۷ — فہرستِ مضامین — نمبر ۱

بابت ماہِ جنوری سنہ ۱۹۳۰ء

سید عبداللطیف منیجر رسالہ ہمایوں نے گیلانی الیکٹرک پریس لاہور میں باہتمام نظام الدین پرنٹر چھپوا کر شائع کیا۔

یکم جنوری ۱۹۲۲ء تھی جب ہمایوں پیدا ہوا۔ آج ۱۹۳۰ء کا آغاز ہے۔ بقول دہلی والوں کے ابھی جمعہ جمعہ آٹھ دن کی پیدائش ہے کیا جانے دنیا کو دنیا والوں کو۔ آٹھ سال کے بچے میں جتنی طاقت ہوتی ہے اُتنی اِس میں ہوگی آٹھ سال کے بچے میں جو قابلیت ہوسکتی ہے بس کچھ اُتنی ہی اِس میں ہوگی۔ ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے کہ یہ بڑے بوڑھوں کو عقل کی باتیں سکھائے۔ خدا کرے اِس میں صرف اتنی صلاحیت پیدا ہوجائے کہ یہ اپنے سے بڑوں کی عزت کرے اور اپنے سے چھوٹوں سے محبت اور دونوں کے عمل و طرزِ عمل سے اُن کی وہبی و اکتسابی خوبیوں کے اخذ کرنے میں اِس طرح معروف رہے جیسے کوئی ننھی دوشیزہ چمن چمن کے پھول چننے میں محو ہو!

مُدیر ہمایوں نے جو ایک سال کے بعد اپنی مصروف فراغت کے خول کے اندر سے منہ باہر نکالا تو کیا دیکھتا سنتا ہے کہ ادب کی دنیا ہے اور اُس میں ایک طوفانِ عظیم، علم کی محفل ہے اور اُس میں ایک دست شہ روغل، قول تو ہمایوں کا تھا کہ "دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا" لیکن یہ چال چل اور گئے اور ہمایوں راہ میں بیٹھا کا بیٹھا۔ سوچا کہ حضرت تم خوابیدہ نہ سہی لیکن اب تو بیدار و بیدار تر و بیدار ترین کا زمانہ ہے ہر وقت اک کام کے سرانجام دینے کا عہد ہے نہ کہ اک جھوٹے بچے گزشتہ ایام کے صوفے پر آرام کرنے کا۔ تہار اقول تو ضرور ہی دوڑ و بھاگو لیجیو و الا رہا لیکن عمل اس پر صرف اِتنا کہ دوسروں کا منہ تو ضرور تکتا رہا لیکن اپنے دل میں اک کاوش کا باب کھل گیا دوسروں کی ظاہر انسکین تو ضرور ہوگئی لیکن اپنی باطنی تحریک ہونی تھی نہ ہوئی۔

سچ یہ ہے کہ "اردو" کی "ادبیت" "نگار" کی "نقادیت" "معارف" کی "علمیت" "نیرنگ خیال" کی "تصوریت" "عالمگیر" کی "غزلیت" "مخزن" کی "رموزیت" "ادبی دنیا" کی "ارزانیت" "کامیابی" کی "اشتہاریت" اور "جامعہ" کی "متانت" سے ابھی ہمایوں کو بہت کچھ سیکھنا ہے اور "ہمایوں" کا ارادہ ہے کہ وہ اِن بڑے چھوٹے بھائیوں سے جو کچھ بھی ضروری ہے سیکھے اور سیکھتا رہے لیکن "ہمایوں" جہاں تتبع کا رضا کار ہے وہیں اپنے مخصوص انداز کا علم بردار بھی رہنا چاہتا ہے یعنی "اخلاقیت" جو خواہ خاص ہمایوں کا مطمحِ نظر نہ ہو سکے جمع ہمایوں کا خاص مطمحِ نظر ضرور ہے اور رہے گا۔ اب حقیقت یہ ہے کہ آج کل اخلاق کے معنی اِس قدر وسیع ہوتے جارہے ہیں کہ اخلاق کی تربیت میں صرف صحیح ضبط اور صحیح نیکی نہیں بلکہ صحیح حسن و محبت اور صحیح علم و آزادی سب کی کم و بیش ضرورت ہے لہٰذا حسنِ اخلاق نری خشک مزاجی سے وابستہ نہیں بلکہ آج اِس میں وہ چیز بھی شامل ہوتی جارہی ہے جسے کل تک تر دامنی کہتے تھے۔ وعظ و پند کی گفتار اخلاقی طور پر اتنی سود مند نہیں ہوتی جتنی شاید ایسے فطری حسن کی ایک جھلک جو پاکیزہ جذبات

کو انسان کے دل میں اُبھارے یا ایسی آزادانہ کردار جس سے قوتِ شباب بوسیدہ بندشوں کو توڑ کر ایک نئی عمل کی دنیا میں قدم رکھے۔ غرض تمام وہ چیزیں جو زندگی کو زندہ رکھتی ہیں زندہ تر تابندہ تر بناتی ہیں وہی سب کی سب صحیح اخلاق کی جان ہیں اور اُن سب کی طرف ہمیں برابر توجہ کرنی چاہیئے اگر ہم دنیا میں سچّے اور قوی انسان بننا چاہتے ہیں!

ہمایوں کو زیادہ تر معاونینِ ہمایوں نے بنایا جو کچھ کہ وہ ہے اور اُسے زیادہ تر وہی بنا سکتے ہیں جو کچھ کہ اُسے ہونا چاہیئے لیکن مدت کے بعد مدیرِ ہمایوں کو اس کا احساس پیدا ہوا ہے کہ معاونین کی اعانت کے ساتھ اپنی آپ مدد اور اپنی اور سب کی مساعی میں اِک خاص نوع کا ربط و ضبط ضروری ہے اگر ادب کے اُس ہندوستان میں جہاں اب مونٹ ایورسٹ اور کنچن جنگا کا سر بلند ہو رہا ہے ہمیں بھی اپنے دھرم سالہ کے ادنیٰ لیکن انوکھے نظّارے کو پیش کرنا ہے! بزم و رزم میں ضرورت صرف بلیغ ترین مُقرّر یا مضبوط ترین دلاور کی نہیں ہوتی بلکہ ہر ایسے صاف گو اور ہر ایسے منچلے کی جو اک اپنے ہی انداز میں کوئی نئی بات کہے کوئی نیا کام کرے خواہ وہ بات ذراسی خواہ وہ کام چھوٹا سا ہی کیوں نہ ہو! اگر اس بسیار گوئی کے زمانے میں حُسن نمائی کے ساتھ راست گوئی سے کام لیا جائے تو ہر ایسا کام آپ اپنا انعام ہو ــــــ مدیرِ ہمایوں کی تمنّا ہے کہ ہمایوں اب ایسا کام کرے۔ تمنّا ہے ارادہ ہے اُمّید ہے لیکن دعوےٰ نہیں کیونکہ صرف سرانجام شدہ کام ہی صحیح ادّعا ہے اور یہ سرانجامی صرف مدیر کے ہاتھ میں نہیں بلکہ زیادہ تر معاونین کے ہاتھوں ہی سے ہو سکتی ہے!

کاش یہ معاونین کبھی ایک آل انڈیا ہمایوں کانفرنس میں اکٹھے ہو کر ہمارے افسانہ نگار عاشق بٹالوی کی اِس آرزو ئے ہمایوں کو بر لائیں لیکن ہماری قوم کے کاموں میں اور پھر ادبی کاموں میں ایسی مستعدی کی امید عاشق کی افسانہ سنجی کو ہو تو ہو ہمیں کچھ کم ہی ہے۔ لیکن پھر بھی خیر اُتنا نہ سہی اِتنا ہی ہو جائے اور کیوں نہ ہو ہو سکتا ہو کہ کچھ میل جول سے، کچھ نامہ و پیام سے، کبھی پُوری کبھی آدھی ملاقات سے، اہلِ ہمایوں کبھی مدیرِ ہمایوں کی خلوت میں، کبھی صفحاتِ ہمایوں کی جلوت میں، اپنی تجویزوں تحریروں سے بزمِ ہمایوں کو فروغ دیں اور دیتے رہیں۔ ہمیں اپنے خریداروں اور مضمون نگاروں سے توقع ہے کہ وہ نہ صرف گاہے گاہے ہمایوں کی اصلاح و ترقی کے لئے اپنے خیالات کا اظہار کریں بلکہ عملاً اُس میں حصہ لیں۔ سوچیں سمجھیں کہ اُن کے ہمایوں میں کیا کمیاں ہیں پھر دیکھ بھال کر کہیں کریں جو کچھ بھی لائقِ التفات اور قابلِ عمل ہے۔ اس طرح ایک بزمِ ہمایوں صحیح معنوں میں قائم ہو سکتی ہے پھر کیا عجب ہے کہ کسی روز یہ کاغذی بزم زیادہ نہ سہی دو اِک روز کے لئے اِک اصلی بزم کی صُورت بھی اختیار کرلے!

اب تو یہ حالت ہے کہ سال کے بعد ہمایوں کے دو صفحوں میں بزمِ ہمایوں منعقد ہوتی ہے اور مدیر جیسا کہ اُس کا اِس دفعہ بھی ارادہ ہے دو ہی دو لفظوں میں دس بیس ارکان کا مختصر سا شکریہ ادا کرکے پھر اپنی بے نیاز خلوت میں سال بھر کا چلّہ کاٹنے کے لیئے غائب ہو جاتا ہے + ہمارے اِک قابل رکن نے پُر اثر شاید بجا شکایت کی ہے کہ اکثر اور رسالے تو اپنے مضمون نویسوں پر نوٹ بلکہ نوٹ در نوٹ لکھتے ہیں اُن پر "شذراتی" "ملاحظاتی" اور کیسے کیسے اور "تعریفاتی" پھُول برساتے ہیں لیکن غُنچہ دہن ہمایوں سال میں ایک دفعہ بھی اپنا منہ کھولتا ہے تو اظہارِ تشکّر میں محض بُخل سے کام لیتا ہے + اِس کے جواب میں گزارش ہے کہ مدیرِ ہمایوں کی رائے میں ہر مضمون کی آبجو پر تعریف کے پُل باندھنا اُس آبجو پر سے محض گذر جانے کا ایک بہانہ ہے۔ یہ درست ہے کہ ہمارے بدبخت ملک میں اور ایک حد تک آج کل کی ساری کاروباری دنیا میں اعتبار اکثر اشتہار سے قائم ہوتا ہے اور عزّت کے معنی محض شہرت ہو کر رہ گئے ہیں لیکن اِسی ملک اور اِسی دنیا میں وہ بھی ہیں جو اعتبار و عزّت کے اَور زیادہ سنجیدہ و متین رستوں کے مسافر ہیں۔ یہی ہیں جن کے ساتھ خدا کرے ہم اور آپ ہمیشہ ہم سفر ہوں + پھر بھی اپنے تمام اہلِ قلم حضرات کی خدمت میں یہ معذرت خلوصِ دل سے پیش کی جاتی ہے کہ اُن کی مساعی اور احسانات کا حق تو یوں ہے کہ "حق ادا نہ ہُوا" اور یہ حق رسمی لفظوں میں یا چند جملوں میں کیسے ادا ہو۔ اِن میں سے بعض صاحبوں کے متعلق اگر فی مضمون نگار کئی کئی صفحے کا مضمون لکھا جائے تو پھر کہیں جا کر اُن کی تصانیف کی خصوصیات پر کچھ روشنی پڑے اور پھر کہیں جا کر اُن کی محنتوں کی کچھ تھوڑی سی داد ملے لیکن دراصل نہ اُن کی محنت مدیرِ ہمایوں کے شکریے کے لئے صرف کی جاتی ہے نہ اُن کی قابلیّت اُس کے چند تعریفی جُملوں کے لئے ظہور میں آتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اِن جواہر پاروں کی جگہ ناظرینِ ہمایوں کے دل میں ہے!

گذشتہ سال جس طرح میاں عبدالعزیز نے فلک پیمائی پروفیسر ہارون خاں شیروانی نے تاریخ نور الٰہی محمد عمر صاحبان نے ڈراما بیگم آغا حیدر حسن نے دہلوی روزمرہ حامد علی خاں و حمید احمد خاں نے تنقید سراج الدین احمد نظامی اور میاں عطاء الرحمٰن نے افسانہ خواجہ غلام السیدین اور مہر محمد خاں شہاب نے سیرت و اخلاق سیّد حسن صاحب بنی اور عبدالرحمٰن صاحب اعجاز نے علم و فن کے شعبوں میں جو کچھ پیش کیا اُسے ناظرینِ ہمایوں بھُول نہیں سکتے اِسی طرح شعر و نظم میں جوش کی فطرت نگاری آزاد انصاری کی زبردست اخلاقی تعلیم حامد علی خاں کا فلسفیانہ تغزّل اثر صہبائی کا لاجواب رباعیانہ فلسفہ اور جگر و اکبر ذوقی و شر ما عابد و حشمت اور ح۔ب صاحبہ کے شیریں نغموں کو سامعینِ ہمایوں کبھی فراموش نہیں کر سکتے! ادا کرنے سے اگر شکریہ ادا ہو سکے تو اِن سب کا شکریہ سو بار ہمایوں اور اہلِ ہمایوں کی طرف سے!

ب ل

جہاں نما

ہم ہندیوں کے لئے جو یوں پرانے ہوں لیکن جو ابھی اس نت نئی دنیا میں ننھے بچے ہی ہیں یہ دنیا کیا ہے؟ ــــ محض اک جغرافی نقشہ جسے زمانے کے سیاست دان اُستاد نے ہماری پردہ دار چار دیواری کے اندر لٹکا رکھا ہے اور جس کی ملکی و قومی اور خشک و تر رنگینیوں سے ہماری بچپن کی فطرت کھیلتی رہتی ہے! اس نقشے پر ایک خونیں رنگ ہے جس کے دھبے جا بجا پائے جاتے ہیں اور جس کی طرف اکثر ہمارے اُستاد کی چھڑی ہمیں متوجہ کرتی رہتی ہے لیکن ہم بزدل جن میں کچھ دلیری سی آتی جاتی ہے اب کچھ دنوں سے اپنی نظر کو اَور رنگوں کی طرف بلکہ اپنی بے رنگی کی طرف بھی پھیرنے لگے ہیں! یہ استاد کون ہے؟ ــــ ؟

انگلستان! ــــ خونین رنگ والا سب "حق" پرستوں کا مجازی خدا لئے مالدار!

اِس کے بعد ہم کسے دیکھتے ہیں اور کیا دیکھتے ہیں؟ ــــ ؟

امریکہ! ــــ سبھی نئی نویلی ترقیوں کا اجارہ دار

جرمنی! ــــ اپنے پرانے غم و غصّہ کو نئے تعمیری کاموں میں تحلیل کرنے والا، غیر نادم صاحب ایثار

فرانس! ــــ عیش پسند، حسن پرست، علم دوست، فن آرا، پُرکار

اطالیہ! ــــ خود نما رہبر کا مغرور رکاب دار

جاپان! ــــ مشرق کا خوددار پہرہ دار

رُوس! انسانی معاشرت کی تپتی ہوئی سفید و سیاہ دیگ میں اپنا سخت و کرخت چمچہ پھیرنے والا مزدوروں مسکینوں کا ظالم مددگار

چین! اپنے ہزاروں بکھیڑوں کو سمیٹ لپیٹ سکنے والا قدیمی تجربہ کار

ٹرکی! ــــ تہذیبِ جدید کے لئے سب بُری بھلی روایات کو دُور سے مغربی سلام کرنے والا نیم مشرقی فوجدار

مصر! ــــ اپنی ہی ایک نہر میں اپنی ساری آبرو ڈبو کر اب اُس سے باہر کود سکنے کے لئے بےقرار پر بے اختیار

ایران! ــــ خاموش و پُراطمینان و بُردبار

افغانستان! ــــ حیران و پُرہیجان و بے اعتبار

عراق! ــــ گرفتار بیدار و بیزار

فلسطین! ــــ انگریزی یہودیت کا شکار

ہسپانیہ! ــــ محض سُست رفتار

ہنگری! ــــ اقلیتوں کی اقلیم ننگ دستار

اور سب سے نیچے اور سب سے پیچھے اِسی ۃ کی آخری تختی میں جس میں ہر اور ہائے کی حکومت ہے:

ہندوستان! ـــــــ وحدت کو کثرت سے پس پا کرنے والا نوجوانِ پرستار

آؤ دیکھیں کہ ۱۹۲۹ء میں دنیا کے اِن ملکوں میں کیا ہُوا۔

انگلستان کو وہ نہیں سمجھتے جو کہتے ہیں کہ انگلستان کا دن ہو چکا۔ جس ملک نے ہندوستان کے موتی اور جواہر اپنے قبضے میں کر رکھے ہیں وہ پُورا زمانہ شناس ہے وہ وقت پر بالڈون سے بے بال و پر شخص کے بے سود ہو جانے پر ریزے میکڈانلڈ سا پر بہوا آدمی پیدا کر دیتا ہے اور ہاتھ سے جاتی دنیا کو اپنے بائیں ہاتھ کے کرتب سے پھر اپنا بنا لیتا ہے۔ گذشتہ مزدور حکومت کے جانے کے بعد جب قدامت پسندوں نے پھر اپنا بوسیدہ ڈھول بجانا شروع کیا تو دنیا کے عقلمندوں نے سرگوشیاں کیں کہ دیکھا انگلستان وہی پرانی لغویت کی پوٹ مگر نہیں انگلستان نے اُن کے عقل کے ترازو کو ہلکا ثابت کر دیا۔ مزدور حکومت پھر آئی اور اس شان کے ساتھ کہ گو یا وہ ایک "قلیلی" حکومت تھی مگر اُس نے سب کٹیروں کے منصوبے مٹی میں مٹی کر دیئے۔ اُس نے یورپ میں مسئلہ تاوانِ جنگ امریکہ میں مسئلہ حرب و مقابلہ مصر میں مسئلہ آزادی اور ہندوستان میں مسئلہ سوراج کو اِس دلیری اور سچائی سے حل کرنے کی ٹھانی کہ دوست دشمن سب نے یک زبان ہو کر احسنت و مرحبا کہہ دیا۔ رُوس کے افعی کی طرف اِس مداری نے پیار سے ہاتھ بڑھایا اور ملکی بے روزگاری کی گتھی کو سلجھانے کے لئے اپنی تدبیر کا ناخن کام میں لگایا کہ زیادہ نہ ہو لیکن کچھ نہ کچھ تو ہو جائے +

امریکہ گو ابھی انجمنِ اقوام سے بے نیاز اور بالا بالا رہتا ہے لیکن یہی وہ ملک ہے جہاں صلح و ترقی کی تازہ ترین ایجادیں ہوتی ہیں۔ یہیں معاہدہ کیلگ تجویز ہو کر پختہ ہُوا۔ انگریزی وزیرِ اعظم بحری مصالحت کا پیغام لئے ہوئے یہیں آیا اور یہاں سے خوش گیا۔ مادی خوشحالی کی یہ حالت ہے کہ اِس وقت اس ملک میں ایک کروڑ نوے لاکھ ٹیلیفون ہیں اور ہر تیسرے گھر میں لاسلکی کا آلہ ہزاروں میل کی خبریں اور آوازیں صبح و شام تبا نا سنا رہتا ہے + یورپ کے نظریے باز کانپ رہے ہیں کہ امریکیت کا اژدہا منہ کھولے یورپ کی تہذیب پر پھنکار مار رہا ہے۔ وہ کہتے ہیں امریکیت کے معنی "ناشخصیت" زندگی کی "مقداریت" "مشینیت" اور محض "معیاریت" ہیں۔ اپنی سیاسی یکجائیت اور معاشی فوقیت کی وجہ سے امریکہ یورپ پر چھایا جا رہا ہے اور اس امریکی جانور کے بچے جا بجا دنیا میں اپنا سر نکال رہے ہیں ـــــ خیر اور کچھ نہ ہو پھر بھی بچے اک دل بہلاوا ضرور ہوتے ہیں۔

جرمنی سے انگریزی فوج نکل آئی اور فرانسیسی اور چھ ماہ میں گھر لوٹ آئیں گے۔ جرمنی آزاد ہو رہا ہے + وہاں کی شبابی تحریک میں اس وقت ۱۴ سے ۱۸ سال تک کی عمر کے ۷۰ فی صدی جرمن شریک ہیں جن میں سے اکثر شراب و تمباکو سے پرہیز کرتے ہیں اور سادگی جن کا شعارِ زندگی ہو گیا ہے + جرمنی نے اپنے اعلیٰ درجے کے قیدیوں کو سال میں ۱۴ روز رخصت کی اجازت دی ہے وہ کبھی کبھی بیرونی آجرین کا کام کر سکتے ہیں اور قیدیوں کے انتظام میں اُن سے مشورہ لیا جاتا ہے + گذشتہ جنگ کی یہ مغلوب قوم گئے سال اپنے فاتح انگلستان پر ساری کسرتی کھیلوں میں غالب رہی ایسی قوم اپنی گئی گذری ناکامیوں پر کب تک روئے اور کس لئے کہ دنیا کے مستقبل میں اُس کا حصّہ بھی ہو گا اور وہ اک خاصہ حصہ ہو گا!

فرانس کو کوئی بیرونی کام نہ تھا سو وہ اپنی اندرونی حکومتیں بدلنے میں کچھ نہ کچھ مصروف رہا!

اطالیہ ابھی بدستور اپنے خدائے قہار کا پیرو کار ہے وہاں آج کل جو نیکی ہے وہ بھی زبردستی کی ہم پیالہ و ہم نوالہ ہے۔ مسولینی حکم و تشدد کا گاندھی ابھی اپنے عقلمندانہ قہر کی آندھی بپا کئے ہوئے ہے اور اس عفونت سے کئی عفونتیں صاف ہوتی رہتی ہیں!

روس کے بڑے بڑے پرانے دشمن بھی اب مان گئے ہیں کہ وہ آج کل دنیا جہان کا سب سے بڑا معاشرتی تجربہ گاہ ہے۔ وہ حیرت انگیز ملک

جہاں اس وقت ۴۹ مختلف زبانیں ۱۸۲ جداگانہ قومیں اور ۴۸ بڑی ریاستیں مل جل رہی ہیں۔ وہاں امدادِ باہمی کی انجمنوں کے اس وقت تین کروڑ پچاس لاکھ ارکان ہیں اور دس بارہ سال کے عرصے میں وہاں پہلے کی بہ نسبت دگنے زیادہ مرد اور تگنی زیادہ عورتیں تعلیم یافتہ ہوگئی ہیں + پھر کون کہہ سکتا ہے کہ روس جہنمی ہے؟

چین میں "کومن ٹانگ" جماعت نے اپنے سردارِ اعظم چیانگ کے شک کی "قومی ٹانگ" سے سوئے ہوئے چین کو بیدار کر دیا ہے اور وہاں دھڑا دھڑ ترقی کا کام ہو رہا ہے۔ سڑکیں، پل، جہاز، بجلی، ہوا بازی ہے اور امریکی اور جرمن استاد ہیں۔ مگر مچھ کنارے آلگا ہے۔ اب دیکھئے کیا ہو!

ترکی ترقی کا ہم رکاب ہے۔ جہاں اپنا فائدہ ہے وہاں دشمن کا بھی بلا سے ہؤا کرے لیکن جہاں اپنا نقصان ہو وہاں پرانے دوستوں کی دوستی بالائے طاق۔ ملکی صنعتوں پر زور ہے رسم الخط بدل گیا اور خلافت کا کیڑا اب فقط ہندی مولویوں کی ڈاڑھی کا آوارہ مسافر ہے اور اُس کا تنہا کام ساردا ایکٹ کی مخالفت ہے اور بس۔ حق مغفرت کرے عجب ایمان دار ہیں!

مصر کے لئے اُس کے توفیق اور عرابی اور کامل اور زاغلول نے جو خاک و خون کی ندی بہائی تھی مزدور حکومت کے ہاتھوں اس کی آبیاری سے اُس کا لالۂ صحرا خوب رنگین و شگفتہ ہونے والا ہے!

ایران نے جرمنی اور سویڈن سے معاہدے کئے اور خاموشی سے راضی برضا رہا۔

افغانستان کی جہالت امان اللہ کی جلد باز عقل سے زیادہ نادر الوجود نکلی۔ اب خدا نادر خاں کو اُسکے پنجے سے بچائے رکھے!

عراق۔ کیا کہے، کچھ دنوں خاموش رہے!

فلسطین میں ۶½ لاکھ عربوں کا پلہ ہلکا ہے کیونکہ اُس کے مقابل میں ۱½ لاکھ یہودیوں کے ہاتھ میں لارڈ بالفور کے دستِ مبارک کا ایک مسودہ محفوظ ہے جس کا ایک ایک حرف لوہے کا ساختہ اور خون سے پرداختہ ہے۔ اے اہلِ کتاب عربوں کے عتاب سے بچنا!

ہسپانیہ میں ایک نئے جمہور کُش آئین کا آئینہ پیشِ نظر ہے +

ہنگری نے ہندوستان کی سوراجی حکومت کا رستہ آسان کرنے کے لئے حکم دے دیا ہے کہ وہاں کے پانچ فی صدی یہودیوں کو مدارس میں پانچ فی صدی سے زیادہ تعلیم نہ دی جائے!

ہندوستان جو کبھی کنجِ امن و ایمان تھا آج ایک جائے شک و ہیجان ہے اور کیوں نہ ہو وہ جس کے ہاں گاندھی سے موتی اور جواہر سے لال اور ٹیگور سے با اقبال جگمگ جگمگ کریں وہ کب تک سکون کو جو موت کی تاریکی ہے دل میں جگہ دیئے رہے وہ ایسے کیوں علم و عمل سے جو زندگی کی روح ہے روشن و پُرنور نہ کرے۔ آرام ہوچکا اطمینان ہوچکا۔ اب کام ہوگا کام، بے چینی ہوگی بے چینی اور کیونکر نہ ہو؟ جب مزدور حکومت کا دل ہماری حالت دیکھ کر پسیج جائے تو کیا ہمارا اپنا دل ہی ایسا ہے کہ گداز و گداز تر نہ ہوتا جائے۔ ہاں ساتھ ہی ضرورت مصروفیت میں سوچ بچار کی ہے خواہش میں صبر کی اور کام میں استقلال کی۔ اگر آہستگی موت تھی تو جلدی بھی جہنم کو لے جاسکتی ہے سو خبردار! ۱۹۲۹ء سائمن والی ہڑتال سے شروع ہؤا پھر اُس نے گاندھی اور وائسرائے کو بلا کر انہیں پٹیل کے ہاں چائے پلائی پھر جواہر لال کو کانگرس کا صدر منتخب کیا جس پر انگلستان کی دُور اندیش حکومت نے ہمیں نوآبادیوں کی سی حکومت

دینے کی جھلکی دکھائی پھر بٹلر کمیٹی کو ہندوستان کے مفروضہ اتحاد سے ڈرا کر ریاستی اور برطانوی ہند کی دوئی کا شاخسانہ کھڑا کرا دیا۔ پھر مزدور کمیشن کے پاؤں میں چکر ڈال دیا۔ اُدھر جتندر ادا س نے بھوک ہڑتالیوں کا قومی دل سردار بن کر عدم کی راہ لی اور اِدھر اسمبلی میں بم پھینکنے والوں نے عدالت میں انقلاب زندہ باد کا نعرہ بلند کرکے چار دانگ عالم میں تہلکہ مچا دینے کی ٹھان لی یعنی یا مردہ بوسے نہ اور یا کفن بھی پھاڑ سے۔ اچھا بھئی کفن کوئی مہنگی شے نہیں تم مر گئے تو پھر بھی شاید مفت ہی مانچسٹر سے مل جائے!

ہندوستان میں اب قطعی بیداری کا زمانہ آگیا ہے۔ اِس ملک نے اب سمجھ لیا ہے کہ نرے گاندھی کے چرخے اور قدیم ہند کے سے ٹونے ٹوٹکے سے موجودہ دنیا میں ترقی کی صُورت نہیں۔ اپنی ہیئت کو بھی قائم رکھو لیکن دوسروں سے بھی سیکھو جو کچھ سیکھنے کے قابل ہے۔ نئی ہندی تہذیب مجموعہ ہو گا نئے پرانے علوم وفنون کا، عطر ہو گا وید اور قرآن اور انجیل اور گرنتھ اور زند اوستا کے پھولوں کا اور سست رفتار بھائیو اور تیز رو دوستو! یاد رکھو کہ سیاست کے طوفانی سمندر میں تمہاری کشتی کے لئے ضرورت ہے نہ صرف اُن کے بازوؤں کی جو چپّو چلانے والے ہیں بلکہ اُن کے ہاتھوں کی بھی جو پتوار تھامنے والے ہیں! اور خدا ترسو اور رسم پرستو! اگر تم خدا کے بندے ہو، وطن کے خادم ہو تو اپنے اعتقادات کو صیقل کرو اپنے بوسیدہ رسم و رواج کو جلا کر بھسم کر دو، تاریک دلوں میں علم کی روشنی پھیلاؤ اور ست عیش پسندوں کے رگ و پے میں کام کی بجلیاں دوڑا دو۔ اس کے بعد صبر کرو اور انتظار کہ قومیں اور طبیعتیں کیسے بنتے بنتے بنتی ہیں!

نقلی دنیا کے ملکوں میں تو یہ کچھ ہوا اب آؤ دیکھیں کہ اصلی دنیا کے لوگوں میں کیا ہو رہا ہے؟
انسانیت اور اُس کی تحریکات! یہ ہے دنیا کا حقیقی نقشہ!

اِس وقت دنیا میں تین زبردست تحریکیں عمل میں آرہی ہیں۔ علوم وفنون کی تحریک، آزادیوں کی تحریک، وسعت و مُعاونت کی تحریک اور یہ تینوں تحریکیں زندگی کے ہر شعبے میں بیک وقت اثر انداز معلوم ہوتی ہیں+

یہ علوم کے کرشمے ہیں کہ ہوا باز گھنٹے میں ۳۵۵ میل چل سکتا ہے اور نیویارک سے فرانسسکو تک کے ۲۸۲۲ میل ۲۹ گھنٹوں میں اور انگلستان سے ہندوستان تک کی ۴۱۳۰ میل کی مسافت بلا توقف ۵۰ گھنٹوں میں طے ہو جاتی ہے۔ یہ اُن لوگوں کے کارنامے ہیں جن کے ہاں ایک مسٹر لیہر کیمبرج یونیورسٹی میں کیمیا وغیرہ کی ترقی کے لئے اپنی جیب سے دو لاکھ پونڈ کا عطیہ پیش کر سکتا ہے اور برطانوی حکومت قوم کے لئے تین تصویریں تقریباً ڈھائی لاکھ میں خرید کر خوش ہوتی ہے اور فرانسیسی اکادیمی کے ارکان "غیر فانی" پکارے جاتے ہیں!

یہ آزادیوں کے کرشمے ہیں کہ اِس وقت برطانوی دارالعوام میں ۱۴ عورتیں ارکان ہیں اور اُن میں سے ایک عہدۂ وزارت پر متمکن۔ جنوبی افریقہ کے قطعی کالے لوگوں کی قومی کانگرس اور افریقی حقوق کی لیگ اپنے مطالبات پیش کرتی ہیں۔ دولِ متحدۂ امریکہ میں اب "حبشی تاریخ" پڑھائی جاتی ہے اور وہاں کی یونیورسٹیوں سے ہر سال دس ہزار حبشی تعلیم پا کر نکلتے ہیں اور مغرور امریکیوں کی سفید کانگرس میں ایک حبشی رکن بھی ہے! چین میں عورتیں تعلیم اور طب اور سیاست کے

ملکوں میں حصہ لے رہی ہیں اور یہ کیا ہندوستان میں شریف ہندو عورتیں ہزاروں کی تعداد میں خوشنما لباس پہنے بیسیوں مفید کام کرنے کو نکل رہی ہیں اور خدا کے فضل وکرم سے چند مسلمان خاتونیں بھی اپنی بھولی بھٹکی قوم کی چیخ و پکار کے باوجود کچھ نیم پردے میں کچھ پردے سے باہر نہ صرف خدا کی دی ہوئی ہوا اور روشنی سے حظ اٹھاتی ہیں بلکہ گاہے گاہے انسانیت کے لئے اپنی ننھی سی ناچیز خدمات بھی پیش کر رہی ہیں!

یہ وسعتِ معاونت کے کرشمے ہیں کہ انجمنِ اقوام ابھی قائم ہے اور کچھ کام کر رہی ہے۔ ڈاکٹر برنارڈو کے یتیم خانے میں سے جو دنیا کا سب سے بڑا کنبہ کہلاتا ہے ایک لاکھ سے زائد بچے مفید شہری بن کر نکلے ہیں اور اُس کے دروازے ہمیشہ ہر بچے کے لئے کھلے ہیں ۔ لندن میں سکاوٹ لڑکوں کا پچاس ہزار کا مجمع منعقد ہوتا ہے جس میں ۴۲ ملکوں کے نمائندے شریک ہوتے ہیں اور وہ ایک دوسرے سے دوستی کے تعلقات قائم کر لیتے ہیں۔ اسی طرح گائڈ لڑکیوں کی مل کر کام کرنے کی انجمنیں اپنا کام کرتی ہیں۔ لندن کا لارڈ میئر مصیبت زدہ کان کنوں کی امداد کے لئے جو فنڈ کھولتا ہے اُس میں پونے نو لاکھ پونڈ جمع ہو جاتے ہیں۔ اِس کے علاوہ ایک لندن کی خیراتی انجمنوں کی فہرست اٹھا کر دیکھئے کہ رعشہ زدوں کی انجمن اور غریب اندھوں کے خبر لینے والوں کی انجمن اور بچوں کو والدین کے مظالم سے بچانے والی انجمن اور پھر سپاہیوں کی اور جہازرانوں کی اور خدا اُن پر کیوں رحم نہ کرے اور رحم و تعلیم و مشورت کی سینکڑوں امدادی انجمنیں کہ جن کا بیان بھی ہم کچھ نہ کرنے والوں کے لئے سوہانِ روح ہے!

اِس کے بعد کون کہے گا کون کہہ سکتا ہے کہ یہ دُنیا ترقی پر نہیں؟ کہا جاتا ہے کہ اِس وقت دنیا میں تین کروڑ مسلح آدمی موجود ہیں پھر صُلح و آشتی کا ذکر لاحاصل ہے! بے شک یہ تین کروڑ تیر تفنگی توپچی ہیں اور ضرور ہیں بلکہ اِن کے ساتھ ارب ڈیڑھ ارب جاہل واجہل اور لوگ بھی ہیں۔ لیکن یہی تیر توپیں یہی جہل و تعصّب تو ہیں جن کے اندر سے، خود اِنہیں کے قلع قمع کرنے کے لئے اِن کے نامناسب جوش وخروش کو مناسب ہمت و شجاعت میں بدلنے کے لئے کیلگ اور ہوور اور میکڈانلڈ اور مصطفےٰ کمال اور ٹیگور اور گاندھی پیدا ہوئے! یہ کشمکش ہمیشہ سے جاری تھی اور ہے اور رہے گی اور خدا کرے زیادہ ہی زیادہ ہو۔ ہاں یہ ہو کہ جہاں یہ لڑائیاں ہاتھ پاؤں کی تھیں، خاک وخون کی تھیں، جسم و جان کی تھیں وہاں یہ لڑائیاں محض دل ودماغ کی ہوں، روح واصول کی ہوں۔ جہاں یہ جھگڑے ملکیت کے تھے وہاں محض یہ اختلافات محبت و معاونت کے ہوں جس سے ہر ایک فرد چند قدم اور سب انسان مل جل کر ہزاروں کوس میدانِ زندگی میں بڑھیں اور بڑھتے چلے جائیں!!

ب ل

وطن کا راگ

اے ہندوو! پُرانے نام و نشان والو
اے مُسلمو! دلیرو! اے آن بان والو
سِکھّو! خُدا پرستو! تیر و کمان والو
عیسائیو! جوانو! اے عزو شان والو

بن جاؤ بھائی بھائی ہندوستان والو!

صد حیف ہے تم اب تک غفلت میں سو رہے ہو
جو وقت کام کا ہے وہ وقت کھو رہے ہو
کیوں آبرو کو اپنی آپ ہی ڈبو رہے ہو
اپنی ہی کھیتیوں میں کیوں پھوٹ بو رہے ہو؟

اِک قہر ہے لڑائی ہندوستان والو!

اے ہندوو! کہاں ہے دریا دلی تمہاری؟
اے مسلمو! کہاں ہے حق آگہی تمہاری؟
کیا ہوگئی ہے سکھّو! اب جاں دہی تمہاری؟
عیسائیو! محبّت کیا مٹ گئی تمہاری؟

ہوتی ہے جگ ہنسائی ہندوستان والو!

چھوڑو یہ نیند اپنی اُٹھّو جو دم میں دم ہے
منزل بہت کٹھن ہے دوڑو کہ وقت کم ہے
غفلت تمہاری کیا ہی اپنے پہ اِک ستم ہے
عشرت تمہاری کیا ہے وجہِ ہزار غم ہے

ہے کاہلی بُرائی ہندوستان والو!

جکڑے ہوئے ہو جن سی اُن بندشوں کو توڑو
تم قید میں ہو اپنی اُٹھّو یہ قید چھوڑو
رشتے جو مدتوں سی ٹوٹے ہیں اُن کو جوڑو
کھانا الگ ہو جن میں اُن برتنوں کو توڑو

دل کی کرو صفائی ہندوستان والو!

وہ دن گئے تمہارا جگ میں تھا بول بالا وہ دن گئے کہ تم سے دنیا میں تھا اُجالا
اب ایسی آفتوں سے آکر پڑا ہے پالا بکھری ہے دانہ دانہ ہو کر تمہاری مالا

صدیوں کی وہ کمائی ہندوستان والو!

اُٹھو سپوتو اُٹھ کر بکھرے ہوئے یہ دانے اِک بار پھر دکھا دو دنیا کو وہ زمانے
دُنیا میں جب تھے یکتا ہندوستان کے سیانے جنّت بنا دیا تھا جب ہند کو خدا نے

جب سب تھے بھائی بھائی ہندوستان والو!

ہوتا نہیں ہے کیا کچھ دُنیا میں محنتوں سے ممکن نہ ہو جو، وہ بھی ممکن ہے ہمتوں سے
پالو مسرتوں کو اپنی مشقّتوں سے اپنا بنالو سب کو اپنی محبّتوں سے

خدمت میں ہے بھلائی ہندوستان والو!

دیکھو تمہاری حالت کیا کچھ دکھا رہی ہے سیکھو تمہاری فطرت کیا کچھ سکھا رہی ہے
جاگو تمہاری قسمت تم کو جگا رہی ہے دوڑو خدا کی قدرت تم کو بُلا رہی ہے

ہے جوش پر خدائی ہندوستان والو!

کام آئے گی نہ ہرگز دشمن کی اب شرارت ہوگی نصیب سب کو اب دوست کی زیارت
علم و عمل کی دولت پائے گا اپنا بھارت چمکے گی اپنی قسمت سُن لو مری بشارت

اب تم ہو اور رہائی ہندوستان والو!

ل ب

گول میز کانفرنس

کیا کہیں اس ہمہ گیر سیاست کے بے پناہ زمانے کو جب کہ بمصداق "ہر چیز کہ در کانِ نمک رفت نمک شد" ہر چیز اگر سیاسی نہیں تو نیم سیاسی ضرور ہے۔ اگر اُسے سیاسیات سے براہِ راست واسطہ نہیں تو کم از کم اُس کے طور طریقوں میں سیاسیانہ انداز ضرور ہی ہے۔ سیاست کیا ہی اک دوسرا نام بے چینی اور ناشکری کا، اک بہانہ لڑنے جھگڑنے کے لئے، زندہ رہنے کی اک ترکیب، بس یہی ہی سیاست۔ اب غور سے دیکھئے کہ علم و ادب میں بھی جن میں بمقابلہ سیاست کی گرمجوشی کے قابلیت کی سرخروئی ہونی چاہئے تھی آج کل کیا کچھ ہو رہا ہے؟ مناظرہ اور مباحثہ تک کا مقابلہ تو خیر یہاں جائز تھا بلکہ ضروری ہے لیکن اس کے ساتھ اب کاروباری مسابقت علمی و ادبی مخاصمت اور مصوّرانہ مخالفت بھی خدا کے فضل سے شاملِ حال ہو گئی ہے۔ یہ کیا ہے سیاست کا اثر علم و ادب پر۔ اس کی وجہ محض یہ کہ چونکہ ہم "ادیبوں" کے لئے سیاسی محفل میں ادب سے تعظیماً کرسیاں نہیں چھوڑ دی جاتیں اور خلوص و انکسار سے ہماری قابلیت کے آگے سر نہیں جھکا دیئے جاتے اس لئے ہم چراغ پا ہو کر اپنی اک یوں کہنے کو ادبی لیکن کام کرنے کو اک ڈیڑھ اینٹ کی الگ سیاسی انجمن کھڑی کر دیتے ہیں اور اُس میں تازہ ترین سیاسی و تمدنی طریقے سے خوب لڑتے جھگڑتے ہیں۔ اخیر خدا کا شکر ہی لڑتے ہیں جھگڑتے ہیں مگر کچھ کام تو کرتے ہیں۔ خدا بچائے ہمیں ایسے امن و امان سے، ایسے روح شکن سکون و اطمینان سے جو خُون کو رگوں میں اور تمنّاؤں کو دل میں منجمد کر دے!

میں انہیں خیالوں میں غرق نہیں نہیں فقط ہاتھ پاؤں مار رہا تھا کہ کسی نے گویا لاسلکی کے ذریعے سے مجھے کسی فلک نما کوہستان میں پہنچا دیا۔ ذرا ہوش سنبھالا تو کیا دیکھتا ہوں کہ خدائے جبّار کا نہیں یہ تو وہی مولانا محمد حسین آزاد والا دشوار گذار پہاڑ ہے جس کے اوپر سے بجائے نیرنگِ خیال والی شہنائی کے ڈھولک اور طبلے کی سی آواز سنائی دے رہی ہے اور جس کی چوٹی پر بجائے ایک بقائے دوام کے غالباً صرف اک شہرتِ عام کا (مگر اندر بارِ خاص منعقد ہونے کو ہے) ایک ہلکی سی پکار میں ہمایوں کا نام بھی سنا گیا سو داخل ہو کر کیا دیکھتا ہوں کہ بجائے حضرتِ آزاد والے وسیع و شاندار ایوان کے اک تنگ و مختصر لیکن روشن و ہوادار کمرے میں ایک گول میز لگی ہے جس پر لکھا ہے ہندوستان اس کے گرد کوئی ایک درجن منچلوں کا اجتماع ہے اور ہر ایک کے گلے میں ایک ایک گویا سیاسی ٹکٹ جس سے شاید ان کا حسب نسب معلوم ہو سکتا ہے لٹک رہا ہے اور وہ یوں بیٹھے ہیں:
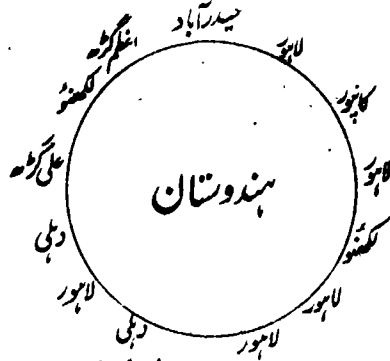
جب ہمایوں پہنچا تو کانفرنس شروع ہونے والی تھی اور میز پر پشمینے کی ایک چادر بچھنے کو تھی جسے کہیں کہیں کیڑا لگ چکا تھا اور جس کے وسط میں فارسی خط میں "اُردو" کاڑھا ہوا تھا! حاضرین آ آ کر ناظرین اور سامعین بن رہے تھے اور بھلا ہو کسی غیبی طاقت کا جس نے ان جیسی بے جیسی شکی مزاجوں میں ایک متین و مستند کو کرسی صدارت پر بٹھا دیا تھا کہ ان کی متخاصم بغاوتوں کو امن و مصالحت کا سبق پڑھائے +

صدر اُٹھا اور ایک "حقانی" لہجے میں ارکان کی "حاضری لینی" شروع کی جنہوں نے اس طرح لبیک کہا:۔

صدر	لاہور	نمائندہ	ملی جُلی چار آوازیں
"	عمر کے لحاظ سے جواب دو۔ اس میں پہلی زندگیاں بھی شامل ہیں!		
"	لاہور!	"	مخزن!
"	اعظم گڈھ!	"	معارف!
"	کانپور!	"	زمانہ!
"	لکھنؤ!	"	الناظر!
"	لاہور!	"	ہمایوں!
"	علی گڑھ!		علی گڑھ میگزین (اور اپنے کئی مردہ دوستوں کی طرف سے بھی)!
"	لکھنؤ!		نگار (اپنی عقل اور "نقاد" کی شکل کے ساتھ)!
"	دہلی!	"	جامعہ!
"	لاہور!	"	نیرنگ خیال!
"	لاہور!	"	عالمگیر!
"	لاہور		ادبی دنیا! (اپنے نگران اور اپنے سارے محکمۂ ادارت کی طرف سے بھی)

صدر — دہلی — نمائندہ — کامیابی! ادساری پرانی نظامیات کی طرف سے بھی کو سب سے نیا!"

" — حیدرآباد — صدر — اُردو!

باہر کے دروازے پر کھٹ کھٹ کھٹ! اور آوازیں "دروازہ کھولو دروازہ کھولو" ناظرین سامعین بن جاتے ہیں! اور بعض صدر کی طرف حیرت و استعجاب سے دیکھتے ہیں!

صدر۔ فی الحال دروازہ کا غلافی پردہ چھوڑ دیا جائے لیکن اگر مسلسل کھٹ کھٹ کے ساتھ اور نعرے بھی مستقل طور پر سنائی دیں تو ہر مستقل مزاج کو اس قومی مجلس میں آنے کی اجازت دی جائے گی (بعض حاضرین ناک بھوں چڑھاتے ہیں) حضرات یاد رکھئے یہ ایک جمہوری مجلس ہی ہے۔ آپ میں سے کوئی صاحب بلکہ سب کے سب میرے سمیت بھی کسی کو باہر کھڑا رہنے پر مجبور نہیں کر سکتے

ناظمین کی طرف سے مجھے ہدایت ہوئی ہے کہ میں آپ سب صاحبوں کو مطلع کر دوں کہ اس گول میز میں مستطیل میز ہونے کی قابلیت موجود ہے۔ (اس " استیطال" پر سامعین میں "قیل وقال" ہونے لگتی ہے!)۔

لہٰذا آج کے اجلاس کے بعد میں غور کروں گا کہ اوروں کے اندر آنے کی اجازت دی جائے۔ ممکن ہے ہماری کوتاہی سے بعض ایسے اصحاب باہر رہ گئے ہوں جن میں "ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات" ہونے کی صلاحیت ہے۔ میں اس امر پر بھی غور کروں گا کہ "اندر آنے کی اجازت نہیں" کا تختہ باہر کے دروازے سے ہٹا لیا جائے اور ہم لوگ ایک عام ملکی لسانی کانفرنس منعقد کریں جس میں اُردو کی طرف سے ہندی پسند دوستوں کو بھی دعوت دی جائے! (نعرہ ہائے تحسین و علاماتِ چیں بہ جبیں!) اتنے میں میں دیکھ رہا تھا کہ اب میز کی صورت یہ ہے:

اُردو — مخزن — زمانہ — ہمایوں — نگار — نیرنگ خیال — ادبی دنیا — کامیابی — عالمگیر — جامع — علی گڑھ میگزین — الناظر — معارف

اُردو
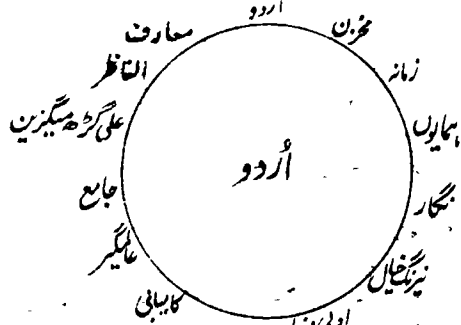
اور ان میں کچھ ذرا پرانی مگر زیادہ تر نئی وضع کے لوگ ہیں۔ بعض ہیں کہ عمامے پہنے ہیں اور ریش دار بھی ہیں لیکن اس ریش کے اندر ہی اتنی صفاچٹ زبانیں سمجھنے بولنے کے مدعی ہیں کہ پتلون کوٹ والے تک شرمندہ ہوں! پھر جو صدر کی تقریر سے بے اعتنا ہو کر میں نے اپنے ہم میزوں کی وضع قطع کی طرف توجہ کی تو کیا دیکھتا ہوں کہ

کوئی ہندوستان بھر کا نقشہ پہلو سے لٹکائے ہوئے ہے اور اس کے ایک کونے میں کچھ لکھا ہے جس میں صرف "صحیفہ" پڑھا گیا

کسی کے عمامۂ معرفت کے پیچ و تاب میں ادھر پیچ فلسفہ ہے اور اُدھر تاب مذہب!

کسی کا اس قول پر عمل ہے کہ "خیر زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بساز"

کوئی صرف اپنی "نظرے خوش گذرے" میں مست ہوکر "مبقرانہ نگاہوں" سے کسی کے خیال میں گم ہے

کسی کی کوئی سنے نہ سنے مگر وہ خواہ مخواہ واعظ بن کر زبانِ حال ہی سے یوں سرگرمِ تقریر ہے کہ "دورِ زمانہ چال قیامت کی چل گیا"

کوئی اپنے چھپے میگزین سے "علیگی" کاغذ کی طالب علمانہ گولیاں برسا رہا ہے۔

کسی کے نقش و نگار میں ریاستِ تحریر اور جوابِ استفسار کا بھاری بھرکم وقار ہے۔

کوئی معنوی حیثیت سے تقریباً جامع معلوم ہوتا ہے اگرچہ صوری نقطۂ نظر سے مانع نہیں!

کسی کی ساری حکمت اسی میں صرف ہو رہی ہے کہ وہ اپنی نت نئی نیرنگیوں اور سالانہ فنی دعوے داریوں سے ہر کہ و مہ کو حیران و مبہوت کر کے اپنے قابو میں کر لے!

کوئی حسنِ کامیابی کے پر لگائے کاروباری زمین سے ادب کی چوٹیوں اور ادب کی چوٹیوں سے علم کے آسمان تک پہنچ جانے کے لئے کوشاں ہے!

کسی نے نیرنگی کے مقابل میں عالمگیری کو اپنا مطمحِ نظر بنا لیا ہے۔

کوئی ہندوستان سے گذر کر زمین کے دونوں کُرے ایک اس کان سے دوسرا اُس کان سے لٹکا رہا ہے کہ وہ دنیا کے ذریعے سے ادب کی اور ادب کے ذریعے سے دنیا کی خدمت خلوصِ وفا و حسنِ عبادت کے ساتھ کرنے کا تاج اپنے وزبان و ملک کے سر پر رکھنے کا متمنائی ہے!

اور ان "کوئی" اور "کسی" کا صدر وہ ہے جسے اپنی "اردویت" کا دعویٰ نہیں لیکن جس کا خاموش دگویا عمل اُسے خود بخود اس انجمنِ ادب کا صدر بنائے ہوئے ہے اور یہ صدارت ہی اک ایسی شے ہے جس کا سب کو کم از کم دل میں متفقہ اعتراف ضرور ہے!

میں اس تاک جھانک میں مصروف تھا اور ان صورتوں پر دوبارہ سہ بارہ نظر دوڑانے کا آرزومند تھا کہ پھر باہر سے کھٹ کھٹ کھٹ کھٹ کی آوازیں آنی شروع ہوئیں یہ کہ سالانہ نمبر عید نمبر بقر عید نمبر افسانہ نمبر مستانہ نمبر بہار نمبر بے شمار نمبر!

حاضرین میں اک کھلبلی سی پڑ گئی۔ صدر نے پہلے تو اِس بے ہنگم شور و غل کی طرف ایک متین بے توجہی برتی لیکن جب دیکھا کہ اس سے کام نہیں چلتا تو "خاموش خاموش" کا پُر زور جملہ کہا لیکن پھر بھی بعض بولا کئے اور بعض تو اور زیادہ زور سے چیخنے چلّانے لگے یہاں تک کہ اِن فصحا میں سے مخزن نیرنگِ خیال عالمگیر ادبی دنیا اور اخیر میں ہمایوں بھی یہ کہہ کر اُٹھ بیٹھے اور اُٹھ کے دروازے کی طرف لپکے کہ اُردو ہمیں عزیز ہے لیکن اپنے "سالنامہ" بچے کچھ کم عزیز نہیں ہیں! اور جب باقی ماندوں نے کچھ تشویش و اضطراب ظاہر کیا تو باہر سے صرف اتنی آواز سنائی دی کہ "پھر ملیں گے اگر خدا لایا"! ــــ گھر پہنچ کر ہمایوں جی ہی جی میں کہتا ہے اے میرے خدا! اب تُو ہی ہم سب کے دلوں کو ملائیو!

ل ب

اقبال منزل کی نشست گاہ میں داخل ہونے پر نگاہِ حسن تلاش کے لئے دو مقناطیس ہیں۔ دائیں طرف ایک قطعہ ہے جس میں خوشنویسِ ازل کا نام یعنی

اللہ

بڑی شان سے ہویدا ہے اور بائیں طرف ایک تصویر ہے

یعنی یہ ——— ۵

اللہ کی بندی

ان دو کو نہ دیکھنا تقریباً ناممکن ہے۔ انہیں دیکھ کر دوبارہ نہ دیکھنا قطعی ناممکن ہے۔ اس بتِ ہندی کی ادنیٰ نخوت یہ ہے کہ انسان اللہ سے منہ موڑے تو پھر اسے دیکھے۔

یہ تو پتہ نہیں کہ یہ کسی کی تصویر ہے یا محض مصور کی ذہنیت میں صنفِ نازک کا خیالی معراجِ کمال ہے مگر بنانے دیکھنے والوں کا دل یہ ضرور کہتا ہوگا ع

بہشت را چہ می کنم بنا بہشتِ من توئی

آکاش کے جوگی کی سُورگ اُس کے اپنے دل میں ہے مگر اس تصویر سے استادہ ضرور کہے گا۔ ور کہیں نہ کہیں تو ضرور ہوگی۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ خدا مصور سے پیچھے رہ گیا ہو! تُو ہوگی اور ضرور اپنی اس تصویر سے بڑھ چڑھ کر ہوگی۔

اے رخِ زیبا! اس تصویر میں تیری صرف ایک جھلک ہے۔ ہاتھ ملائیں، مالا گلے میں اور وہ دو میٹھے بڑے یعنی تیرے ہونٹ بس ہلا ہی چاہتے ہیں، قلم بازی کہنے کو ہیں گونگے ہیں۔ تُو خود اور کہاں تیرے فردوسِ ناز کا یہ اختصار! اس میں تیری خوشبو کہاں، تیری گفتگو کہاں؟ مصور نے ذرا سا کچھ دکھلا کر کیا کیا نہیں چھپایا! کس قدر تجھے ڈھانکا ہے! مگر مصور سچا تھا۔ ورنہ جو بجائے تیرے لباس کی تہ در تہ دلفریبیوں کے خود تیری گلعذاری کی شعریت کی داد دیتا جو تیرے رنگ کی رونق کو، تیرے روپ کے فروغ کو یوں نہاں کرتا تو تُو اے برقِ مستور خدا جانے کہاں کہاں گرتی! اے ناز آفریں! تیرا حسن بجائے خود ایک خدائی پیغام ہے مگر اس کی ترجمانی کا وقت نہیں ع خراب بادۂ لعلِ تو ہوشیار انند کار آگ کون شروع کرے اور اُس کے سننے والے کتنے ہیں! مگر ہاں یہ یقین رکھ کہ تو جہاں کہیں بھی ہو دنیا تیری غزل خواں ہے۔ اے اب اے پرتیِ رخسار خدا حافظ! ہمایوں میں یہ سفر تجھے مبارک ہو مگر اپنی سرخ تلک والی بہنوں کی طرف ایک پیغام لیتی جا! انہیں کہہ دے کہ گنگا والے تو مرنے کے بعد اپنی جلی راکھ گنگا میں ڈبوتے ہیں اللہ والے جیتے جی اپنی آبرو گنگا میں بہا چکے ہیں، اب ان سے غصہ گلہ فضول ہے۔ انہیں کہہ دے کہ برسوں تُو خود دیکھ چکی ہے کہ ان کی آنکھیں اس شرم سے جھکی رہتی ہیں کہ ان کے دلوں کی امنگ کہ ہندوستان کی سیوا کریں پوری نہ ہوئی۔ کہہ دے کہ یہ تو ہیں کہ چھوت مٹانے آئے تھے مگر خود اچھوت بن کر رہ گئے اور ان کی انتہائی ندامت یہ ہے کہ جو کام انہوں نے شروع کیا پورا اب کسی اور سے ہوگا۔ یہ سب کچھ کہنا اور پھر اپنی بہنوں سے پوچھنا کہ اپنوں کو غیر کب تک بناتی رہیں گی؟

آکاش کا جوگی

---

۵ یہ لکیر کا تیر الٹا ہے۔ نیز اندازہ ہے۔ دائیں بائیں مقابل جس طرف سے دیکھو، کمرے کے جس حصہ سے دیکھو پیر و مرشد غالب کے شعر کی مصداق ہے

دل سے تیری نگاہ جگر تک اتر گئی — دونوں کو اک ادا میں رضامند کر گئی

دُنیا کا نیا تمدّن

دُنیا میں ایک نئے تمدّن کا آغاز ہے!

بیسیوں تمدن سطحِ ہستی سے اُبھرے اور مٹ گئے۔ ایلمی بابلی اشوری، مصری چینی ہندی، ایرانی یونانی رومی یہ پرانی تہذیبیں آئیں اور چلی گئیں۔ پھر وسطی زمانے میں اسلامی تمدّن کا بول بالا ہُوا اور اُس کے ڈنکے کی چوٹ دنیا نے مشرق سے مغرب تک سنی۔ یورپ یہ آوازہ سُن کر جاگ اُٹھا، اُس کے گھروالے باری باری اپنا اپنا بستر بوریا سنبھالنے لگے اور یوں اُس کے ہاں اُس تہذیب کی ابتدا ہوئی جس کی چکا چوند آج دنیا بھر کو خیرہ کرنے کی مدعی ہے۔ لیکن مغرب کی یہ جھوٹی سچی دعویداری فی الحقیقت مشرق اور صرف مشرق نہیں دنیا بھر کی بیداری ثابت ہوئی مغرب نے نخوت سے مشرق کے مُردوں کو ٹھکرایا لیکن یہ اعجازِ مسیحائی تھا یا قدرتِ خداوندی کہ وہ سب کے سب یکے بعد دیگرے اپنی زیاں کاری کے مرقد سے اُٹھ بیٹھے اور ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے اپنے اربابِ حل عقد سے دست و گریبان ہو گئے! تہذیبِ مغرب کا سورج سپین اور پرتگال فرانس اور انگلستان جرمنی اور اطالیہ کا چکر لگاتا ہُوا امریکہ پہنچا اور بحر الکاہل میں ڈوبتا ہُوا جاپان میں گویا مشرق سے پھر طلوع ہُوا۔ یہاں اُس کی نور پاشی نے چین اور ہندوستان ترکی اور ایران عرب اور مصر یہاں تک کہ بیچارے افغانستان کو بھی مدتوں کے خوابِ گراں سے بیدار کیا۔ حق یہ ہے کہ مغربی تہذیب کی برقی ضیا نے تمام دفن شدہ تہذیبوں کے بھُولے بسرے آثار پر روشنی ڈال کر اُنہیں صدیوں کی نیند سے جگا دیا۔ جو کوئی اُٹھا اُس نے مغربی تہذیب کا جامہ زیبِ تن کیا لیکن قوموں کی انجمن میں جگہ پاکر اپنے وقت پر تھوڑی دیر کے لئے تو اپنی ہی پرانی تہذیب کی ڈفلی بجائی جو کچھ کسی کی سمجھ میں آئی کچھ نہ آئی۔ ہندیوں نے قدیم ہندی، اسلامیوں نے قدیم اسلامی چینیوں نے قدیم چینی تہذیب کے گن گانے شروع کئے۔ لیکن انصاف یہ ہے کہ تو کہنے والوں نے بزور کہا اور سننے والوں نے بھی بغور سنا لیکن نہ اکثر کہنے والے نہ اکثر سننے والے کسی ایک بات سے اس قدر متاثر ہوئے کہ دوسری باتوں کو بالکل بھول گئے بلکہ سب نے جی ہی جی میں یہی سمجھا کہ ہر ایک بات میں کچھ کچھ بات ضرور تھی۔ ہر ایک نے محفل میں اپنے موقع پر اُٹھ کر اپنے اپنے باغ کے پھول برسائے پیلے اور نیلے لال اور ہرے پیازی اور جوگیا، محفل اِن رنگارنگ پھولوں سے غیرتِ ارم اور نمونۂ جنت بن گئی سو اگر کوئی پوچھتا کہ کونسا رنگ

اہلِ محفل کو بھایا تو اُس کا جواب خاموشی یہی دیتی کہ پھولوں کی ملی جلی رنگینیوں نے محفل کے دل و جان کو قسم قسم کی گلچینیوں کا حلقہ بگوش بنا دیا۔ محفل رنگوں کی ایک محفل تھی جس میں کسی ایک رنگ کی کمی بھی اہلِ محفل کو منظور نہ ہوتی ——— یہ ہے اب دنیا کی محفل کا انداز! دنیا قسم قسم کے تمدن کی جلوہ گاہ ہے۔ طرح طرح کی تہذیب کا مینا بازار ہے رنگ رنگ کے پھولوں کا چمن ہے۔ اب کیا کہیں کون سی صورت بیچ میں سے نکل جائے کونسی آرائش کم کر دی جائے کونسا پھول توڑ مروڑ دیا جائے اب تو جی یہی چاہتا ہے کہ سبھی کا جلوہ ہو سبھی کی صحبت ہو اک دوسرے کے ساتھ اک دوسرے کے لئے سبھی کا حسن ہو اک دوسرے کی محبت اک دوسرے کی ترقی و تقویت کے لئے! ——— مشرق و مغرب شمال و جنوب غرض ہر سمت سے خوش منظر بدلیاں امنڈ امنڈ کے آئی ہیں ایک کو دوسری ہٹاتی ہوئی نیچا دکھاتی ہوئی بڑھی چلی آتی ہے تخالف ہے تصادم ہے کیا زور ہے کتنا شور ہے بجلیاں کوندتی ہیں بدلیاں گرجتی ہیں رعد کی کڑک سے دل سینوں میں دہلے جاتے ہیں برق کی چمک سے آنکھیں چندھیائی جا رہی ہیں ڈر ہے کہ ابھی آن کی آن میں اِن طرف طرف سے بڑھنے والے جنگجوؤں کا مقابلہ و معرکہ ہونے والا ہے دل کانپتا ہے کہ ابھی آسمان شق ہو جائے گا ابھی قیامت دنیا پر ٹوٹ پڑے گی ابھی خدا جانے کیا سے کیا ہو جائے گا ——— نہیں نہیں دوستو! یہ خوش منظر بدلیاں بڑھ رہی ہیں کہ عین ہمارے سروں پر آکر ہماری قسمت کی اندھیری رات میں اُس چمکتے دمکتے ستارے کو اپنی آغوش میں لے لیں جس سے دنیا بھر کی ظلمتیں منور و متجلی ہونے والی ہیں۔ یہ ظلمت کو بڑھا رہی ہیں کہ وہ ستارہ اور چمکے یہ دلوں کو بتا رہی ہیں کہ جنگ و مخالفت کا یہ ظاہرہ طوفان دراصل امن و موافقت کا پیغام ہے سو ہمدردی کے کان کھولو اور محبت کی آنکھیں وا کرو اور سنو اس ملی جلی شیریں آواز کو، دیکھو اس گھُلے ملے پیارے سے حسن کو!

دنیا کے سب قدیم و جدید تمدن جو بظاہر عرصۂ عالم میں ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہونے کو ہیں فی الحقیقت بہت جلد اک دوسرے سے ہم آغوش ہونے والے ہیں بلکہ غور کی نگاہ کیجئے تو اب بھی رہ رہ کر اک دوسرے سے بغل گیر ہوئے جاتے ہیں!

یہ ہے دنیا میں ایک نئے تمدن کا آغاز! تہذیبیں مل رہی ہیں اور اُن کے اتصال سے وہ تمدن پیدا ہو رہا ہے جس پر فرشتوں کی نگاہیں ہیں اور جس کے نشو و نما میں حصہ لینا جس کے ارتقا میں اک دوسرے کا ہاتھ بٹانا ہم میں سے ہر ایک کا فرض اور ہم میں سے ہر ایک کے لئے باعثِ ہزار مسرت ہے!

مسز اینی بسنت نے جو اس وقت دنیا کی سب سے عظیم الشان ہستیوں میں شمار ہوتی ہیں جو علم و روحانیت

اور عدل و معاونت کی علمبردار اور جہل و الحاد اور ظلم و استبداد سے روز و شب برسرپیکار ہیں تھوڑا عرصہ ہوا لندن میں اس نئے تمدن پر چار زبردست خیال انگیز تقریریں کیں جن میں انہوں نے اس کا خاکہ کھینچ کر اہلِ دنیا کو دکھا دیا کہ دنیا میں کیا کچھ ہونے والا ہے اور اُنھیں اس انقلاب میں کیا کچھ کرنا چاہئے!

پہلی تقریر موجودہ تمدن کے انحطاط کا خاکہ ہے۔ دوسری تقریر نئے تمدن کے مذہب کا نقشہ ہے تیسری تقریر نئے تمدن کی تعلیم کا عکس ہے۔ چوتھی تقریر نئے تمدن کی معاشیات کا بیان ہے۔

موجودہ تمدن زوال پر ہے لیکن اس زوال کے اندر کمال کی نت نئی صورتیں ظاہر ہو رہی ہیں اور یہ ہمارے اختیار میں ہے کہ اِن صورتوں کے رُونما ہونے میں ان کی اور اس طرح اپنی آپ مدد کریں۔

مسز اینی بسنت اور اُن کے ہم خیال "تھیاسفیوں" کو ایک نئے روحانی معلّم و رہبر پر اعتقاد ہے جو دنیا کو اک نئے رستے پر لگانے والا ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ جب انسانی معاشرت زوال پر ہو انسانی مذہب انحطاط پر ہو انسانی قول و عمل میں ایک ہیجان برپا ہو تو ایسے وقت میں ہمیشہ دنیا میں ایک نیا رہبر رونما ہوتا ہے ایک نئی نسل نمودار ہوتی ہے اور ایک نیا تمدن ظاہر ہوتا ہے۔ آج کل اک ایسا وقت ہے سو اٹھو اور علم و تعاون کی برکتوں سے اپنے آپ کو اور دنیا بھر کو مالا مال کر دو!

فطرت میں انقلاب کی نشانیاں ظاہر ہو رہی ہیں۔ یہ ہیبت ناک زلزلے یہ موسم کے سخت تغیرات بے معنی نہیں۔ اگر ہم ان کو ملاحظہ کریں اور محض روزانہ اخباروں کی گھڑ دوڑوں کی ہار جیت اور موٹر کاروں کے حادثوں کے مطالعہ میں اپنا وقت ضائع نہ کریں تو ہمیں اُن آنے والے واقعات کی اک دھندلی سے جھلک دکھائی دے جائے جو گا ہے گا ہے تاریخ دنیا میں ظاہر ہوتے رہتے ہیں بعض دفعہ ہم گئی گذری نسلوں کے تغافل پر ہنستے ہیں کہ جب ایسے ایسے حالات اُن کے پیشِ نظر تھے تو کیوں وہ اپنے خوابِ خرگوش سے نہ جاگیں۔ کیا اسی طرح آنے والی نسلیں ہم پر نہ ہنسیں گی کہ جب دنیا کے واقعات زبانِ حال سے ہمیں ہونے والی تبدیلیوں کا یوں پتہ دے رہے تھے تو ہم کیونکر اپنی غفلت سے بیدار نہ ہوئے؟

واقعات و حالات سے نتائج اخذ کرنا آسان کام نہیں اور پھر اس میں اختلافِ رائے کو اس قدر دخل ہے کہ ہم از روئے انصاف اپنے سے مختلف رائے رکھنے والوں کو الزام نہیں دے سکتے لیکن الزام ہم اُن لوگوں پر ضرور لگا سکتے ہیں جو کوئی رائے نہیں رکھتے یا جو واقعات و حالات پر کافی غور نہیں کرتے اور پہلے کی طرح اپنی پرانی بوسیدہ رائے پر قائم رہ کر آنکھوں پر پٹی باندھے رکھتے ہیں اور پھر کہتے ہیں تو یہی کہ ہمیں تو آنے والے طوفان

کی کوئی ذراسی جھلک بھی دکھائی نہیں دیتی + ضرورت اس امر کی ہے کہ لوگ غور کریں اور پھر رائے قائم کریں غور کریں اور ہر غور کرنے پر اپنی رائے کو بشرطِ ضرورت تبدیل کرنے پر تیار ہو جائیں۔ محض آرام پسندی اور کاہلی سے حال پر قانع نہ رہیں بلکہ دیکھیں کہ اُن کے اور دوسروں کے لئے بہتری کن باتوں میں ہے اور وہ باتیں کیونکر حاصل کی جاسکتی ہیں +

حق یہ ہے کہ سب سے بڑی ضرورت پہلے اپنے خیالوں کو تبدیل کرنے کی ہے۔ خیال کی طاقت زبردست ہے۔ قبل اس کے کہ ملکوں اور قوموں کے آئین و قوانین میں نوعِ انسان کی بہتری کے لئے تبدیلیاں ہوں ضرورت ہے کہ لوگوں کے خیالات میں تبدیلی ہو۔ لوگوں کا خیال تبدیل ہوگا تو قانون بنانے والوں کو قانون خود بخود تبدیل کرنے پڑیں گے +

بعض ماہرینِ علم الانسان کے نزدیک اس وقت دنیا میں ایک زبردست نسلی انقلاب ہو رہا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ آج کل ایک نئی تحتی نسل نمودار ہو رہی ہے جس کے افراد عام لوگوں سے بہت زیادہ بلند پایہ ہیں۔ مسز بسنت کہتی ہیں کہ دُولِ متحدۂ امریکہ میں کیلیفورنیا کے علاقے میں معلمین نے مدارس میں اس امر کا تجربہ کیا ہے کہ یہ نئی قسم کے بچے ۴½ یا ۵ برس کی عمر میں وہ کچھ بآسانی سیکھ لیتے ہیں جو دوسرے عام بچے ۷ یا ۸ برس کی عمر میں سیکھ سکتے ہیں۔ یہ فرق اس قدر نمایاں اور عملی نقطۂ نظر سے اس قدر تکلیف دہ ہے کہ مدارس میں اب وہاں بچوں کے دو فرق بنا دیئے گئے ہیں ایک نئی قسم کے بچوں کا اور دوسرا عام بچوں کا۔ ان کو اکٹھے پڑھانا ناممکن ہو گیا ہے۔ یہ نئے بچے باتوں کو بہت جلدی سمجھتے ہیں اور ان میں ایک غیر معمولی دماغی وصف وجدان کا ہے جو دوسروں میں نہیں ہوتا۔

تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہماری عظیم الشان مادری نسل میں سے وقتاً فوقتاً تحتی نسلیں نکل نکل کر نقل مکانی کرتی رہیں۔ ان میں ہر تحتی نسل کا ایک روحانی معلم تھا ہر ایک کا اپنا تمدن تھا اور ہر ایک کی اپنی سلطنت تھی + قدیم زمانے میں نقل مکانیوں کے بعد ہم مصر کی سلطنت ایران کی سلطنت روما کی سلطنت اور ہندوستان کی سلطنتیں اُبھرتی دیکھتے ہیں۔ سوائے ہندوستان کے اُن میں سے ہر ایک میں ایک ہی تحتی نسل تھی اور ہر ایک نے اپنے وقت میں ایک عالمگیر سلطنت قائم کی اور ہر ایک کا ایک تمدن تھا جو اس سلطنت میں پھولا پھلا اور پھر وہیں مٹی میں مٹی ہو کر غائب ہو گیا + اس سلسلے کی پانچویں تحتی نسل ٹیوٹنی نسل ہے۔ ابھی تک انہوں نے ایک پوری عالمگیر سلطنت قائم نہیں کی لیکن ہاں یہ ضرور ہے کہ گذشتہ تین صدیوں میں برطانوی قوم نے دنیا میں چاروں طرف دُور دُور اپنی نوآبادیاں پھیلا دیں۔ چند سال ہوئے کہ اس نسل کے اندر دو گروہوں میں ایک سخت

جنگ یعنی ۱۹۱۴ء کی جنگِ عظیم وقوع میں آئی۔ اور اس سے بہت پہلے ڈیڑھ صدی ہوئی کہ اس نے حصہ برطانوی سلطنت سے علیحدہ ہوگیا۔ امریکی جنگِ آزادی خود اختیاری حکومت کی لڑائی تھی۔ جنگِ عظیم میں "قوت پسند" سلطنت کو شکست ہوئی لیکن اب دیکھنا یہ ہے کہ "حریت پسند" سلطنتیں کیونکر اپنی حریت کو عمل میں لاتی اور کچھ کر دکھاتی ہیں۔

جرمن سلطنت اگرچہ زور و قوت پر مبنی تھی لیکن اس کے ساتھ اس میں تحصیلِ علوم کی کوششیں جاری تھیں اُس کی حکومت نے اپنے استبداد کے زمانے میں بھی مزدوروں کو فراموش نہ کیا بلکہ بیسیوں طرح سے ان کی بہبود کو مدِنظر رکھا اور علم و فن میں اور آرام و آسائش میں اُن کو حصہ دیا۔

دُولِ متحدۂ امریکہ میں انسانی معاشرت کی حالت بمقابلہ دوسرے ملکوں کے بدرجہا بہتر اور قابلِ ستائش ہے۔ وہاں غریب انسان کلوں سے بےکل نہیں رہتا وہ کلوں کا غلام نہیں بلکہ کلیں اُس کی غلام ہیں۔ وہاں کے بڑے شہروں میں وہ بھیانک حصے مفقود ہیں جہاں غربا ڈھوروں کی طرح زندگی بسر کرتے ہیں۔ وہاں مزدوروں کے گھر بھی آرام دہ ہیں جن میں نہ صرف باقاعدہ رہائشی کمرے ہیں بلکہ جن کے اردگرد اپنے اپنے چھوٹے سرسبز باغ ہیں۔ یہ باغ دیواروں سے گھرے ہوئے نہیں ہوتے نہ ان کے اردگرد باڑیں ہوتی ہیں کہ پاس کے گزرنے والے ان کے اندر جھانک نہ سکیں۔ نہیں بلکہ وہ عام سڑک کی طرف کھلے رہتے ہیں اور رنگارنگ کے پھول ان میں لہلہاتے ہیں جس سے شاہ راہ پر گزرنے والے ایسی سڑکوں پر چہل قدمی کرسکتے ہیں جن کے دو رویہ پھولوں کے تختے ہوں۔ پھر امریکہ میں جماعتی احساس ذرا نہیں۔ بلاشبہ دولت بے انتہا فرق ڈال دیتی ہے لیکن انہیں دولت مندوں میں وہ بھی ہیں جو ابھی تھوڑی مدت ہوئی کسی کے کارخانے میں ہر روز اپنے ہاتھ سے کام کرتے تھے۔ انگلستان میں جہاں قدرے متموّل مزدور بھی ہوں اُن میں اور زیادہ باثروت لوگوں میں ایک قسم کا جماعتی احساس ضرور ہوتا ہے۔ امریکہ میں یہ حالت نہیں وہاں کوئی امیر ہو یا غریب اپنے ہاتھ سے کام کرنے والا دماغ سے کام کرنے والے کے ساتھ بالکل اسی طرح ملے گا گویا وہ دونوں ایک ہی طبقے کے رکن ہیں۔ اس سے انسانی دوستی کی ایک عجیب دل کش فضا پیدا ہو جاتی ہے جو دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

اس کے مقابل میں باقی ماندہ دنیا کی حالت نہایت قابلِ رحم اور لائقِ شرم ہے۔ نہ صرف امارت و عزت کی وجہ سے ایک مصنوعی فرقِ مراتب قائم ہوگیا ہے بلکہ اس پر مستزاد کہیں ہندوستان کی طرح ذات پات کی تفریق کہیں حاکم و محکوم کا قضیہ کہیں گورے کالے کے جھگڑے ہیں۔ اور اس کا نتیجہ کیا ہے؟ امیر غریب کی مغایرت جماعتوں

کی منافرت قوم ونسل کی کشمکش اور جیسا کہ روس میں ہوا ہیبت ناک انقلابات جو پے در پے زلزلوں کی طرح انسانی
معاشرت کو کچھ عرصے کے لئے تباہ و برباد کردیں + جہاں کہیں عوام الناس کا ایک بیشتر حصہ ذلت کی زندگی بسر
کرتا ہے خواہ وہ غلامی پرانی قسم کی ہو یا نئی قسم کی، مغربی مزدورانہ غلامی یا مشرقی غربا کی سی بدترین غلامی جو دن رات
فطرت ونوعِ انسان کے آگے ٹکڑے ٹکڑے کے لئے محتاج ہیں وہاں متمدن سے متمدن ملک کے دل میں بھی گویا ایک
ناسور چھپا ہے جو کسی روز یک لخت اُس کی حرکت کو بند اور اُس کی تمدنی زندگی کو اک مدت کے لئے مسدود کر سکتا
ہے + اس کا کیا علاج ہے؟ یہی کہ ان ملکوں کے متمول اور تعلیم یافتہ لوگ اپنے خوابِ غفلت سے اٹھیں اپنی آراء
کو دہرائیں نچلی جماعتوں سے اپنے سلوک کے طریقے بدل ڈالیں دوسری قوموں سے اپنے تعلقات نئے سرے
سے قائم کریں اور جو باتیں بصورتِ دیگر قیامت خیز انقلابوں سے ہوکر رہیں گی اُن کو ارتقا اور امدادِ باہمی سے ابھی
وجود میں لے آئیں!

جنگِ عظیم میں کیا ہوا؟ کہا جاتا ہے کہ ایک "قوت پسند" سلطنت کو ایک "حریت پسند" اتحاد نے پچھاڑا۔ اگر قوت
فی الحقیقت حریت سے پسپا ہوئی تو وقت ہے کہ انسانیت بھی دیکھے کہ وہ حریت کیا پھل لائی ہے؟ زور و قوت کے
اضداد کیا ہیں حریت و اخوت! اب ضرورت اس کی ہے کہ قوموں کی ایک آزاد دولتِ عامہ قائم کی جائے + ٹیوٹنی
نسل نے جو برطانوی سلطنت دنیا میں جگہ جگہ قائم کردی ہے وہ کس طرح قائم رہ سکتی ہے؟ محض اس طرح کہ
اُس کے اجزا اور اجزا بھی تمام کے تمام آزادی وخود اختیاری کے رشتوں سے آپس میں منسلک ہوجائیں برطانوی
مدبر اس خود اختیاری اور آزادی کا تذکرہ کرتے ہوئے اکثر اپنی سلطنت میں کے ہر سات آدمیوں میں سے اُن چھ
کو بھول جاتے ہیں جن کا رنگ اُن کی بہ نسبت زیادہ سیاہی مائل ہے۔ پھر کیا یہ خود اختیاری کیا یہ آزادی ہے اور کیسا
ہے یہ تعاونِ عمل اور اتحادِ سلطنت جو رنگ ونسل کے امتیاز کو کسی طرح نظر انداز نہیں کرتا؟ کب تک یہ رنگ
کی حدِ فاصل چلی جائے گی؟ مسز بسنت خوب کہتی ہیں کہ آسٹریلوی انگریز بھی تو اب سفید سے زرد ہوتے جاتے
ہیں پھر چند برسوں کے بعد خدا جانے اُن کو سفید سلطنت میں کہاں جگہ ملے گی؟

اگر ہمیں موجودہ معاشرت کو تباہی سے بچانا ہے تو ہمیں اس میں سینکڑوں سیاسی اور معاشی اور انفرادی
تبدیلیاں کرنی پڑیں گی۔ اب وقت آگیا ہے کہ نوعِ انسان کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ انسانی معاشرت کا سب سے بڑا
اور اٹل قانون قانونِ اخوت ہے۔ یہ قانون اتحادِ زندگی پر مبنی ہے جس طرح خدا واحد ہے اسی طرح وہ زندگی
بھی جو اُس نے بنائی ہے تمام دنیاؤں میں واحد ہی ہے اور زندگی کے اس اتحاد کے یہ معنی ہیں کہ اُن تمام زندگیوں میں

جو بظاہر جدا جدا ہیں فی الحقیقت وحدت کا سیمیں رشتہ قائم ہے۔ اس لئے وہ جو اپنی انفرادی بہبود کا خیال کریں گے قومی بہبود کے خلاف اور جو قومی بہبود کا خیال کریں گے بین قومی بہبود کے خلاف اور نوعِ انسان کے خلاف اور اس طرح توڑنا چاہیں گے قانونِ اخوت کو قانونِ اخوت خود اُن کو اور اُن کے منصوبوں کو توڑ پھوڑ کر رکھ دے گا!!

اور یہ قانونِ اخوت محض انسانی زندگی تک محدود نہیں بلکہ وہ ہر قسم کی زندگی پر حاوی ہے۔ کوئی زندگی نہیں جو اس سے باہر ہو۔ حیوانی زندگی (اور جیسا بوس نے ثابت کر دیا ہے) نباتاتی زندگی (اور جیسا بعضوں کا خیال ہے) معدنی زندگی (اور جیسا رُوحانیوں کو یقین ہے) فوق انسانی زندگی سب کی سب اِسی سنہری قانون سے وابستہ ہیں۔ اس اتحادِ زندگی کو جان کر سمجھو اُن فرائض کو جو تم پر عائد ہوتے ہیں۔ اگر تمہیں زندگی میں پُھولنا پھلنا ہے تو اس قانون کے مطابق دنیا میں رہنا سہنا سیکھو!

اب وقت آ گیا ہے کہ ہم سلطنتوں کے خواب چھوڑ دیں اور بجائے سلطنت کے ایک دولتِ عامہ کے قیام و استحکام پر غور کریں۔ ہماری معاشرت اور ہماری حکومتوں میں کن تبدیلیوں کی زیادہ ضرورت محسوس ہوتی ہے؟ کون سی باتیں ہیں جو ہمارے مسلّمہ قانونِ اخوت کے خلاف کام کر رہی ہیں؟ کون سا حصّہ ہے جو اس قانون کی برکتوں سے محروم ہے؟ بلا شبہ غریبوں اور مزدوروں کا طبقہ اور نوعِ انسانی کی عورتیں اور نوعِ انسان کے بچّے! کب تک مزدوروں کی حالت یوں ناگفتہ بہ رہے گی؟ جسمِ انسانی کا یہ زخم کب تک مندمل نہ ہو گا؟ کب تک عورتیں گلی کوچوں میں ماری ماری پھریں گی عورتیں جو اپنے اندر نسلِ انسانی کا مستقبل لئے ہوئے ہیں؟ کب تک بچے معاشرت کا غیر ضروری جزو سمجھے جائیں گے بچے جن کی صحیح تعلیم اور صحیح تربیت پر دنیا کی بہتری کا دارومدار ہے؟ اگر تم ہر عورت کو جو بازار میں چلتی پھرتی ہے اپنی ماں سمجھ کر دیکھو اور اُسی طرح اُس کی عزت کرو اگر تم ہر ہونے والی ماں کو انسانیت کی اک امانت تصور کرو اور اُس کے تحفظ کا کما حقہٗ خیال کرو تو تمدن کے چہرے کا یہ بدنما دھبّا ایک خوشنما خال ہو جائے۔ اگر تم سمجھ لو کہ ہر بچّہ جو دنیا میں آتا ہے اپنے ساتھ ایک جداگانہ سیرت لے کر آتا ہے، کئی زندگیوں سے عمل و تجربہ کی دولت لے کر آتا ہے، اپنے اندر چھپائے ہوئے ساتھ لے کر آتا ہے ربّانیت کی ایک مقدس چنگاری کو جس سے کمال و نیکی کا اک حیات بخش شعلہ بلند ہو سکتا ہے۔ اگر تم یہ سمجھ لو تو تم جان لو کہ بچّہ ہمارا سب سے بڑا اور سب سے قیمتی قومی سرمایہ ہے، تم مان لو اُن فرائض کو جو تم کو ادا کرنے ہیں اُس کے لئے، پھر تم اُسے ایک پسندیدہ ماحول میں رکھو اُسے ایک مکمل تعلیم دو اور اُسے شہریت کی وہ تمام باتیں سکھاؤ جس سے وہ آنے والی برادرانہ جمہوریت کا ایک کارآمد رکن بن جائے!

دوستو! انسانی زندگی کے تین بڑے شعبے ہیں +

پہلا شعبہ مذہب ہے۔ مذہب کا یہ کام ہے کہ وہ زندگی کی طرف ہمارے نقطۂ نگاہ کو اور اس دنیا میں ہمارے مدعا کو نیکی کے سانچے میں ڈھال دے۔ اُس کی رہبری میں ہمارا مطمح نظر خودغرضی نہ ہو بلکہ بے غرضی جس کا دائرہ ہمیشہ وسیع تر ہوتا ہے یہاں تک کہ آخر کار وہ ایک عظیم الشان برادری بن جائے جس میں ہر زندہ وجود کے لئے ایک جگہ ہو +

دوسرا شعبہ تعلیم ہے۔ تعلیم کا کام ہے کہ وہ ہماری صلاحیتوں کی اصلاح کرے انسانی قوتوں کو اُبھارے تاکہ وہ روز بروز بڑھیں اور طاقت پکڑیں۔ اس طرح حصولِ علم سے ہم چیزوں کو سمجھنے لگیں۔ پھر اس علم میں محبت کا اضافہ ہو اور اس ملاپ سے ہم میں عقل و دانش پیدا ہو۔ تعلیم ایسی ہونی چاہئے کہ اس کے ذریعے سے ہر فردِ واحد جو دنیا میں آئے اپنی قوتوں کی بوجہِ احسن نشو و نما کر سکے۔ تعلیم ہی سے افراد و قوم کی شائستگی رونما ہوتی ہے اور شائستگی سے ہے انسانی زندگی اور نوعِ انسان کی ترقی میں ہر اُس شے کا عمل درآمد جو ہم سیکھتے ہیں +

تیسرا شعبہ معاشیات ہے۔ معاشیات ہماری معاشرت کی جڑ اور اس کی بنیاد ہے۔ وہ علم ہے مادی زندگی کی ضروریات کی صحیح پیدائش اور صحیح تقسیم کا + اس کے علاوہ اس کا مدعا ہے پورا پورا موقع دینا ہر ایک کو کہ وہ ایک حقیقی انسانی زندگی بسر کر سکے۔ اس زندگی کے معنی مادی جسم کی ضروریات کا پورا کرنا نہیں صرف ہر اُس شے کی بہم رسانی جس سے جسمانی مسرت یا جسمانی لطف حاصل ہو یا نری جسمانی ضروریات سے کچھ زائد چیزیں میسر ہوں بلکہ اس سے مراد اعلیٰ تر انسانی صفات کا انکشاف و ارتقا ہے جو بجائے استعمال سے فنا ہونے والی اشیا کے ان چیزوں میں اپنی خوشی پاتی ہیں جو استعمالِ باہمی سے اَور بڑھتی اور جلا پاتی ہیں، انسانی نفس کے خزانے جو علم و ادب میں ہیں انسانی جذبات کے خزانے جو فن و حرفت میں ہیں یعنی وہ غیر فانی خوشیاں جو ہماری فطرت کے اعلیٰ حصے کو فروغ دیتی ہیں اور انسان کو وہ کچھ بناتی ہیں جو اُسے ہونا چاہئے اگر اُسے تکمیل کو حاصل کرنا ہے جو ارتقا کا فطری مقصود ہے +

سب سے پہلے ہم پہلے شعبے یعنی مذہب پر ایک گہری نگاہ ڈالتے ہیں +

مذہب انسانی قلب کا درونی تقاضا ہے اُس زندگی کے حصول کے لئے جو ربانی زندگی ہے انسان کے اندر، وہ خدا جو اپنے مادی ماحول سے گھرے رُکے ہوئے انسان میں چھپا ہوا ہے اور اپنی باہیں پھیلاتا ہے اُس خدا کی طرف جو اُس کے باہر ہے ہر جگہ اس پر محیط ہر جگہ اُس میں دخیل۔ اگر یہ درست ہے کہ تمام کائنات میں صرف ایک ہی زندگی ہے اور وہ زندگی ایک قوت ہے محیطِ کل جس کے باہر کسی شئے کا وجود نہیں تو پھر یہ ظاہر ہے کہ وہ زندگی ایک

ذوی العقول پُرجذبات اور اپنے کاروبار سے اپنی مادی دنیا پر اثر ڈالنے والی ہستی میں رہ کر وہ "درونی خدا" ہمیشہ بیرونی خدا سے مل جل جانے کے لئے ساعی ہوگا۔ انسانی تاریخ کے دوران میں ہم ہمیشہ اس انسانی تمنا کو انسانی دل میں بیتاب دیکھتے ہیں! یہ ہے مذہب اک درونی تقاضا اپنی ہی بلند تر خودی کو جاننے پہچاننے کے لئے! اور دنیا کے مذاہب کیا ہیں وہ بیرونی خدا کے جوابات ہیں، انسانوں کے درونی سوالات کے عارضی جوابات، اک دوسرے سے اپنی تفصیلات میں بہت مختلف لیکن ہمیشہ وہی بیرونی محبت، اپنے اندر لئے ہوئے جو اس اندرونی محبت کی تلاش میں سرگرداں ہے!

ہم دیکھتے ہیں کہ ہر نئی انسانی نوع کے ساتھ ایک نیا مذہب ظہور میں آتا ہے۔ یکے بعد دیگرے ہم تاریخ انسانی میں اِن مذاہب کو دیکھتے ہیں باطن میں اک دوسرے سے مشابہ لیکن ظاہرا ہر ایک اپنے جداگانہ نشانات لئے ہوئے ہر ایک کی اپنی اک خاص خوبی اور ہر ایک اُس نشانیوں اور خوبیوں کے خوشنما ہار کی زینت بڑھانے والا جو صرف اُنہیں کے تخیل کی آرائش ہے جو مذاہب عالم کی باطنی یکسوئی اور بیرونی رنگارنگی کو سمجھ سکتے ہیں۔ مثلاً "مادری نسل" میں ہم خدا کی وحدت کا ذکر "وہ" ایک بغیر دوسرے کے" سنتے ہیں۔ پھر یہی خیال مصر میں سورج ایران میں آگ اور یونان میں ہم آہنگی بن کر نظر آتا ہے۔ ہر مذہب نے اپنے اپنے وقت میں انسانی نسل کی بڑھتی ہوئی ممکنات میں اپنی اپنی خوبی کا اضافہ کیا۔

دنیا کے ہزاروں ایک سے ایک مختلف مذہبوں کے کثیر اختلافات کی واحد یکسوئی کیا ہے؟ وحدت! یہ وحدت سب میں برابر پائی جاتی ہے۔ اس وحدت کی پہلی خصوصیّت خدا کا سب پر حاوی اور سب میں مستور ہونا ہے۔ پھر ساری دنیا میں اِن آسمانی زندگیوں کی منزلِ مقصود انسانیت کی تکمیل ہے۔ اور یہ تکمیل کس طرح حاصل ہوسکتی ہے؟ محض اس طرح کہ زندگی کے بعد پھر زندگی ہو اور یوں حصولِ کمال کے لئے زندگیوں کا ایک سلسلہ چلا جائے۔ پھر یہ عرصۂ زندگی تین دنیاؤں میں منقسم ہے جسمانی دنیا درمیانی دنیا اور آسمانی دنیا۔ جسمانی دنیا میں انسان تجربہ حاصل کرتا ہے، نیکی بدی کا تجربہ، ہر قسم کی زندگی کا تجربہ۔ یہ تجربہ لئے ہوئے وہ موت کے منہ میں سے ہوکر گزرتا ہے۔ درمیانی دنیا میں بعض قسم کے تجربے پر دل مغموم ہوتا ہے کہ یہ کائنات کے ترتیب و حسن کے خلاف ہوتا ہے اس سے بے اطمینانی اور بے تابی پیدا ہوتی ہے کیونکہ جسم کے فنا ہونے کے بعد جسم کی بے تاب خواہشات بھی باقی نہیں رہتیں پھر اس قسم کے تجربہ سے اک کشیدگی روح میں پیدا ہوتی ہے اور یہ کشیدگی مستقبل کا خمیر بن کر روح میں جگہ پالیتی ہے۔ اخیر میں آسمانی دنیا ہے جہاں ہر قسم کا کارآمد تجربہ سیرت بن کر رونما ہو جاتا ہے، جہاں اوصاف قلب

کی کلیاں پھول بنتی ہیں جہاں ہر بلند پایہ تمنا قوتِ حصول کے پیدا کرنے میں اعانت کرتی ہے، ہر عالی خیال نفس کی ایک قوت بن کر پھر جسمانی دنیا میں صورت اختیار کرتا ہے، مدد دینے کی ہر آرزو اک پائیدار محبت بن جاتی ہے جسے موت نقصان نہیں پہنچا سکتی، ایک جذبہ زیادہ عمیق ایک خواہش زیادہ قوی ایک ہیجان زیادہ پُرزور و پُرطاقت - یہ ہے یقینی تکمیل ہر فردِ بشر کے لئے تکمیل جس کی راہ میں گرنا پڑنا رکاوٹ مصیبت سب کچھ ہے لیکن جو قطعی یقینی ہے ہر وجود کے لئے!

مولانا روم نے خوب کہا ہے:-

از جمادی مُردم و نامی شدم	از نما مُردم بحیواں سرزدم
مُردم از حیوانی و آدم شدم	پس چہ ترسم کے ز مُردن کم شدم
حملۂ دیگر بمیرم از بشر	تا برآرم از ملائک بال و پر
بارِ دیگر از ملک پرّاں شوم	آنچہ اندر وہم نایدآں شوم
آبِ کوزہ چوں در آبِ جُو شود	محو گردد در وے چوں اُو شود

یہ ہیں وہ بنیادی سچائیاں جو تمام مذاہب میں پائی جاتی ہیں وہ سچائیاں جو وحدتِ حیات پر مبنی ہیں اور جن کا لازمی نتیجہ تمام زندوں کی اخوت ہے! یہی سچائیاں ہیں جو تمام مذاہبِ عالم کے اتحاد کی بنیاد ہیں اور اس سے پیدا ہوتی ہے "مذاہب کی مصاحبت" + مذاہب کی یہ مصاحبت نئے تمدن کی مرکزی خصوصیت ہوگی۔ اس کا یہ مدعا ہے کہ مذہبی جھگڑے ختم ہو جائیں گے مذہبی لڑائیاں بدترین جرم سمجھی جائیں گی مختلف مذاہب کے ارکان کے درمیان بجائے خوف بے اعتباری اور منافرت ہونے کے وہ اِس مصاحبت کا اقرار کریں گے اور سمجھ لیں گے کہ مختلف مذاہب ایک ہی انگوٹھی کے مختلف نگینے انسانیت کے گلے میں ایک ہی ہار کے چمکتے ہوئے موتی ہیں، یہ مصاحبت نئے تمدن میں بتدریج نشو و نما پائے گی اور حقیقت یہ ہے کہ اس کی ابتدا ہمارے سامنے جا بجا ہو رہی ہے تھوڑا عرصہ ہوا امریکہ کے ایک شہر بوسٹن میں پراٹسٹنٹوں کا ایک جلسہ اِس غرض سے منعقد ہوا کہ اس میں رومن کیتھلک مذہب کی خوبیوں پر غور کیا جائے - اِسی طرح یہودی "ربیوں" اور عیسائی پادریوں کے اکٹھے جلسے جنوبی ہندمیں ورا کے مقام پر ہندوؤں مسلمانوں کا جو عموماً آپس میں لڑتے بھڑتے رہتے ہیں مل کر عبادت کرنا اور اس قسم کے اور واقعات صاف ظاہر کرتے ہیں کہ باوجود اختلافات و مناقشات کے باہمی مصالحت و مصاحبت کا زمانہ آرہا ہے+ ایسے زمانے میں ہم میں سے ہر ایک کا فرض ہے کہ بجائے نقطہ چینی کے مختلف مذاہب کی خوبیوں پر غور کریں دیکھیں کہ ہر جدا

مذہب میں وہ کونسی خصوصیت ہے جو اُسے انسانیت کے لیئے بالعموم اور بعض خاص قوموں کے لئے بالخصوص مفید بنائے ہوئے ہے۔ ساز کے مختلف پردے جب ایک خاص انداز سے مل کر اپنی اپنی آواز بلند کریں تو یہ ملی جلی آوازیں اک ایسی لَے پیدا کردیتی ہیں جس میں صحیح اور اعلیٰ موسیقی ترنم ریز ہوتی ہے + اس سے ظاہر ہے کہ جہاں کہیں ہم اختلاف رائے پائیں ہمیں اس پر ناک بھوں نہ چڑھانا چاہئے بلکہ ہمیں خندہ پیشانی سے اس پر توجہ کرنی چاہئے تاکہ ہم صداقت کی مختلف الاضلاع شکل کے مختلف پہلو دیکھ سکیں اور مل جل کر اُس سے پوری واقفیت حاصل کرسکیں۔ اسی طرح مذاہب کی مصاحبت میں ہم اپنے بھائی کے مذہب کی قدر و قیمت کو اختلاف اور مشابہت دونوں ذریعوں سے ٹھیک ٹھیک پہچان سکتے ہیں +

ہمارے اس نئے تمدن میں مذہب کی خاص خصوصیّت کیا ہوگی؟ مسز بسنٹ کہتی ہیں یہ خصوصیت بجائے اعتقاد کے علم ہوگی۔ اُس نئی نسل میں جو دنیا میں جا بجا اُبھر رہی ہے ہم دیکھتے ہیں کہ وجدان کی صفت پیدا ہو رہی ہے وجدان جس کے متعلق شہرۂ آفاق فرانسیسی فیلسوف برگساں کا خیال ہے کہ وہ بجائے عقلی قوت کے جبلّی قوت اور موروثی تجربے کے زیادہ قریب ہے۔ یہ موروثی تجربہ کئی زندگیوں میں جاکر حاصل ہوتا ہے اور اس کے حصول کے بعد عامل بلا استدلال اُسے عمل میں لے آتا ہے۔ یہ صفت حیوانات میں جبلّی تحفظِ حیات ہے اور انسان میں وہ حقیقت نما وجدان ہے جو استدلال اور عقل سے بالاتر ہے +

وجدان کی یہ خاص صفت ہے جو نئی تحتی نسل کے بچّوں میں رُونما ہو رہی ہے اور یہی ہے جو نئے تمدن کے مذہب میں اعتقاد کی جگہ لے گی۔ کیونکہ وجدان حقیقت کی پہچان ہے براہِ راست، پہچان جو اندرونی زندگی کے اندر سے پیدا ہوتی ہے نہ ایسی جو مادّہ کے بیرونی ذرائع والی زندگی سے ظاہر ہو۔ دقیق مادے کی نقاب محض روح کی اک پوشاک سی رہ جاتی ہے جب وجدان نشو و نما پائے اور وجدان کی نشو و نما اک فرد میں نوعِ انسان کے معمولی ارتقا سے بہت پیشتر ہوسکتی ہے +

یوگ یا معرفت سے ہم فطرت کے وہ اعلیٰ اوصاف اور قوتیں بڑھا سکتے ہیں جن سے دنیا ترقی پاتی ہے اس دنیا میں ہمارا کام مادے کو روحانی بنانا اور متجلّی کرنا ہے تاکہ وہ روح کا فرمانبردار خادم اور آلۂ کار بن جائے ہم محنت و ریاضت اور ایثارِ نفس سے وجدان کو اپنے اندر پیدا کرسکتے ہیں قبل اس کے کہ ارتقائے عامہ اسے ساری بنی نوعِ انسان میں پیدا کردے + معرفت وہ علم ہے جس کے ذریعے سے انسانی روح عمداً حیاتِ ربّانی کے ساتھ اتحاد پیدا کرلیتی ہے۔ اس علم کی دو شاخیں ہیں۔ تصوف اور خفائیت +

صوفی دنیا کی آنی جانی چیزوں کو پسِ پشت ڈال دیتا ہے اور اُن پر کبھی توجہ نہیں کرتا۔ وہ خوشی کے پیچھے نہیں دوڑتا اگر یہ نہ ہو، اور اگر ہو تو وہ اُس سے روگرداں نہیں ہوتا۔ وہ اپنی راہ میں آنے والی چیزوں کو اک بلند روحانی بے اعتنائی سے دیکھتا ہے جسے نہ کسی شے کی خواہش ہے نہ نفرت جس کے لئے کچھ اجنبی نہیں۔ فانی چیزوں کو یکے بعد دیگرے چھوڑ کر جسم کی شہوات سے منہ موڑ کر جذبات سے علیحدہ ہو کر نفس سے دُور دُور رہ اپنی ہی فطرت کی گہرائیوں میں غوطہ زن رہتا ہے اور وہاں اُن کی تہ میں خدائے عزوجل کی ذات کو پالیتا ہے۔ اُس کی راہ ہے تنہائیوں کی راہ جہاں کوئی اُس کا ساتھی نہیں ایسی راہ جس پر چلنے والوں کو اکثر دنیا نہیں سمجھ سکتی اور جب وہ منزلِ مقصود پر پہنچ جاتا ہے تو فقط اک خاموشی ہے جو اُس کا اظہار ہوتا ہے دنیا کی طرف۔ فلسفہ اپنا استدلال کرلیتا ہے ماورا الطبیعات اپنا جو کچھ ایک نفس وضع کرتا ہے دوسرا اُسے سمجھ سکتا ہے۔ لیکن وہ "اعلیٰ" جو حقیقت ہے وہ اعلیٰ جو سرمدی ہے تقدیر میں یوں ہی لکھا ہے کہ اُس سے عقل خاموش ہو کر پیچھے گر پڑتی ہے اور اُس خاموشی میں حقیقت کا پتہ چلتا ہے + اسی لئے تصوف مکمل طور پر سکھا یا پڑھا یا نہیں جا سکتا۔ بہت سی باتیں ہیں جو کی جا سکتی ہیں بہت سے علوم ہیں جو سیکھے جا سکتے ہیں لیکن جب "بیرونی خدا" "اندرونی خدا" پر اپنا پرتو ڈالتا ہے تو اس اتحاد میں خاموشی ہی کا ماحول فطری اور لابدی ہے + یہ ہے علم حقیقت کا براہِ راست!

"خفائی" کا رستہ اس سے بالکل جدا ہے جس طرح انسانوں کی طبائع ایک سے ایک جداگانہ ہیں + خفائی علم سیکھتا ہے تاکہ علم کی رموز سے وہ قدرت کی قوتوں پر قابو حاصل کرلے۔ اسی لئے اُس کے دو رستے ہیں ایک ایثار و معرفت کا رستہ دوسرا اغرض و ہوس کا۔ یہ دوسرا رستہ بنہایت خطرناک ہے اور بہت سے آدمی ہیں جنہوں نے اِسے طے کرتے ہوئے آپ اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماری ہے + لیکن اگر اُس نے سب سے بڑا اور مفید سبق سیکھ لیا ہے، لوگوں کی خدمت کا رستہ، اگر وہ قوت حاصل کرنا چاہتا ہے محض اس لئے کہ وہ کمزوروں کی مدد کرسکے راستی اور پاکیزگی چاہتا ہے تاکہ وہ بھولے بھٹکے بھائیوں کو سیدھی راہ پر لا سکے تو وہ یقیناً اُن بلند چوٹیوں پر پہنچ جاتا ہے جہاں کے رہنے والے دنیا بھر کو بلند و بالاتر کرنے والے ہیں + نئے تمدن میں صوفیوں اور خفائیوں کی اک خاصی تعداد ہو گی اس لئے تمدن کی تکمیل کے لئے نہ صرف عقل و دانش کی ضرورت ہے کہ دنیا کی مادی ضروریات پوری ہوں بلکہ اُس ربانی انسانی اتحاد کی حاجت بھی ہے جس سے حقیقت کی روشن ترین ضیا انسانوں کے جادۂ زیست پر پڑتی ہے! اس ترقی کی شرط، لابدی شرط خدمت ہے اور خدمت کا بہترین طریق یہی ہے، وہ طریق جس سے زندگی کا بلند ترین اطمینان اور بہترین تسکین حاصل ہوتی ہے، کہ اُن چیزوں سے جو ہماری ہیں ہم دوسروں کے ساتھ مل جل کر لطف اٹھائیں جو

کچھ ہم میں علم، فنون، شائستگی کی دولت ہے صحیح مذہب کی تعلیم یہی ہوگی کہ ہم سب کے ساتھ مل کر اُس سے مستفید ہوں۔ دنیا کی بہترین اشیا وہی ہیں جن کا استعمال مشترک ہو۔ اپنے لئے محض اپنے ہی لئے کوئی شے مخصوص نہ کرلو بلکہ جو قیمتی اور انمول چیزیں تمہارے قبضے میں ہوں اُنہیں دوسروں کے ساتھ مل کر استعمال کرو۔ اس کے یہ معنی ہونگے کہ تم اپنی بیش بہا دولت کو باہر بہائے جاؤ گے اور جتنا یہ بہاؤ باہر کو زیادہ ہوگا اُتنا ہی اُس نہ ختم ہونے والے آسمانی خزانے کا بہاؤ تمہارے اندر زیادہ ہوگا جس کا سیم و زر خود خدا کی ذات ہے۔ جتنے تمہارے ہاتھ خالی ہوتے جائینگے اُتنا ہی ربّانی قوت اُن کو اپنی نعمتوں سے لبریز کئے جائے گی!

یہ ہے خفائی کا مقصد کہ وہ اِس قوت کو دنیا بھر میں پھیلا دے، خاموشی میں چھپا ہوا شِشش جہت میں اپنے زبردست خیالات کی رَو بھیجے جس سے تمدّن اپنے خطروں سے محفوظ رہے اور صحیح رستے پر لگ جائے۔ یہ کچھ تعجب کی بات نہیں ذرا بھی ناممکن نہیں۔ کیا آج بھی سائنس دانوں نے قدرت کی بعض چھپی ہوئی قوتوں کو آشکار کر کے انسانی خیالات و علوم کی نشر و اشاعت نہیں کی؟

تھیاسفیوں کو یقین ہے کہ آج کل ساتویں کرن دنیا میں طاقت پکڑ رہی ہے اور اُس کی اعانت سے دقیق دنیاؤں کے رہنے والے نوعِ انسان کے ساتھ اشتراکِ عمل کر سکتے ہیں جس سے دونوں کو زیادہ قوت مل سکتی ہے کہ ارتقا کی رفتار تیز تر ہو جائے۔ مسز بسنت کہتی ہیں کہ میں نے خود مشاہدہ کیا ہے کہ جب دعا اِس یقین کے ساتھ کی جائے کہ اُس کا جواب ملے گا تو جواب فوراً ملتا ہے اور ساری فضا میں اک تبدیلی واقع ہو جاتی ہے! اُن کا قول ہے کہ روز بروز دنیا میں ایسے بچے زیادہ تعداد میں پیدا ہو رہے ہیں جن میں مستقبل بینی اور دُور بینی کی قوتیں فطری طور پر موجود ہوتی ہیں۔ سر کے وسط میں ان قوتوں کا مرکز ہے اور یہ ترقی پا رہا ہے۔ اس کے بعد وہ وقت آئے گا کہ فرشتے انسانی آنکھوں کو نظر آنے لگیں گے۔ پھر انسانوں اور فرشتوں کی مصاحبت کا دوبارہ یقین پیدا ہوگا اور دنیا ایک نئی دنیا ہو جائے گی۔

اب بھی اپنی خیالی قوت کے عمدی استعمال سے تم بہت کچھ کر سکتے ہو۔ یہ خیالی قوت کیا ہے؟ کیا تم جانتے ہو کہ یہ تمہارے دماغ کی وہ قوت ہے جو برق پیما کے ذریعے سے ناپی جا سکتی ہے۔ اگر تمہاری یہ قوت زیادہ ہو اگر تمہیں اپنی اس قوت پر زیادہ اختیار ہو تو برق پیما کی سوئی زیادہ لرزنے لگ جاتی ہے۔ تمہارا خیال تمہارے دماغ کی برقی رَو ہے۔ یہ یاد رکھو کہ دنیائیں درشت و دقیق مادے کی دنیائیں اک دوسرے سے الگ الگ نہیں بلکہ ایک کے اندر ایک کا نفوذ ہے جس طرح ہوا پانی کے اندر چلتی ہے اسی طرح خیال مادے کے اندر نافذ ہو جاتا ہے

جب ہوا اور برق ایسے ایسے کرشمے دکھاتی ہیں تو تم کیوں تعجب کرتے ہو کہ انسانی خیال نئی سے نئی طاقتیں حاصل کر کے دنیا کے تمدّن کو جِلا دے سکتا ہے ؟!

اور جب بہت سے انسان مل کر اس خیالی قوت کو استعمال کریں تو یقین کئے رہو کہ اِس قوت سے بڑی عظیم الشان تبدیلیاں واقع ہو سکتی ہیں۔ یہی وہ طاقت ہے جو تھیاسفیوں کے اعتقاد کے مطابق دنیا کی "درونی حکومت" استعمال کرتی ہے + قدرت ہر بات کے لئے اپنے قوانین رکھتی ہے اور ان قوانین کی متابعت لازم ہے۔ علم کا حصول بھی قانون کی فرماں بری سے ہو سکتا ہے نہ کہ سرکشی سے! اگر ہم میں بہت سے آدمیوں کو معرفت کا علم حاصل ہو جائے تو ہم آج مل کر خدا جانے دنیا کو کیا سے کیا بنا دیں! نئے تمدّن میں خیال کی قوت مسلّمہ ہوگی اور بیرونی تمدن شریف ترین و بہترین انسانوں کے خیالوں کے سانچے میں ڈھلتا چلا جائے گا۔ نیا مذہب ایثارِ نفس کا مذہب ہوگا اور یہ ایثارِ نفس محبت اور علم کی شاخ سے پھوٹے گا۔ نئے مذہب کا ایک اصول کچھ کچھ اس طرح کا ہوگا "سب اہلِ محبت کا اتحاد اُن کی خدمت کے لئے جو دکھ درد میں ہیں!"

اب ہم نئے تمدّن کی تعلیم کی طرف توجہ کرتے ہیں۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ تعلیم کی غرض و غایت انسان کی تمام قوتوں کو جلا دینا۔ اُن کو ابھارنا اُن کو مکمل کرنا ہے + انسان اُس ذاتِ پاک کا اک ٹکڑا ہے جو اپنے تئیں قوت دانش اور عمل میں ظاہر کرتی ہے۔ جمادات محض ہستی تھے نباتات میں احساسات کی ابتدا ہوئی حیوانات میں عملیت کی طرف رجحان ہوا اور آخر کار انسان میں شعور کے تین بڑے طریقے ظہور میں آئے قوت ارادہ میں، دانش حقیقت کی تفہیم میں، عمل عقل میں رُونما ہو گیا۔ شعور کی یہ راہیں ہیں جن پر تمدّن یکے بعد دیگرے گامزن ہوئے۔ ارتقا پر غور کرو کہ کیونکر حیاتِ عالمگیر پردے سے باہر نکلی کیونکر اُس نے ہر حالت کے مطابق اپنے لئے نشو و نما کے ذرائع اختیار کئے رُوحِ مجسم نے "دیکھنا چاہا تو آنکھ سننا چاہا تو کان اور سوچنا چاہا تو نفس پیدا ہو گیا!" یہ عالمگیر حیات ہمیشہ جد و جہد کرتی رہی کہ ایسی ہستیاں وجود میں لائے جن میں اک چھوٹے پیمانے پر اُس کی مکمل خوبیاں رُونما ہوں + ٹیگور نے خوب کہا ہے "بچّہ خدا کا اک پیغام ہے کہ خدا ابھی نوعِ انسان سے مایوس نہیں ہوا" خدا کے اِس پیغام کو ہمیں سننا ہے اور اُس کے لئے رستہ صاف کرنا ہے + تعلیم کا کام ہے کہ جو ربانی قوتیں بچے میں موجود ہیں اُن کو ابھارے بڑھائے ظاہر کرے اور اُن کو دنیا کی بہبود و ترقی کے کام میں لگائے + اس غرض سے ہمیں انسان کی فطرت سے مکمل آگاہی درکار ہے اُس کے نفس

اُس کے احساسات اور اُس کی جسمانی خواہشات سے واقفیت درکار ہے +
سب سے پہلے جسمانی تعلیم آتی ہے پھر جذباتی تعلیم - جذبات کا شہوات پر انحصار ہے لیکن نفس ان جذبات کو سیدھی راہ پر لگا سکتا ہے اور ان سے بجائے عارضی جسمانی خوشی حاصل کرنے کے زیادہ مستقل لطف لے سکتا ہے - اس کے بعد نفسی تعلیم کی باری آتی ہے جس کا مدعا ہے قوائے نفس کو ابھارنا اور جہاں تک ہو سکے سدھانا! ہمارا مقصد ہے کہ بچے کو ایک شہری بنائیں جو پہلے اپنے گھرانے میں پھر اپنے گاؤں یا شہر میں پھر اپنے ملک میں اور بعدہٗ اپنی قوم میں ایک اچھا شہری بن کر کچھ مفید کام کرے - لیکن اُس کا دائرۂ عمل محض اپنی ہی قوم تک محدود نہ ہو بلکہ بتدریج دوسری قوموں تک پھیلتا چلا جائے، تعلیم کا کام ہے کہ وہ ایک ایسا منتہائے کمال بچے کی نظروں کے سامنے رکھے منتہا جو اُس کی سیرت پر اک گہرا اثر ڈالے اور اُس کے روز و شب کو اَور کا اَور بنا دے + بچہ اک قوت اپنے ساتھ لے کر آتا ہے تعلیم کا کام ہے کہ وہ اُس قوت کی راہ میں سے دنیاوی رکاوٹوں کو ہٹا دے اور اُس عظیم الشان قوت کو اپنا کام کرنے دے + اس سے اب کسی کو انکار نہیں کہ بچہ اپنے ساتھ اک خاص سیرت لے کر دنیا میں داخل ہوتا ہے - ایک مسلمان مصنف لکھتا ہے کہ بچہ دنیا میں اپنی سیرت اپنے گلے میں لٹکائے آتا ہے اور یہ ہے اُس کی قسمت! سچ یہ ہے کہ انسان کی سیرت ہی میں اُس کی قسمت مضمر ہے لیکن اس سے بڑی صداقت یہ ہے کہ بچہ ربّانی زندگی کا ایک ننھا سا پتلا ہے جس میں عقل اور وجدان اور ارادہ کی وہ زبردست قوت ہے جو انسان کی فطرت میں ربّانیت کا کرشمہ ہے - انسان کو دنیا میں سچی آزادی اگر حاصل ہو سکتی ہے تو محض اِسی طرح کہ وہ انسانی ارادہ کو ربّانی ارادہ کے ساتھ ہم آہنگ کر دے! آزادی خدمت ہے، مشیتِ ایزدی کی خدمت، مشیتِ ایزدی سے مطابقت انسانی ارادہ کی! کیونکہ انسان کی بھلائی اسی میں ہے کہ اُس کا ارادہ خدا کے ارادہ کے مطابق ہو جائے + سائنس کے مسئلۂ ارتقا کے مطابق ہر قسم کی ترقی اندرونی زندگی کی مساعی سے ہوتی ہے، اس زندگی کی مسلسل کوشش اپنے اظہار کے لئے - اس طرح خدائے قدیر اپنا بلند مدعا انسان کے ذریعے سے پاتا ہے اور انسان کے بچوں کو دنیا کا محافظ بنا دیتا ہے - سو تعلیم کا یہ کام ہونا چاہیے کہ وہ انسان کی اعلیٰ فطرت کے اندر ربّانیت کو آزاد کر دے، انسان کے اندر چھپے ہوئے خدا کو آشکار کر دے!

ہماری تعلیم کا مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ اک ایسا تمدن تیار کرے جو دنیا اور انسانیت کے قابل ہو + آج کل کے تمدن کے بعض پہلوؤں پر غور کرو تو معلوم ہوتا ہے کہ ہماری موجودہ تعلیم میں ضرور بعض سخت نقائص ہونگے جس کا نتیجہ ہمارے روزمرہ کے باہمی سلوک میں یوں ظاہر ہوتا ہے + ہم میں اپنے ہم جنسوں کے دکھ درد کی

طرف بہت بے اعتنائی ہے۔ بے شک نوع انسان میں ایثار اور باہمی اعانت کی بہت سی عمدہ مثالیں پائی جاتی ہیں لیکن اس سے کسی کو انکار نہ ہوگا کہ ابھی تک ہم ایسے پُرخطر واقعات سے اک گونہ لطف اٹھاتے ہیں جو خود ہمارے لئے خطرناک نہ ہوں + ہم اکثر لوگوں کو ایسی گھُڑ دوڑ یا موٹر دوڑ کا مزہ لے لے کر ذکر کرتے سنتے ہیں جن میں بعض شخص جان جوکھوں میں ڈال کر دوسروں کے لطف کا سامان بہم پہنچاتے ہیں۔ نربرک لینڈ کی موٹر دوڑوں میں کتنوں نے جان کھودی! اگر یہی ہمت کسی خطرے میں پڑے ہوئے انسان کی مدد کرنے میں دکھائی جاتی تو بات ہی اَور ہوتی + پھر دیکھو کہ کیونکر ایک ہی شہر میں امیروں اور عیش پسندوں کے سربفلک محلوں کے ساتھ ساتھ غریبوں اور مزدوروں کے جھونپڑے ہیں جن میں سے بعض کی حالت غایت درجہ شرمناک ہے۔ اُدھر زیادہ کھا کھا کر بیمار پڑنے والے بانکے آدمی ہیں اِدھر نانِ شبینہ کے محتاج بلکنے والے بچے۔ اگر یہ باتیں ہمیں یاد رہیں اگر یہ باتیں ہمارے دلوں کو دکھ دیں تو دنیا کی حالت جوں کی توں نہ رہے + دوستو! ہمیں اک ایسی تعلیم کی ضرورت ہے جو نئی پود کے نوجوانوں کو جن کے دل زیادہ گرم ہیں جن کا جوش زیادہ سچّا ہے اور جن کے جذبات زیادہ جلد متاثر ہو جاتے ہیں اُبھارے اور اُن کو انسانی خدمت کی راہ پر لگا دے تاکہ انسانی معاشرت کی شرمناک قباحتیں دُور ہوں اور ہماری آنے والی نسلیں اِن بندشوں سے آزاد ہو جائیں + اگر یہ کہا جائے کہ اِس کے لئے بہت سا روپیہ درکار ہے تو کیا آج بہت سا روپیہ بہت سی لغو و بے معنی باتوں میں پانی کی طرح نہیں بہایا جا رہا؟ آلاتِ حرب میں سامانِ زیبائش میں سیر تماشوں میں کتنا روپیہ صرف کیا جاتا ہے! اگر یہی فاقہ کش بچوں اور عورتوں کے پیٹ بھرنے میں صرف کیا جائے تو دنیا کتنی کچھ ترقی نہ کر جائے!

آؤ دیکھیں کہ بہتر تعلیم کیونکر دی جا سکتی ہے؟ سب سے پہلے ہمیں خوف کے جذبے سے انسانی نفس کو بالکل پاک و صاف کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ذرا ایک لمحے کے لئے خیال کرو اُس ننھی سی ہستی کا جو گویا دیووں اور جنوں کی دنیا میں داخل ہوتی ہے پھر سوچو کہ اُس کا کیا حال ہوتا ہوگا بے پروا اور خود کام لوگوں کے درمیان جو اُسے ہمیشہ ڈراتے اور بعض وقت دھمکاتے بھی ہیں! اور یہ کیا بہت سے راست رَو آدمی بھی ایک چھوٹے بچے سے بات کرتے وقت کچھ سوچتے سمجھتے نہیں۔ کیا تم کو کبھی خیال گذرا ہے کہ ایک بچّے کو کبھی کوئی سخت لفظ نہ کہنا چاہیئے اُسے کبھی ایسی شے سے ڈرنے نہ دینا چاہیئے جس سے اُسے بچایا جا سکتا ہے۔ کیونکہ سب سے ضروری وصف جو انسان میں پیدا ہونا چاہیئے وہ وصف جس کے بغیر کوئی تمدن تمدن کہلانے کا مستحق نہیں ہو سکتا جرات کا وصف ہے جس کی سب سے بڑی رکاوٹ خوف ہے۔ اگر ایک بچّے کو دلیر اور دلاور بننا ہے جیسا کہ اُسے بننا چاہیئے تو

اُسے خوف وخطر سے یکسر آزاد ہونا چاہیئے + کہا جاتا ہے کہ بچّے میں قصور ہوتے ہیں ہاں ضرور ہوتے ہیں لیکن کیا
ہم میں قصور نہیں ہوتے ؟ پھر ہم نہیں ڈرتے جیسا کہ ہم بچّے کو ڈرا دیتے ہیں ۔ بیچارے بچّے کی خصوصًا اپنے گھر میں
کوئی جائے پناہ نہیں ۔ اُس کے ماں باپ کبھی کبھی آپے سے باہر ہو جائیں تو ہو جائیں لیکن بچے کا مزاج اچھا ہی ہونا
چاہیئے ۔ کیونکہ جہاں اُس کا مزاج ذرا چڑچڑا ہوا وہیں وہ شریر اور نافرماں بردار ہوگیا + ضرورت ہے ایسی تعلیم کی جس میں
ڈرانے دھمکانے کی باتیں نہ ہوں کیونکہ بچوں کے آدھے قصور اور کمیاں ڈر کا نتیجہ ہیں + بچے سے سچ بلوانے کی بہترین
ترکیب یہی ہے کہ اُسے نڈر بنایا جائے + یاد رکھو کہ بچّے کو سچ بولنے میں بہت سی دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے ۔ بچے
کا تخیل نہایت تیز ہوتا ہے ۔ وہ بہت سی باتیں تصوّر کر لیتا ہے جو فی الحقیقت موجود نہیں ہوتیں ۔ بعض بچّوں میں وہبی
کی قوت ہوتی ہے ۔ ایک بچّے کی بابت بیان کیا گیا ہے کہ اُس کے ساتھ کھیلنے والا ایک اَور بچّہ تھا جو بظاہر نظر نہ آتا
تھا ۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ بچّہ ایک شے کو دیکھے نہ لیکن واقعی سمجھ لے کہ ہے ۔ پھر اگر وہ نازک احساس ہو یا ڈرنے والا
ہو تو زجر و توبیخ یا طعن و تشنیع سے ڈر کر وہ بعض وقت جھوٹ بولنے پر مجبور ہو جاتا ہے + ہمیں چاہیئے کہ ہم بچے کو صرف
سخت چوٹ سے بچائے رکھنے کے بعد زیادہ سے زیادہ آزادی دے دیں + ہم اُس کا دھیان کریں دیکھیں کہ اُس کا
میلان کس طرف ہے دیکھیں کہ اُس کی خصوصی قوتیں کیا ہیں دیکھیں کہ اُس میں کون سی کمی ہے جو بتدریج پوری کی
جا سکتی ہے ؛ پھر ہم اُسے ایسی تعلیم دیں جو اُس کی قوتوں کو بدرجۂ اتم بڑھائے ۔ یاد رکھو کہ یہ حق ہے بچّے کا ہم پر کیونکہ حقوق
کمزوروں کے ہوتے ہیں اور فرائض طاقتوروں کے ــــــ یہ بات ہم اکثر بھول جاتے ہیں !

ہم "انسان کے حقوق" کا بہت شور و غوغا سنتے ہیں ۔ کاش کہ ہم بچے اور جانور کے حقوق کا بھی کچھ ذکر
اذکار سنیں ۔ اِن کی حفاظت کا فرض ہم پر عائد ہوتا ہے ۔ اور نئے تمدن میں بچّوں کو سکھایا جائے گا اور وہ آسانی
سیکھ بھی جائیں گے کہ وہ اپنے گرد سب سے انسانوں سے حیوانوں سے غرض سب محسوس کرنے والوں سے
محبت کریں ۔ مسز بسنت کے قول کے مطابق نئے تمدن میں گوشت خواری کی عادت کو ظلم و بے رحمی سمجھ کر قطعی
ترک کر دیا جائے گا ۔ یہ دلدوز نظارہ کبھی دیکھنے میں نہ آئے گا کہ آج بچّے جس جانور کے ساتھ محبت سے کھیل رہے
ہیں کل اُسی کے کباب اُن کے سامنے کھانے کی میز پر لائے اور کھائے جائیں + لوگ کہتے ہیں کہ فطرت ظالم ہے
بھلا ذرا سوچو کہ جنگلی جانور پر فطرت کا ظلم زیادہ ہے یا پالتو جانور پر انسان کا ظلم ؟ ہمیں اپنا سلوک اُن سے جو ہمارے
قبضے میں ہیں جو ہمارے اختیار میں ہیں وہ بچے ہوں یا حیوان ہمیں اِس سلوک کو تبدیل کرنا ہے ۔ ہمیں جانوروں کی
ارتقا میں بھی مدد دینی ہے ہم جنہیں زیادہ عقل آ گئی ہے ۔ انسانی فطرت کی یہ بڑی خوبی ، رحم اور ہمدردی ، اگر

سے اپنے ہیں اور اپنے بچوں میں بڑھائیں گے تو یہ ایک نئے اور بہتر تمدن میں پھل لائے گی۔ ہماری تعلیم کا ایک جز
ر زندہ شے سے رفاقت کا احساس ہونا چاہئے!

بچے کی عمر کے پہلے سات سالوں میں اُس کی جسمانی پرداخت پر توجہ کرنی چاہئے ۔ وہ نہایت صحت بخش
حول میں رہے، اُس کی خوراک جسم پرور ہو، اُس کے لئے ہوا اور روشنی کی کھلی جگہیں ہوں ۔ زندگی کے یہ پہلے سات
سال وہ ہیں جن کی تلافی بعد میں کبھی نہیں ہوسکتی ۔ سائنس دان تم کو بتائیں گے کہ بچہ حیوانیت کے سب مراحل
یں سے ہو کر گزرتا ہے۔ اُس کے حواس غایت درجہ حسّاس ہوتے ہیں۔ لہٰذا یہ عمر ہے بچے کے اِن حواس کو تعلیم
ینے کی۔ ہوڈینی مشہور مداری کا قصہ ہے کہ وہ لندن کے ایک مشہور بازار میں سے گذرتے ہوئے اپنے بچے کو دکان
ں کھڑکیوں میں پڑی ہوئی فروختنی اشیار کی طرف توجہ دلایا کرتا تھا۔ پہلے پہل تو بچہ نہ بتا سکتا تھا کہ اُن میں کیا کیا
یزیں ہیں لیکن آہستہ آہستہ یہ حالت ہوگئی کہ جب اُس سے پوچھا جاتا تو وہ تقریباً ساری کی ساری چیزیں گنوا دیا
رتا ۔ "مونٹ سوری" طریقۂ تعلیم میں دیکھنے اور سننے اور چھونے کی طاقتوں کو ابھارا جاتا ہے۔ بچے میں یہ ساری
تیں خوب تیز ہوتی ہیں اور اُن کو بآسانی بڑھایا جاسکتا ہے ۔

سات سال سے چودہ سال تک کی عمر میں جذبات کی طرف توجہ کرنی چاہئے ۔

اس کا انتظار نہ کرو کہ جذبات بے لگام ہونے لگیں تو اُن کو سُدھارا جائے جب لڑکے اور لڑکی میں وہ اک
لوفان برپا کردیں اور وہ نہ سمجھیں کہ یہ کیا ہے ۔ نوجوانوں کے آگے نوعِ انسان کے بہترین افراد کی مثالیں پیش کرو جس سے
ن کے جان و دل میں عمل کی اک برقی رَو دوڑ جائے۔ بڑے بڑے جنگجوؤں بڑے بڑے نبرد آزماؤں کی مثالیں نہیں بلکہ
نوعِ انسان کے محسنوں اور خادموں کی مثالیں، بڑے بڑے نقاش بڑے بڑے سنگتراش بڑے بڑے مصنّف
بڑے بڑے شاعر، دوسروں کی راہ میں اپنی جانیں دینے والے دوسروں کے لئے اپنا آرام کھونے والے، وہ
جنھوں نے دوسروں کے لئے اپنے تئیں قربان کردیا نہ وہ جنھوں نے اپنے لئے دوسروں کو قربان کیا! یہ مثالیں نوجوانوں
کے آگے رکھو تو تم دیکھو گے کہ وہ بھی اپنی زندگیوں کو ان شاندار نمونوں کے مطابق بنالینا چاہیں گے!

شروع ہی سے کوئی نہ کوئی دستی کام تعلیم کا جزو ہونا چاہئے۔ علمِ ادب اور ریاضی اور دوسرے عام مضامین
کے ساتھ ساتھ ہاتھ سے کوئی نہ کوئی کام کرنے کی عادت بھی ڈالنی ضروری ہے کہ اس سے چابک دستی اور درستگی
جسمانی خوش اسلوبی اور جسمانی قوت حاصل ہوتی ہے جسم کی اس ورزش اور صلاحیت سے ہماری آنے والی
نسلیں زیادہ حسین و پُرصحت ہو جائیں گی ۔

جسمانی ورزشوں میں ٹولیوں کی ورزشیں بہت اہم ہیں۔ ایک سردار کے پیچھے ہولینا کھیل میں ایک معمولی حصہ لینے پر رضامند ہوجانا اگر اس سے ٹولی زیادہ اچھی طرح جیت سکے، یہ باتیں سیرت کو بہتر و مضبوط تر بناتی ہیں، یہ باتیں ہیں جن سے خوش مزاجی، رفاقت، کام کرنے کی خواہش بغیر کسی ذاتی مفاد کے پیدا ہوتی ہے۔ ان سے نوجوان ملک وقوم کے بہتر ارکان اور بہتر شہری بنتے ہیں +

اس کے بعد چودہ سال سے اکیس سال تک کی عمر ہے جب نفس کی تربیت کا خاص وقت ہوتا ہے۔ اس عمر میں آکر دماغ کے تمام وہ کیسے تیار ہوتے ہیں جو خالص عقلی علوم کے لئے درکار ہیں، علوم جن میں منطق اور تعقل کی ضرورت ہوتی ہے + تم جانتے ہو اکثر لڑکوں کو سکول میں اقلیدس سکھائی جاتی ہے وہ ثبوت نہ سمجھ کر خطوط اور زاویوں کے حروف طوطے کی طرح سیکھ لیتے ہیں لیکن حروف کو ذرا اِدھر اُدھر کردو تو وہ ٹامک ٹوئیے مارنے لگتے ہیں۔ اس میں اُن کا کچھ قصور نہیں۔ وہ استدلال نہیں کرسکتے۔ ہماری تعلیم ایسی ہونی چاہئے جو نہ صرف بچے کی نئی قوتوں کی نشوونما کرے بلکہ جو عام دماغی ارتقا کا بھی پورا پورا لحاظ رکھے تاکہ ہماری تعلیم بچے کے لئے مفید ہو، کہ مضر یا بے سود + اور تعلیم جس قدر بھی مختلف النوع ہو مفید ہوگی + کبھی بچے سے زبردستی نہ کرو۔ تم بعض وقت کہتے ہو کہ بچہ نکما بیٹھنا چاہتا ہے۔ بات یہ ہے کہ وہ نکما بیٹھنا نہیں چاہتا بلکہ وہ خاص ایسا کام نہیں کرنا چاہتا جو تم چاہتے ہو کہ وہ کرے۔ اگر تم بچے کی پسند ناپسند پر غور کروگے تو تم جان لوگے کہ عموماً جو کچھ بچہ کرنا چاہتا ہے اُس کے کرنے کی اس میں خاص صلاحیت ہوتی ہے + ہر بچہ دریافت کرنا چاہتا ہے اور یہ بات معلّم کو مدِنظر رکھنی چاہئے معلّم کو دیکھنا چاہئے کہ جب بچّہ متوجہ نہ ہو تو وہ کونسی بات ہے جو بچّہ کرنا چاہتا ہے +

اگر تم بچے کی بات مانوگے تو یہ یقین رکھو کہ وہ بھی وقت پر تمہاری بات مان لے گا۔ تمہارے الفاظ اور تمہاری مہربانی کو وہ نہ بھولے گا۔ اکثر ایسا ہوگا کہ اگر تم اک تھکے ہوئے بچّے کو تھوڑی دیر باہر کھیلنے کی اجازت دے دوگے تو واپس آکر وہ شوق سے کام میں لگ جائے گا۔ اس کے برخلاف اگر تم اُسے کونے میں کھڑا کرکے سزا دوگے تو ناخوش اور ترش رُو ہوجائے گا + سکول وہی کام کا ہے جہاں طلبا خوش خوش چھٹیوں کے بعد کام کرنے کو جائیں کیونکہ اس میں قسم قسم کے کام اور طرح طرح کے کھیل ہوتے ہیں جہاں اُن کی طبیعت خوش ہوتی اور کچھ کرکے دکھا سکتی ہے +

یہ امن و اطمینان کی فضا سکول میں تبھی پیدا ہوسکتی اور تبھی قائم رہ سکتی ہے جب معلّم یا متعلّم کو اپنی روزی کمانے کی فکر نہ ہو۔ قدیم ہند کے دارالعلوموں میں تعلیم پر حکومت کو مطلق اختیار نہ ہوتا تھا۔ معلّم جس طرح مناسب

سمجھتا تھا دار العلوم کو چلاتا تھا۔ اور دار العلوم کے اندر اُس کی بادشاہ سے بھی زیادہ عزت و وقعت ہوتی تھی اگرچہ وہ کبھی زیادہ متمول نہ ہوتا تھا کیونکہ اُسے دنیاوی جاہ وحشم کی ضرورت نہ تھی۔ وقار و شہرت اُس کے لئے بس ہوتی +

ملک میں ہر شخص کے لئے ایک جگہ ہونی چاہئے ملک کی دولت میں ہر شخص کو ایک حصہ ملنا چاہئے۔ ہمارے تمدّن میں ہر شخص کی عمر کے پہلے اکیس سال تعلیم کے لئے وقف ہونے چاہئیں۔ اس کے بعد جیسا کام یا پیشہ بھی وہ اختیار کرے اگر وہ اُس کام کو اچھی طرح سرانجام دے تو ہمیں اُس کی عزت کرنی چاہئے خواہ وہ اک مزدور ہو یا کچھ اور + اور اگر اُس کا کام زیادہ سختی اور ذلت کا کام ہے تو اُس کے کام کا عرصہ کم اور اُس کی مزدوری مقابلتہً زیادہ ہونی چاہئے تاکہ وہ اپنی فرصت کے اوقات میں اُن اوصاف کو اپنے اندر پیدا کر سکے جن کے لئے ہمارے موجودہ تمدّن میں وقت نہیں +

کیا تمہیں معلوم ہے کہ آج کل امریکہ میں جہاں ہر فرد بشر تعلیم یافتہ ہے جہاں ایک نوکر کا ملنا بھی بہت مشکل ہوتا جاتا ہے وہاں گھر کا تمام کٹھن اور ذلیل سا کام کل کے ذریعے سے کیا جاتا ہے۔ وہاں گھر کی مالکہ کے دس دس بارہ بارہ نوکر نہیں ہوتے۔ وہاں وہ خود بہت سا کام کرتی ہے کیونکہ کل اُس کے لئے یہ کام کر دیتی ہے + وہ کھانے کا سامان اکٹھا کر کے رکھ دیتی ہے کل میں اُسے ترتیب سے رکھ دیتی ہے اور گھڑی میں سوئی کو اُس گھنٹے کے نشان پر لگا دیتی ہے جب وہ کھانا تیار چاہتی ہے پھر وہ دوسرے کام کاج میں لگ جاتی ہے یا سیر تماشے کو چلی جاتی ہے اور جب واپس آتی ہے تو آکر دیکھتی ہے کہ کھانا عین اُسی وقت پر پکا پکایا تیار رکھا ہے۔ اس لئے گھر کا کام وہاں ایک بوجھ سا نہیں ہوتا + جیسا کہ ہم اوپر کہہ چکے ہیں کلیں انسان کے لئے ہیں نہ کہ انسان کلوں کے لئے!

ہمارا آئندہ تمدّن باہمی رفاقت کا تمدّن ہوگا ایک ایسا تمدّن جہاں ہم سب بآسانی مل جُل سکیں گے جہاں سب تعلیم یافتہ ہونگے جہاں سب کے ادب آداب اور باہمی سلوک عمدہ اور پسندیدہ ہونگے اور آپس میں ملنا جلنا ایک خوشی کی بات ہوگی نہ کہ حسد اور کینے کا باعث + اگر تم اک ایسا تمدّن پیدا کرنا چاہو گے اگر تمہارے دلوں میں اُس کی صحیح خواہش ہوگی اگر تم اُس کے لئے جرأت اور دلیری دکھاؤ گے تو تم ایک ایسا نظامِ تعلیم قائم کرو گے جو تمہارے تمدّن کی صورت بالکل بدل دے تاکہ زندگی سب زندوں کے جینے کے قابل ہو، زندگی جس کے مقاصد اعلیٰ اور بلند ہوں، جس کا ماحول خوشنما ہو، جس کی تکمیلات عظیم الشان ہوں۔ وہ زندگی جس کا حصول انسان کے لئے ممکن ہے، جس کے لئے انسان کو پیدا کیا گیا اور یہاں بھیجا گیا!

اخیر میں ہم نئے تمدن کی معاشیات کی طرف توجہ کرتے ہیں +

اس بات پر تو اب تقریباً سبھی سمجھ دار لوگ اتفاق کرتے ہیں کہ معاشرت اور اُس کے طبقوں کی موجودہ حالت ناقابلِ برداشت ہے اور قطعی شرمناک - لندن سے متمدن شہروں میں جو جمہوری قوموں کے دارالسلطنت ہیں محلوں اور عشرت خانوں کے ساتھ ساتھ اُن سے بالکل تھوڑی ہی دُور مزدوروں اور مفلسوں کے تنگ و تار مکانات ہیں جہاں فاقہ مستی کے نظارے دیکھے جا سکتے ہیں - پھر ہندوستان سے ملکوں کا ذکر ہی نہ کیجئے جہاں قحط و طوفان و وبا سے مر جانے والوں کی تعداد آئے سال لاکھوں تک پہنچ جاتی ہے + فی الحقیقت انسانیت کا دل نہیں کہ ان ذلتوں کو محسوس کرے ورنہ یہ زمین آسمان کے فرق یہ عشرت و عسرت کے مقابلے کبھی قائم نہ رہ سکیں! دقت یہ ہے کہ انسان نے ابھی اپنی خود غرضی سے رُوگردانی کرنی نہیں سیکھی!

غربت اور مفلسی کو دُور کرنے کی صحیح ترکیب صرف صحیح معاشیات کی بنیاد قائم کرنا ہے + لوگ کبھی دوسری بڑی بڑی اصلاحات کے ذکر پر کان نہ دھریں گے اگر اُن کے رہنے کو باقاعدہ مکان نہ ہوں اگر اُن کو پہننے کے لئے باقاعدہ کپڑے نہ ملیں اگر وہ آئے دن کئی کئی فاقے کر رہے ہوں + انگلستان سے متمول اور متمدن ملک میں بھی بے روزگاروں کی تعداد لاکھوں تک پہنچی ہوئی ہے - بلا شبہ اس قسم کی حالت کی بہتری کی تدبیر کچھ زیادہ مشکل نہ ہونی چاہئے + پھر جب ہم دیکھتے ہیں کہ مزدور جتنی زیادہ تعداد میں ضروریات کی چیزیں بنائیں اتنی ہی بازار میں ان کی بہتات ہوتی ہے اور اتنی ہی مزدوروں کی مزدوری بھی کم ہو جاتی ہے یا اُن میں سے بعض بے روزگار ہو جاتے ہیں جب ہم یہ عجیب و غریب حالت دیکھتے ہیں تو ہمیں یقین ہو جاتا ہے کہ موجودہ معاشی نظام میں ضرور کوئی نہ کوئی سخت خرابی ہے - یہ باتیں ہم آئے دن کہتے سنتے ہیں لیکن معاشی نظام پھر بھی جُوں کا توں قائم رہتا ہے گویا اس کا کوئی علاج ہی نہیں گویا نہ انسانیت کے دماغ میں سوچنے کی قوت باقی رہی ہے نہ اس کے دل میں ہمدردی کا جذبہ!

یورپ کے مقابل میں امریکہ میں مزدوروں کی حالت بدرجہا بہتر ہے - امریکہ میں افلاس تقریباً ناپید ہے - کچھ عرصے سے امریکہ میں ایک زبردست صنعتی انقلاب جاری ہے - یہ انقلاب ایک طرف مزدوروں کا دوسری طرف اُن کے آجرین کا پیدا کردہ ہے + ممالکِ متحدۂ امریکہ میں مزدوروں کی انجمنوں نے جا بجا اپنے کارخانے کھول دیئے ہیں اور پھر ان کارخانوں کو کامیابی سے چلانے کے لئے مزدوروں کے بنک بھی کھولے ہیں - انہوں نے عوام کے آگے چندے کے لئے ہاتھ نہیں پھیلائے بلکہ خود اپنی بچت سے ایسے کاروبار قائم کئے ہیں جو نہایت کامیابی کے ساتھ چل رہے ہیں - ان کارخانوں کے مالک مزدور ہیں اور ان میں کام کرنے والے بھی یہی مزدور ہی ہیں جو

ان کاروبار کے منافع کو امدادِ باہمی کے اصول پر آپس میں تقسیم کر لیتے ہیں + بہت سے مقامات میں مزدوروں کو علاوہ اُجرت کے منافع کا کچھ حصّہ بطورِ انعام کے دیا جاتا ہے امریکہ کے بعض کارخانوں میں اِس.کی، بجائے مالک خود اپنے مزدوروں کو اپنے کاروبار میں مستقل نفع رساں حصہ دیتے ہیں - اس طرح مزدور مالکوں کے ساتھ حصہ دار بن جاتے ہیں اور جلسوں میں کاروباری معاملات میں اپنی رائے دیتے اور اپنا اثر ڈالتے ہیں + ایک اور نہایت حیرت انگیز اور قابلِ ستائش طریقہ بعض اصل داروں نے اختیار کیا ہے - وہ یہ کہ وہ خود ایک حد سے زیادہ روپیہ جمع نہیں کرتے - وہ دولت سے سیر ہو جاتے ہیں - وہ دیکھتے ہیں کہ روپیہ صرف کرنے کی بھی ایک حد ہے - اچھے کپڑے اچھی خوراک اچھی رہائش ان سب کی ایک حد ہے - وہ اپنے لئے ایک خاصی رقم علیحدہ کر کے اپنا سارا کاروبار اور سارا جمع شدہ اصل مزدوروں کے ہاتھ میں دے دیتے ہیں کہ وہ خود ہی ہشیار منتظمین کے زیرِ اہتمام کاروبار چلائیں +

یہ ہیں وہ حیرت انگیز عملی باتیں جن سے افلاس گویا ممالکِ متحدہ میں بالکل منسوخ ہی ہو گیا ہے + ہاں چند اَور اہم عناصر بھی ہیں - ان میں پہلا عمدہ تعلیم ہے اور دوسرا یہ کہ وہاں جماعت جماعت کے درمیان کوئی جماعتی احساس نہیں جس کے ہوتے ہوئے ایک پیشے میں کام کرنے والا حلقۂ معاشرت میں ایک خاص درجہ رکھتا ہے + یہ احساس امریکہ میں ناپید ہو گیا ہے وہاں خودداری اور دوسروں کی وقعت کا یہ حال ہے کہ ایک معمولی مزدور اپنے تئیں ایک آزاد ملک کا آزاد شہری سمجھتا ہے - وہ اس بات کے اظہار پر مُصر نہیں نہ اُسے اِس کا احساس ہے کہ اِس کے سوا کوئی اَور حالت ممکن بھی ہے - وہ تمہارے ساتھ برابر کا ہو کر بات کرتا ہے جیسا کہ دوسرے ملکوں میں ایک ہی جماعت یا طبقے کے لوگ ایک دوسرے سے بے تکلف ہم کلام ہوتے ہیں +

امریکہ میں بعض بڑی بڑی کمپنیاں ہیں جو اپنے بڑے ہونے کے باعث بعض چیزوں کی اجارہ دار بن گئی ہیں - وہ ان چیزوں کو نہایت ارزاں فروخت کر سکتی ہیں - اس کی وجہ بڑے پیمانے کی معاشی پیدائش ہے - امریکہ میں دولت کی پیدائش کے چار عناصر سمجھے جاتے ہیں نہ صرف خام پیداوار محنت اور اصل بلکہ "انتظام" بھی - امریکہ نے صنعتی کاروبار کے بعض نہایت ہوشیار اور ذکی منتظمین پیدا کئے ہیں + بعض دفعہ ایک بڑی شراکت کی بجائے کاروبار کا مالک ایک ہی مجبز شخص ہوتا ہے جیسا کہ مسٹر ہنری فورڈ - فورڈ ایک نہایت اعلیٰ کاروباری دماغ کے ساتھ ایک نہایت ہمدرد دل بھی رکھتا ہے - یہ دلی دماغی اجتماع نہایت شاذ ہوتا ہے + فورڈ نے اپنے کارخانوں میں مزدوروں کے لئے ہفتہ بجائے سات دن کے پانچ دن کا کر دیا ہے یعنی وہ کام پانچ دن کرتے ہیں لیکن اُن کو اُجرت سات دن کی ملتی ہے - فراغت کے دو دنوں میں وہ نہ صرف آرام کر سکتے ہیں بلکہ وہ اپنا وقت تعلیم اور عام

شائستگی کے حصول میں صرف کر سکتے ہیں جس کے بغیر کوئی انسان انسان کہلانے کا مستحق نہیں + یہ نیک سرشت بلند فہم شخص نہ صرف پُرصحت آدمیوں سے اعلیٰ درجہ کا کام چاہتا ہے بلکہ اُس نے اپاہجوں اور لنگڑوں اور اندھوں کے لئے اپنے کارخانوں میں اُن کے حسب حال کام وضع کئے ہیں جن سے بغیر اپنی خودداری کھوئے کے وہ آپ اپنی روزی کما لیتے ہیں + ان کارخانوں کے باہر سہ پہر کے چار بجے نظارہ دیکھنے کے قابل ہوتا ہے جب وہاں کے مزدور کام ختم کر کے باہر نکلتے ہیں اور اپنی اپنی موٹر کاروں میں بیٹھ کر گھر کو سدھارتے ہیں + جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے امریکہ کے بہت سے خوبصورت شہروں کی سڑکوں کے گرد بنگلے ہیں جن کے سبزہ زار اور گلزار پیدل راہوں تک پھیلتے چلے گئے ہیں - اگر تم پوچھو کہ یہاں کس قسم کے لوگ رہتے ہیں تو یہی جواب ملے گا کہ "معمولی مزدور" - یہ ہیں امریکہ کے معمولی مزدوروں کے گھر جہاں وہ اپنی فراغت کے اوقات تمدنی و دماغی ترقی کے حصول میں صرف کرتے ہیں +

یہ حالت دنیا کے دوسرے ملکوں کی بھی ہو سکتی ہے لیکن کس طرح ؟ بہتر درجے کی تعلیم سے، بہتر درجے کی معاشیات سے، نوعِ انسان کو مساوی حقوق دینے سے اور اگر یہ حقوق نہ ملیں تو کسی نہ کسی طرح نرمی سے ترغیب سے یا یوں بس نہ چلے تو زور و قوت سے ان فطری حقوق کے حاصل کرنے سے ، دوسرے لفظوں میں صحیح قسم کی اشتراکیت سے + مسز اینی بسنت کہتی ہیں کہ امریکہ میں علاقہ کیلیفورنیا کی اُس تھیاسفی نوآبادی میں جسے انہوں نے "مسوروادی" کا نام دیا ہے وہ نئے تمدن کو ایک چھوٹے پیمانے پر قائم کر رہی ہیں - وہاں معاشی اشتراکیت ہوگی اور عملی اخوت اور ایک ایسی حکومت جس کی باگ ڈور دانشمندوں کے ہاتھ میں ہوگی !

جسے دنیا آج جمہوریت کہہ رہی ہے وہ اگر سچی جمہوریت ہے تو وہ اپنے بہترین نمایندوں کی تلاش میں سرگرداں ہے، وہ ڈھونڈ رہی ہے اپنے دانشمند اپنے راست باز اپنے بہترین انسان دیہات میں شہروں میں سارے ملک میں قوموں کی عظیم الشان برادری میں - یقین کرو کہ سچی حکومت وہی ہے جس میں حکومت کرنے والوں کے دماغ میں دانشمندی ہو لیکن اس دانشمندی کے ساتھ دل کی ہمدردی بھی ہو + دانشمندی کیا ہے ؟ کسی نے خوب کہا ہے دانشمندی علم ہے محبت کے ساتھ وابستہ کیونکہ علم ایسا بھی ہو سکتا ہے اور اکثر ہوتا ہے جو خودغرضی اور دوسروں کی تباہی کے لئے استعمال کیا جائے لیکن اگر علم کے ساتھ تم محبت کو ایزاد کر دو تو اس اتحاد سے دانشمندی پیدا ہوتی ہے جو حقیقی اختیار ہے - ایسا علم جو سمجھے اور ایسی محبت جو اس سمجھ کو سب کے لئے برابری کے ساتھ استعمال کرے + ایسے لوگ اگر وہ ہمیں ڈھونڈے سے مل جائیں حکومت کے اہل ہیں اور مستحق ہیں اپنے ہم جنسوں کی اطاعت کے + تم اکثر دیکھو گے

لہ عوام الناس کے مجمع میں عموماً بجائے خود غرضی کے بے غرضانہ دلیری ہوتی ہے۔ اپنی جان پر کھیل جانے والا
آدمی ہمیشہ عوام کی نظروں میں مقبول ہوتا ہے۔ تباہ شدہ کان میں اُترنے والا کان کن، آتش زدہ مکان پر چڑھ کر
آگ فرو کرنے والا یہ ہیں وہ لوگ جن کے کارناموں پر خلقِ خدا مرحبا کہتی ہے کیونکہ انسان کا دل نیک روش ہے
ور وہ دلیرانہ نیکی کو جہاں کہیں پاتا ہے اُس کی قدر کرتا اور اُس سے محبت کرنے لگتا ہے۔ دانشمندی اور دلیری
کھنے والے انسان آزاد لوگوں کے فطری رہنما ہوتے ہیں ہر فہیم جمہوریت ایسے ہی اشخاص کی تلاش میں رہتی ہے
رچہ وہ عموماً اس تلاش میں بھٹک بھی جاتی ہے۔ تاہم اِن کا پالینا اُس کے لئے لازم ہے ورنہ اُس کا قیام ناممکن ہے

اس ضمن میں سب سے ضروری بات افلاس کے اسباب جانچنا اور پھر اُنہیں دور کرنا ہے یقینی
طور پر اس کا بہترین طریقہ منتظم تعاون ہے جس کا لازمی اور فطری نتیجہ اشتراکیت ہے! اشتراکیت
ومی تعاون ہے لیکن کون سی اشتراکیت؟ وہ اشتراکیت جو ہمدردی اور محبت پر مبنی ہو۔ بلدیات کو
پاہئے کہ وہ زندگی کی ضروریات اور آسائشیں بہم پہنچائیں اور اِن منافع کے ذریعے سے جو اس بہم رسانی سے
اصل ہوں محصولات میں کمی کرتے چلے جائیں۔ صنعت و حرفت کی تنظیم اُن کے ہاتھوں میں ہو جو قوم کے منتخب
ایندے ہوں اور جن کی کاروباری قابلیت مسلّمہ ہو۔ کیلیفورنیا میں "سرور وادی" میں تھیاسفیوں نے ہر کام تعاون
ے اصول پر شروع کیا ہے ضروریات بہم پہنچانے والے کارخانے سب اسی اصول پر قائم ہیں۔ مل جل کر کام کرنے
، عادت، اکٹھا کام کرنے، معمولی جگہ لینے، سب کی بہتری مدِ نظر رکھنے کے خیال یہ ہیں وہ باتیں جو یہاں کے لوگوں
مطمعِ نظر ہیں۔ دنیا کے تمام متمدن ملکوں میں اس امر کی سخت ضرورت ہے کہ بتدریج لوگ قوم کے سارے کام تعاون
ے ذریعے سے خود سنبھال لیں تاکہ قوم کی جتنی کمائی ہو وہ قوم ہی کے کام آئے اور صرف چند ہی افراد اس سے مستفید
ہوتے رہیں۔ وقت ہے کہ اب اور پرائیویٹ کمپنیاں نہ بننے پائیں۔ ایک شہر کی آب رسانی اور آمد و رفت کے
رائع اور اس قسم کی بیسیوں اور چیزیں سب قومی ہاتھوں میں ہونی چاہئیں نہ کہ خاص کمپنیوں کے قبضے میں۔

اگر قومی تعاون کا یہ اصول ایک بڑے پیمانے پر قائم کیا جائے اور یوں افراد بہت متمول ہو کر یورپ کے تاجر
راکی طرح جنگ و صلح کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں نہ لے سکیں تو بین قومی لڑائیاں ناممکن ہو جائیں اور مختلف ملک
ب دوسرے کے ساتھ ہمیشہ صلح رکھنے پر خود بخود آمادہ نظر آئیں۔

دولِ متحدہ (امریکہ) میں جہاں یورپ کی مختلف آپس میں لڑنے والی قومیں ایک دوسرے سے مل جل کر رہنا
یکھتی ہیں ایک ایسی بین قومی فضا پیدا ہو گئی ہے جو دوسرے ملکوں کا منتہائے نظر ہونا چاہئے۔ جہالت سے

نسلی منافرت اور صحیح علم سے نسلی موافقت پیدا ہوتی ہے ۔ یہ علم ایک دوسرے کو دیکھ بھال کر سمجھ بوجھ کر پیدا ہوتا ہے
وہ وقت کیوں دُور ہو جب دنیا کی مختلف قومیں مصالحت اور موافقت میں اپنا انفرادی نفع بھی دیکھ لیں اور قوم
قوم اور ملک ملک کے درمیان تمام مصنوعی حدود کو یک قلم موقوف کر دیں ۔ دولِ متحدہ اور کینیڈا کی درمیانی سرحد
تین ہزار میل تک پھیلتی چلی گئی ہے لیکن وہاں ایک ملک نے دوسرے کے خلاف ایک توپ بھی نصب نہیں کی
اگر یہ بات وہاں ممکن ہے تو پھر اَور ہر جگہ کیوں ناممکن سمجھی جاتے ؟

اخیر میں ہمیں ایک نہایت اہم اور خطرناک امر کی طرف توجہ کرنی ہے ۔ وہ ہے دنیا کی سیاہ فام قوموں کا آ
والا دباؤ سفید رنگ قوموں کے خلاف ! سفید لوگوں نے کچھ مدت سے بعض سیاہ فام قوموں کے ملکوں پر قبضہ کر لیا
ہے اور بعض کو معاشی استحصال سے اپنے زیرِ نگیں کر رکھا ہے ۔ یہ غیر سفید قومیں اب اپنے گھروں میں جاگ رہی ہیں ا
رہی ہیں اُٹھ رہی ہیں اور ترقی کے میدان میں چلنا چاہتی ہیں دوڑنا چاہتی ہیں + چین میں ایک انقلاب برپا ہے چین
اجنبیوں سے نفرت کرتے ہیں کیوں ؟ محض اس لئے کہ اجنبیوں نے بزور چین میں تجارت کا دروازہ کھلانے
پر اصرار کیا حالانکہ اُدھر چینیوں کو اپنے ملکوں میں آنے سے روک دیا ۔ اس لئے کہ چینیوں کے چالیس کروڑ متنفس
کینیڈا کے لمبے چوڑے کم آباد ملک کی طرف دیکھتے ہیں جہاں انہیں آزادی سے بسنے کی اجازت نہیں آسٹر
میں ساٹھ لاکھ سفید لوگ آباد ہیں لیکن پاس ہی جاپان میں جو رقبہ میں آسٹریلیا سے بیسواں حصہ ہے آسٹریلیا
دس گنا زیادہ آبادی ہے + یہ ہے دنیا بھر کی معاشیات ، معاشیات جن کا دنیا بھر کی سیاسیات پر اثر پڑ رہا ہے ا
روز افزوں زیادہ بڑھنے والا ہے + یہ ہے رنگ کا وہ ہیبت ناک مسئلہ جس کا حل لازم ہے !

اس کا علاج کیا ہے ؟ اس کا علاج قوموں کے نوجوان افراد کے ہاتھ میں ہے جن کے دل زیادہ رواد
اور جن کی طبیعت زیادہ فراخ ہے ۔ اس کا علاج دنیا بھر کے رہنے والوں کی برادری ہے + آج دنیا میں جہاں
قوموں کے طالب علم قوموں کی یہ نئی پود اپنے سینوں میں وسیع خیالات لئے ہوئے ہے ۔ ان میں وہ قومی مناف
وہ قومی شکوک وہ قومی جنگ کے خیالات موجود نہیں ہیں جو قوموں کے سیاسی رہنماؤں کے دل و دماغ میں مت
رہتے ہیں ۔ جرمنی میں بھی جو ابھی ابھی اپنا بہت کچھ کھو چکا ہے نوجوانوں کے دل میں انتقام کے جذبات نہیں
بلکہ وہ یہی چاہتے ہیں کہ اُن کا ملک اپنے فنون اپنی موسیقی اپنے فلسفے اور اپنی طبیعیات سے بامِ ترقی پر چڑھے
توپ اور بندوق سے دنیا کو ڈرائے دھمکائے +

یہی حال دوسرے ملکوں کا ہے چینی تحریک میں چینی طلبا پیش پیش ہیں ۔ اسی طرح سب دوسرے

ملکوں کا حال ہے۔ ہر جگہ ترقی کی تحریکیں نوجوانوں کے ہاتھ میں ہیں۔ چند سال ہوئے (سنہ ۱۹۲۲ء میں) ویلز کے بچّوں نے دنیا کے مختلف ملکوں کے سکول جانے والے بچّوں کو نیک دلی کا ایک پیغام بھیجا۔ امریکہ نے اس کا جواب یوں دیا کہ ایک نیک دلی کا دن قائم کیا۔ آسٹریلیا نے بھی اسے پسندیدہ سمجھا۔

اِن نوجوانوں سے جو مختلف ملکوں میں مختلف قوموں میں اپنی نئی نئی امنگوں اپنی رواداری اپنی یگانگت اپنی فراخ دلی کے ساتھ جوان ہو رہے ہیں مدارس کے بچّے، دارالعلوموں کے نوجوان، اِن سے دنیا کے مستقبل کی امیدیں وابستہ ہیں کیونکہ یہی ہیں جو خیالات کو زیادہ بلند اور حالات کو زیادہ پسندیدہ بنائیں گے۔ یہی ہیں جو دنیا کی نئی برادری قائم کریں گے وہ برادری جس کے ہاتھ میں دنیا کی بہتری ہے۔ یہی ہیں جو نئے تمدّن کی چمن بندی کریں گے ہمارے ننھے نیک دل باغبان!

آنے والی نسلوں میں مستقبل کی امید ہے۔ آؤ ہم اِن نوجوانوں کی ہمت بڑھائیں آؤ ہم اِن کے آگے وہ بلند مطمحِ نظر رکھ دیں جو ہم بزرگ پورا نہ کر سکے اب یہی لوگ ہیں جو نئے تمدن کو عملی اخوت اور قوموں کے درمیان باہمی محبت و موافقت کا شاندار ذریعہ بنائیں گے۔ اب دنیا کی قسمت انہیں نوجوانوں میں سے ہر ایک کے آگے کھڑی زبانِ حال سے پکار رہی ہے ؎

ہوس نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے نوعِ انساں کو
اخوّت کی زباں ہو جا محبّت کا بیاں ہو جا

بشیر احمد

تم نے کچھ نام سُنے اُن قوتوں کے جو فطرت نے پیدا کیں لیکن جن کا نام دنیا نے رکھا؟ یہ نام ـــــــ

محمود قوت کا نام جرمنی،

مسنون قوت کا نام انگلستان،

جسمانی قوت کا نام سینڈو،

روحانی قوت کا نام گاندھی،

اسبر قوت کا نام انسان اور عالمگیر قوت کا نام خدا! ـــــ اور اور ہزاروں لاکھوں کروڑوں یوں کہ جہاں دیکھو قوتیں ہی قوتیں ہیں اور جہاں سنو وہاں یہ نام ہی نام!

ب

جزائے ہمّت

کسی جوانمرد کا مقدّر بُری طرح اُس سے پیش آیا
وہ شر اُٹھایا کہ اُسکو بالکل تباہ و برباد کر کے چھوڑا
اگرچہ قسمت نے دشمنی کی مگر وہ خاطر میں بھی نہ لایا
اگرچہ بے حال ہو چکا تھا مگر وہ شاکی ہوا نہ بے دل
ہزار صدمے اٹھائے لیکن ذرا جبیں پر شکن نہ آئی

بُری طرح اور حد سے بڑھ کر بُری طرح اُس سے پیش آیا
وہ قہر ڈھایا کہ اُس کو بالکل تباہ و برباد کر کے چھوڑا
اگرچہ طالع نے زک پہ زک دی مگر وہ خاطر میں بھی نہ لایا
اگرچہ پامال ہو چکا تھا مگر وہ شاکی ہوا نہ بے دل
ہزار آزار پائے لیکن ذرا جبیں پر شکن نہ آئی

مگر جب اس پر بھی حسب سابق نصیب کو گرمِ جور دیکھا
تو وہ جوانمرد سر اٹھا کر یہ چند الفاظ لب پہ لایا
بلا سبب شر اٹھانے والے اِستا لے اچھی طرح ستا لے
مگر تجھے او کمینہ پرور! خبر بھی ہے کس سے چھیڑ کی ہے
زمانہ بھر اس کو جانتا ہے کہ میں اپاہج نہ پست ہمّت
سما کی رفعت سے تا سمک میں کسی سے دب کر نہیں رہا ہوں
ہراس بالکل فضول جب تک دفاعِ بے داد کی سکت ہے
خدا نے چاہا تو وہ عوض لوں کہ خود ترا دل اُسے سراہے
جو ٹھان لوں آسمان سے بھی ستم کا پیشہ چھڑا کے دم لوں
یہ کہہ کے مردانہ وار فوراً وغا کے میدان میں در آیا
وغا کے میدان میں در آ کر عمل کی تیغِ دو دم سنبھالی

اُسی طرح اپنے ناموافق نصیب کو گرمِ جور دیکھ
نڈر نظر سے نظر ملا کر یہ چند الفاظ لب پہ لایا
بلا سبب قہر ڈھانے والے اِستا لے اچھی طرح ستا لے
جفا کے عادی ستم کے خوگر! خبر بھی ہے کس سے چھیڑ کی ہے
یقین ہے تو بھی مانتا ہے کہ میں اپاہج نہ پست ہمّت
تمام عالم میں آج تک میں کسی سے دب کر نہیں رہا ہوں
مجھے خبر ہے کہ مجھ میں اب تک طویل تابِ مقاومت ہے
خدا نے چاہا تو وہ زکیں دوں کہ عاجز آ کے صلح چاہے
تری حقیقت ہی کیا، اُسے بھی غلامِ خدمت بنا کے دم لوں
بگڑ کے دیوانہ وار فوراً وغا کے میدان میں در آیا
وغا کی خاطر قدم جما کر عمل کی تیغِ دو دم سنبھالی

عمل میں رنجِ شکست سہہ کر عمل کی رفتار تیز کر دی

عمل میں ناکامیاب رہ کر عمل کی رفتار تیز کر دی

یہ رنگ دیکھا تو خود مقدّر گزارشِ عفو لے کے لپکا
اِدھر سے دنیائے کامرانی نثار ہونے کی خاطر آئی
اِدھر سے سچی مسرّت آئی سکونِ جاوید ساتھ لے کر
اِدھر سے اقبال کی نہایت ہدیۂ داد لے کے پہنچی
یہ طاقتیں مل ملا کے اُسکو مدد کا مژدہ سنانے دوڑیں
تمام غیبی اعانتوں کے ہجوم نے اُس کو آن گھیرا

اور اُس کے ہمراہ لطف لے اور سفارشِ عفو لے کے لپکا
اُدھر سے توفیقِ آسمانی نثار ہونے کی خاطر آئی
اُدھر سے غیبی حمایت آئی خدا کی تائید ساتھ لے کر
اُدھر سے اللہ کی عنایت پیامِ امداد لے کے پہنچی
مدد کا حق دار پا کے اُس کو مدد کا مژدہ سنانے دوڑیں
تمام عالم کی طاقتوں کے ہجوم نے اُس کو آن گھیرا

یہ بھیڑ دیکھی تو اُس نے ٹوکا فضول یہ اجتماع کیوں ہے
احاطۂ کار میں دَر آنا صریح بے جا مداخلت ہے
کسی کا یوں ہرجِ کار کرنا کہاں روا ہے کہیں نہیں ہے
ہجوم بے جا سے فائدہ کیا۔ اُدھر ہٹو۔ اپنی راہ پکڑو

فضول حرکت سے کیا نتیجہ فضول یہ اجتماع کیوں ہے
خیالِ اہلِ عمل بٹانا صریح بے جا مداخلت ہے
یہ کارِ جبر اختیار کرنا کہاں روا ہے۔ کہیں نہیں ہے
یہاں نہ میلا نہ کچھ تماشا۔ بڑھو بڑھو اپنی راہ پکڑو

یہ سن کے وہ سب ادب سے بولیں، معاف کرنا، معاف کرنا
تکدّرِ طبع تو بجا ہے، مگر ہمارا تو عذر سنئے
زمانے کے اتنے ظلم سہنا، یہ کام انسان کا نہیں ہے
یقیں ہے ایسی کڑی مصیبت پہاڑ کو پاش پاش کر دے

بصد لجاجت زبانیں کھولیں، معاف کرنا معاف کرنا
ملال بھی غصہ بھی روا ہے مگر ہمارا تو عذر سنئے
اور اُس پر اس طرح زندہ رہنا، یہ کام انسان کا نہیں ہے
ضعیف انساں کی کیا حقیقت پہاڑ کو پاش پاش کر دے

ہمیں فقط اِس قدر بتا دو کہ "تم میں یہ بل کہاں سے آیا"
یہ غیر مفتوح جوشِ ہمّت یہ عزم فاتح کہاں سے پایا"

حکیم آزاد انصاری

میاں عبدالعزیز

CALCUTTA ART PRINTING WORKS, LAHORE.

اللہ میاںؐ

اللہ میاں میں حاضر ہوں۔

کیا کہا کہ اب تک کہاں تھا؟ اللہ میاں یہ نہ پوچھئے۔ کیا ارشاد ہوا کہ ضرور کہوں؟ اللہ میاں کیوں مجھ سے کہلواتے ہو؟ کوئی مولوی غصے میں آگیا تو مصیبت پڑ جائے گی۔ ہیں ہیں یہ کیا ہوا؟ اللہ میاں تم تو خفا ہو گئے، میری تو بسم اللہ ہی غلط ہو گئی۔ کیا کہا کہ مولوی کا لفظ سننا ناگوار ہے؟ مولویوں سے تنگ آگئے ہو؟ مگر اللہ میاں انصاف کی بات تو یہ ہے کہ اب تمہاری خاطر یہ لوگ چھوڑے تو نہیں جا سکتے! کیا کہا کہ کیوں؟ اللہ میاں تمہاری جانے بلا۔ نہ تمہارے کسی سے تعلقات، نہ باپ دادا کے وقت سے مراعات، تم اپنی بے نیازی میں مخمور ہماری کٹھن زندگی کو کیا سمجھو؟ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ بدتر سے بدتر مسلمان بھی ایسا نااہل ہو جائے کہ لحاظ، وضع بالائے طاق اور قوم سے غداری؟ کیا کہا کہ اس میں کیا مشکل ہے؟ اللہ میاں بڑی بھاری مشکل ہے۔ اللہ میاں تم اپنی تنہائی میں یکتا کنبہ برادری، میل جول، شادی بیاہ، جلسوں اور جنازوں کا کیا اندازہ کر سکتے ہو؟ اللہ میاں سچ تو یہ ہے کہ خدا ہونا آسان ہے انسان بننا مشکل ہے۔ بازو جب ٹوٹے تو گلے سے بندھتا ہے۔ اب تو مارو یا چھوڑو ان مولویوں سے ہمیں محبت نباہنی ہی پڑے گی۔ کیا کہا کہ کوئی اور بات کروں؟ اچھا اللہ میاں تھینک یُو کہ تم نے اصرار نہیں کیا کہ بتاؤں کہ اب تک کہاں تھا اور ہاں اللہ میاں عقل کی باتیں، نیکی کی باتیں تو جو لوگ تم سے روزانہ سنتے ہیں وہ ضرور سناتے ہی ہونگے مجھ سے باتیں سننی ہیں تو میری لغویات سنو! کیا کہا کہ ہاں ضرور سنوگے؟ اچھا اللہ میاں! میں بھی کوئی بات چھپائے نہ رکھوں گا۔ اللہ میاں مسکراتے کیوں ہو؟ کیا یہ مطلب ہے کہ میں جھوٹ بولوں گا؟ کیا کہا کہ وقت ضائع نہ کروں اپنی داستان شروع کروں؟ اچھا اللہ میاں سنئے! مجھ پر تو یہ تمہارا احسان کیا کم ہے کہ تم نے محض میری خوشی کے لئے کتنے لاکھوں جھوٹ بولنے والے انسان بنائے اور پھر انہیں کیا کیا رتبہ دیا؟ نہیں اللہ میاں ناول نویس نہیں! وہ بچارے تو پھر کچھ سچ بولتے ہیں میرا اشارہ شاعری کے اُن شاہنشاہوں کی طرف ہے جنہوں نے کہیں نروان کا قلعہ آراستہ کیا، کہیں تناسخ کی ندی جاری کی، کہیں یزدان اور اہرمن کو ایک دوسرے سے کھڑوا دیا اور اللہ میاں یہ جھوٹ ہیں کس قدر پیارے؟ اور اللہ میاں وہ بھی تم نے بنائے جو تمہارے نام پر ہر وقت سائنس اور مذہب کا عقد کر دینے کو تیار ہیں۔ محض میری تفریح کے لئے؟ اللہ میاں کس قدر تم نے سوچا ہوگا؟ پہلے مجھے پڑھایا لکھایا ساتھ ہی مطالعہ کا

شوق دیا اور سوچنے کے قابل بنایا۔ اور پھر یہ سمجھ کے کہ میرا مطالعہ بے لطف رہے گا تم نے مجھ سے ہزاروں سال پہلے ہی وہ لوگ بھی بنا دیئے جن کی باتوں پر ہنستے ہنستے انسان لوٹ جائے۔ اللہ میاں کیا کہا کہ غنیمت ہے کہ کسی بات سے توکوئی انسان تم سے خوش ہے؟ اللہ میاں۔ میں تو ضرور خوش ہوں! کیا کہا کہ اور زیادہ خوش رہوں؟ اچھا اللہ میاں یہ بھی کوشش کروں گا مگر سچ تو یہ ہے کہ اور لوگوں کی طرح مجھے خوشی کی طمع نہیں۔ اللہ میاں بات یہ ہے کہ خالی خوشی سے تو وقت نہیں کٹتا اور انسان خوشی کو ہضم کس چیز سے کرے؟ اچھے اللہ میاں یہ بات تو بتا دو! اللہ میاں بس یہ بات کچھ نہیں کہ مطلب جب آتا ہے تو تم خاموش ہو جاتے ہو۔ کچھ تو ہوں ہاں کرو۔ اچھا اللہ میاں! خوشی کو ہضم کرنے کی معجون نہیں بتاتے تو ایک بات اور بتا دو یعنی یہ کہ کونسا پوڈر ملوں کہ تم مجھے خوبصورت سمجھو! سجدے والا اٹھنا تو بہت پرانا ہوگیا۔ اللہ میاں! شرارت سے بھی تو چہرہ چمک اٹھتا ہے شرارت کا غازہ مل لوں؟ اللہ میاں! تم تو پھر چپ ہو گئے! کیا کہا کہ کوئی اور بات کروں؟ اچھا اللہ میاں کوئی اور بات کروں گا۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ یہ تمہاری کانفیڈنشل (Confidential) باتیں ہیں کہ انسان خوبصورت کیسے ہو اور خوشی کی غذا کو کس چورن سے ہضم کرے؟ ہاں اللہ میاں خوب یاد آیا۔ ایک دن میں خواہ مخواہ اپنے آپ کو برا بھلا کہہ رہا تھا کہ مجھے خیال ہوا کہ تم نے روک دیا کہ فضول وقت مت ضائع کرو یہ کھیل بڑے آدمیوں کا ہے۔ یاد ہے اللہ میاں، اُس دن بہت کوشش کی کہ اپنی روح کو بھی بدل ڈالوں، تم سے نئی اُجلی سی روح مانگ لوں مگر یہ بات حاصل نہ ہوئی۔ اللہ میاں یہ کیا بات ہے کہ گمراہوں کے لئے تم نے نبی بھیجے۔ لاکھوں اوروں کی اصلاح ہوگئی میری نہ ہوئی؟ کچھ نہیں بتاتے؟ کیا کہا کہ یہ باتیں چھوڑوں اپنی کج بحثی کے قصے سناؤں؟ اچھا اللہ میاں میری کج بحثی کے قصے سُن لو۔ ایک دفعہ میں دو معمولی سی باتیں سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک یہ کہ زیادہ نیک ہونا بڑا بھاری گناہ ہے۔ ٹھیک ہے نا اللہ میاں؟ یہ کیا بات ہے اللہ میاں کہ تم مشورہ نہیں دیتے؟ ہاں میں یہ کہہ رہا تھا کہ زیادہ نیک ہونا گناہِ کبیرہ ہے اور مثال یہ دے رہا تھا کہ ایک نوجوان لڑکے کی دو بہنیں ہیں جو باوجود حسین اور فہیم ہونے کے نیکی کی معصیت میں گرفتار ہیں اور نتیجہ یہ ہے کہ اس لڑکے کی آنکھوں میں ان دو کا نمونہ کچھ ایسا سما گیا ہے کہ شاید اب تمام عمر وہ مختلف لڑکیوں کو ردی کی ٹوکری میں پھینکتا رہے۔ یہ ہے ان دو لڑکیوں کی نیکی کی برائی اور میں اپنے سامعین پر یہ واضح کر رہا تھا کہ کسی شخص کا حق نہیں کہ وہ غیر معمولی طور پر نیک ہو کیونکہ غیر معمولی نیکی دنیا کے محدود راس المال پر ایک مذموم قسم کا غصب ہے۔ مگر میرے سامعین کے دل ختم اللہ علیٰ قلوبہم والے دل تھے! ایک نے میری بات نہ مانی۔ اللہ میاں کیا کہا کہ تم نے کسی کے دل پر مہر نہیں لگائی؟ اچھا اللہ میاں! یوں ہی ہوگا! اُنھوں نے خود لگا لی ہوگی! ہاں اللہ میاں دوسری سیدھی سی بات جو لوگوں کو میں سمجھانا چاہتا تھا

وہ یہ تھی کہ نیکی کو بدی میں بدلتے رہنا حقیقی مذہب ہے ۔ اللہ میاں کیا کہا کہ میں مضمون چور ہوں اور یہ خیال کسی اَور کا ہے ؟ اللہ میاں خفیف سا حصہ اس میں ایک اور شخص کا ہے ورنہ آج تک زبان سے وہ بات نہیں نکلی جو خود اپنی نہ ہو ۔ ہاں اللہ میاں اس شخص نے کہا تھا کہ ترقی یہ ہے کہ نیکی کو بدی بناتے رہو ۔ میرا خیال ترقی کا نہیں ! سوسائٹی چاہے ترقی نہ بھی کرے مذہب کی محتاج ہے ۔ میں ایک اٹل قانونِ فطرت بیان کرتا ہوں وہ شخص ایک عارضی کیفیتِ ارتقا کا نقاش تھا ۔ اللہ میاں جب چیچک کا ٹیکا نہ تھا اور نالیاں صاف رکھنے کی تجاویز نے علمی جامہ نہ پہنا تھا تو یہ نیکی تھی کہ ہر قسم کی وبا کو تیرا قہر اور اپنے گناہوں کی سزا سمجھ کر تسلیم و حمد سے قبول کیا جائے ۔ اب وقت آ گیا ہے کہ اس نیکی کو بدی میں بدل دیا جائے یعنی جو شخص وبا کے معاملہ میں کہے " اللہ کی مرضی " اُسے کافر قرار دیا جائے اور جو شخص ٹیکے اور صفائی میں مدد نہ دے اُسے بدترین گنہگار قرار دیا جائے یعنی اللہ میاں پیشِ نظر ترقی نہ ہو بلکہ تمہاری خوشی یعنی یہ کہا جائے کہ اب تمہارا حکم ہے کہ وبا کو گناہ سے یا قہر سے کوئی واسطہ نہیں ۔ یعنی تمہارے نام سے یہ کہا جائے کہ جو صاف نہ رہیں گے ، صاف ہمسایوں میں نہ رہیں گے ، صاف شہر اور صفا ملکوں میں نہ رہیں گے وہ مریں گے بھی بُری طرح اور مر کر اٹھیں گے بھی بُری طرح ۔ یہی اللہ میاں تمہارا حکم ہے نا ؟ ہاں تو اللہ میاں لوگوں کو میں یہ سمجھا رہا تھا کہ اپنی پرانی غلیظ نیکیوں کا منہ دھوڈالو اور انہیں سوٹ بوٹ پہنا کر ایسی طرح بدل دو کہ وہ گناہ کی طرح دلفریب اور دلکش ہوں ۔ یہ ہے میرا خیال اللہ میاں ! نہ اُس خشک مغز کا خیال کہ ترقی یہ ہے کہ نیکی کو گناہ بناتے رہو ! میں تو چاہتا ہوں کہ پرانے گناہوں کی کشش کے عطر سے دنیا کو معطر کروں ورنہ اگلے زمانے کی نیکیاں اگلے زمانے کے گناہ میرے کس کام ؟ جب کوئی بھوکا ننگا ہی نہ ہوگا تو خیرات خود بخود ایک فضول حرکت بن جائے گی ۔ جب ہر بچہ سنِ بلوغ سے پہلے ہی دس بیس دفعہ دنیا کے گرد چکر لگائے گا تو حج کے سفر میں کیا صعوبت باقی رہ جائے گی اور بدو بچارے کہاں حاجیوں کو پتھر مار رہیں گے ؟ میرا نقطۂ خیال اللہ میاں بہت بلند ہے اور وہ یہ ہے کہ حقیقی نیکی صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ تجھے حاصل کر کے بھی محض ازراہِ محبت **اپنے آپ کو تیرا بندہ سمجھنا** یعنی جب تک تُو حاصل نہ ہو نیکی کا نام لینا بھی فضول ہے ۔ وہ ذرائع جن سے تُو حاصل ہوتا ہے اور جنہیں غلط العام میں نیکی بیان کیا جاتا ہے بدلتے ہیں اور بدلتے رہنے چاہئیں ۔ جو آج ٹھیک ہے وہ اسی صورت میں ٹھیک ہے کہ کل وہ غلط ثابت ہو اور انسان کی قسمت ہے کہ وہ جھوٹ پر پلے ۔ خیر یہ بات میں لوگوں کو سمجھا رہا تھا ۔ کسی نے کہا دہریہ ہے ! کسی نے کہا باولا ہے ! اللہ میاں اس لفظ پر تو تم بہت ہنسے ! اچھا اللہ میاں اب میں لوگوں سے کہوں گا کہ مجھے یہی کہیں کیونکہ اس سے تم خوش ہو مگر اللہ میاں اتنا ذمہ تم لے لو کہ یہ بات اُن کی سمجھ میں آ جائے ۔ اسی وقت ایک صوفی صاحب

کہنے لگے کہ "لوگو اس شخص پر کلام پلٹ پڑا ہے اسے کچھ نہ کہو" لوگوں نے اس صوفی کا پیچھا لے ڈالا کہ "بڑا آیا ہے وہاں سے خدا رسیدہ ۔ ایسے کافر کی حمایت کرتا ہے!" اللہ میاں بڑا لطف آیا ۔ اُس دن تیرا ایک نقلی دوست (یعنی وہ صوفی) ایک تیرے اصلی (دشمن کہوں کہ دوست اللہ میاں؟ کیا کہا کہ نادان دوست کہہ دوں؟ اچھا یوں ہی سہی!) نادان دوست کے کام آگیا ۔ اللہ میاں اس غریب صوفی کو معاف کردے اور اسے تصوف کی ذلت سے بچا کر معرفت کی وردی پہنا دے! کیا کہا کہ تمہارے کاموں میں دخل نہ دوں؟ اللہ میاں تو تم دخل دینے دیتے کب ہو؟ برسوں کے بعد تو یہ موقع ملا اور یہ بات بھی یونہی بے ساختہ زبان سے نکل گئی ۔ پرانی کمبخت بھیک مانگنے کی عادت اب تک نہ گئی ۔ کیا کہا کہ معاف کردیا؟ اچھا، تھینک یو ۔ اللہ میاں ۔ معلوم ہوتا ہے کہ بھولے کی لغزش تم کبھی کبھی فوراً معاف کردیتے ہو! کیا کہا کہ اگر معافی مانگتا تو معاف نہ کرتے؟ ہاں ٹھیک تو ہے اللہ میاں! جس کمبخت کو تم پر اتنا بھی اعتبار نہ ہو کہ تم بن معافی مانگے بھی معاف کردیتے ہو تو اسے تم معافی مانگنے پر کیوں معاف کرو؟ یہ تو اللہ میاں انصاف ہے ۔ اس میں تمہیں کوئی برا نہیں کہہ سکتا ۔

اللہ میاں میں سمجھا نہیں کہ کیا تم نے پوچھا؟ وہ بات! اللہ میاں تمہیں خوب وہ بات یاد رہی! اللہ میاں سچ تو یہ ہے کہ تمہارے نام پر کج بحثی میں مجھے بے انتہا لطف آتا ہے ۔ میں دل ہی دل میں تمہیں یاد کرلیتا ہوں لوگ سمجھتے ہیں کہ بڑا دہریہ ہے ۔ انہیں کیا پتہ کہ دیوانہ بکار خویش ہشیار! ۔ ہاں اللہ میاں تو بات یہ تھی کہ میں نے کہیں کہہ دیا کہ بھئی مجھے تو پرانا بوسیدہ صدیوں کی ذمہ داری تلے دبا ہوا خدا درکار نہیں بلکہ میں نے یہاں تک کہہ دیا کہ سیکنڈ ہینڈ (Second-hand) کپڑا پہن لیں مگر سیکنڈ ہینڈ خدا ہرگز نہیں ۔ تم تو بالکل نوجوان ہو نا اللہ میاں؟ کس قدر یہ لوگ باتیں بناتے ہیں کہ تم وہی ہو جو تھے! اتنا نہیں سوچتے کہ جس میں خدا ہو کر بھی شباب نہ ہو اُسے خدائی کا کیا مزہ ۔ اللہ میاں کیا کہا کہ مجھے اس گستاخی کے بدلے پھونک دوگے؟ اللہ میاں ہرگز نہیں تم خوب جانتے ہو کہ دنیا میں گنہ ضرور ہیں مگر گنہگار کوئی نہیں ۔ اللہ میاں کیا کہا کہ اس بات کا چرچا کروں گا تو ضرور سزا پاؤنگا؟ اللہ میاں میں نہیں مانتا ۔ اللہ میاں کیا کہا کہ شاباش؟ ۔ اچھا اللہ میاں تھینک یو مگر تم تو بڑے استاد ہو اور جو میں سچ مچ ڈر جاتا؟ کیا کہا کہ جو میں ڈر جاتا تو مجھے سیدھا جہنم بھیج دیتے؟ اللہ میاں بات تو ٹھیک کہتے ہو! ڈرنے والوں کے لئے جہنم ہی ٹھیک ہے ۔ اللہ میاں میں نے تو شروع سے ہی فیصلہ کرلیا تھا کہ دو مصیبتیں اکٹھی برداشت نہ ہونگی ۔ یعنی ایک یہ کہ تجھ پر ایمان لائیں اور دوسری یہ کہ ڈریں ۔ بندے نے تو پہلی مصیبت انتخاب کرلی ۔ اب جس کا جی چاہے وہ ڈرے ۔ ہم سے تو یہ نہیں ہوتا کہ تُو بھی ہو اور تیرا ڈر بھی ہو ۔ اللہ میاں تُو اکیلا ہی کافی ہے ۔ اللہ میاں

ایک بات پُوچھنی تھی؟ کیا کہا کہ پوچھوں؟ ہاں تو اللہ میاں گناہ تو تم معاف کر دو گے بشرطیکہ معافی مانگی نہ جائے مگر نیکی کی
کون معاف کرے گا؟ کیوں اللہ میاں جواب کیوں نہیں دیتے؟ یا کہیں یہ مطلب تو نہیں کہ نیکی ایسی جو رہی نیکی ہے قطعی
طور پر نا قابلِ تلافی ہے؟ اچھا نہ بتاؤ۔ کبھی نہ کبھی تو یہ عقدہ بھی کھل ہی جائے گا۔ اللہ میاں کیا بات پوچھی؟ بننے والی؟
اللہ میاں وہ بات تو میں بھول ہی گیا تھا۔ کیا کہا کہ اب میرا کیا خیال ہے؟ اللہ میاں بڑی دیر کی بات ہے کہ ایک دن
یونہی میرے منہ سے شکر کا کلمہ نکلا کہ شکر ہے کہ خدا نے ہندوستان میں پیدا کر کے بھی مجھے بنیا نہیں بنایا۔ اس بات
پر اللہ میاں تم بہت بگڑے۔ اِدھر میں بھی جل گیا کہ اللہ میاں کی جو بات ہے نرالی۔ سید کی جائداد بنیا اڑائے اور
اللہ میاں بس دیکھا کرے۔ خیر اِدھر میں پیچ و تاب میں تھا اُدھر اللہ میاں تمہیں یہ ضد تھی کہ بنئے کو کوئی بُرا نہ کہے
کہ مسٹر سمتھ آ گئے۔ مجھے درہم برہم دیکھ کر کہنے لگے کہ کیا بات ہے؟ اس انگریز کو اصل بات تو میں نے نہ بتائی مگر
اس سے پُوچھا کہ تم اس ملک میں اجنبی ہو تمہاری بنیوں کی نسبت کیا رائے ہے؟ سوچ کر کہنے لگا "دل بنیا بہت
اچھا لوگ ہے۔ وہ دولت جمع کر کے کارخانے بناتا ہے۔ ہمارے ملک کی مشین خریدتا ہے۔ انکم ٹیکس دیتا ہے۔
بنک میں روپیہ رکھتا ہے۔ بنیا بہت کام کا آدمی ہے۔" یہ تھی اس کی رائے۔ جواب میں اسے میں نے یہ کہا کہ بنیا غریب
کا خون چوستا ہے۔ اس پر اس انگریز نے کہا کہ غریب آدمی کو خدا اسی لئے بناتا ہے کہ ہشیار آدمی اُس کی محنت سے
فائدہ اٹھائے۔ خیر اللہ میاں اُس سے تو بات ختم ہوئی مگر میں پھر سوچنے لگ گیا کہ اللہ میاں اس قدر غریب آدمی کیوں
بناتا ہے؟ کیا اسے غریب پیارے ہیں؟ بہت دیر تو یہی میرا خیال رہا کہ تمہیں غریبوں سے محبت ہے مگر پھر مجھ پر
واضح ہوا کہ نہیں در اصل تمہیں بنیوں سے محبت ہے اور غریب آدمی تم اپنے لئے نہیں بناتے بلکہ بنیوں کے
لئے۔ خیر تمہارے کام میں مجھے کیا دخل؟ ہاں مگر اللہ میاں اُس دن تمہاری ایک بات پر بہت تعجب ہوا، پوچھا
تھا کہ تم نے مسلمانوں کو کیوں چھوڑ دیا؟ تم نے جواب میں کہا کہ ہرگز نہیں۔ پھر جو میں نے پوچھا کہ اللہ میاں تم
کن مسلمانوں کے ساتھ ہو تو اللہ میاں تم نے کہا جاپان میں۔ پھر جو پوچھا کہ وہاں کون مسلمان ہیں تو اللہ میاں تم
نے کہا کہ مسلمان وہ ہے جو محنت سے کام کرے، تھوڑا کھائے بہت نہائے، ہر وقت مسکرائے اور میرا نام لے کر
طارق کی طرح رخشِ عمر کو غلطی کے سمندر میں ڈال دے۔ پار لگانا میرا کام ہے۔ یہی بات پوچھتے تھے نہ اللہ میاں؟ مگر
اللہ میاں میں تو اس نئی تعریف سے ایسا ڈرا کہ اسے اب تک چھپائے رکھا۔ آج تمہارے پوچھے پر ظاہر کرتا ہوں۔
مگر اللہ میاں سینکڑوں دفعہ جی میں آیا کہ لوگوں سے کہوں کہ "بھئی نمازوں کو صدیوں ہم سب نے آزمایا۔ اللہ میاں
بھی اکتا گیا ہو گا کہ یہ کمبخت فرصت ہی نہیں دیتے۔ آؤ نمازوں کو چھوڑ کر دیکھیں!" اللہ میاں کیا کہا کہ پھر اب تک

یہ بات کیوں نہ کہی ؟ اللہ میاں میری کمزوری۔ کیا کہا کہ ہنستا بہت ہوں ؟ ہاں اللہ میاں یہ بھی کمزوری مجھ میں ہے مگر اللہ میاں مجھ بالکل ہی فیل تو نہ کرو۔ کیا کہا کہ نہیں یہ خیال نہیں ہے۔ اچھا تو اللہ میاں یہ کام کیسے ہو کہ مذاق مذاق میں مسلمان کام کے آدمی بن جائیں ؟ کیا کہا کہ کوشش کروں ! اللہ میاں کچھ تم بھی تو مدد کرو ! تمہیں کیا پتہ کہ مسلمان کی کھوپڑی کیا آفت ہے ؟ گولی سے یہ نہ پھٹے، علم سے یہ نہ پھوٹے عقل سے عاری اور دولت پر بھاری کچھ تم اسے قدرے نرم کردو !۔ کیا کہا کہ مسلمان بجائے تمہارے ہاتھ بکنے کے تمہیں خریدنا چاہتے ہیں اور یہ تمہیں ناگوار ہے ؟ بچارے مسلمان خود بھی کچھ نہ بنے اور تم سے بھی گئے !

اچھا اللہ میاں ایک بات اور بتادو ! کیا کہا کہ پوچھوں ؟ ہاں اللہ میاں میں کیا کروں ؟ کیا کہا کہ جو جی میں آئے کروں ؟ نہیں اللہ میاں یہ بات نہیں۔ میں چاہتا ہوں تم کچھ میرے جی میں ڈال دو۔ نہیں ؟ اچھا یہ بھی نہیں تو پھر یہ کرو کہ میرے دل میں رہا کرو۔ کیا کہا کہ اچھا ! اللہ میاں تم تو میرے ہونا ؟ اللہ میاں میں تمہیں کسی کو مانگا نہ دوں گا لوگوں کی طرح گلی کوچے میں تمہارا ذکر نہ کروں گا۔

اللہ میاں ! اللہ میاں ! اب کیوں نہیں سنتے ؟ کہاں گئے ؟

ارے ابھی تو مجھے کیا کچھ کہنا تھا۔ اللہ میاں تم سنتے تو تمہیں سناتا کہ کل رات تمہیں کس کس طرح یاد کیا۔

۲

اللہ میاں ! وہ حقیقی بیداری کی زندگی جس میں تم اور میں رُو در رُو تھے کس قدر جلد ختم ہوئی ؟ اب پھر وہ کمبخت خواب ہے جس میں زر کے زور سے عقل فرمانروائے کا ہے، جس میں آج اور کل کا گورکھ دھندا ہے۔ اللہ میاں ! اللہ میاں !! سنتا نہیں تو دیکھ ! دیکھ !! عقل کس طرح میری گردن دبوچے ڈالتی ہے !۔ اللہ میاں اس خواب میں میرا ہونا اور تیرا نہ ہونا دونوں غضب ہیں۔

اللہ میاں ! کاش ذرا تم اور ٹھہرتے !! ایک بات تم سے کہتا۔ تمہیں بتلاتا کہ باوجود اس مساوات کے کہ تم میرا خواب ہو اور میں تمہارا خواب ہوں (اور یہ کون کہے کہ دونوں میں سے کس کا خواب بہتر ہے ؟) میں تم سے معذرت کرتا۔ تم سے صرف ایک جملہ کہتا۔

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا۔

اللہ میاں ! تم خود سمجھ لیتے کہ کس کا حق کس نے ادا نہ کیا مگر میرا مطلب یہی ہوتا کہ قصور میرا تھا۔ اللہ میاں ! اللہ میاں !! دیکھ ! عقل کمبخت مجھے کھائے جارہی ہے۔ مجھے کہتی ہے کہ میرا جسم میرا اپنا نہیں۔ اس پر ملک کے،

شہر کے ہمسایوں کے، ماں جایوں کے، حقوق ہیں۔ کہہ رہی ہے کہ میرے خیالات میرے اپنے نہیں کیونکہ وہ عکس ہیں
اُن حالاتِ گذشتہ و حاضرہ کا جن کا ظہور میرے قربِ ذہنی میں وقتاً فوقتاً ہوتا رہتا ہے۔ کہہ رہی ہے کہ ندی میں اگر ابر
کی پرچھائیں ندی کی جدتِ طبع کا نتیجہ ہیں تو میرے خیالات بھی میرے اپنے ہو سکتے ہیں ورنہ ہرگز نہیں۔ اللہ میاں
جب نہ جسم نہ خیال کچھ بھی میرا اپنا نہیں تو دنیا مجھ سے چاہتی کیا ہے؟ میرے کچھ نہ ہونے پر یہ دنیا مجھ پر کیوں اس
قدر حاوی ہے؟ اللہ میاں! جلدی پہنچ نہیں تو عقل مجھے مٹا دے گی! اللہ میاں! تم نہیں آتے! اچھا وہ تو سُن لوکہ
تمہیں کس طرح یاد کیا! اللہ میاں! میرا ایک بھائی ہے جو حاجی اور حافظ ہے اور تمہیں دوست بھی رکھتا ہے۔ اسے
اپنا دوست بنا کر تمہیں میں یوں یاد کر رہا تھا۔

اے دوست!

سورج اور تاروں کا، چاند اور بادلوں کا ذکر تو کروں مگر زبان کہاں سے لاؤں؟ کس خلوص، کس تپاک سے
فطرت کے یہ معجزے انسان کو اپنی طرف مائل کرتے ہیں؟ ان کی ثقاہت میں کیا رعنائی ہے؟

اے دوست!

کیا تم نے سورج کی Courtesy پر کبھی غور کیا ہے؟ سورج میرا استاد ہے تو چاند میرا بھائی جسے گھٹنے
بڑھنے کا گلہ نہیں، جیسے نور اور سایہ برابر ہیں۔ استاد کو یا بھائی کو ترقی کی فکر نہیں، تنزل کا غم نہیں اور ہو تو کیوں ہو؟
جو اپنے کام پر مستعد ہیں غمِ فردا اُن کی بلا کو۔

اے دوست!

مجھے لمبا سفر درپیش ہے۔ زادِ راہ کے لئے سورج اور چاند کی مثال کو اپنے دل میں سو احتیاط سے سنبھال لیا ہے۔
بادل مجھے پانی پلا دیں گے، تارے مجھے رستہ بتا دیں گے۔ نہ سہموں گا، نہ بھٹکوں گا سیدھا چلا جاؤں گا۔

اے دوست!

دل میں سب کچھ ہوگا مگر خالی ہاتھ جو وہاں جا نکلا تو میرا کیا حال ہوگا؟ کیا تمہیں پتہ ہے کہ وہاں کیا تحفہ قبول
ہوتا ہے؟ اتنا مجھے معلوم ہے کہ وہاں پوچھا جاتا ہے
"کیا لائے ہو؟"

اے دوست!

میں کیا جواب دوں گا؟ اپنے استاد سورج سے پوچھ چکا ہوں وہ کچھ نہیں بتاتا۔ بادلوں سے پوچھو تو غائب ہو

جاتے ہیں، تاروں سے دریافت کرو تو ہنسنے لگتے ہیں۔ انسانوں سے بہت پوچھ گچھ لیا۔ یہی کہتے ہیں کہ کوئی دلفریب سا جھوٹ پیش کر دینا۔

اپنے بھائی اور دوست!

اس دنیا میں کہیں کہیں صداقت کی خوشبو ہے۔ تم تو اس کا عطر پیش کر دینا اور جب مجھ سے پوچھا جائیگا کہ کیا لائے ہو؟ تو میں یہ کہہ دوں گا

"حضور میں تو کہیں گیا نہ تھا"

اور یہ سچ ہوگا۔ یہاں ہونے پر بھی وہیں ہوں۔

۳

اللہ میاں! یہ تھا تمہیں یاد کرنے کا ایک طریقہ مگر سچ پوچھو تو تصنّع چاہے کتنا ہی لیاقت کے عمامے اور اعتقاد کے جُبّے میں ملبوس ہو پھر تصنّع ہے۔ اور تمہارے اور میرے درمیان تصنّع کیوں ہو؟ اللہ میاں کیا کہا کہ ٹھیک کہتا ہوں؟ اللہ میاں! تم آ گئے؟۔ ہپ ہپ ہرّے۔ اللہ میاں! تم کہاں تھے؟ کیا کہا کہ یہیں کہیں؟ اللہ میاں تم چھپتے کیوں ہو؟ کیا کہا کہ چھپیں نہ تو اور کیا کریں؟

کس سے ملیں؟ کس سے نہ ملیں؟؟

عبدالعزیز

نظارہ تو تھا لیکن ابھی دیکھنے والی آنکھیں نہ تھیں، دیکھنے والی آنکھیں تو تھیں لیکن ابھی محسوس کرنے والا دل نہ تھا، محسوس کرنے والا دل تو تھا لیکن ابھی سوچنے والی روح نہ تھی۔ سوچنے والی روح تو ہے لیکن ابھی وہ پیدا کرنے والا خدا نہیں بنی!

شیرینیاں، رنگینیاں، گلچینیاں بیدینیاں ہوں لیکن اگر حسن بینیاں ہیں تو یقیناً حق آفرینیاں ہیں!

مکائدِ نفس

تسکیں کو، زندگی کا فنا نام رکھ دیا
جو درد تھا، اُسی کا دوا نام رکھ دیا

کیا شے ہے علم؟ حاصلِ اوہامِ رنگ رنگ
ترکیب دے کے جہل کو، کیا نام رکھ دیا

کہتے ہو جس کو حق، وہ ہے باطل کا ایک رُخ
کیا تم نے اُس کا "نامِ خدا" نام رکھ دیا

فرسودگی میں جب کوئی لذّت نہ پا سکے
ہر کُہنہ شے کا ہم نے نیا نام رکھ دیا

کل تک جو کُفر تھا اُسے ایماں بنا لیا
اپنی رضا کا حق کی رضا نام رکھ دیا

ایماں جو کل تھا آج اُسے الحاد کہہ دیا
اتنا سا فرق ہے کہ جُدا نام رکھ دیا

جس وضع سے ہو فطرتِ نَوشیوہ کو اِبا
یونہی اِک اُس کا بے سروپا نام رکھ دیا

خالی سبُو میں شورشِ دریا، فریب ہے،
دل کی صدا کا حق کی صدا نام رکھ دیا

نیکی وہی ہے اے متذبذب وہی بدی
تُو نے ہی اِک سے اِک کا جُدا نام رکھ دیا

دل جس پہ خوش ہوا اُسے پہنچا کے عرش پر
مقبولِ خاصِ ربِّ علا نام رکھ دیا

دِل جس سے پھر گیا، اُسے شیطاں بنا دیا　　مردُودِ بارگاہِ خدا نام رکھ دیا
ظلمت پہ نُور، نُور پہ ظلمت ہے کامیاب　　غافل نے اِس کا صبح و مسا نام رکھ دیا

قِلّت ہمیشہ دب گئی کثرت کے سامنے　　ہر نا روا کا اُس نے روا نام رکھ دیا
تسکیں کہیں نہ جب دِلِ مظلوم پا سکا　　حدِّ ابد کا روزِ جزا نام رکھ دیا

اے دل طلسم خانۂ وہم و خیال کا　　بھُولے سے کس نے ارض و سما نام رکھ دیا
ہے ہر نفس پیامِ فنا باغِ زیست کو　　صرصر کا، آہ کس نے صبا نام رکھ دیا
سودا سے جب ہُوا دلِ وحشی کنارہ گیر　　سودائیوں نے اس کا فنا نام رکھ دیا

معراجِ آرزو کی یہ پروازِ فکر ہے　　ناکامیٔ طلب کا خدا نام رکھ دیا
جو کچھ نہیں ہے، کیا ہے وہ، آخر کہاں ہے وہ؟　　جب کھوج ذات کا نہ ملا نام رکھ دیا

کیا تُو بھی ہم سے ہے، عدمِ مطلق! اِس پہ خوش
تُو کچھ نہیں، پہ ہم نے ترا نام رکھ دیا!!

حامد علی خاں

صبح چند مہمان آجانے کی وجہ سے تمام دن اُن کی خاطر مدارات میں صرف ہوگیا۔ عصر کے قریب میں بشکل مطالعہ کے لئے وقت نکال سکا اور شام تک پڑھتا رہا۔ اسی ضمن میں سہ پہر کی ہواخوری بھی ضائع ہوگئی۔ جب چراغ روشن ہوئے تو کتابوں سے دل برداشتہ ہوکر صحیفۂ فطرت کا مطالعہ کرنے یا یُوں ہی چہل قدمی کے لئے میں مکان کی چار دیواری سے باہر نکلا۔ ابھی دس قدم بھی نہ گیا ہونگا کہ کسی نے آہستہ سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ مڑ کر دیکھا تو ایک دُبلا پتلا چھریرے قد کا آدمی میلی سی اچکن پہنے کھڑا تھا۔ گہری شام کے غلیظ دھندلکے میں اُسے پہچاننے میں مجھے کچھ دقت ہوئی لیکن جب اُس نے مانوس اور شیریں آواز میں، اور یقیناً وہ آواز دنیا میں صرف ایک ہی شخص کی ہوسکتی تھی، میرا نام لے کر پکارا تو میں حیرت سے "اصغر" کہہ کر بے تحاشا اُس سے لپٹ گیا۔ معانقہ ختم ہوا تو سب سے پہلے میں نے اُس کی ہیئتِ ظاہری پر لب کشائی کی جس کی وجہ سے وہ بالکل اجنبی معلوم ہورہا تھا۔ پرانے بے تکلفانہ انداز میں اُس کی کمر پر زور سے تھپکی دیتے ہوئے میں نے کہا "خیریت تو ہے۔ تم نے یہ کیا حالت بنا رکھی ہے؟ اگر تم نہ بولتے تو شاید میں تمہیں پہچان بھی نہ سکتا۔"

اُس نے کچھ رُکتے رُکتے کہا "میں ملتان سے آرہا ہوں، راستے میں میرا کپڑوں کا بکس چوری ہوگیا۔"

ہمدردی کی بجائے میرے منہ سے بے اختیار قہقہہ نکل گیا پھر ہنسی کو ضبط کرتے ہوئے میں نے کہا "واللہ قدرت بھی عجب ستم ظریف واقع ہوئی ہے۔ تمہارے کپڑوں کا بکس گم ہوجانا اپنی نوعیت کے لحاظ سے ایسا ہی افسوسناک سانحہ ہے بلکہ اس سے بھی شدید جیسا کسی مصور، نقاش یا سنگتراش کی اختراعاتِ فائقہ اور عمر بھر کی عرق ریزی سے جمع کئے ہوئے نوادرِ روزگار کا کھویا جانا۔ یقیناً اس حادثہ سے صنعت اور فنونِ لطیفہ کی دنیا کو بہت نقصان پہنچے گا۔ کہو یہ واقعہ کیونکر پیش آیا؟"

اُس نے کہا "بندۂ خدا مذاق پھر کرلینا پہلے یہ تو پوچھو کہ میں آیا کیوں ہوں۔ میرے قیام و طعام کا بندوبست کرو۔ میں تمہارے ہاں ٹھہروں گا۔"

"بسم اللہ۔ آیئے" میں سیدھا اُسے اپنے بیٹھنے کے کمرے میں لے گیا۔ جب ہم اطمینان سے آرام کرسیوں

پر دراز ہو گئے اور لمپ کی روشنی اُس کے چہرے پر پڑی تو میں نے دیکھا کہ اصغر بہت زرد اور نحیف ہو رہا ہے۔
اگرچہ اُس نے مخصوص انداز میں اپنی ترکی ٹوپی کو نہایت لااُبالیانہ طریقہ سے اتار کر میز پر پھینک دیا اور زیر لب گنگنانے لگا لیکن اُس کی ہیئت مجموعی سے صاف پتہ چل رہا تھا کہ وہ بننے کی کوشش کر رہا ہے۔ دراصل آج کا اصغر اُس اصغر سے جسے میں جانتا تھا کوئی نسبت نہ رکھتا تھا۔ اُداس، منحنی سا چہرہ، معمولی ادنیٰ درجہ کے لباس میں ملبوس، آنکھوں میں کھویا پن، اور کہاں وہ چاق چوبند، خوش طبع، انگریزی فیشن کا دلدادہ اصغر جو اپنی سحر کار شخصیت اور ندرتِ کلام سے حاضرین کو مبہوت کر دینے کے علاوہ لطیف بذلہ سنجیوں اور فلک شگاف قہقہوں سے بزم کی بزم کو کشتِ زعفران بنا دیتا تھا۔ اُس کا حسنِ مذاق مسلم اور اُس کی رائے خصوصاً پوشاک اور آرائش کے معاملات میں ہمیشہ ہمارے حلقۂ احباب میں سند کے طور پر پیش کی جاتی تھی۔ چند لمحے خاموشی میں گذر گئے تو میں نے کہا "ہاں تو تم نے بتایا نہیں وہ بکس کیسے گم ہو گیا؟"

"ارے بھئی کوئی بات ہو تو کہوں۔ سراسر میری ہی غلطی تھی۔ میں ملتان سے چلا تو بہت سراسیمگی اور ذہنی انتشار کے عالم میں تھا۔ یہ اچکن کھونٹی پر لٹک رہی تھی۔ اُسی پریشانی میں جلدی سے اتار کر پہن لی اور باقی تمام کپڑے اور چند کتابیں ٹرنک میں بند کر لیں۔ ریل میں بیٹھا تو بھی وہ ادھیڑبن طاری رہی اور میں اُس ڈبے کے باقی مسافروں کا بخوبی جائزہ بھی نہ لے سکا۔ بعدازاں میں نے محسوس کیا کہ وہاں دو شخص ایسے موجود تھے جو اپنی حرکات سے بہت مشکوک چلن کے معلوم ہوتے تھے۔ راستہ میں اتفاق سے میری آنکھ لگ گئی اور خانیوال اسٹیشن پر جاگا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ٹرنک غائب۔ کمرے میں میرے سوا اور کوئی مسافر نہ تھا۔ میں نے گارڈ، اسٹیشن ماسٹر اور پولیس کے افسر کو فوراً اطلاع کی۔ وہ کہنے لگے کہ اپنا سفر منقطع کر کے وہیں ٹھیر جاؤں تاکہ اُن کو تلاش و تفتیش میں سہولت ہو مگر میں نے سوچا مضیٰ مامضیٰ، قسمت اچھی ہوئی تو بکس بھی مل جائے گا ورنہ جان تو باقی ہے۔ اُن کو ضروری ہدایات دے کر میں چلا آیا۔ اگر یہ نقصان بعض اور حالات کے ماتحت ہوتا تو شاید میں بالکل ہی محسوس نہ کرتا۔ مگر جیسا مبہم پروگرام اب میرے پیشِ نظر ہے اور جس قسم کی غیر مستقل زندگی سے میں دوچار ہونے والا ہوں وہاں لباس ایسی اہم اور ضروری چیز کی عدم موجودگی سے ضرور رنج ہوگا۔"

میں نے ایک لمبا سانس لیا اور کہا "اصغر ہم ہندوستان میں کتنی جلدی بوڑھے ہو جاتے ہیں۔ میری مراد جذباتی بڑھاپے سے ہے۔ تم اور ذہنی انتشار کے عالم میں گھر سے چلو، اور پھر تمام سفر ایک ادھیڑبن میں گذار دو۔ خدا کی قسم میں باور نہیں کر سکتا۔ مگر جب دیکھتا ہوں کہ یہ بڑھاپا ہر لحظہ ہم پر شدت سے وار کر رہا ہے اور بہت کم لوگ

ہیں جو اپنے اندر قوتِ مدافعت رکھتے ہیں تو پھر میرے لئے حیرت کی کوئی وجہ نہیں رہتی اور تمہاری گذشتہ زندگی سراسر ایک تعلّی معلوم ہوتی ہے"!

"تعلّی"! اصغر چمک کر اُٹھ بیٹھا "تم دیکھو گے کہ میں اپنے اصول سے سرِ مُو انحراف نہیں کرتا۔ باقی رہا یہ کہ میں خاص احوال میں کیوں سراسیمہ ہؤا تو عرض ہے کہ میں نے اس بات کا تو کبھی دعوےٰ نہ کیا تھا کہ میرے اعصاب فولاد اور قلب و دماغ پتھر کے ہیں۔ ہر ذی حیات شعوری یا غیر شعوری طور پر زندگی کی ارتقائی منازل طے کر رہا ہے، اور منجملہ اُن بالا از شمار نفوس کے ایک میں بھی ہوں جسے اسرارِ حیات کو سمجھ لینے کا دعویٰ تو نہیں ہاں جس نے بزعمِ خود ایک ایسا راز جان لیا ہے جس سے زندگی کی غایت پر روشنی پڑتی ہے۔ اُسی روشنی میں میں نے اپنے لئے چند اصول وضع کر لئے ہیں جو میری رہبری کر رہے ہیں۔ تم ان باتوں پر ہنستے ہو لیکن ایسی ہنسی میں پہلے سینکڑوں مرتبہ دیکھ چکا ہوں۔ تم مجھے نور کو تاریکی اور تاریکی کو نور کہنے پر مجبور نہیں کر سکتے۔ لاریب مجھ میں بہت سی خامیاں ہیں جن کے دفیعہ کے لئے میں ہمہ اوقات مصروفِ جدّوجہد ہوں۔ آخر انسان ہوں ؎ پیالہ و ساغر نہیں ہوں، کہ گردشِ مدام سے گھبرا نہ جاؤں، ہر چند کہ جانتا ہوں کہ گھبراہٹ سراسر بے سود اور تکمیلِ حیات میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ لیکن میرے عمل کی کوتاہی سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ زرّیں اصول جس کی حقانیت و صداقت پر مجھے دو اور دو چار والا اعتقاد ہے اپنے اندر کچھ حقیقت نہیں رکھتا۔ تم اسے وہم کہتے ہو لیکن خدارا مجھے بتاؤ ہماری زندگی میں کوئی ایسی چیز، مادی یا غیر مادی بھی ہے جس کی بنیاد وہم نہ ہو؟ عزیز دوست انسان کے تمام اعمال و معیار اعتباری ہیں۔ اگر یہ صحیح ہے تو کامیابی پر آپے سے باہر ہو جانے اور ناکامی پر گریہ و زاری کرنے کے کیا معنی؟ تم میرے ہی کہنے سے اُس اصول کو جسے میں صداقت اور تم وہم سے تعبیر کرتے ہو ایک مرتبہ تو اپنی زندگی میں جاری و ساری ہو جانے کا موقع دو اور پھر دیکھو کہ حجابات یک قلم اٹھ جاتے ہیں یا نہیں؟ زندگی پر ایک غیر فانی گرفت میسر حاصل ہوتی ہے یا نہیں! علّت و معلول کی اس دنیا میں جہاں جاندار اور بے جان سبھی ایک غیر مختتم سلسلہ میں منسلک ہیں میں اسباب و نتائج کی طبعی کڑی سے کیونکر آزاد ہو سکتا ہوں۔ باقی انسانوں کی طرح میں بھی حسبِ منشا نتائج اخذ کرنے کے لئے اسباب پر قدرتِ کاملہ حاصل کرنے کا متمنی ہوں مگر بسا اوقات ناکامی سے واسطہ پڑتا ہے۔ ناکامی ہماری طبائع پر کیونکر اثر انداز ہوتی ہے۔ بس یہیں سے میرے تمہارے راستے الگ الگ ہو جاتے ہیں"۔

ابھی خدا معلوم وہ اس سے بیں کیا کچھ کہہ جاتا کہ میں نے دفعتہً ایک قہقہہ لگا کر اُسے خاموش کر دیا کہا سبحان اللہ کیا کہنے ہیں آپ کی لسانی کے۔ آئینہ لاؤں حضور کے سامنے کہ آپ کو اپنے اصول کی حق

آجائے۔ ذرا اس چہرے کو دیکھو جس میں خونِ زندگی کا قطرہ تک نظر نہیں آتا۔ اپنی جھرّیوں سے اٹی ہوئی پیشانی دیکھو۔ رخساروں کی زردی اور آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے دیکھو۔ اپنے ہاتھوں سے اپنے جسم کی ہڈیاں گن لو۔ ایک چھلتی ہوئی نگاہ اپنے لباس پر بھی ڈال لو کہ یہ اُس شخص کا لباس ہے جو زیادہ عرصہ نہیں گذرا ذوقِ جمال اور آرائش لباس کے معاملہ میں مجتہد کا درجہ رکھتا تھا اور پھر مجھے بتاؤ کہ اگر غیر فانی شباب اسی کا نام ہے تو ننگِ شباب کی اصطلاح کس پر عائد ہوتی ہے؟"

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اصغر کے متعلق قدرے تفصیل کے ساتھ بیان کروں تاکہ یہ گفتگو "پس منظر" کی روشنی میں زیادہ دلچسپ اور واضح ہو سکے۔ یہ کہنا کہ اصغر میرا دوست تھا چنداں قابلِ التفات بات نہیں کیونکہ طالب علمی کا زمانہ تو ہر شخص پر دوستی کا ملمع چڑھا دیتا ہے۔ اصغر اور میں چار سال ایک ہی کالج اور ایک ہی دارالاقامہ میں رہے جن میں سے ایک سال کے لئے میں اور وہ "ہم کمرہ" بھی تھے۔ اصغر کی والدہ فوت ہو چکی تھیں اور اُس کے والد نے نکاحِ ثانی کر لیا تھا۔ اصغر کے حقیقی بہن بھائی کوئی نہ تھا اور والد کے ساتھ بھی اُس کے تعلقات کشیدہ نہ تھے تو بہت زیادہ خوشگوار بھی نہ تھے۔ طوعاً و کرہاً وہ اُس کے تعلیمی اخراجات کے کفیل ہو رہے تھے۔ اِن ہی وجوہ کے باعث اصغر کی صرف اپنی ہی زندگی اُس کی تمام تر توجہات اور دلچسپیوں کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ چھٹیوں میں بھی وہ بہت کم مکان پر جاتا تھا۔ کبھی میرے ہاں کبھی آپ کے، یونہی فرصت کا وقت گزار لیتا یا اگر جیب گرم ہوئی تو ہندوستان کے مختلف شہروں کا چکر لگانا اُس کا محبوب مشغلہ تھا۔ حالات کی اس نامساعد روش نے، جو یقیناً مجھ ایسے ذکی الحس انسان کے لئے بے حد تکلیف دہ اور ضرر رساں ثابت ہوتی، اصغر کی طبیعت میں ایک خاص قسم کی بے نیازی اور قوتِ ارادہ پیدا کر دی تھی۔ ہیئتِ اجتماعی کا فرد ہونے کی حیثیت سے انسان پر بہت سے فرائض ایسے بھی عائد ہوتے ہیں جن کو اُس کے طبعی رجحان اور حقیقی ذوق کے ساتھ چنداں تعلق نہیں ہوتا۔

والدین کی خدمت، دوستوں کی مروّت، بیوی بچوں کی الجھن، بھائی بہنوں کی محبت، تعلقات کی ایسی ہی سینکڑوں زنجیروں نے ہمیں سوسائٹی کے مختلف شعبوں سے اس طرح باندھ رکھا ہے کہ انفرادی زندگی کا کوئی مفہوم ہی نہیں رہا۔ دراصل انسانی زندگی ایسے ہی خونی رشتوں اور جذباتی تعلقات کے مجموعہ کا نام ہے۔ ان بندھنوں سے جیتے جی آزاد ہونا محالات سے ہے۔ لیکن ہم ایسی زندگی کا تصوّر ضرور کر سکتے ہیں اور اُس کا قیام بھی ممکن ہے جہاں انسان محض اپنے لئے زندہ رہتا ہے۔ کہتے تو ہیں کہ اکیلا خدا دشمن کو بھی نہ کرے مگر ایسا قائم بالذات شخص جو طعن و تشنیع کے دغدغے سے بے نیاز اپنی ہر ممکن الحصول خواہش کی تکمیل کے لئے آمادہ کار ہو جائے، جس کے لئے کل کائنات

سمٹ سمٹا کر اُس کی اپنی زندگی میں محدود ہو گئی ہو۔ جس کی آرزوئیں رسمیاتِ عہد کے دباؤ اور جس کے ارادے خندہ استہزا کے خوف سے یکسر آزاد ہوں بلاشبہ اپنی زندگی میں ایک خاص لذت رکھتا ہے۔ بعض دنیا دار شاید اس حالت کو آوارگی سے تعبیر کریں لیکن سچ پوچھئے تو ہر جذبہ اپنی آخری منزل میں بے عنان ہو کر آوارگی ہی کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ آج سے کئی سال قبل جب میں اول اول اصغر سے ملا تو اس کی ایسی ہی آزادی و بے عنانی نے مجھے بھونچکا سا کر دیا تھا۔ کہاں کالج کا ایک مبتدی اور کہاں یہ باغیانہ طبیعت۔ ذہانت کے لحاظ سے وہ اپنے ہم جماعتوں میں بہت کم حریف رکھتا تھا۔ لیکن چونکہ اُس نے اوقات بہت بے ڈھنگے طریقہ سے تقسیم کر رکھے تھے اس لئے بعض دفعہ وہ کئی کئی ہفتے کسی کتاب کو نہ چھوتا۔ پڑھنے پر آتا تو زاہد شب زندہ دار کی طرح رات کو آنکھ جھپکنا بھی حرام سمجھتا۔ میں کبھی اُس کے لاابالی پن پر لب کشا ہوتا تو وہ یہی جواب دیتا کہ "میں طالب علمی کی شہرت حاصل کرنے کا خواہاں نہیں ہوں کہ کتابوں میں سر کھپانا مقصودِ زندگی قرار دے لوں۔ کتب بینی جو مشاہدہ کی صلاحیت سلب کر لے ایک ذہنی بیماری ہے۔ میرے لئے تو اسی قدر مطالعہ کافی ہے جس سے امتحان میں کامیابی حاصل ہو سکے۔" اور پھر عالمِ سرخوشی میں یہ شعر پڑھ دیتا۔

مومن بہشت و عشقِ حقیقی تمہیں نصیب
ہم کو تو رنج ہو جو غمِ جاوداں نہ ہو

دو سال بعد جب اتفاق سے میری اور اُس کی رہائش ایک ہی کمرے میں ہو گئی تو اُس کے حالات و اطوار زیادہ وضاحت کے ساتھ مجھ پر عیاں ہونے لگے۔ اُس کا معمول تھا کہ سرِ شام کھانا کھا کے نکل جاتا اور رات کے گیارہ بارہ بجے واپس آتا۔ حالانکہ قواعد کی رُو سے کوئی طالب علم ۹ بجے کے بعد اپنے کمرے سے باہر نہیں رہ سکتا تھا خوبیٔ قسمت سے دارالاقامہ کے مہتمم بہت بامذاق اور زندہ دل تھے۔ اُنھوں نے جب بھی سرزنش کی اصغر صاحب نے ہنس کر جواب دیا "حضرت نوعِ انسان پر ایک ہی قسم کے قوانین عائد کرنا دانشمندی نہیں۔ بعض کو قدرت مستثنیات کے لئے پیدا کرتی ہے۔ بندہ بھی انہیں میں سے ہے۔"

اُس کی صحبت یقیناً افزائشِ مسرت کا موجب تھی مگر جب وہ آدھی رات کو آ کر سوتوں کو جگاتا اور دروازہ کھٹکھٹا کر میرے آرام میں بے طرح مخل ہوتا تو طبیعت جھنجھلا اُٹھتی تھی، اور پھر ایک روز کی بات ہو تو خیر مضائقہ نہیں، اُس کا تو مہینہ میں تیس دن وطیرہ ہی یہی تھا۔ ایک رات وہ خلافِ معمول بہت دیر سے آیا، شاید دو بجے ہونگے۔ صبح ہوئی تو میں نے سامان باندھنا شروع کر دیا۔ بڑی بے تابی سے پوچھنے لگا "خیر ہے۔ کہاں

کا ارادہ ہے؟" میں چلّانے لگا "تمہارے ساتھ رہ کر میں اپنی صحت خراب کرنا نہیں چاہتا۔ غضب خدا کا دن بھر تو کالج کی بک بک میں صرف ہو جاتا ہے، رات کو آرام کا وقت تم یُوں برباد کر دیتے ہو۔ اگر ایسی ہی آوارگی دماغ میں سما گئی ہے تو کالج کو خیرباد کہہ دو۔ تم ایسے جہاں گردوں کے لئے خدا کی زمین تنگ نہیں ہے؟"

"وہ بستر سے اچھل کر مجھ سے آلپٹا" دوست، خفا ہو گئے۔ سچ پوچھو تو تمہارے ہی بھروسے پر یُوں بے فکری سے گذر رہی ہے، ورنہ مجھ ایسے سیلانی کو ہوسٹل کی قید و بند میں رہنے کا سلیقہ کب تھا۔ یار تم بھی کسی کٹھ مُلّا سے کم نہیں۔ کئی بار میں نے کہا کہ کتابی کیڑا بننا ہی طالب علمی کی غایت نہیں۔ انسان تو عمر بھر طالب علم رہتا ہے اور حصولِ علم کی سینکڑوں راہیں دنیا میں کھلی ہیں۔ لیکن تم ہو کہ کالج کے کمرے اور درسی کتابوں کے گنبد سے نکلنا ہی نہیں چاہتے۔ خدا کے لئے کوئیں کا مینڈک نہ بنو۔ ذرا چلو پھرو دنیا جہان کی سیر کرو۔ زندگی کا مختلف پہلوؤں سے نظارہ کرو۔ حواس کو آزاد چھوڑ دو۔ پھر دیکھو کہ نفسیات کا علم جیمز کی کتاب سے حاصل ہوتا ہے یا تجرباتِ ذاتی سے؟"

اصغر سخت کثیر الاحباب تھا۔ لیکن دوستی کے متعلق اس کا نظریہ بھی عجیب تھا۔ وہ کہا کرتا تھا "مجھے اُن لوگوں پر ہنسی آتی ہے جو دوستی کو بھی لازمۂ حیات تصور کرتے ہیں۔ چودھویں صدی کی شعلہ آشام دوستیاں پانی کے بلبلے اور آنکھ اشارے سے جلد فنا ہو جاتی ہیں، پھر ایسی ناپائیدار چیز کو ہم کیونکر روح کی غذا بنا سکتے ہیں۔ وہ لوگ جو دوستوں کی صحبت کے بغیر زندگی گذارنے کی اہلیت نہیں رکھتے خطرناک فریبِ نفس میں مبتلا ہیں۔ تم نے بہت سے فریب خوردہ اشخاص کو دیکھا ہوگا جو گذشتہ صحبتوں کی یاد میں آٹھ آٹھ آنسو رونے اور ایامِ رفتہ کو یاد کر کے آہیں بھرنے کے عادی ہیں۔ یہ بیچارے اسی قماش کے بزرگ ہیں جو بسر اوقات کے لئے دوستی کو دو وقت کی روٹی کی طرح ضروری سمجھتے ہیں اور اُس پر مستزاد یہ کہ اپنی وفاکیشیوں اور جاں سپاریوں کے عوض میں دوسروں سے بھی تسلیم و وفا کی توقع رکھتے ہیں۔ نادان نہیں جانتے کہ اس تغیر پذیر عالمِ ارضی میں اکثریت اُن کی ہے جو نہیں جانتے وفا کیا ہے۔ بھائی سچ جانو میں تو شطرنج اور ٹینس کی طرح دوستی کو بھی وقتِ فرصت گذارنے کا ایک کھیل سمجھتا ہوں۔ جب کام سے طبیعت اکتائی دو گھڑی کے لئے کسی دوست کو جا پکڑا۔ جس طرح شطرنج نہ کھیلنے کے باوجود تمام عمر خوش رہ سکتا ہوں اسی طرح دوستوں سے قطع تعلق کر لینے پر بھی میری زندگی میں ملال پیدا نہیں ہو سکتا۔ کسی چیز کا پابند ہو جانا زندگی کی نشو و ارتقا کو غارت کر دیتا ہے۔ رنج و مسرت کی تخلیق تو ہمارے نفس کے سپرد ہے۔ واقعاتِ خارجی کو ہم اپنے رنگ میں رنگ لیتے ہیں ورنہ غم و شادی تو ایک اضافی امر ہے۔

اصغر صرف لباس کے معاملہ میں محتاط تھا۔ کچھ تو مزاج طبعًا خوش پوشی کی طرف زیادہ راغب تھا اور کچھ اس کا خیال تھا کہ دنیا کو صرف لباس کے ذریعہ سے دھوکا دیا جاسکتا ہے۔ وہ کہتا تھا کہ میں بڑے بڑے جہاں دیدہ لوگوں سے ملا ہوں جو بزعم خود علم وفضل کے مجسمے بنے بیٹھے ہیں اور جن کا خیال ہے کہ انہیں زندگی کے نشیب وفراز اور حیاتِ انسانی کی باریکیوں سے کامل آگاہی حاصل ہے۔ لیکن کوئی ملاقات ایسی نہ تھی جس کے اختتام پر میں نے اُن کی سادہ لوحی پر قہقہے نہ لگائے ہوں۔ فیشن کے مطابق شاندار لباس زیبِ تن ہو اور واقعاتِ عالم پر فصاحت کے ساتھ گفتگو کرنے کا ڈھنگ تمہیں آتا ہو تو دنیا کو اُلّو بنا لینا بڑی بات نہیں۔" ایک دفعہ تو اُس نے غضب ہی کر دیا۔ بڑے دن کی تعطیلات سے قبل کالج کا سالانہ ڈنر تھا جس میں شمولیت کے لئے اُس نے بڑے ٹھاٹھ کا سوٹ سلوایا تھا۔ ڈنر کے روز جب اُس نے اپنے کپڑوں کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ نئے سُوٹ کے ساتھ پہننے کو کوئی حسب پسند نکٹائی نہ تھی۔ اُدھر مہینے کا اخیر تھا اور اُس کی جیب خالی ہو چکی تھی۔ اُس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جھٹ فلسفہ کی درسی کتاب (جسے اُس نے ابھی چند روز ہوئے بازار سے خرید کیا تھا) ایک کتب فروش کے ہاں نصف قیمت پر فروخت کر دی اور بازار سے نئی نکٹائی خرید لایا۔

اپنی خصوصیات کی بوقلمونی کے لحاظ سے اصغر ایک اچنبا تھا۔ ہمیشہ مقروض رہتا، وہ کہا کرتا تھا کہ اگر قدرت نے کبھی حکومتِ پنجاب کی کرسیٔ وزارت مجھے بخشی تو پانچ ہزار روپیہ ماہوار مشاہرہ پانے کے باوجود بھی میں تھوڑا بہت مقروض ضرور رہوں گا۔ جن لوگوں کو اُس سے زیادہ واقفیت نہ تھی وہ اُسے ایک سطحی نگاہ رکھنے والا شخص تصور کرتے تھے جسے حالاتِ دنیا کا بغور مطالعہ کرنے کا موقع نہ ملا ہو۔ وہ چونکہ کسی شے کو اہمیت دینے کا عادی نہ تھا اس لئے بعض سنجیدہ مزاج لوگوں کو بھی اس سے شکایت تھی لیکن دراصل اصغر کو دنیا والوں کی کمزوریاں اور تعلیاں دیکھ دیکھ کر زہر خند ہونے کی عادت ہو گئی تھی۔ عیب وثواب کی کوئی راہ نہ تھی جس پر وہ گامزن نہ رہ چکا ہو نیکی و بدی کا کوئی کوچہ نہ تھا جس کو اُس نے پامال نہ کیا ہو اور پھر دامن جھاڑ کر یُوں نہ نکل آیا ہو کہ

ہزار دام سے نکلا ہوں ایک جنبش میں
جسے غرور ہو آئے کرے شکار مجھے

میں اُس کی دقّتِ نظر کا ہمیشہ معترف رہا ہوں۔ لاعلمی وجہالت کو مسرت کا ضامن قرار دیا جاتا ہے لیکن وہ اُن چند در چند نفوس میں سے تھا جو بقول سپنسر "سوچتے ہیں اور پھر مسرور رہتے ہیں" اصغر یقینًا ایک رجائی تھا لیکن اُس کی امید جہالت پر مبنی نہ تھی۔ اُس نے زمانہ کا سرد وگرم چکھا۔ خار دار جھاڑیوں میں الجھ کر دامن کو

تار تار کیا۔ پھولوں کے تختوں میں سے نسیم سحری بن کر گزرا اور پھر اسی نتیجہ پر پہنچا کہ

کام کرتی ہے نظر نام ہے پیمانے کا

اپنی نگاہ میں رنگینی داخل کر لو اور کل کائنات قوسِ قزح کی طرح نظر فریب ہو جائے گی۔ طبیعت میں استغنا پیدا کر لو تو جھونپڑوں میں محلوں کے خواب دیکھو گے۔

ایک روز ہم سب بیٹھے تھے۔ ہمارا دوست وحید بھی تھا۔ وحید تھا تو بہت ذہین لیکن اُس کی ذہانت اُس کے لئے وبال بن گئی تھی۔ اُس کا تخیل دخانی جہاز کی طرح ہمیشہ طوفانی کیفیت میں گرفتار رہتا تھا۔ کچھ شاعر، کچھ وہمی حد درجہ کا، قدرے مریض اور اس پر طرہ یہ کہ محبت کا زخم خوردہ۔ وہ اکثر عزلت نشینی کو پسند کرتا اور عہدِ ماضی کی نوحہ خوانی میں مصروف رہتا تھا۔ یا پھر مستقبل کے خواب دیکھ دیکھ کر حال کو اور زیادہ افسردہ بنا دیتا تھا۔ وہ اصغر کو "ہری چگ" کے نام سے پکارتا تھا اور اصغر صاحب تھے کہ اس لقب کی موزونیت پر لوٹ پوٹ ہو جاتے تھے۔ اصغر نے اس روز وحید کو مخاطب کر کے دیر تک سلسلۂ کلام جاری رکھا اور سچ پوچھئے تو ہماری معلومات میں دل خوش کُن اضافہ کیا۔ وہ کہنے لگا۔ دیکھو بھائی وحید، اگر چندے تمہاری یہی حالت رہی تو قیس کی دیوانگی اور فرہاد کی کوہکنی کو دنیا یقیناً فراموش کر دے گی اور تم اُن کے جانشین کی حیثیت سے مسندِ تاریخ پر رونق افروز ہو گے۔ اگر بقائے دوام کے خواہشمند ہو یا شہیدانِ عشق کی فہرست میں نام لکھانا چاہتے ہو تو تمہارا یہ طریقِ عمل بہت موزوں ہے لیکن اگر زندہ رہنا اور زندگی کی حلاوتوں سے لذّت اندوز ہونا چاہتے ہو تو خدا کے لئے اُس "نیک بخت" کو بھلا دو۔ زندہ قوموں کا عشق بھی حیات افروز ہوتا ہے لیکن ہمارے ہاں عشق اور تپِ دق ہم معنی الفاظ ہیں۔ اور پھر اس ملک میں رہ کر عاشق بننا تو فطرت کے خلاف جنگ کرنا ہے۔ میں سنتا ہوں کہ تمہاری محبوبہ ہندوستان کے جذبات کُش طرزِ انتخاب کے ماتحت کسی اَور کے حوالے کر دی گئی ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو تم کیوں ہمالیہ سے ٹکرا کر سر کو لہولہان کر رہے ہو۔ محبت تو جذبات کی انتہائی کمزوری کا نام ہے، اور ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ ہر دعوے دار اپنی محبت کو بے لوث ظاہر کرتا ہے۔ جہاں خون کا جوش زیادہ ہوا محبت کے جراثیم پیدا ہونے شروع ہو گئے۔ محبت کا جذبۂ بے لوث صرف ماں کے سینے میں فروزاں ہوتا ہے اور باقی سب باطل۔ اِس غلام آباد میں اَور مصائب کیا کم ہیں کہ عشق کا روگ! یزاد کر دیا جائے۔ سب سے بڑی مصیبت تو یہ ہے کہ ہم میں زندگی بسر کرنے کی صلاحیت نہیں۔ بات بات پر آنکھوں کو آنسوؤں سے ڈبڈبا لینا، ہر وقت ٹھنڈی آہیں بھرنا، دنیا کو دھوکے کی ٹٹی کہنا، ہر ہنسنے والے کو خدا سے باغی اور قہقہہ لگانے والے کو گنہ گار خیال کرنا یہاں دین داری

میں داخل ہے۔ تم گردن جھکا کر آنکھیں بند کر کے گذر رہے ہو درآنحالیکہ چھوٹی چھوٹی چیزیں معمولی معمولی واقعات جن کے اندر مسرت وشادمانی کے لازوال خزانے پوشیدہ ہیں تمہیں زبانِ حال سے پکار پکار کر اپنی طرف متوجہ کر رہے ہیں۔ کوئی بسترِ علالت پر کراہ رہا ہے اور کوئی عسرت وتنگدستی کے ہاتھوں نالاں ہے۔ کوئی کسی عزیز کی موت پر نالہ کناں ہے اور کوئی فکرِ فردا اور غمِ ماضی میں جان گھلا رہا ہے۔ یہ کیوں؟ کہ ہم ابھی تک بحرِ حیات کی موجوں کے تھپیڑے کھا رہے ہیں۔ کوئی نہیں جو سطح کے نیچے جا کر دیکھے کہ کیسے کیسے گراں قدر دفینے اور زر وجواہر کے عظیم الشان انبار مدفون ہیں۔ کامیاب زندگی کا راز یہی ہے کہ زندگی کو اہمیت نہ دو۔ زندگی تو سرد و معطر ہوا کا جھونکا ہے جو سن سے گذر جاتا ہے اور تم اس شمیم جانفزا کو مقید کرنے کی فکر میں ہو۔ یہ جھونکے اسی طرح آتے اور گذرتے جائیں گے۔ تمہارا فرض بس اتنا ہے کہ اُن کی عطر بیزی سے اپنے دل ودماغ کو مسرور بناؤ اور چلتے جاؤ۔ کائنات کی وسعتِ بے پایاں کو دیکھو جس میں اس دنیا جیسی ہزاروں دنیائیں آباد ہیں اور پھر ان دنیاؤں میں جاندار مخلوق بھری پڑی ہے۔ اُس بالا از شمار جاندار آبادی کا نقشہ چشمِ تخیل کے سامنے لاؤ اور سوچو کہ ارض وسما کے درمیان اور اس پہنائے عظیم کے اندر ایک تمہاری ہستی بھی ہے جو فنا کے غارِ عمیق کے کنارے کھڑی بادِ مخالف کی تندیوں سے ہر گھڑی کپکپا رہی ہے۔ تمہاری تو حقیقت ہی کچھ نہیں۔ اجل کا ادنیٰ سا اشارہ تمہیں ملیامیٹ کر سکتا ہے۔ سہ روزہ زندگی کی ناپائیداری پر غور کرو کہ کل صبح تمہیں اپنے بستر سے صحیح وسالم اُٹھنے کا یقین بھی نہیں۔ اور پھر آلام وتفکرات کے اُس لامتناہی سلسلہ پر غور کرو جس نے تم پر خواب وخور حرام کر کے رات کی نیند اور دن کا چین چھین رکھا ہے۔ کیا تمہارے اوہام وترددات تمہاری کم فہمی کی دلیل نہیں؟ دماغ کو برتو اور سوچو کہ تمہاری کل پریشانیاں اس نقطہ پر نہیں آٹھیرتیں کہ تمہیں پیٹ بھر کر کھانا اور تن ڈھانکنے کو کپڑا درکار ہے؟ اور پھر خدارا مجھے بتاؤ کہ کیا تم نے کبھی کسی کو فاقوں مرتے یا شارعِ عام پر برہنہ جسم پھرتے دیکھا ہے؟ یقین جانو کہ ہر شخص قوتِ لایموت کے مطابق کھا رہا ہے اور منظرِ عام پر برہنہ پھرنے والے کو خود حکومت لباس مہیا کر دیتی ہے۔ پھر تم کیوں خیالی ہموم وغموم سے مرے جا رہے ہو؟ اگر ریشم کی قمیص نہیں تو نہ سہی گاڑھے کا کرتہ پہن لیں گے۔ ولایتی ساخت کا پمپ میسر نہیں آتا تو بلا سے دیسی جوتا اس سے زیادہ مضبوط اور آرام دہ ہے۔ عزیز دوست ذرا غالبِ معجز بیان کے اس شعر پر غور کرو

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب وروز تماشا مرے آگے

یہ وہ شخص ہے جو تمام عمر غم و اندوہ کے سایہ سے گریز کرتا رہا اور بستر مرگ پر شاداں و فرحاں تھا۔ تم بھی دنیا کو ایک اسٹیج تصور کرو اور ہر مرد و زن کو ایکٹر۔ تفریح و تفنن اور رنج و حرماں کے کل مظاہر درحقیقت کامڈی و ٹریجیڈی کے کھیل ہیں جن سے متاثر ہونا قرین دانش نہیں۔ ہر واقعہ کو ایک بے غرض و غیر جانبدار تماشائی کی حیثیت سے ملاحظہ کرو لیکن اس دوران میں اپنے احساس کو واقعہ کی نوعیت سے آلودہ نہ ہونے دو۔ اس عالم متغیر میں جس کی کسی شے کو ثبات نہیں اور جہاں ہر گذرنے والا لمحہ ایک نئی زندگی کی آفرینش کا پیغام دے جاتا ہے زمانہ کی نیرنگیوں اور انقلابات دہر سے اثر پذیر ہونا اس امر کی دلیل ہے کہ تمہیں اپنے دل و دماغ پر قابو نہیں۔ واقعات عالم کا تماشا کرتے وقت ایک سائنس دان کی طرح اپنے حسیات کو بالکل علیحدہ رکھو ورنہ یہاں گریہ وزاری کی ارزانی کی تو یہ کیفیت ہے کہ

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

میں اکثر سوچتا ہوں کہ ہندوستان میں ہم اس قدر جلد کیوں بوڑھے ہو جاتے ہیں۔ میرے خیال میں اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم زندگی کو غیر معمولی اہمیت دینے کے علاوہ اس میں کوئی جدت پیدا نہیں کرتے۔ پیدائش سے موت تک ہم ایک ہی ماحول میں رہتے ہیں۔ وہیں پرورش پائی، وہیں بڑھے اور وہیں مر گئے۔ کسی چیز سے پوری طرح بعجت اندوز ہونے کے لئے ضروری ہے کہ اس کے مختلف پہلوؤں سے تمام امکانی حظ حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ طالب علم اگر صبح سے شام تک کتابوں میں سر کھپائے اور کھیل کو دحرام کرلے تو مطالعہ کا مقصد فوت ہو گیا۔ وکیل اگر گھر سے کچہری اور کچہری سے گھر تک ہی زندگی محدود کرلے یا ایک طبیب اگر دنیا کی طرف سے آنکھیں بند کرکے تشخیص امراض و معائنہ مرضیٰ تک ہی اپنے تئیں وقف کر دے تو اُس نے زندگی کا صرف ایک پہلو دیکھا اور باقی پہلوؤں کے لئے وہ اندھا ہے۔ ایک ہی قسم کے ذائقہ سے طبیعت جلد سیر ہو جاتی ہے مصروفیتوں میں رد و بدل کرتے رہو گے تو دنیا کی اشیا زیادہ خوبصورت اور جاذب توجہ ثابت ہوں گی کبھی "فقیروں کا بھیس" بنا کر "تماشائے اہل کرم" دیکھو تو کبھی اہل کرم بن کر فقیروں کا تماشا دیکھو۔ غالب نے کیا خوب کہا ہے

بخشے ہے جلوۂ گل ذوق تماشا غالب
چشم کو چاہئے ہر رنگ میں وا ہو جانا

بی اے تک ہم اکٹھے رہے۔ اس کے بعد میں ایم اے میں آگیا اور اصغر گھر بے کار بیٹھا رہا۔ میرا خیال تھا کہ

اب وہ زندگی کا بے کاری کے نقطۂ نگاہ سے مطالعہ کرے گا لیکن بعدازاں معلوم ہوا کہ اُس کے والد اُسے مزید تعلیم دینے کے حامی نہ تھے، اس لئے اصغر کو مجبوراً لاہور کی جان بخش درس گاہوں سے محروم رہنا پڑا۔ ایک سال گزر گیا اور اگلے برس اصغر نے یکایک لا کالج میں داخل ہو کر سب دوستوں کو حیران کر دیا۔ کہاں اصغر اور کہاں قانون کی کٹھن منزل۔ لیکن شاید اُس نے اپنی آبلہ پائی کا یہی علاج سوچا تھا کہ وکالت کی وادیٔ پُرخار کے کانٹوں کی پیاس بجھائی جائے۔ ہم جانتے تھے کہ اِس بیل کا منڈھے چڑھنا مشکل ہے۔ سال بھر اصغر قانون کی ضخیم اور خشک کتابوں کا پلندا اٹھائے دو میل کا فاصلہ طے کر کے ہر روز صبح آٹھ بجے کالج پہنچتا رہا۔ اُس کی باقی زندگی اُنہی دیرینہ خصوصیات کی حامل تھی۔ جدت کا وہ اب بھی متلاشی تھا اور شاید لا کالج میں داخل ہونا بھی حصولِ جدت کی ایک سعی تھی۔ مگر اُس کی ذہانت قانون کی حریف نہ ہو سکی۔ یہاں تو وہی لوگ کامیاب ہوتے ہیں جو دنیا کو صرف دو اور دو چار سے تعبیر کریں۔ امتحان میں ناکامی کی خبر اُس کو ایک انگریزی روزنامہ کے ذریعہ سے ملتان میں ملی۔ اُس کے والد جو پہلے ہی سے اُسے ایک ناگوار فرض اور غیر ضروری بار سمجھے بیٹھے تھے یہ خبر سنتے ہی برس پڑے اور لگی لپٹی رکھے بغیر صاف صاف انہوں نے کہہ دیا کہ "میرے مکان سے نکل جاؤ۔ میں عمر بھر کا اندوختہ تمہاری فضول خرچیوں اور تماش بینیوں پر لٹانا نہیں چاہتا۔"

یہ حالت تھی جب اصغر صاحب "نیمے دروں نیمے بروں" کی صورت بنائے، کپڑوں کا بکس کھو کر اداس و مضمحل میرے پاس آئے۔ جب ہم کھانا کھا چکے تو میں نے پوچھا "اب کہاں کا ارادہ ہے"!

"میں بمبئی جا رہا ہوں"

"بمبئی؟ وہاں کیا کرو گے"؟ میں نے حیرت سے پوچھا۔

"تم حیران کس بات پر ہوتے ہو! میں تمہاری طرح آئی سی ایس کے خواب تو دیکھ ہی نہیں رہا کہ اس سے کم کسی چیز پر میری تسلّی نہ ہو گی۔ تمہیں معلوم ہے کہ ذاتی وجاہت و حشمت کے قائم کردہ معیار میں میں تمہارا ہم خیال نہیں ہوں۔ میں تو صرف جان و جسم کا رشتہ برقرار رکھنے کے لئے روٹی اور تن ڈھانکنے کو کپڑا ایک انسان کے لئے ضروری سمجھتا ہوں۔ اور یہ وہ چیزیں ہیں جو میں ہر حال اور ہر جگہ اپنے لئے بآسانی پیدا کر سکتا ہوں۔ اس لئے میرے لئے لاہور، کراچی، لکھنؤ، بمبئی یا لندن سب برابر ہیں"۔

چند روپے اُس کے پاس تھے اور کچھ اُس نے مجھ سے لئے اور حضرت دوسرے روز بمبئی روانہ ہو گئے۔

اس واقعہ کو اڑھائی سال گذر گئے۔ ہم بظاہر ایک دوسرے کے لئے مر چکے تھے کیونکہ نہ اُس نے مجھے

کبھی خط لکھا اور نہ مجھے اُس کا پتہ معلوم تھا۔ اس دوران میں میرے قدیمی ہم جماعت اور دوست آدم اسمٰعیل کی شادی کی تقریب آئی۔ آدم اسمٰعیل بمبئی کے رہنے والے تھے اور وہیں اُن کا کاروبار تھا۔ اُن کے سخت اصرار پر مجھے بھی اس تقریب سعید میں شریک ہونے کے لئے بمبئی جانا پڑا۔ جب برات و ولیمہ کی گہما گہمی سے فراغت ہو چکی تو آدم صاحب نے اپنے خاص دوستوں کو ایک شام تاج محل ہوٹل میں دعوت دینے کا اہتمام کیا۔ تاج محل کی وسیع و شاندار عمارت کے ایک پُرتکلف کمرے میں بیٹھے ہم سامانِ اکل و شرب کا انتظار کر رہے تھے کہ ہوٹل کا ملازم شوربے کی رکابیاں اٹھائے کمرے میں داخل ہؤا۔ اُس نے دہلیز کے اس طرف قدم رکھا ہی تھا کہ میری اُس کی نظریں چار ہوئیں۔ مجھے اپنی آنکھوں پر شک ہونے لگا۔ میں سمجھا کہ عالمِ خواب ہے اور جو کچھ دیکھ رہا ہوں اُس کو حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ آنے والے شخص نے بھی میری طرف دیکھا اور سوائے ایک خفیف تبسّم کے اُس کے چہرہ پر حیرت و استعجاب کی کوئی علامت نہ تھی۔ یہ اصغر تھا جو ہوٹل کے ملازم کی مخصوص وردی پہنے ہمارے لئے میز پر کھانا چُن رہا تھا۔ جب وہ دوسری مرتبہ کمرے میں داخل ہؤا تو میں نے بے اختیار اُس کا بازو پکڑ لیا اور چلّایا "اصغر تم کہاں"؟ اُس نے نہایت تحمل سے جواب دیا "یہ مصروفیت کا وقت ہے پہلے کھانے سے فارغ ہو لیجئے۔ پھر باتیں کریں گے"۔ میرے ساتھی حیران تھے کہ کیا معاملہ ہے۔ میں نے انہیں یہ کہہ کر ٹال دیا کہ کھانے کے بعد مفصل گفتگو ہوگی۔ جب ہم بل ادا کر کے ہوٹل سے رخصت ہونے لگے تو اصغر چند منٹ کے لئے میرے پاس آیا اور کہنے لگا "ابھی کام ختم نہیں ہؤا ورنہ میں آپ کے ہمراہ چلتا۔ یہ بتاؤ ٹھیرے کہاں ہو؟ میں کل صبح آؤں گا"۔

میں نے اُسے اپنی قیام گاہ کا پتہ دیا اور منت درخواست کی کہ خدا کے لئے اپنی اولین فرصت میں ضرور پہنچنا۔ دوسرے روز میں ابھی ناشتے سے فارغ نہ ہؤا تھا کہ اصغر کے آنے کی اطلاع ہوئی۔ ہلکے فاختئی رنگ کا سُوٹ، بیش قیمت انگریزی ٹوپی اور نہایت اعلیٰ بوٹ پہنے اصغر صاحب کمرے میں داخل ہوئے۔ میرے میزبان جو ابتک اصغر کے حالات و اطوار سے بے خبر تھے اس قلبِ ماہیت کو دیکھ کر حیران ہو گئے۔ اصغر نے اندر قدم رکھتے ہی ایک بلند بانگ قہقہہ لگایا اور آدابِ مجلس کو بالائے طاق رکھ کر وحشیوں کی طرح مجھ سے لپٹ گیا۔ وہ اونچی آواز میں یہ شعر الاپ رہا تھا۔

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی

میں بار بار اُس کے کپڑوں کی طرف دیکھ رہا تھا اور سخت متعجب تھا کہ اس طرفہ معجون شخص کا خمیر کس مٹی سے ہوا ہے۔ رات ایک ہوٹل کا خدمتگار تھا اور اب ہائی کورٹ کے وکیل سے کم شان کا مالک نہیں۔ میں نے پوچھا۔ "تم نے بہروپ بھرنے کا پیشہ کب سے اختیار کیا۔ کیا بمبئی میں شروع سے یہی کام کر رہے ہو؟ کیسی شرمناک بات ہے کہ یونیورسٹی کا گریجوایٹ اور تم سا زیرک و خوش فہم شخص یوں ذلیل و خوار ہو"!

اُس نے کہا اگر تم نے زجر و توبیخ کی پرانی عادت ترک نہیں کی تو الحمدللہ میں بھی اپنی دیرینہ خصوصیات پر بدستورِ سابق کاربند ہوں۔ میں تم سے ہمیشہ کہا کرتا تھا کہ دنیا ایک اسٹیج ہے اور ہم سب ایکٹر۔ تم میرے قول کو متانت کے خلاف سمجھ کر ناقابلِ عمل خیال کرتے تھے۔ اب تو اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہو کہ میں کس انداز سے اس اصول کو اپنی عملی زندگی میں جاری و ساری کر چکا ہوں۔ بھائی، سچ جانو میں تم سے زیادہ مسرور و مطمئن ہوں۔ غمِ دنیا و فکرِ عاقبت سے آزاد ہوں۔ اچھا کھانا اچھا پہننا، بمبئی ایسے شہر میں فطرتِ انسانی کا مطالعہ، اور مجھے کیا چاہئے؟ آزادی کا یہ عالم ہے کہ ڈھائی سال کی مدت میں بیسیوں پاپڑ بیل چکا ہوں۔ مدرسی اور اخبار نویسی میں رہ چکا۔ سنگر مشین کا ایجنٹ میں رہا۔ سینما اور تھیٹر کی ملازمت کا مزا میں نے چکھا۔ ٹرام میں نوکری میں نے کی۔ غرض کہ جہاں طبیعت ذرا اکتائی اور حواس پر بڑھاپے کے آثار نمودار ہوئے میں فوراً اپنی مصروفیت کی نوعیت میں تبدیلی پیدا کر لیتا ہوں اور زندگی پھر تر و تازہ ہو جاتی ہے۔

"جاوداں، پیہم دواں، ہر دم جواں ہے زندگی"

میری صحت دیکھو، قابلِ رشک ہے یا نہیں؟" اصغر کی صحت واقعی بے نظیر تھی۔ گوشت اور خون کی کثرت اس پر اُس کا ورزشی جسم، پہلوان معلوم ہو رہا تھا۔ "آج کل یہ کام ہے کہ دن کو یہاں کے ایک رئیس کے خورد سال بچے کو پڑھاتا ہوں۔ معقول مشاہرہ لینے کے علاوہ رہتا بھی انہی کے مکان پر ہوں۔ اور شام کو تاج محل ہوٹل۔ پچھلے دنوں جرمنی کی ایک مشہور تجارتی کمپنی کے گماشتے سے میری ملاقات ہو گئی۔ وہ اپنے کاروبار کے سلسلہ میں مجھے جرمنی لے جانے پر رضامند ہے۔ شرائط ابھی طے نہیں ہوئیں۔ ممکن ہے چند ماہ تک جرمنی چلا جاؤں اور یوں یورپ جانے کی پرانی آرزو بر آئے۔"

مجھے بمبئی سے واپس آئے سال بھر سے زیادہ عرصہ ہو گیا ہے۔ آدم اسماعیل اور اصغر کی خاصی دوستی ہو گئی تھی۔ چنانچہ آدم صاحب کے خط سے معلوم ہوا کہ اصغر جرمنی روانہ ہو گیا ہے۔

کعبہ کی ہے ہوس کبھی کوئے بتاں کی ہے ۔۔۔ مجھ کو خبر نہیں مری مٹی کہاں کی ہے

عاشق بٹالوی

ہم

ی میں اپنی بے خودی میں حقیقت آشنا ہم ہیں
سراپا مدّعا ہونے پہ بھی بے مدّعا ہم ہیں

آزاد کو بندش ہی ہے پیغامِ آزادی
جفا کاری کی تدبیروں میں تقدیرِ وفا ہم ہیں

ری زندگانی معرکہ ہے حقّ و باطل کا
رہ و رسمِ جہاں میں نعرۂ صدق و صفا ہم ہیں

سے موت زندہ ہے ہمیں سے زیست تابندہ
اُدھر رنگِ فنا ہم ہیں اِدھر آبِ بقا ہم ہیں

کے نفس میں مضمر ہے جنت بھی جہنّم بھی
قیامت زندگی ہے داورِ روزِ جزا ہم ہیں

ن نورِ ہدیٰ ہیں ظلمتیں ناکامرانی کی
بہت گمراہ ہیں پھر بھی خود اپنے رہنما ہم ہیں

سے جاں پڑی کون و مکاں کے جسمِ بے جاں میں
حیاتِ تازۂ برگ و گل و ابر و ہوا ہم ہیں

ہیں صورتیں ہیں ممکناتِ زندگانی کی
حجر ہم ہیں شجر ہم ہیں بشر ہم ہیں خدا ہم ہیں

ی ہی چمک سے ہی چمک سی بحرِ ہستی پر
سمندر جس پہ نازاں ہے وہ دُرِّ بے بہا ہم ہیں

ی سمت بینی میں ہے نصب العین فطرت کا
یہ وہ کافر ہے جس کی روح کے قبلہ نما ہم ہیں

ازور پنہاں ہے ہماری کس مپرسی میں
فلک بھی گونج اُٹھے جس سے وہ صحرا کی صدا ہم ہیں

ی چھیڑ سے دُنیا کی کیا نغمے نکلتے ہیں
خدا دلگیر ہے جس کے لئے وہ دلربا ہم ہیں

معنی جہاں اظہار ہم اسرارِ معنی ہیں
زمیں پر شاہدِ معنی کا یعنی آئنہ ہم ہیں

بشیر انسان کیا ہے بازوئے قوّتِ خدائی کا
وہ سرکش ہیں جو کہتے ہیں خدا کی خاکِ پا ہم ہیں

بشیر احمد

خانہ جنگی

ہندوستان کے ہر گوشہ سے آج کل خانہ جنگی کی مذمت نہایت اونچی آواز میں الاپی جارہی ہے. خیریت یہ ہے کہ ۷۵ فی صدی مذمت کرنے والے محض اوپری دل سے، عالمگیر آواز کے ساتھ سُر ملانے کی کوشش کرتے ہیں اور ۲۰ فی صدی اپنے دلی معتقدات کے اظہار کی ہمت نہیں پاتے! مشکل سے ۵ فیصدی ایسے ہونگے جو دراصل خانہ جنگی کو فعلِ مذموم سمجھنے کی غلطی میں مبتلا ہوں —— اگر خدانخواستہ تمام غل مچانے والے فی الحقیقت خانہ جنگی کو فعلِ مذموم تصور کرنے لگتے تو غالباً زندگی اجیرن ہوجاتی.

خانہ جنگی کے متعلق کوئی رائے قائم کرنے کے لئے سب سے سیدھا اور سہلِ ممتنع نظر آنے والا استدلال یہ ہے کہ خانہ جنگی بھی دراصل جنگ کی ایک قسم بہ لحاظِ مکان ہے. جنگِ بحری، جنگ برّی، اور جنگِ کوہسار کی طرح جنگِ خانہ بھی ایک قسم کی جنگ قرار پائے گی۔ اب اگر جنگ انسان کے لئے مفید ہوسکتی ہے تو خانہ جنگی بھی مفید ہوسکتی ہے؛ جنگ اگر شعارِ انسانی ہے تو خانہ جنگی بھی شعارِ انسانی ہے؛ جنگ اگر مقتضائے تہذیب و ترقی ہے تو خانہ جنگی بھی مقتضائے تہذیب و ترقی ہے. جنگ کے شعارِ انسانی اور مقتضائے تہذیب و ترقی ہونے کے لئے کسی زبردست بحث کی حاجت نہیں؛ تاریخِ اقوام کی خونی سرخیاں تمام مخالف دلائل کا زندہ جواب سمجھی جاسکتی ہیں. پھر جو رائے جنگ کے لئے قائم کی جائے وہی خانہ جنگی کے لئے بھی قائم کی جائے گی، کیونکہ جو حکم کُل کے لئے لگایا جائے وہی جزو پر عائد ہوگا. جنگ کے فعلِ مستحسن قرار پاجانے پر صرف اِس قدر کہنا باقی رہ جاتا ہے کہ ہر نیکی کا آغاز گھر سے ہوتا ہے. کوئی وجہ نہیں کہ جنگ کی برکات سے اپنے گھر کو محروم رکھا جائے اور محض پڑوسی کے گھر کو اُس سے فیضیاب ہونے دیا جائے!

اس سیدھے اور سہل استدلال کے علاوہ خانہ جنگی کو مختلف اصولوں پر، کسی قدر عمیق نظر سے بھی جانچا جاسکتا ہے.

+ + + + + +

سب سے پیشتر نظریۂ حیات کو لیجئے:-

لوازماتِ حیات میں تنازعہ کا وہی مرتبہ ہے جو جسمِ جاندار میں جان کا، کائنات کا ایک ایک ذرّہ تنازع للبقاءُ

کے اصول پر قائم و کاربند ہے۔

حیات کیا ہے؟ ——— تسلسلِ کش مکش - یا - مجموعۂ تنازعات!

موت کیا ہے؟ ——— عدمِ احساس - یا - امنِ مطلق!

اگر یہ طاقتِ تنازعہ للبقار تمام کائنات سے صلب ہو جائے تو وجودِ گوناگوں یک لخت عدمِ تاریک سے بدل جائے۔

ایں جہاں جنگ است کُل چو بنگری (مولانائے روم)

تنازعہ اس لحاظ سے ایک فعلِ فطری ثابت ہوتا ہے اور خانہ جنگی سے گھر کو ناآشنا رکھنے کی کوشش بالکل ایسی ہی حماقت نظر آتی ہے کہ گھر قوانینِ فطرت کے خلاف قائم کیا جائے۔

+ + + + + +

اب فلسفۂ نیک و بد کے لحاظ سے نظر ڈالئے:۔

دنیا کی کوئی شے، بہ ذاتِ خود، نہ اچھی ہے نہ بُری؛ انسان کا کوئی قول و فعل، فی نفسہٖ، نہ نیک ہے نہ بد؛ اچھی سے اچھی چیز کا بھی ایک تاریک رُخ ہے اور بُری سے بری شے کا بھی ایک روشن پہلو ہے۔ کسی شے کا اچھا یا بُرا مانا جانا اُس کے کارآمد یا مضرت رساں ہونے پر مبنی ہے - یعنی - ایک شے اگر نسبتاً زیادہ صورتوں میں مفید ہے اور کم صورتوں میں مضر تو اُس کو اچھا سمجھا جائے گا اور اس کے برعکس ہو تو برا تصور کیا جائے گا - گویا - کسی شے یا فعل کے نیک و بد ہونے کا انحصار اُس کے کارآمد و مضرت رساں ہونے کے تناسب پر ہے؛ کارآمد و مضرت رساں ہونا قطعی طور پر انسانی ضروریات سے وابستہ ہے، اور انسانی ضروریات ہمیشہ تغیر پذیر، نتیجہ یہ اخذ ہوتا ہے کہ کسی شے یا فعل کا انسانی رجحانِ احتیاج کے بدولت نیک یا بد قرار پانا ہمیشہ متغیر ہوتا رہے گا۔

مثالاً (۱) عریانی کو لیجئے:۔

ایک زمانہ تھا کہ لباس انسانی معلومات سے خارج تھا؛ برہنگی اس دور میں شعارِ انسانی تھی۔

پھر ایک زمانہ آیا کہ کپڑے کی ایجاد ہاتھ آتے ہی ستر پوشی لوازمِ انسانی کی اہم شے قرار پا گئی اور افراسیاب کی لڑکی منیژہ بھی فردوسی کے قلم سے اپنی شرافت کے استدلال میں یہ دعوے پیش کرنے لگی کہ

منیژہ منم دخترِ افراسیاب
برہنہ ندیدہ تنم آفتاب

اب پھر۔ کم از کم مغرب میں۔ یہ زمانہ آتا ہے کہ پاکبازی و ذوقِ نظر کے اوصاف حاصل ہو جانے پر لباس ایک بارِ ناگوار قرار پاتا ہے اور حسنِ مادرزاد کا نظر فریب اظہار اس درجہ خوبی تصور کیا جاتا ہے کہ اُس کی عملی تلقین و تشہیر (Demonstration and advertisement) کی خاطر مس ہاڈالین کو جاہلستان کا سفر اختیار کرنا پڑتا ہے۔ فی الحقیقت، عُریانی، ایسے زمانہ میں جب کہ حیاتِ حیوانی تعلیم رائج کے زیرِ سایہ معدوم ہونے کی حد تک پامال ہو چکی ہوں اور کپڑے کے دام ملکی درآمد و برآمد کے بدولت دوبالا ہو گئے ہوں، نسبتاً زیادہ مفید اور برائے نام مضرت رساں رہ جاتی ہے۔ عریانی کا ایک ادنیٰ کرشمہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ "یہ وہ جامہ ہے کہ جس کا نہیں سیدھا الٹا" اور اس میں شک نہیں کہ الٹے سیدھے کا امتیاز رفع ہو جانے پر اور کچھ نہیں تو یہی آسانی پیدا ہو جاتی ہے کہ ایسے جامہ کو آنکھیں بند کرکے چاہے جس رخ سے استعمال کیا جا سکتا ہے!

(۲) مفلسی پر غور کیجئے:۔

ایک زمانہ تھا کہ انسان کے کان سیم و زر کے نام تک سے ناآشنا تھے۔ ہر متنفس بے سیم و زر یعنی مفلس تھا اور مفلسی اُس زمانہ میں شانِ انسانیت تھی۔

پھر ایک زمانہ آیا کہ سیم و زر کا پتہ چل جانے پر، مال و دولت حاجت برآری کا ذریعہ قرار پا گئے اور مفلسی تکلیف دہ سمجھی جانے لگی، مگر پھر بھی اطمینانِ قلب کی خوبی افلاس ہی میں تسلیم کی جاتی تھی اور کہا جاتا تھا کہ ——

دو قرصِ نان اگر گندم است یا از جَو	دوتائے جامہ اگر کہنہ است یا خود نَو
بچار گوشۂ دیوارِ خود بخاطرِ جمع	کہ کس نہ گویدازیں جا بخیز و آں جارو
ہزار بار فزوں تر بہ نزدِ ابنِ یمین	زفرِ مملکتِ کیقباد و کیخسرو!

اب ایک زمانہ آتا ہے کہ دولت۔ اور محض دولت۔ جوہرِ شرافت و روحِ انسانیت قرار پاتی ہے، سیم و زر کو "ستارِ عیوب و قاضی الحاجات" کا مرتبۂ خداوندی مل جاتا ہے اور مفلسی بدترینِ عیوب تصور کی جاتی ہے۔ مفلسی کے اسباب کے متعلق ایک دوسرے کو متہم کرنے لگتا ہے۔

ایک کہتا ہے کہ گوشت خوری سے اصراف پیدا ہوتا ہے اور اصراف سے مفلسی؛ دوسرا کہتا ہے کہ گوشت خوری انسان میں اُس وقت سے پیدا ہوئی جب وہ فلاکت زدہ ہونے کی وجہ سے جنگل کے جانوروں سے پیٹ بھرنے پر مائل ہوا۔ سبزی خور کا دعوےٰ ہے کہ گوشت خوری مفلسی کا پیش خیمہ ہے، اور۔ گوشت خور کا استدلال ہے کہ مفلسی گوشت خوری کی بنا ہے؛ واقعہ یہ ہے کہ مفلسی کو سبزی خوری سے لے کر گوشت خوری تک کسی "خوری" سے تعلق نہیں۔

البتہ چغل خوری اور حرام خوری خارج از بحث ہیں۔

فی الحقیقت، مفلسی ایسی بُری چیز نہیں جیسی کہ سمجھی جاتی ہے۔ مفلسی کی موجودہ خوبی یہ ہے کہ وہ فاقہ مستی کا عادی بناتی ہے، اور فاقہ و فقر نفس کشی کی پہلی سیڑھی ہے۔ فاقہ مستی کے زیرِ سایہ قحط و وبا کے نتائج نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کئے جاتے ہیں اور رفتہ رفتہ انسان کو خود فراموشی کا مرتبۂ اعلیٰ حاصل ہو جاتا ہے۔ فاقہ مست کا ہاتھ حسبِ حیثیت اپنے ہی منہ کی طرف جائے گا اور شکم سیر کا ہاتھ حسبِ حاجت گوشِ مدعی کی جانب؛ ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بہ کجا!

(۳) ملازمت پر نظر ڈالئے:-

ایک زمانہ تھا کہ انسان کسی دوسرے ہم جنس کا مطلق تابع فرماں نہ تھا؛ ہر شخص اپنی بھوک کھاتا اور اپنی نیند سوتا تھا۔ تمام عالم مساوات کا مکمل نمونہ تھا۔

پھر ایک زمانہ آیا کہ کھیتی اور بیوپار کے بعد چاکری بھی ایسا شیوۂ زندگی قرار پایا جو بھیک کے سوائے سب سے بدتر مانا گیا۔ اب بھی یہ ایک وطیرۂ مذموم ہی رہا۔ اس قدر مذموم کہ عمر خیام کی رائے میں دو دن میں ایک روٹی اور ایک کوزہ بھر ٹھنڈا پانی میسر آجانا اپنے جیسے دوسرے انسان کی خدمت کرنے سے بدرجہا افضل تھا

یک ناں بدو روز گر شود حاصلِ مرد ۔۔۔ وز کوزۂ بشکستہ دمے آبے سرد

مامورِ دگر کسے چرا باید بُود ۔۔۔ یا۔ خدمتِ چوں خودے چرا باید کرد؟

اب زمانہ آتا ہے کہ غلامی آزادی سے بہتر اور ملازمت دنیا بھر کے مشاغل سے افضل قرار پاتی ہے۔ تجارت کمتر اور زراعت زیادہ تر محض جاہل یا نیم تعلیم یافتہ طبقہ کا شیوۂ حیات بن جاتے ہیں۔ ملازمت اس درجہ چوٹی کی خوبی مانی جاتی ہے کہ تعلیم کا مقصدِ انتہائی، تربیت کا مقصدِ آخری، بلکہ حیات کا مقصدِ واحد نظر آتی ہے۔ انسان پڑھتا ہے تو ملازمت کی خاطر، نیک اطوار بنتا ہے تو ملازمت کی خاطر، عبادت کرتا ہے ملازمت کی خاطر، اور جیتا ہے تو ملازمت کی خاطر۔ سُنتے آئے تھے کہ بھیروں کی راگنی ایک ایسی راگنی ہے جو صبح کے علاوہ اور اوقات بھی کانوں کو بھلی معلوم ہوتی ہے، مگر اب دیکھتے ہیں کہ چاکری کی دُھن، سوہنی سے لے کر بھیروں تک اور ملہار سے کر کجری تک، ہر راگنی پر ہر وقت و موسم میں غالب آجاتی ہے۔

(۴) چند دیگر عادات کا تغیر مجملاً ملاحظہ کیجئے:-

انسان پہلے جینے کی خاطر کھاتا تھا، اب کھانے کی خاطر جیتا ہے؛ پہلے مذہب کی خاطر لڑتا تھا اب لڑنے

کی خاطر مذہب اختیار کرتا ہے، پہلے انسانی آبادی کی خاطر حیوانات کا استیصال کرتا تھا، اب حیوانات کی خاطر انسانی آبادی کا قلع قمع کرتا ہے۔

اس موقع پر احتمال پیدا ہوتا ہے کہ آپ امثالِ مذکورہ سے یہ نہ تصور کرلیں کہ ایک چیز کا نیک سے بد ہو جانا ایک عرصۂ دراز کے تغیر پر منحصر ہے ـــ دراصل ایسا نہیں ہے۔ انقلابِ احتیاج -یا- تغیرِ میلانِ طبع کسی مدت کا محتاج نہیں، یہ تبدیلی فی الفور بھی صورت پذیر ہوتا ہے اور فی الفور بھی ـــ گردشِ ایام کے ساتھ ساتھ بھی پیدا ہوتا ہے اور حالاتِ گردوپیش کے اعتبار سے بھی۔

مثالاً:ـــ راست گوئی -یا- دروغ بافی ایک ایسا فعل ہے جو ایک ہی زمانہ میں محض حالاتِ گردوپیش کے اعتبار سے عیب بھی ہے اور ثواب بھی۔ راستی اگر عبادت کی شان ہے تو دروغ فنونِ لطیفہ کی جان ہے۔ راستی دہقان کی جھونپڑی اور خدا کے گھر میں نیکی ہو، مگر محفلِ مشاعرہ اور مجلسِ مباحثہ میں بدی ہے؛ دروغ غلامی کی حالت اور نزع کی کیفیت میں عیب ہو، مگر ایوانِ سلطنت اور عدالت کے کمرے میں خوبی ہے۔

اسی طرح:ـــ چہل قدمی ـــــــ جوان آدمی کے لئے حماقت ہے اور سن رسیدہ کے لئے ضرورت؛
فاقہ ـــــــ مفلس کے لئے مصیبت آمیز ہے اور متمول کے لئے صحت انگیز؛
کوششِ اتحاد ـــــــ شملہ کی بلندی پر عیب، جنوبی ہند کی سطح پر خوبی، اور پنجاب کی حدود میں گناہِ عظیم ہے!!

نظریۂ نیک و بد کی تشریح و توضیح کے بعد استدلال کی تکمیل محض اس جملہ سی ہو جاتی ہے کہ "خانہ جنگی" بھی گردشِ ایام کے تحت میں -یا- تغیرِ گردوپیش کے اعتبار سے، عیب کے بجائے خوبی بن جانے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

+ + + + + +

محض تجرباتِ انسانی کی بنا پر موازنہ کیجئے:ـــ

بظاہر اس استدلال میں اہمیت نظر آتی ہے کہ "خانہ جنگی" کو دنیا ہمیشہ سے نقصان رساں سمجھتی آتی ہے اس لئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ انسان نے ہمیشہ اس کو مضرت رساں ہی پایا ـــ مگر بباطن یہ استدلال محض نمائشی ہے واقعہ یہ ہے کہ انسان کے تمام معقولات کی بنا اُس کے تجربہ پر نہیں ہوتی -اکثر کی بنیاد محض ہوا پر ہوتی ہے وہ معقولات جو دراصل تجربہ کی بدولت وجود میں آتے ہیں ہمیشہ عمل کے موافق ہوتے ہیں -اور حیوانی ہوتے ہیں؛ جن کو تجربہ سے تعلق نہیں ہوتا وہ عمل سے متناقض ہوتے ہیں -اور انسانی ہوتے ہیں۔

اس اجمال کی تفصیل میں چند اقوال و افعال کا مقابلہ کیجئے:۔

انسان کہتا ہے کہ "زندگی کا دار مدار پانی پر ہے"۔ یا "آگ جلا دیتی ہے"۔ چنانچہ وہ ہمیشہ پانی کو استعمال کرتا ہے اور آگ سے بچتا ہے۔ کوئی زمانہ ایسا نہیں بتایا جا سکتا جب انسان نے پانی کا استعمال ترک کر دیا ہو۔ یا۔ اپنے جسم کو آگ سے محفوظ نہ رکھا ہو۔ ایسے مقولات تجربہ کی بنا پر وجود میں آتے ہیں اس لئے انسان اُن کے خلاف کبھی عمل پیرا نہیں ہو سکتا۔ غور کیجئے تو حیوان کو بھی آگ اور پانی کی بابت یہی علم ہے اور وہ بھی پانی کو استعمال میں لانے اور آگ سے محفوظ رہنے پر کاربند ہے۔ اس قسم کے مقولات کا علم انسان و حیوان میں مشترک نظر آتا ہے اس لئے وہ کرشمۂ انسانیت نہیں مانے جا سکتے، بلکہ دراصل حیوانی ہیں۔

دوسری قسم کے اقوال ہیں، انسان ہمیشہ سے کہتا آتا ہے کہ "جھوٹ بولنا بُرا فعل ہے" مگر ہمیشہ سے خلوت و جلوت میں جھوٹ بولتا آتا ہے۔ یا۔ انسان ہمیشہ مانتا رہا ہے کہ شراب نوشی نہایت مضر حرکت ہے مگر ہمیشہ ہے آشامی پر عامل رہا ہے۔ ایسے مقولات پر عمل نہ کر سکنے سے ترشح ہوتا ہے کہ اُن کی بنا تجربۂ انسانی پر نہیں ہے؛ اگر یہ تجربہ پر مبنی ہوتے تو انسان اُن کے برعکس عمل کرنے کی جرات تک نہ کر سکتا۔ غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ ایسے مقولات کو حیوان سے کوئی تعلق نہیں اور وہ محض انسان کا طرۂ امتیاز ہیں۔ لہذا انسانی ہیں۔

اسی طرح انسان ہمیشہ کہتا رہا کہ "خانہ جنگی مضر ہے" مگر ہمیشہ خانہ جنگی پر عامل رہا ہے۔ گویا اس مقولہ کو فعل سے برعکس ہونے کی وجہ سے تجربہ پر مبنی نہیں کہا جا سکتا۔ بلکہ یہ بھی ایک ایسا انسانی مقولہ ہے جس کو عمل سے بہت کم تعلق ہے۔ ایسے مقولات محض انسانی غلط فہمی و غلط بیانی پر روشنی ڈالتے ہیں:

غلطیہائے مضامیں مت پوچھ　　لوگ نالہ کو رسا باندھتے ہیں!

+ + + + + +

انسانی غلط فہمی و غلط کاری کے لحاظ سے مجھے ایک واقعہ یاد آ جاتا ہے جو بجائے خود وقیع نہ ہو مگر برمحل ضرور ہے۔ مضمون کی طوالت کا خیال بھی اُس کے بیان کر دینے کی خواہش پر غالب نہیں آتا اور میں اُس کو دُھرانے پر اتر تا ہوں:۔

حدیثِ دلکش و افسانہ از افسانہ می خیزد
دگر از سر گرفتم قصۂ زلفِ پریشاں را

ایک روز شام کے وقت، تمام دن قیصرِ ہند اور ملزم کے تنازعات میں سر مار چکنے کے بعد، میں اپنے بنگلہ

کے سامنے والے چبوترے پر، آرام کرسی پر دراز، حقہ سے لطف حاصل کرنے میں مصروف تھا اور سوچ رہا تھا کہ چاروں طرف نظر آنے والے بلند درخت بھی اگر جاندار سمجھ لئے جائیں تو یہ ایک ایسی مخلوق قرار پائے گی جو یک پایہ ہے۔ کہ۔ ایک صاحب مع اپنے پنج سالہ صاحبزادہ کے دفعتاً نازل ہوئے اور ایک کرسی آگے بڑھا کر جلوہ افروز ہو گئے۔ مجھے اپنے مشغلۂ تخیل سے بادلِ ناخواستہ دست کش ہونا پڑا اور اُن کی مہمل گفتگو میں وقت ضائع کرنا پڑا۔ اُن کی گفتگو کا شباب تھا کہ آندھی آگئی اور ہم سب کو پُوری عزت کے ساتھ برآمدہ میں پسپا ہونا پڑا۔ میں نے دیکھا کہ بچہ اپنی پھول سی ٹوپی کو حملۂ باد سے بچانے میں مصروف تھا اور ہوا کا ہر جھکّڑ ٹوپی اڑا لے جانے میں زور آزمائی کر رہا تھا۔ بالآخر اس کوششِ مسلسل سے عاجز آکر بچے نے اپنے بزرگوار سے کہا "ابا یہ ہوا نہیں مانتی"

"لاؤ ٹوپی مجھے دے دو" بزرگوار نے جواب دیا

جس قدر سوال کا بھولا پن مزہ دار تھا اُسی قدر جواب کا خرانٹ پن قابلِ تنفّر تھا۔ سادہ لوح بچے نے محض ہوا کی دست درازی کی شکایت کی تھی اور ٹوپی کے متعلق کسی امداد کی خواہش نہیں کی تھی۔ مگر۔ گرگِ باراں دیدہ نے ہوا کا معاملہ قطعی نظر انداز کر دیا اور ٹوپی کو اپنی نگرانی میں لے لینے کا مسئلہ چھیڑ دیا۔ مجھے اس سوال و جواب میں وہی لطف آرہا تھا جو ایک معاملہ فہم کو دو مختلف ممالک کے باہمی نامہ و پیام میں آتا ہے۔ بچے کا ننھا سا دل اپنی ٹوپی سے دست بردار ہونے پر مائل نہیں ہُوا۔ تاہم۔ ہوا سے پریشان ہو کر اب اُس نے مجھ سے خطاب کیا "تم ہوا کو یہاں کیوں چلنے دیتے ہو؟"

"ہوا کو روکنا مجھے نہیں آتا" میں نے اُس کی بساط کے موافق جواب دیا۔

"ان درختوں کو ہٹا دو۔ پھر ہوا نہیں چلے گی۔" اُس نے بے ساختہ تدبیر بتائی۔

وہ آندھی اتر گئی، وہ صحبت گذر گئی۔ مگر۔ اُس معصوم ہستی کی بظاہر لائقِ تبسم تدبیر میرے حافظہ میں باقی رہ گئی۔ مَیں نے بارہا اُس پر غور کیا اور ہر مرتبہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ دنیا کے تمام ذی فہم مدبّر اور طاقتور حکمران اسی تدبیر پر کاربند نظر آتے ہیں۔

ہوا اور درخت کے مسئلہ میں، درخت اُس جزو کو ظاہر کرتے ہیں جو مرئی ہے اور ہوا اُس کو جو غیر مرئی ہے۔ ہوا ایک نظر نہ آنے والی قوت ہے جو چلتی ہے اور درخت مادی شے ہے جس پر اس قوت کا اثر ہوتا ہے۔ ہوا بمنزلہ مذہب فلسفہ اور انقلاب کے ہے اور درخت بمنزلہ شہر، معاشرت اور انسان کے ہیں۔ ہوا کا اثر درختوں پر ہوتا ہے اور انقلاب کا اثر انسانوں پر۔ آپ نہ ہوا کو دیکھ سکتے ہیں نہ فی نفسہٖ انقلاب کو۔ درختوں کی جنبش، گرد و غبار کی سرگردانی

ابر کے ٹکڑوں کی دوڑ، یہ سب ہوا کے کرشمے ہیں، بذاتِ خود ہوا نہیں ہیں ـ اسی طرح ـ بازاروں کی ہڑتال، پولٹیکل جلسوں کی بھرمار، اخباروں کی زبان درازی، اور شہروں کی شورش؛ سب انقلاب کے نتائج ہیں، فی نفسہٖ انقلاب نہیں ہیں۔ مشاہدہ کرنے والا نظر آنے والے نتائج سے نظر نہ آنے والے اسباب پر رائے لگا دیتا ہے۔

ہر انقلاب وشورش کے موقع پر ایسے بھاری بھرکم افراد کا استیصال کیا جاتا ہے جو انقلاب وشورش سے زیادہ متاثر نظر آتے ہیں ـ اور اس اعتماد پر کیا جاتا ہے کہ اُن کے استیصال سے انقلاب وشورش رفع ہو جائے گی ـ گویا ـ آندھی کے موقع پر بڑے بڑے درخت، جو زیادہ ہلتے ہوں، اِس امید پر کاٹ ڈالے جائیں کہ آندھی جاتی رہے گی۔ ان دونوں تدابیر میں بظاہر کوئی فرق نہیں معلوم ہوتا اور اس اعتبار سے میں اُس کم سن بچّے کی تدبیر اور مدبرینِ ملک کے عمل کو یکساں طور پر غلط فہمی پر مبنی پاتا ہوں۔

\+ \+ \+ \+ \+ \+

سب کے آخر میں، خانہ جنگی کی خوبیاں قابلِ غور ہیں:-

خانہ جنگی کی برکات کے لحاظ سے، چوٹی کی خوبی گھر کی رونق ہے جس گھر میں رونق نہ ہو اُس کو بقولِ مرزا مرحوم دشت سمجھنا چاہیئے ـ فرماتے ہیں:-

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

گھر کا لازمی عنصر رونق ہے، اور رونق کا انحصار گھر کی سجاوٹ پر نہیں ہے بلکہ گھر والوں کی چہل پہل پر، بات چیت پر، شور وغوغا پر ہے۔ سچ فرمایا ہے کہ "ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق" اور ہنگامہ کے لئے خانہ جنگی اسی قدر ضروری ہے جس قدر اتحاد کے لئے سائمن کمیشن ـ یا ـ خوفِ عاقبت کے لئے طاعون!!

کبوتروں کی کابک نما خانہ سے لے کر انسان کے وسیع مسکن تک، ہر جگہ خانہ جنگی کا امکان ہے خانہ جنگی کی برکات بھی خانہ کے حدودِ اربعہ کی ماتحت ہیں ـ یعنی ـ جس قدر خانہ کی حدود وسیع ہونگی اُسی قدر خانہ جنگی کی برکات زیادہ ہونگی۔ جس گھر کی چار دیواری محض میاں بیوی کے دو نفوس پر مبنی ہو اُس کی خانہ جنگی بھی چولہے اور پلنگ تک محدود ہوگی؛ اگر ان دو نفوس میں صرف ایک ساس کا وجود اضافہ کر دیا جائے تو خانہ جنگی کی لطافت بھی المضاعف ہو جائے گی۔ اسی طرح اگر خانہ کے حدودِ اربعہ ایک صوبہ یا ملک تک وسیع کر دیئے جائیں تو اُس کی رونق کے اسباب بھی ہنگامہ سے متجاوز ہو کر بلوہ تک پہنچ جائیں گے۔

ملکی خانہ جنگی کے زیرِ فیض۔ ہزاروں بیکاروں کو کار، فاقہ مستوں کو اُدھار، ایڈیٹروں کو موادِ اخبار، اور گرگھنٹالو دعقیدت مندوں کی فوجِ بے شمار "میسّر" آجائے گی؛ بلکہ راجہ سے پرجا تک، ہر ایک کو علیٰ قدرِ مراتب خانہ جنگی کی برکات سے مستفید ہونے کا موقع مل جائے گا۔

خانہ جنگی میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو سبزی خور کو دہی میں اور گوشت خور کو نمک مرچ میں نظر آتی ہیں تمام فرادِ کاربند سے مادۂ فاسدہ خارج ہو کر ہستی کا جوہر باقی رہ جاتا ہے اور خطرۂ اجل سے نجات مل جاتی ہے ـــــ

تنم از ضعف چناں شد کہ اجل جست و نیافت

نالہ ہر چند نشاں داد کہ در پیرہن ست

\+ + + + + +

کسی نقطۂ نظر سے غور کیجیے۔ خانہ جنگی سے زیادہ مفید، افتدار انگیز، محکوم ملک کے لئے موزوں، اور موجودہ آب و ہوا کے موافق، کوئی دوسرا فعل نظر نہیں آتا۔ اطمینان صرف اس سے ہوتا ہے کہ بفضلہ ہمارے ملک کے تعلیم یافتہ طبقہ نے عموماً اور ملازمت و وکالت پیشہ افراد نے خصوصاً، اس کی برکات کو پوری طرح ذہن نشین کرلیا ہے۔

یقین مانئے آپ ایک عدد حسین بیوی اپنے ساتھ نتھی کر کے عیش و آرام نہیں پا سکتے۔ البتہ ـ عیش و آرام پاکر ایک درجن بیویاں وجود میں لا سکتے ہیں۔

اسی طرح

آپ اتحاد کے ذریعہ سے انقلاب تک نہیں پہنچ سکتے۔ البتہ۔ انقلاب کے توسل سے اتحاد پا سکتے ہیں!!

از یک حدیثِ لطف کہ آں ہم دروغ بود

امشب ز دفترِ گلہ صد باب شستہ ایم

سلطان حیدر

(جوش)

متین و شریر

لڑکے دو تھے عزیز اور شبیر　　ایک ان میں متین ایک شریر
جو متین تھا شریر سے بولا　　بات کو تو نے کب کہیں تولا
جی میں جو آئی بس وہ کہہ ڈالی　　بات کڑوی یا میٹھی سی گالی
گالیاں یوں ہیں تیری پھلجھڑیاں　　باتیں بھی موتیوں کی ہیں لڑیاں
بزم میں جس گھڑی تو جاتا ہے　　نت نیا رنگ تو دکھاتا ہے
تو ہے شیدائی "نسائیت"　　تو ہے دلدادہ "شبابیت"
بوڑھا ہونے کو آیا اور ہے جواں　　تیری فطرت جواں ترا شیطاں
تو وہ اضداد کا ہے مجموعہ　　خاک میں رہ کے ہے فلک پیما
کھیلتا بھی ہے سوچتا بھی ہے　　چھوڑتا بھی دبوچتا بھی ہے
گھورتا بھی ہے مسکراتا بھی　　چار سنتا بھی دو سناتا بھی
میں نے مانا تو محفل آرا ہے　　میں نے مانا تو سب کو پیارا ہے
لیکن اتنا بھی لاڈ کیا کرنا　　ہر بھلی شے پہ دوہی جان مرنا
اُس کو دو دن میں بھول جانا پھر　　اپنی خوشبو پہ پھول جانا پھر
پھر وہ ندرت طرازیاں اپنی　　پھر وہ جدت نوازیاں اپنی
باوفا چاہیے رہے انساں　　راہِ نیکی میں دکھ سہے انساں

ہو چکی جب متین کی تقریر　　پُر متانت ہوا وہ تھا جو شریر
اور کہنے لگا کہ بھائی جان　　تم نے مجھ پر کیا بڑا احسان
مجھ کو گو سب برائیاں دے دیں　　کلفتیں میری اپنے سر لے لیں
واہ قرباں تمہاری الفت کے　　واہ احساں تمہاری الفت کے
عمر بالی یہ اور یہ فہمِ رسا　　بڈھے کھوسٹ ابھی سے نامِ خدا
تم بلا ریب حق سے ہو آگاہ　　واہ وا خوب ہے تمہ
تم جو روئے تو رو پڑا حق بھی　　تم کو سنتا ہے لو کھڑا
خود خدا کو سبق سکھایا ہے　　نور کیا ہے تمہارا
ڈھونڈتے ہو خوشی کو در در کر　　میں تو پاؤں گا جو
جھٹکے رہنا مجھے نہیں منظور　　دور سے دیکھتا ہوا
ہے اگر بے نیاز اللہ میاں　　کیوں سراپا نیا
خیر و دانش میں کیوں رہیں ناشاد　　کیوں نہ ہر بند سے ہو
کیوں نہ غم میں بھی مسکرائیں ہم　　کیوں نہ ہر شے کو بھول
مسکرانا ہی زندگانی ہے　　بھول جانا ہی زندگ
خیر و شر پر غم و مشقت پر　　غفلتوں پر خمارِ عشر
پارسا ناک بھوں چڑھاتے ہیں　　جو ہیں عاقل وہ مسکرا
دنیا میدان ہے شرارت کا　　حق یہ احسان ہے شر
گر شرارت نہ ہوتی شیطاں کی　　دنیا بنتی کبھی نہ ان
ہوتا باطل نہ آشکارا گر　　کارنامے نہ حق کے
کچھ برائی نہیں بری اتنی　　تم کو معلوم ہوتی
نیک بننا ہے گر تو نیک بنو　　نیک بن کر مگر نہ ا
تم کو دینی ہے گر بشارت ہی　　ہو بشارت میں کچھ شر
کچھ مری بھی سنو تو بھائی متین　　نام کے باغبان نہ
پھول اگاؤ نہ پھول توڑو تم　　حق یہ پھولوں کو اپنے
باغِ دنیا کے باغباں نہ بنو　　پھول پتوں کے پاس
پھول سنگھنی کی طرح سونگھو سونگھاؤ　　اپنے تن من کو خوشبو دا

مدلین

نسریو

CALCUTTA ART PG. WORKS, LAHORE.

سمندر کی چڑیاں

سمندر

سمندر، سمندر، شان دار بیکراں سمندر! نمی، تری، خشکی سے دُور، خشک مزاجی سے دُور، گویا سمندر دُنیا و مافیہا سے دُور کوئی اَور دُنیا!

دُھواں نہیں، گرد و غبار نہیں، پاکیزگی، لطافت، نزاکت ـــ "اک نزہت گاہِ اُنس"! ایک کشتی بادبانی اور اُس میں دو صورتیں، دو انسانی صورتیں، سکون و محنت کی مورتیں! اُدھر، اُوپر، دائیں بائیں ہر طرف، سمندر کی چڑیاں لہروں سے کھیلتی ہوئی، پانی کی لہروں سے، ہوا کی لہروں سے، سمندر کی گوری گوری چڑیاں! لہریں ملتے جلتے پانیوں کی، ہلکی پھلکی ہواؤں کی، لہریں کھیلتی ہوئی سمندر کی اِنہیں گوری گوری چڑیوں سے!

چڑیاں ہواؤں سے اور ہوائیں لہروں سے، لہریں کشتی سے اور کشتی انسان سے اٹھکیلیاں کرتی، لجاتی شرماتی کتراتی پر ساتھ ہی ساتھ وہ اِس پر اور یہ اُس پر لپکتی اِتراتی پھڑپھڑاتی! اِک دوسرے سے الگ تھلگ؟ اِک دوسرے سے دست و گریباں؟ نہیں نہیں! اِک دوسرے کا ساتھ چولی دامن کا جسم و جان کا روح و رواں کا! چڑیاں چاہتی ہیں ہوائیں ہو جائیں، ہوائیں چاہتی ہیں لہریں بن جائیں، بادبان ہواؤں کا دم بھرتے ہیں اور لہراتے ہیں، انسان نازک لہروں کے نرم تھپیڑے کھاتے ہیں اور اُٹھتی گرتی کشتی کے ابھار گراؤ میں زندگی کا اتار چڑھاؤ بھولے ہوئے ہیں!

ب ا

غریبوں کی سیل

ساون کا مہینہ۔ بلا کا حبس۔ کلّو کو دھیانگی اٹھانے کی تلا توپ پڑی۔ پندرہ دن کا میلا چُوہا کُرتا۔ پسینے میں شور بشور۔ گریبان کھلا۔ بازوؤں تک استینیں بتّی ہوئی چڑھیں۔ ننگے سر۔ جُوڑا بندھا۔ آڑا گلابی پیجامہ۔ مارے پسینے کے جگہ جگہ دھبے پڑے۔ موریاں کہیں۔ گھیر کہیں۔ پنڈلیوں پہ کی نیچے کی سیون گھوم کے اوپر آئی۔ کان میں کندلے کی ایک ایک بالی جس میں سوکھے پھول مولسری کے بھرے۔ خیلہ خبطنوں کی سی وضع۔ کارخانے پہ بیٹھی۔ سامنے بادلے کے تار تنے۔ جھپا جھپ جھپا جھپ ہاتھ چل رہا۔ اور دونوں پاوؤں کے انگوٹھے باری باری سے اوپر نیچے ہوتے جاتے۔ جیسے بھی ہو چراغوں جلے تک ٹھپّے کا نھان اتار لے۔ کہ اِتّے میں کھڑکی والی ہمسائی نے کوٹھے پہ سے آواز لگائی دوئی بوا اسد رحمت! بھلا یہ بھی کوئی کام کا وخت ہے؟ اے چنّو کی اماں! رجّو کی خالا! بوا آشیا! بھابی خُتیجہ! بھُوری! بنّو! نجّو! اے شادو! دوئی لڑکیوں تم کدھر سب کی سب گھس گیّاں؟ اے ذرا باہر نکلو دیکھو تو کیسی اندھیری دے کے آئی ہے۔ کیا دھواں دھار اُٹھی ہے جدھی تو یہ قیامت کی گھُمس تھی۔ پرسوں مُنّن۔ چُنّی۔ شجّی۔ مُغلو۔ بُندو۔ گھسیٹا۔ رکھا غنی مولبی ساب والا کالا منہ کالے ہاتھ کر کے "کالے ڈُنڈے پیلے ڈُنڈے برسیگا برسا دیگا۔ کوڑی سیر لگا دے گا۔ کوڑی گئی ریت میں پانی گیا کھیت میں" کہتے گھر گھر ڈیپے کی دیغ کے لئے دام اکٹھے کرتے پڑے پھرے۔ نانی حجّن۔ دادی شبّو۔ خالا خیرن۔ کنوئیں پہ جا کے روئیں۔ اللہ دی۔ جگنی۔ رحمت۔ فخری۔ بلّو نے پنالے لیپے۔ "اللہ میاں ہم لیپیں تم بہا دو" اِن کنواری بالیوں کی بھی سنوائی نہ ہوئی۔ کیسی کالی بھونرالی گھٹا اٹھی۔ لیکن آندھی بھی وہ کالی آئی کہ بادلوں کو اڑا جانے کہاں کی کہاں لے گئی۔ بہتیر ابچیوں نے غل مچایا "آندھی بیوی کے دامن سے باندھی" سل تلے جھاڑو بھی دبائی لیکن بادل کائی کی طرح پھٹ گئے۔ آج میں نے دھوپ میں ساری دوپہر کھڑے رہ کے کاٹی۔ اے اللہ تیرے صدقے جاؤں میری منہ نہیں جو میاں میرے تیری تعریف کر سکوں۔ کیا اپنی بندی کی بات رکھی ہے۔ کھڑکی والی ہمسائی اپنے آپ ہی آپ باتیں کرتیں اور چیختی رہیں۔ محلّے کی بڑی بوڑھیاں لڑکیاں بالیاں اُن کی آواز سُن دلانوں میں سے نکل انگنائیوں میں آ کھڑی ہوئیاں۔ کوئی جھپ سے چرپائی دیوار سے لگا۔ اُدوان پہ ایک پیر ٹکا۔ جالی پر پہنچے جا بیٹھی

پکڑ۔ پلنگ پہ پاؤں رکھ۔ منڈیر پہ سے چڑھ۔ چھجے کو لٹک جھٹ دینی چھت پہ جا پہنچی۔ کوئی بڑھ بڑھ کر تی سیڑھیوں پر سے چڑھ۔ دبی دبی کوٹھے پہ جا کودی۔ بچے بالے کُلبل کُلبل کر نکل پڑے۔ اُچھل رہے ہیں۔ کود رہے ہیں۔ غل ہے کہ اللہ میاں مینہ برسا دو کوڑی سیر لگا دو۔ گھٹا نے لٹیں بکھیر دیں۔ وہ پانی میں بھیگی بھیگی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا آئی اور ایسی سوندی سوندی خشبو کہ دل کے کنول کھل گئے۔ ساتھ ہی پٹ پٹ موٹی موٹی بوندیں پڑ۔ سوتل دھار اوپر دھار۔ دھوشالی مینہ برسا کہ اب برس کے پھر نہ برسے اور پڑ کے پھر نہ کھلے۔ پرنالے پڑے دھائیں دھائیں چھوٹیں۔ راہ چلتے جہاں ذرا آسرا دیکھیں جا کھڑے ہوں۔ کہ بھیگنے سے بچ جائیں۔ چھتوں۔ پھاٹکوں میں ٹھٹ کے ٹھٹ لگ گئے۔ چھجوں کے نیچے غول کے غول کھڑے ہو گئے۔ باہر مردوں کے یہ حال۔ یہ گھروں میں مہلی کی جائیاں انگنائیوں میں اور پرنالوں تلے۔ کھڑی ہو کے نہائیں اور ایک دوسرے پر کیچڑ اُچھالی۔ موریاں بند کر پانی روک چھپ چھپیا کی۔ ایک ایک کو پکڑ کے انگنائی میں خوب لٹایا۔ جب اس شہدپن اور دھینگا مشتی سے تھک کے بلکان ہو گئیں۔ شربت کے لوٹے ڈال پاک ہو۔ صاف ستھرے کپڑے پہن۔ دالان دالانوں میں جا بیٹھیں۔ چھت کی کڑیوں بلیوں۔ قلابوں میں جھولے پڑے۔ کوئی تکیہ رکھ کوئی پٹڑی۔ انپہ جا ٹنگیں۔ نہنی نیدانوں سے گانا شروع کیا۔

”کوئی بندا چاولوں لائیو رے دال ہے مسور کی“۔

گوری دھن کا بیجنا ہریالا ساون آیا ری۔ گوری دھن کا بیجنا۔ میری بھابو پکا ئے پوریاں میرا بھیا ئے لے بھاگے ری۔ گوری دھن کا بیجنا ہریالا ساون آیا ری“

”نیم کی بنولی پکی ساون کا دن آوے گا جیوے میری ماں کا جایا ڈولی بھیج منگا ئے گا“

”ماں آڑو جامن گھلے دھرے۔ ماں میں نئیں کھاتی میری ماں۔ ماں کپڑوں کی بقچی کھلی دھری۔ ماں میں نئیں پہنتی میری ماں۔ ماں تتا پانی گرم دھرا۔ ماں میں نئیں نہاتی میری ماں۔ ماں مسّی کی ڈبیا کھلی دھری۔ ماں میں نئیں ملتی میری ماں۔ ماں سرمے دانی کھلی دھری۔ ماں میں نئیں لگاتی میری ماں۔ ماں ساجن آئے لینے کو۔ ماں میں نئیں جاتی میری ماں“

”ماں ایک کریلا میں بویا۔ ماں بھابوے کیو توڑے نا۔ جو توڑے چکو چار کریلا میں بویا“

”جمنا پہ چھائے رہی کالی گھٹا۔ کالی گھٹا بھونرالی گھٹا۔ جمنا پہ چھائے رہی کالی گھٹا“

”اماں میرے بھائی کو بھیجو جی کہ ساون آیا۔ اے بیٹی تیرا بھائی تو بالا ری کہ ساون آیا۔ اماں میرے باوا کو بھیجو ری

[illegible]

گہ ساون آیا"

"ساون میں میں نئیں جاتیاں ۔ ساون میں میں نئیں جاتیاں"

کسی نے پورا گیت گایا۔ کسی نے ادھورا چھوڑا۔ کسی نے چین کی۔ کسی نے پیں۔ غرض سب نے مل کر وہ چیاؤں پیاؤں مچائی کہ کان پڑی آواز نہ سنائی دے۔ انہیں دیکھ جان جوانوں کو بھی گانے کی پھڑک اٹھی۔ بچیوں کو ا تار خود جا بیٹھیں۔ چھوٹے چھوٹے جھونٹے لے لے گانا شروع کیا۔

"آئی اندھیری رات۔ رے میں بھیجی جاؤں۔ کہاں سکھاؤں سرخ چندریا کہاں سکھاؤں لمبی پاگ رے میں بھیگی جاؤں۔ کوٹھے سکھاؤں سرخ چندریا چھجے سکھاؤں لمبی پاگ رے میں بھیگی جاؤں"

"ساونوناں میں مہندی مورے سیّاں کن بوئی۔ ارے کن بوئی رے مہاراج۔ ساونوناں میں مہندی مورے سیّاں کن بوئی۔ ناگھر سیّاں ناگھر دیورا۔ ناگھر سیّاں ناگھر دیورا۔ کس پہ رچاؤں دونوں ہاتھ۔ ساونوناں میں مہندی میرے سیّاں کن بوئی"

"مہاراجہ کیوڑیاں کھولو رس کی بوندیں پڑیں۔ تم کھولو کیوڑیاں میری جان رس کی بوندیں پڑیں۔ اونچی اٹریاں چندن کیوڑیاں۔ تیری ناجو کھڑی ہے۔ شرابور رس کی بوندیں پڑیں۔ ہری ہری چوڑیاں۔ گوری گوری بیّاں۔ توری بیّاں سجن کے ہاتھ رس کی بوندیں پڑیں۔ مہاراجہ کیوڑیاں کھولو"

"سنوسکھی سیّاں جوگیا ہو گئے۔ سنوسکھی سیّاں جوگیا ہو گئے۔ میں جوگن نہ رہے ساتھ سنوسکھی سیّاں جوگیا ہو گئے جوگیا نے چھائی جنگل جھونپڑی۔ جوگیا نے چھائی جنگل جھونپڑی۔ اور جوگن نے چھایا ہے بدیس۔ سنوسکھی سیّاں جوگیا ہو گئے۔ جوگیا بجاوے بین اور بانسلی اور جوگن گاوے ہے ملار۔ سنوسکھی سیّاں جوگیا ہو گئے۔ جوگیا رنگائے لال لال کاپڑے اور جوگن کے لمبے لمبے کیس سنوسکھی سیّاں جوگیا ہو گئے۔ ندیوں نے چھوڑا ہے قرار۔ سنوسکھی سیّاں جوگیا ہو گئے۔ سنوسکھی سیّاں"

"جھولا کن ڈالو رے امریاں۔ جھولا کن ڈالو رے امریاں۔ ایک تو میں جھولوں دوجے مورا سیّاں۔ جھولا کن ڈالو رے امریاں"........

یہ گانا ہی شروع ہوا تھا کہ ایک بولی ودئی! یہ بھی کوئی برسات کا مزا ہے؟ گانا ہے تو قطب صاحب چلو واں لاٹھ ہے۔ پھسلنا پتھر ہے۔ بھیم کی چھٹنکی ہے۔ شمسی تالاب ہے۔ جھرنا ہے۔ امریاں ہیں۔ پارے کا تلاب ہے۔ اندھیریا باغ ہے۔ یاں سے واں تک جنگل ہی جنگل اور درخت ہی درخت ہیں۔ رسیاں پٹڑیاں ساتھ لے چلیں گے۔ کھانے پینے کا سامان لے لیں گے۔ کڑھائی چڑھے گی۔ پکوان ہو گا۔ گرم گرم گلگلے پھلکیاں اترتے جائیں۔ گاتے جائیں۔ کھاتے جائیں۔

پھر لطف آئے۔ آٹھ آٹھ آنے سب مل کے پتّی ڈالو۔ بھلی کرائے پہ کرو۔ بھائی شرفو کو ساتھ لیں گے۔ وہی اس گوں کے ہیں۔ بچارے اللہ کا جی۔ کچھ بھی کرو انہیں خبر نہیں۔ کہنے کو مرد کی صورت ساتھ ہونگے۔ ان سے رہنا بھی کھلا ہوا ہے۔ خالہ لطیفن کے میاں چلے۔ تو وہ بُوا تعبیہ بٹھاتے ہیں۔ انہیں پرچھائیں میں غیر مرد نظر آتے ہیں۔ یوں ہی رنگ میں بھنگ ہوگی۔ وہ کام کے نہیں۔ ایک بولی بوا کلّو کو پکڑ کر لاؤ۔ وہ آج خوب کارخانے پہ چپک کے بیٹھی ہیں۔ دوسری نے ایک آواز لگائی۔ خالہ ناآؤ تو اِس بندی کا حلوا کھاؤ۔ کلّو نے جواب دیا۔ اُچھال چھکّاؤں! اچھے حلوے مانڈے کھلائے۔ مستانیوں کو فکر ہی کیا ہے۔ ساون کے اندھے کو ہرا ہی ہرا سوجھتا ہے جیسے نفافتیاں خود نقاشی گھوڑیاں۔ بے ناتھ کے بیل ہیں۔ سب کو ویسا ہی سمجھ رکھا ہے۔" "اچھا دیکھو خالا! اتّی باتیں سنالیں تمہارے صدقے جاؤں اب اٹھ آؤ۔ میری کلیجے کی ٹکڑی خالا! میں تیرے قربان گئی تھی۔ میٹھے دیدوں کی قسم جو تمہاری دھیانگی میں اٹھوادوں گی۔" ایک نے اتنی باتیں ہی کی تھیں کہ دوسری جھٹ کھڑکی میں سے گھس کلّو کے گھر میں جا پہنچی اور پھر تو ایک کے پیچھے ایک ہو۔ دس پانچ مل۔ کلّو کو کارخانے پہ سے اٹھا ہی لائیں۔ اور کہا "خالا! تمہاری اٹھنّی برکت کی ہوگی۔ پہل تمہاری طرف سے ہو۔" کلّو نے کہا "چلو خنّاماؤں! باؤلیاں ہوئی ہو۔ اٹھنّیاں درختوں میں سے جھڑ رہی ہیں یا آج اسمان پہ سے برسی ہیں۔ یا فرنگیوں کی نیت درست ہوگئی۔ جو پیسے کی ریل پیل ہو۔ اٹھنّی تو اٹھنّی یاں آٹھ کوڑیاں بھی نہیں۔ نئیں بوانئیں! میرے پاس پھوٹی کوڑی نہیں۔ نامیں کہیں آؤں جاؤں۔" "اے خالا چلو پرے ہٹو۔ تم نے تو کنّاس پنے کی حد کردی۔ جوڑ جوڑ مر جائیں گے اور مال جنوائی کھائیں گے۔ تم تو ایسی نئیں تھیں۔ یہ کیا اللہ کی پھٹکار ہوئی ہے۔ کہ پیسا نہیں کھسکتا۔" سب کے کہنے سننے سے چوتی دینے پر راضی ہوئیں۔ کہنے لگیں۔ "چڑیلوں! میں نے آٹھ آنے کُرتے کے لئے لگا رکھے ہیں۔ مرداریں پیچھے پڑ گئیں۔ بھلا مجھ بیاروں کی بلا کھائی کو گھسیٹنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں بڈھا چرخا۔ تم جان جوانوں میں گھستی کیا اچھی معلوم ہونگی۔" "واہ خالا اچھا کہا؟ یہ ساری برکت (تمہارے ہی) تمہاری ہی دم کی ہے۔ تم نئیں۔ تو سیل ہی مزا نئیں۔ یہ سات روپے جمع ہوئے ہیں۔ تمہارے سُدّاں ساڑھے سات ہونگے۔ یہ روپے ہیں۔ تم جانو۔ تمہارا کام۔ ہمیں سیل کرالاؤ۔" "دوتی روپوں کا میں کیا کروں۔ شرفو کی خوشامد کرو۔ دو ڈھائی میں سارے دن کی بہلی ہوگی۔ چاہے بھارکس منگاؤ چاہے منجھولی۔ گنجائش کو دیکھ لو۔ روپے کا تیل بارہ آنے کا بیسن۔ سوا روپے کا گھی۔ سیر سیر بھر آٹا گھر سے باندھ لو۔ دو روپے اُڑے تُھڑے کو لگا رکھو۔ واں تندور پہ روغنی بیسنی روٹیاں پکوالیں گے۔ آم کا اچار ہوگا۔ نیبو۔ پیاز۔ ہری مرچوں کی چٹنی بنالیں گے۔ بیری پراٹھے پکائیں گے۔ تیل کے سلونے زیادہ ہوتے ہیں۔ بھُرتا ساتھ لیتے چلیں گے۔ سارے

ن رہیں گے۔ شام تو آ ہی جائیں گے۔ کڑھائی تو بھول ہی گئی۔ اپنے وہیں پکوان ہوتا جائے گا۔ گرم گرم کھانے کا مزہ کہ
ب منصوبے باندھ۔ شرفو کی خوشامد کر مار و مار بزار بھیجا۔ وہ سب سامان لے آیا۔ گاڑی والے کو بھی سائی دے آیا۔ سب
، جلدی جلدی سب سامان چلنے کا لیس کیا۔ باندھا بوندھی میں لگ گئے۔ ایک ٹبیریاں لگا دو لڑا بچانے کو۔ ایک
ا لوٹنی پوچھی۔ گردن بیٹھی۔ پتیلا ادھسا۔ جگہ جگہ گڑھے پڑے۔ قلعی اڑی تانبا جھلکتا ساتھ لیا۔ محلے کے حلوائی
، کڑھائی منگالی۔ ٹکے کرائے پہ ڈھولک بھی آ گیا۔ مرغ نے اذان بھی نہ دی تھی کہ بہلی گلی میں آ کھڑی ہوئی۔ سرنا
نی لٹک چلے تھے کہ ہر ایک اپنے اپنے بچوں کو ہشیار کر۔ سوتوں کو گھسیٹ گھسیٹ لانے لگی۔ کسی نے پھٹی جازم اوڑھی
ی نے پیوند لگا برقعہ سر پہ ڈالا کوئی ایک ایک کی منت سماجت کر کے مانگے کی چادر لینے لگی۔ گھروں سے نکلتے نکلتے ضرورت کی
یں یاد آتیں۔ دیوانوں کی طرح بھاگ کے اندر جاتیں۔ اور پھر خالی ہاتھ واپس آتیں۔ بچوں کو بہلی میں ٹھونسنا
رع کیا۔ اور ایک پر ایک لدنے لگی۔ بہلی والے نے جو یہ طوفان بدتمیزی دیکھا لگا چلانے "اری مائیوں پہئے کا دھرا
ہ جائے گا۔ بیل بیٹھ جائیں گے۔ اتنے تو گاڑی میں نہ بیٹھو" بھلا اس غولا جولی میں اس کی سنتا کون؟ ایک پر ایک
ں ٹھس کے بیٹھ گئیں۔ چار پانچ تو سانگی میں جا بیٹھیں۔ جب بہلی والے نے دیکھا کہ یہ یورش کسی طرح کم ہی نہیں ہوتی۔
دب چلایا۔ کہ ان سب کے کانوں میں آواز پڑی۔ اور ایک ان میں سے تنک کر بولی "چل جوانا مرگ کیوں اپنا دم
لے جارہا ہے۔ موئے تیری بہلی میں کون بیٹھا ہے۔ میں تو باجی کے گھٹنے پہ بیٹھی ہوں۔ اس نامراد نے اوچیخ چیخ کے بھیجا کھا
جوں توں کر کے ایک بیس بائیس تو خدا جھوٹ نہ بلائے گھس ہی بیٹھے ہوں گے۔ تو مجھ پر میں تجھ پر کا عالم تھا۔ بچے بھچنے
شکایت کرتے۔ تو مائیں اتار پھینکنے کی دھمکی دیتیں۔ جانے کے شوق کے مارے دم نہ مارتے تھے۔ جب جان ہی پہ
ی جاتی تو پھر ایک آواز نکالتے۔ ارے مر گئے مر گئے۔ بھچ گئے۔ تو مائیں کہتیں۔ مرجاؤ نگوڑو یہاں بھی پیچھا نہ چھوڑو۔
مجال جو ذرا یہاں چین سے گذر جائے۔ تھو تھو موئے بھوت ہو گئے جانوں کو" خدا خدا کر کے بھرتی کی مشکل آسان
ئی۔ اور بہلی والا بڑبڑاتا برا بھلا کہتا۔ بیلوں کو ہانکتا۔ سانٹے مارتا۔ سڑی سڑی گالیاں دیتا سب کو بھر گلی کے باہر نکلا۔
یہ سب تاروں کی چھاؤں چل پڑے۔ اجمیری دروازے پہنچے تو موچیوں والی مسجد میں صبح کی جماعت کی تیاری ہو
ی تھی سب عورتوں نے جلدی جلدی وضو کر ایک طرف ہو نماز پڑھی اور جلدی سے پھر اسی طرح آ ٹھسے۔ جن کے سر کھلے تھے
لو بڑی بوڑھیوں نے ڈانٹا کہ بے ڈھنگیوں اصفیلیں آ گئیں۔ شہر پناہ کے دروازے سے نکلنا ہے سر تو زلدی ڈھانکو۔
ب نے جلدی جلدی سر ڈھانک لئے۔ اب بہلی شہر کے باہر ہولی پہاڑ گنج تک توان سب کا پردہ رہا۔ جیسے ہی
ڑ گنج نکل گیا۔ تو جوا تنی دیر ٹھسی ہوئی بیٹھے رہنے سے شل ہو گئی تھیں۔ وہ جلدی سے بہلی رکوا باہر کود پڑیں۔ پھدکتی تیاں

الگ۔ کسی کی ٹاٹ بافی صفاچٹ۔ کوئی نری کی کوئی اَدھوڑی کی۔ کوئی کیمخت کی۔ کوئی وصلی کی۔ کسی پہ ڈیڑھ حاشیہ کسی پہ بیل کسی پہ پھول کوئی سادی۔ غرض عجیب عجیب ہیئت کی جوتیاں تھیں۔ اِنہیں اُتار بغلوں میں دبا۔ ننگے پاؤں بہلی کے پیچھے پیچھے ہولیں۔ بڑی کی دیکھا دیکھی بچے بھی اتر پڑے۔ اور پیدل ہولئے۔ جو بہلی میں مٹھی رہیں۔ انہیں پھیل کر بیٹھنے کا موقع ملا۔ ماچی میں سے ڈھولک کھلوایا۔ اندر لے۔ بجانا اور گانا شروع کیا " تیرے جو مرنے کھایا جھکولا رے۔ تیرے کھانے کو پاندان لے دوں گا رے"۔ "مدنا[1] گنڈیری والے۔ بالم گنڈیری والے۔ سونے کی تیری ڈنڈی۔ رُوپے کے تیرے پلڑے۔ نینوں کی جھونک ماری رے مدنا گنڈیری والے"۔ دُور سے کوئی مرد آتا نظر آتا۔ تو دوئی مردوُ کر کے چیخیں مارتیں۔ بڑی بوڑھیاں ڈانٹتیں کہ اوہ مُوئی متانیوں! مردوا ہے تو کیا کھا جائے گا؟ آنکھوں کے اندھے نام نین سکھ۔ بلاؤں یہ مردوا ہے یا باہروالا ہے موا گنوار۔ اُدھلن ہار ہو بانس بلینڈوں کو سانپ بتاتے۔ اُس کو نہ اپنے آپے کی خبر نہ جان کا ہوش + جہاں کوئی اُجلے پوش شہری دکھائی دیا۔ جلدی سے کترا کے بہلی کے پیچھے ہو جاتیں۔ جن کے پاس چادریں اور برقعے نہ تھے وہ دوسروں کے برقعوں اور چادروں میں گھس جاتیں۔ یا ذرا سی بھی آڑ پاتیں تو اُس کی اوٹ میں آجاتیں۔ گنواروں کو دیکھ کر خوب مذاق اڑاتیں۔ فقرے کستیں۔ پھبتیاں کہتیں۔ "گنوار نے گیہوں کھایا سیڑھی لے آسمان کو دھایا"۔ "گنوار بھیلی دے گنّا نہ دے"۔ "گاؤں میں اونٹ آیا۔ لوگوں نے جانا پمیشر آیا"۔ جس گنواری کی چُٹیا نظر نہ آتی تو آواز لگاتیں۔ "لکھو بندریا چابے پان۔ اڑ گئی چٹیا رہ گئے کان"۔ وہ بھی بے سمجھے اِن کے کھلّو باولے پنے سے کھلے جاتے۔ دانت نکلے پڑتے۔ جو چلتے چلتے تھک جاتیں۔ وہ بہلی میں آبیٹھتیں اور بہلی والیاں اُتر کے چلنے لگتیں۔ اس طرح باری باری اترتے چڑھتے۔ تین پہر دن چڑھے تک منصور کے مدرسے آپہنچے۔ یہاں بیلوں نے دم لیا۔ سواریوں نے اتر کے سنجتے۔ مٹر۔ چنے۔ چٹ پٹی دال۔ پوریاں۔ پرمل۔ بہادر شاہی سیو پیسے پیسے دھیلے دھیلے کے لئے۔ اب ان کے ساتھ کہاں کہاں مارا مارا پھرا جاتے۔ قطب صاحب گئیں۔ سارے دن رہیں۔ ساری رات رہیں۔ دوسرے دن تھک کے ہلکان ہو۔ کسی کا گلا بیٹھا۔ کسی کے کھر ینچیں لگیں۔ کسی کے کھونچیں گرتی پڑتی لنگتی لٹکاتی۔ اپنی جانوں کو گھسیٹتی گھٹاتی گھروں میں گھسیں۔ بچوں پہ خفا ہونے کا بھی دم نہ تھا۔ ڈھیر ہو پڑ رہیں۔ کماؤ میاؤں نے بھی ڈر کے مارے اُف نہ کی۔ اس لئے لڑائی کے تُنگے نہ تنے +

آغا حیدر حسن دہلوی

[1] یہ گیت حضرت ظفر بہادر شاہ بادشاہ غازی نے "مدنا" گنڈیری والے نیشکر فروش پر جوڑا تھا۔ شہر آبادی میں مدنا کا بڑا چرچا تھا اور یہ گیت [illegible]

بچھڑی ہوئی جوانی

کچھ کسک سی دل میں، کچھ آنکھوں میں آنسو آبدار
گاہ دردِ بے نوائی، گاہ کربِ انتظار

ہجر کی کچھ خشمگیں تاریکیوں کا پیچ و تاب
وصل کی کچھ دل نشیں راتوں کا نورِ ماہتاب

چند وقفے خوش دلی کے، چند گھڑیاں جبر کی
کچھ تمنائیں شبِ مہتاب و روزِ ابر کی

کچھ لگاوٹ، کچھ ستم، کچھ نرمیاں کچھ گرمیاں
گاہے ماہے چند راتیں مہوشوں کے درمیاں

کچھ نسیمِ عیش کے جھونکے کنارِ آب جو
زانوؤں کے چند تکئے، چند جامِ مشکبو

کچھ دنوں چھائی ہوئی شامِ بلا کی تیرگی
کچھ شبوں میں پھول سے چہروں کی میٹھی چاندنی

چند لمحے ظلمتِ ہول آفریں گرمِ عتاب
چار دن کو کچھ سنہری کنگنوں کی آب و تاب

دو گھڑی کے واسطے احباب سے راز و نیاز
چند لمحوں کے لئے رنگین باہوں کا گداز

کچھ دنوں بھیگی ہوئی راتوں کا لطفِ بے قیاس
دل نشیں باتوں کا رس، گلرنگ چہروں کی مٹھاس

ساعدوں کی چند شمعیں، عارضوں کے کچھ گلاب
کچھ رُخوں کی سرخیاں کچھ مست آنکھوں کی شراب

کچھ خنک لہجوں کی شبنم، کچھ ترانوں کی پھوار
کچھ لبوں کا شہد، کچھ زلفوں کا عطرِ مشکبار

لطف کے دو ایک دن، تفریح کی ایک آدھ رات
اے جوانی! اتنی تری لے دے کے اتنی کائنات!!!

پھر بھی تیرا وہ سبک پرواز عہدِ مختصر
خندہ زن ہے آج تک عمرِ مسیح و خضر پر

داغ ہے تجھ سے حیاتِ جاودانی کا سراج
تُو ہے فانی زندگی کے سر پہ وہ انمول تاج

وقت کی سعیِ جفا پر بڑھ کے پانی پھیر دے
اُن دنوں کے چند لمحے اے جوانی پھیر دے!!

جوش
ملیح آبادی

غزل

ہم نے مانا کہ عمر فانی ہے
موت تمہیدِ زندگانی ہے

سوزِ عشق اصلِ زندگانی ہے
داغ دل مُہرِ کامرانی ہے

کیوں ہے افسردہ اس قدر اے دل
ہم بھی فانی ہیں غم بھی فانی ہے

سبزہ و سایہ و نسیم و طیور
میری دنیائے شادمانی ہے

محو رہتا ہوں سیرِ دریا میں
کیا تجمّل ہے کیا روانی ہے

نغمۂ طائرانِ خوش الحاں
سازِ گلبانگِ دلستانی ہے

پرتوِ حُسنِ دوست ہیں ہم بھی
اپنی ہستی بھی جاودانی ہے

ہے نوائے سروشِ عشق سخن
شاعری دل کی ترجمانی ہے

جس سے پروانہ بنتا ہے شعلہ
وہ جگر آتشِ نہانی ہے

جگر بریلوی

خوبصورتی

خُوبصورتی، حُسن، رعنائی ——— زندگی! تواُس دنیا میں چل بس جس کی آبادی یہ پریاں ہیں!

۲

وہ خوبصورت ہے ——— رسیلی خوبصورت آنکھیں، لمبی خوبصورت پلکیں، گول خوبصورت چہرہ موتی سے خوبصورت دانت، پنکھڑی سے خوبصورت لب ——— اور اسی پر بس نہیں بلکہ اس کے ساتھ اک درد بھرا خوبصورت دل، اک خوش خیال خوبصورت دماغ اور اک نیک روش خوبصورت روح!

۲

میں خوبصورت ہوں ——— خوبصورت صورتوں کی تصویر دل میں لٹکاتے ہوئے، خوبصورت خیالوں کی بساط دماغ میں بچھائے ہوئے، نفس کو خوبصورت جذبات کی مسلسل تلاش، روح میں خوبصورت حقیقتوں کی بے تاب محبت اور یہ اس طرح کہ میرے تصور میں بیک وقت ظہور میرے وجود میں بیک وقت نفوذ ایسی ایسی خوبصورتیوں کا کہ جھلمل جھلمل کرتے تارے، پھول اور پتیاں سیمیں زرّیں رنگین، جواہر ریزے اور دُردانے اونچے پہاڑوں کے گہرے سمندروں کے، عرب کے صحراؤں کی خیال انگیز وسعت، اور ہند کے دریاؤں کی روح پرور روانی، اپنی ننھی بچّی کے لبوں کی اچھوتی مسکراہٹ، اپنی رفیق کی نگاہوں کا متین و معصوم حُسن، انسان کی قوت کا پھیلا ہوا زمینی نقشہ، اور حق و باطل کے تصادم سے پیدا ہونے والی روشنی اور اور ہزاروں بلکہ لاکھوں بلکہ کروڑوں خوبصورتیاں جن میں کسی کا ٹھیک ٹھیک عکس اور کسی کی محض دھندلی سی تصویر!!

۲

نفیس ستھرا مکان، چیزیں قرینے سے رکھی ہوئی، پھولوں سے بچے بچوں سے پھول کھیل رہے آقا و بندہ کا تعلق سدھرا ہوا، گفتار شائستگی کردار تمدن، رواداری، آزادی، غلطیاں، غلطیاں لیکن نیک غلطیاں، زمین سبزہ و گل سے بھی صحن خوشبوؤں میں بسا ہوا ——— یہ ہے میرے اَن دیکھے دوست کا مکان جہاں آنے جانے کا اذنِ عام مجھ کو ہے اے خوبصورتی!

باغبان

ایک خط اور ایک پارہ

خط

نیویارک، ۱۶۔ نومبر ۱۸۸۳ء

عزیز دوست!

امید تو نہیں کہ تمہیں یاد ہو مگر میری شادی کو آج پانچ سال ہوتے ہیں، اور کل ۔۔۔ کہ یہ خط کل سے پہلے ہی بند ہو جائے گا ۔۔۔ میری سالگرہ ہے ۔۔۔ چالیسویں سالگرہ۔ میرا دماغ خیالات سے پُر ہے اور انہیں میری روزمرہ کی عادت صفحۂ قرطاس پر لانے کے لئے مجبور کر رہی ہے، جہاں میں اُن کا اظہار بہترین طریقے سے کر سکتا ہوں، اور وہ وہ خیالات ہیں جنہیں میں صرف شفیق ترین اور ہمدردترین آنکھوں کے لئے لکھنا چاہتا ہوں میری زندگی میں میرے لئے یہ امر کچھ کم مسرت کا باعث نہیں کہ میرا ایک دوست ہے جس کے سامنے میں اپنے دل کو کھول کر رکھ سکتا ہوں۔

میری بیوی اِس وقت تمہارے ہم نام کو سُلا رہی ہے، مگر تم اس سے یہ نتیجہ نہ نکالنا کہ اس تقریب پر اُسے بھی اِس وقت تک کہ ساڑھے گیارہ بج چکے ہیں، جاگنا پڑا ہے، نہیں، وہ ٹھیک آٹھ بجے ایک دو آنسو بہا کر سو گیا تھا، لیکن جب کہ اُس کی ماں اپنے معمول کے مطابق اُس کے کمرے میں داخل ہوئی تو میں نے اُس کی نیند میں ڈوبی ہوئی ننھی سی مستفسرانہ آواز سنی، پھر میں بھی اُس کے پیچھے چل دیا اور دروازے کا پردہ اٹھا کر دیکھنے لگا۔ مگر میں کمرے میں داخل نہیں ہُوا۔

سایہ دار شمع کی زرد زرد روشنی کا ایک دھبا سا پالنے کے سرہانے کے قریب چمک رہا تھا، جہاں میری بیوی میرے بیٹے کے قریب جھکی ہوئی تھی۔ اُس کا ننھا سا چہرہ جو ہو بہو اپنی ماں کی تصویر ہے اُس کی طرف متوجہ تھا۔ بچے کے ہونٹوں پر ایک تبسّم تھا، اور میں جانتا ہوں کہ یہ بھی اُسی کے تبسّم کا عکس تھا۔ وہ بیدار رہنے کی نیم کوشش میں خوشی سے اپنی آنکھیں جھپک رہا تھا، مگر اُس سحر آفریں تبسّم کے اثر سے جسے میں نہیں دیکھ سکا، بیداری اُس سے اپنا دامن

چھڑا رہی تھی۔ اُس کی بھوری آنکھیں بند ہوگئیں، ایک لمحے کے لئے کھلیں اور پھر بند ہوگئیں! نیند کی ہلکی پھلکی چادر اُس پر تن گئی اور وہ وہاں پہنچ گیا جہاں ہم اپنی گہری نیندوں میں بھی اُس کا تعاقب نہیں کرسکتے۔ پھر قبل اس کے کہ میں اپنی بیوی کا چہرہ دیکھوں جو اب جھک کر اُس کا منہ چوم رہی تھی میں نے پردے کو چھوڑ دیا، اور یہاں واپس چلا آیا، تاکہ اپنی زندگی کی آخری آگ کے سامنے بیٹھ کر اس مقدس نظارے کو اپنی روحانی آنکھوں سے ایک مرتبہ اَور دیکھوں، اور اُس ناقابلِ بیان مسرت کو حیران ہوکر سوچوں جو بلا استحقاق اور کسی پُراسرار طریقے سے مجھ پر چھا گئی ہے۔

میں تمہیں بتاؤں، وہ لمحہ سوتے سے جاگ اُٹھنے کے اُن لمحوں کی طرح تھا جن کا احساس کبھی کبھی ہمیں بچپن میں ہوتا ہے، جب ہم کسی لطیف و خوشگوار خواب کا دامن جاتے جاتے پکڑ لیتے ہیں —— وہ خوشگوار خواب جو ہماری آنکھیں اچھی طرح کھلنے سے پہلے ہی غائب ہوچکتا ہے؛ جس کی تصویر دنیاوی تصورات نہیں بنا سکتے جو اپنی راہ میں ایک بلند و برتر مسرت چھوڑ جاتا ہے اور جس کی نسبت شاعر کہتے ہیں کہ وہ کسی جنت کی یاد ہے جس کی تازگی ہماری نوخیز روحوں میں ابھی باقی ہوتی ہے۔

تم اندازہ کرسکتے ہو کہ میرے لئے اُن چیزوں کی واقعیت کا یقین کتنا تعجب خیز ہوگا جو اَب میری زندگی میں داخل ہوچکی ہیں؛ کیونکہ تم جانتے ہو کہ آج سے چند ہی سال پہلے میری زندگی کیا تھی۔ میں اُس آدمی کی طرح ہوں جس نے اپنی عمر کے پہلے تیس سال کسی تاریک غار میں گزارے ہوں۔ کیا تم کسی ایسے شخص کو دس سال سے پہلے پہلے آفتاب کے نور اور آسمان کے نیل کا یقین دلا سکتے ہو۔

میں ابھی ابھی آتش دان کے سامنے بیٹھا تھا اور میرے پاؤں اُس سمور میں لپٹے ہوئے تھے جو تم نے ہم دونوں کو پچھلی کرسمس کے موقع پر بھیجی تھی۔ ہلکی ہلکی آگ کی روشنی کمرے کے سایوں پر، میری کتابوں پر، اور تصویروں پر، اور اُس تمام نادر و نفیس ساز و سامان پر رقص کررہی تھی جو اَب میری آنکھوں اور میرے دل کو مسرور کرتا ہے اور اُس مذاق کے لئے تسکین کا باعث ہوتا ہے جو روٹی میسر آنے پر بڑھتا ہی جاتا ہے۔ سو کچھ اِس طرح میں اپنی شادکامی اور کامرانی کا جائزہ لے رہا تھا —— اپنی مادی دولت کا، اپنی اُس بہتر دولت کا جو مجھے دنیا کی طرف سے ملی ہے یعنی شہرت کا اور سب سے بڑھ کر اُس دولتوں کی دولت کا جو ساتھ کے کمرے کی دہلیز کے پار —— اُس کمرے میں؟ نہیں —— وہاں، یہاں، ہر کمرے میں، گھر کے ہر کونے میں امن کی روح بن کر بسی ہوئی ہے، یہ محبت کی پاک و پاکیزہ روح ہے۔

جب میں بیٹھا اِن باتوں کو سوچ رہا تھا تو میرا خیال آج سے بائیس برس —— ہاں آئندہ فروری میں

بائیس برس قبل کی دنیا میں پہنچ گیا جب ہم پہلی مرتبہ ایک دوسرے سے ملے تھے۔ میں اُس ہیبت ناک دن کو ابھی اور بائیس برس تک بھی نہ بھول سکوں گا جب میں "مارننگ ریکارڈ" کے دفتر میں داخل ہُوا۔ ایک بڑے سے تاریک اور افسردہ کمرے میں گیس کی چھوٹی چھوٹی بتیاں جل رہی تھیں، جا بجا زرد چہروں والے کلرک بیٹھے تھے اور دیواروں پر روشنائی کے بڑے بڑے دھبے پڑے ہوئے تھے۔ سردی کا موسم تھا اور باہر بارش ہورہی تھی۔ گو ناصاف روشندانوں میں سے کچھ نظر نہ آتا تھا لیکن میں اُس کی نمی اور سردی کو محسوس کر رہا تھا۔ عقب کے کمرے سے سیاہی اور کھٹے کی بُو آرہی تھی، اور چھاپے کی بڑی بڑی کلوں کا شور اور لرزش نیچے سے اوپر پہنچتا تھا۔ میں اپنے گیلے کپڑوں میں وہاں بیٹھا تھا اور اپنے پہلے تقرر کا انتظار کر رہا تھا۔ میری عمر اُس وقت اٹھارہ سال کی تھی اور میں بے حد غریب تھا۔ لڑکپن کی امید میرے دل میں تھی اور میرے سر میں کالج کے ایک واحد سال کی لاطینی اور یونانی کا سرمایۂ علم تھا۔ میری طبیعت بیٹھی جارہی تھی۔ میرا دل ایڈیٹر کی ہر آواز پر جب وہ اپنے نئے رنگروٹوں کو ایک ایک کرکے بلاتا اور انہیں اُن کے فرائض تفویض کرتا تھا دھک دھک کرنے لگتا تھا۔ میں خاموش یہ دعا مانگ رہا تھا کہ وہ مجھے کوئی آسان سا کام دے اور مجھے اُس کے انجام دینے میں خفت نہ اٹھانی پڑے۔ الامان، ولیم، بوڑھا بالڈون نیک دل ہونے کے باوجود کتنا سخت گیر منتظم تھا! کیا تمہیں اُس کی تیز کڑکتی ہوئی آواز یاد ہے اور اُس کا "مختصراً مختصراً!" کتنا جو انسان کے دماغ سے تفصیل کو اجمال کے ساتھ پیش کرنے کی تمام قابلیت سلب کرلیتا تھا اور اُس کی کہانی کے الفاظ کو منتشر کرکے اُسے ہکلاتے ہوئے چھوڑ دیتا تھا؟ بالڈون کا نام اب تک "مارننگ ریکارڈ" کی پیشانی پر موجود ہے۔ مَیں حیران ہوتا ہوں کہ کون بدبخت اس وقت اُس پریشان کن نکتہ چینی کے سامنے کھڑا لرز رہا ہوگا۔

وہ کیسا کم نصیب دن تھا! وقت کی رفتار غم کی طرح سست تھی۔ داغ دار، چھوٹی ننگی باہوں والے بھنّنے ہوا میں پھڑپھڑاتے ہوئے لمبے لمبے پروف ہاتھوں میں لئے پھر رہے تھے۔ مجھے یُوں معلوم ہوتا تھا کہ ہر شخص مجھ پر تعجب اور حقارت کی ایک نظر ڈالتا ہے اور پھر مجھے اپنے خیالات سے نکال دیتا ہے۔ ہر شخص کو کچھ نہ کچھ کام تھا مگر مجھے کوئی کام نہ تھا جو لوگ میرے ساتھ انتظار کر رہے تھے ایک ایک کرکے بلا لئے گئے اور انہیں کام بتا دیا گیا۔ میں اکیلا رہ گیا۔

تب ایک اور خطرے نے میری کمزور و مصروف تخیلہ کو عذاب دینا شروع کیا۔ کیا میرا افسر اپنے نئے رنگروٹ کو بھول گیا؟ یا اُسے میری کم حیثیت کے مطابق کوئی کام ہی نہیں ملا؟ اس خیال نے پہلے تو مجھے شرم میں غرق کر دیا پھر یکایک غصے اور غلط کاری کے جذبے سے بھر دیا۔ آخر وہ کیوں میری یوں تحقیر کرے؟ کیا میں حق نہیں رکھتا کہ

مجھے آزمائش کے طور پر ہی کہیں لگا دیا جائے؟ کیا کوئی ایسا کام بھی تھا جس کے متعلق اُس نے سوچا ہو کہ میں اسے سرانجام نہ دوں گا یا اُس کے لئے اپنی جان دینے سے دریغ کروں گا؟ میں اُس کے پاس جاؤں گا اور اُس سے کہوں گا کہ میں یہاں کام کرنے آیا ہوں اور کام لے کر چھوڑوں گا۔ نہیں، مجھے جھڑک دیا جائے گا اور واپس اپنی جگہ پر بھیج دیا جائے گا، یا شاید اُسی وقت برطرف کر دیا جائے۔ مجھے اس تحقیر کو خاموشی کے ساتھ برداشت کرلینا چاہئے۔

میں نے نظر اٹھائی تو تم داخل ہو رہے تھے۔ تمہارا روشن، سرخ، بھیگا ہوا چہرہ چمک رہا تھا۔ جب تم آئے تو سارا کمرہ جگمگا اُٹھا۔ تمہاری اِس زندہ دلی اور خود اعتمادی پر میں نے تمہیں بلا سوچے سمجھے خوب دل کھول کر کوسا۔ آہ جدوجہد اور کامیابی کا کتنا فاصلہ تمہیں مجھ پر فوقیت دیئے ہوئے تھا ——— تمہیں، جو رپورٹر تھے، مجھ پر، جو مبتدی تھا! اور عین اُس وقت یہ ہولناک آواز آئی۔ ——— "بارکلے! بارکلے!" ——— یہ کرخت آواز اب میں قیامت ہی کو سنوں گا۔ میں اندر گیا، مجھے اپنے متعلق حکم سنایا گیا جسے لے کر میں باہر آیا، مجھ پر کچھ ایسی پریشانی اور گھبراہٹ طاری تھی کہ یقیناً بالڈون نے مجھے ایک احمق سمجھا ہوگا۔ اور پھر تم میرے پاس آئے اور اپنے مدعا کو چھپاتے ہوئے ایک عجب بے قاعدہ طور پر تم نے مجھ سے واقفیت حاصل کی اور میرے کام کے متعلق تم نے مجھے ایک دو باتیں بتا دیں۔ اُس وقت میں تمہارے لئے جان تک دینے کے لئے تیار تھا۔

یہ ایک معمولی سی بات تھی لیکن وہ دوستی جس کی ابتدا مردانہ دستگیری سے ہوئی تھی بائیس برس تک باہمی اعتماد اور وفاداری سے نبھی؛ اور نشو و نما بیج کو سرفراز کرتی ہے۔ یہ پودا اپنے ابتدائی دنوں میں خوب بڑھا۔ بہار گزر رہی تھی کہ ہم نے اپنے رہنے کے لئے ایک مشترکہ کمرہ کرلئے پر لینے کا فیصلہ کیا۔ یہ ایک بڑا سا کمرہ تھا، ایک بھدا سا کمرہ، اور بارہ طویل سالوں تک یہی ہمارا اور ہماری امیدوں کا اور ہماری ناامیدیوں کا اور ہماری مصائب کا اور ہماری راحتوں کا مسکن رہا۔

میرا خیال ہے کہ میں اس کمرے کی ایک بات بھی نہیں بھولا۔ ہماری پہلی خرید وہ بڑی سی پرانی میز جس پر بیٹھ کر ہم زندگی کی جدوجہد سے بچے ہوئے مختصر وقفوں میں بقائے دوام کے لئے کام کیا کرتے تھے بالکل میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ تمہاری دراز جس میں تمہاری "علم المعیشت" کا مسودہ رہا کرتا تھا دائیں طرف ہے۔ میری دراز بائیں جانب ہے؛ اس میں میرا ناتمام ڈراما اور نظمیں پڑی ہیں۔ تمہاری چارپائی دروازے سے داخل ہونے پر بائیں طرف ہے اور میری دائیں طرف۔

کیسی عجیب بات ہے کہ میں یہ سب کچھ صاف طور پر دیکھ رہا ہوں اب جب کہ سب کچھ بدل چکا ہے۔

اب تک مجھے وہ رات کے ایک بجے نیند سے لڑکھڑاتے ہوئے قدموں کے ساتھ گھر آنا یاد ہے۔ میں نے دروازہ کھولا ـــــ لو، مجھے اُس کی زنجیر اپنے ہاتھ سے چھوتی ہوئی معلوم ہوتی ہے ـــــ اور میں بائیں طرف دیکھتا ہوں۔ آہ، تم گھر میں ہو اور سو رہے ہو۔ مجھے میز کی طرف دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ ہمارے مشترکہ "خزانے" میں کچھ نقدی ہے اور ہماری باضابطہ قرارداد کے مطابق مجھے معلوم ہے کہ میز پر دو روٹیاں اور کچھ پنیر رکھا ہے۔ تم بھوکے ہی سو گئے ہو، کیونکہ جب تک ایک نہ آئے دوسرا نہیں کھا سکتا۔ میں تمہیں جگاؤں گا اور ہم دونوں اکٹھے کھانا کھائیں گے اور پھر گزشتہ اور آئندہ دن کی باتیں کریں گے۔

کیا یہ تعجب خیز نہیں کہ میں اِس حقیقت کو کسی قدر تکلف کے ساتھ پا سکوں کہ یہ محض گزرے ہوئے زمانے کی ایک یاد ہے ـــــ میں، جس کے پاؤں اِس وقت اُس سمور میں لپٹے ہوئے ہیں جسے اگر ہم اُس وقت خریدنا چاہتے تو ہم دونوں کو یا ہم جیسے ایک درجن آدمیوں کو فقیر بنا کر چھوڑتی۔ یقیناً تعجب خیز ہے یہ معاملہ کہ میرے خیالات لڑکپن اور جوانی کی خام کاریوں میں بھٹکتے پھریں۔ میں جس نے دنیا کی نظروں میں نام اور شہرت پیدا کر لیا ہے۔ میں جس کے پاس ایک پختہ کار کی حیثیت سے نوجوان مشورے اور حوصلہ افزائی کے لئے آتے ہیں۔ تعجب ہے کہ میں ایک ایسے زمانہ کا خیال کر رہا ہوں جب ابھی تمہاری سچی اور لازوال دوستی بھی میرے دل کی پیاس نہ بجھا سکی تھی، وہ پیاس جو ایک زیادہ محبوب اور زیادہ دلی رفاقت کے لئے تھی۔ میں، جسے ایک ہمدرد اور شفیق بیوی کی محبت حاصل ہے جو کسی وقت میری نظروں سے اوجھل نہیں ہوتی؛ جو اپنی نیند میں بھی مجھ سے میری روح سے زیادہ دُور نہیں رہتی۔

پھر سب سے زیادہ تعجب خیز بات یہ ہے کہ رنج و اندوہ کا وہ اضطراب اور تنہائی کا وہ زبردست احساس جو کبھی ہمارے اشتراک کے خاتمے پر مجھ پر چھا گیا تھا ایک بھولی بسری یاد ہے دوسری یادوں کی طرح جنہیں ہم دل کی آرامگاہ سے بلا کر خیال کے پردے پر دیکھ سکتے ہیں اور پھر حسبِ دستور ایک آہ یا ایک تبسم کے ساتھ رخصت کر سکتے ہیں! آہ، دس ہی سال پہلے یہ کتنی واقعی بات تھی، کتنی دردانگیز بات! یقین کرو، دوست، ـــــ ہاں میں چاہتا ہوں کہ تم اس پر یقین کرو ـــــ کہ تنہائی کی ان اولین گھڑیوں میں میں بڑی خوشی سے موت کو قبول کر لینے کے لئے تیار تھا! موت کو جو اگر اُس وقت آتی تو اُسی سکون کے ساتھ مجھ پر چھا جاتی جس سکون کے ساتھ ابھی ابھی ساتھ کے کمرے میں نیند میرے بچے پر چھا گئی ہے۔

اُس وقت نہیں اس کی مطلق خبر نہ تھی اور میرا خیال ہے کہ اب بھی تم پوری طرح اس کا یقین نہ کرو گے

کیونکہ ہم مردانہ وار ایک دوسرے سے جدا ہو گئے تھے۔ میرا اوپر کا ہونٹ بھی اُتنا ہی تنا ہوا تھا جتنا کہ تمہارا، صرف اُس پر بال نسبتاً ذرا کم تھے۔ شاید یہ تمہیں مبالغہ معلوم ہو۔ لیکن تمہارے اور میرے حالات میں بڑا فرق تھا۔ جب محبت کے دیوتا نے تم پر نگاہ کی تو تم نے اپنے قلم کا رخ دولت کی طرف پھیر لیا؛ تم ایک جج کی بیٹی سے شادی کرنے جا رہے تھے اور ایک بہت بڑی جاگیر اور روپے کے مالک بننے والے تھے۔ اور اس کا بڑی حد تک تمہیں علم بھی ہو گیا تھا یا کم از کم تمہیں امید ضرور تھی۔ امید بڑی چیز ہے۔ لیکن میں؟ میں اسی کلبۂ احزان میں رہ گیا، اپنے بہترین دوست کو کھو کر، اور میرا دل ویران تھا، اُس میں نہ کسی کی یاد تھی نہ امید، اور میرا آخری افسانہ تمام رسالوں کے دفاتر سے گھوم کر میرے پاس واپس آ چکا تھا۔ مجھے پھر اپنے نفیس کتب خانہ میں پہنچ جانے دو، جہاں اچھی اچھی کتابیں ہیں اور روشن آگ ہے۔ اب میں پھر اپنے پاؤں تمہارے سمور میں ڈالے بیٹھا ہوں اور دوسرے کمرے میں اپنی بیوی کے قدموں کی آواز سُن رہا ہوں۔

چونکہ ہم ایک مدت تک اس درجہ متحد و متفق ہو کر رہے ہیں کہ ایک کی آواز کی ہلکی سے ہلکی لرزش بھی دوسرے کے لئے صریح الفاظ سے زیادہ معانی رکھتی ہے اس لئے جو کچھ میں نے ابھی ابھی کہا ہے اس میں تمہارے کانوں کے لئے میرا پُر افسوس لہجہ بھی شامل ہو گا ——— افسوس اُن دنوں کے لئے جو گزر چکے۔ اور اس میں تعجب کی کونسی بات ہے اگر میں اُن دِنوں کے لئے متاسف ہوں؟ ایک غریب سپاہی جسے قسمت نے اپنے بے بساط لڑکپن میں بھی کام سے فرصت نہ دی ہو، جو صحافت کی آرام نہ لینے والی، اور دوسروں کے لئے راستہ صاف کرنے والی عظیم الشان محارب فوج میں ایک ادنیٰ درجہ سے ترقی کر کے اعلیٰ رتبہ پر پہنچا ہو کیا وہی آدمی، یک لخت، اپنے تنے ہوئے سخت اعضا کو گھر کے آتشدان کے سامنے ڈھیلا چھوڑ کر بیٹھ سکتا ہے؟ کیا اُس کی ٹانگیں سفر کے تصور میں خود بخود ہلنے نہ لگیں گی؟ کیا اس کا موسم زدہ چہرہ بارش کے چھینٹوں کی آرزو نہ کرے گا؟ کیا تمہیں اِس پر حیرت ہو گی اگر رات کے وقت وہ اپنا نرم نرم سفید بستر چھوڑ کر ایک کمبل اوڑھے کھلے میدان میں پھرنا چاہے جہاں اُس کے سر کے اوپر رات کی نیلی وسعتوں کے پرے چمکتی دمکتی دنیاؤں کا جلوس گزر رہا ہو؟ اور اگرچہ ساتھ کے پلنگ پر وہ پیاری پیاری آنکھیں بیدار ہو کر سرزنش آمیز حیرت کے ساتھ اُس کی طرف دیکھنے لگیں! اور اگرچہ محبت آمیز باہیں کھینچ کر پھر اُسے اپنا مطیع کر لیں، لیکن اس پر بھی کیا اُس کا دل دھڑکتا ہوا خوابوں میں اُس جگہ نہ پہنچ جائے گا جہاں سے ڈھول کی آواز آ رہی ہو یا کیمپ کے گیتوں کی موسیقی بلند ہو رہی ہو؟

پہلے سال کی بے قیاس مسرت میں میرا یہی حال تھا، بلکہ بچے کی پیدائش کے بعد تک یہی حال رہا۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ کئی مہینوں تک میں اپنے لڑکے کے وجود کو ایک حقیقت تسلیم نہ کر سکا؟ اس عرصے میں اگر کسی وقت بھی وہ

اپنے کھٹولے سمیت میری نظروں سے اوجھل ہو جاتا تو مجھے ذرا بھی تعجب نہ ہوتا۔ اب مجھے اُس وقت اس کا یقین آیا جب اُس کی آنکھوں میں اُس کی ماں کی آنکھوں کی جھلک نظر آنے لگی۔

ہاں، اُن دنوں میرے اندر کوئی پرانا جذبہ کام کرتا تھا۔ بعض اوقات مجھ پر وہی وحشیانہ آزادی غالب آجاتی تھی جس کے نشہ سے سرشار ہو کر ہم دنیا کا لطف اٹھایا کرتے تھے —— وہی جذبہ جس کے رُو سے ہم اپنی مرضی کے علاوہ دنیا کی کسی ہستی کے آگے جواب دہ نہیں تھے —— وہی احساس جو ایک غیر پابند اور بے پروا طاقت تھا۔

کیا تمہیں وہ رات یاد ہے جب ہم طلوعِ آفتاب تک گھومتے رہے تھے؟ تمہیں یاد ہو گا کہ آدھی رات کے قریب جب ہم نے دفتر چھوڑا کتنی گرمی تھی، اور ایوانِ بلدیہ کے بالمقابل چھٹکی ہوئی چاندنی ہمیں کس طرح میدان کی طرف کھینچ رہی تھی جہاں نہ گیس کی روشنی کی چکاچوند تھی نہ کسی بتی کی جھلملاہٹ۔ ہم یوں ہی سکوت زدہ گلیوں، بے فراز بازاروں اور پرسکون راستوں سے گزرتے گئے۔ بند اور تاریک مکانات پیلی پیلی چاندنی کے اندر بڑے بڑے مقبروں کی طرح نظر آرہے تھے۔ ہم حوالیِ شہر سے گزر گئے؛ ہم بیرونِ شہر کی باغوں سے گھری ہوئی کوٹھیوں سے بھی گزر گئے اور ہم اُس وقت ایک پہاڑی پر پہنچ چکے تھے جب سورج کی کرنیں درختوں کی اونچی اونچی چوٹیوں کو چھونے لگیں۔

میں اُس وقت اِس آزاد سفر کی پاکیزہ مسرت کی خاطر ساری زمین کو طے کر جانے پر تُلا ہوا تھا۔ اُس وقت ہمیں روکنے والی کون سی چیز تھی؟ گھر بار کا کوئی رشتہ نہیں۔ دنیا کے لئے ہم پیچھے کیا چھوڑ رہے تھے؟ چند بے سروپا مہمل تحریریں اور یہ ایک ایسا سرمایہ تھا جس سے ہمارے سرخوب پُر تھے۔ میرا خیال ہے کہ یہی وہ حقیقی موقع تھا کہ ہم اس سیر کو شروع کر کے رُک گئے جس سے اگر ہم جی بھر کر لطف اندوز ہوتے تو اپنی زندگیوں کو تباہ کر لیتے۔

ہاں تو آوارگی کا وہی گستہ عنان جذبہ کبھی کبھی مجھ پر غلبہ پا لیا کرتا تھا۔ ایسے اوقات بھی آتے تھے کہ ایک لمحے کے لئے میں بھول جاتا تھا کہ میری ایک بیوی ہے اور ایک بچہ ہے۔ ایسے اوقات بھی آتے تھے جب میں انہیں اپنے لئے ایک بوجھ سمجھتا تھا۔ میں اسے کیوں نہ کہہ ڈالوں؟ یہ ہر شادی شدہ آدمی کی سرگزشت ہے —— کم از کم ہر مرد آدمی کی —— خواہ اُس کی شادی دنیا کی بہترین عورت ہی سے ہوئی ہو۔ اِس کے معنی محبت کا فقدان نہیں ہیں۔ یہ اتنا ہی ناگزیر ہے جتنا نفیری کی آواز پر تمہارے خون کا اچھلنا ناگزیر ہے۔

پہلے پہل میں ڈر گیا اور اِس جذبے کے خلاف جنگ کرنے لگا جیسے کسی بری عادت کے خلاف جنگ کی جاتی ہے میں عالمِ خیال میں غیر وفادار ہونے پر اپنے آپ کو ملامت کرنے لگا۔ آہ جنگ کرنے کی مجھے کیا ضرورت تھی؟ اپنے باغی تخیلات کا گلا گھونٹنے کی مجھے کیا ضرورت تھی جب میری بیوی کی محبت وہ معجزہ دکھا رہی تھی جس سے دو روحیں مل کر ایک ہو جاتی ہیں؟

آخر یہ اتحاد کیا ہے جو ہمارے لئے ایک حیرت بن کر آتا ہے اور تمام بیرونی دنیا کے لئے ایک ناقابلِ بیان راز بن کر رہتا ہے؟ یہ کیا ہے جو ہماری غیر ازدواجی محبت کو ہماری نظروں میں حقیر اور طفلانہ بنا دیتا ہے؟ تم اور میں، جو اس سے بہرہ ور ہیں جانتے ہیں کہ یہ محض ارتباط و اختلاط کا ثمر نہیں ہے، گو اس کی نشو و نما انہیں کے پہلو بہ پہلو ہوتی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ یہ ایک عجیب انداز سے مرد کو ملتا ہے کہ وہ عورت کی روح کو دیکھے جس طرح وہ اپنی روح کو دیکھتا ہے اور عورت کو کہ وہ مرد کے دل میں نگاہ ڈالے جیسے یہ اُس کا اپنا دل ہے۔ میرا کوئی دوست جب دیکھتا ہے کہ میری بیوی اور میں ایک دوسرے کی بات کو آنکھوں کے اک ذرا سے مل جانے ہی سے پا جاتے ہیں تو وہ اسے ذہانت کی اُس نگاہ سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا جو عموماً دو دلی دوستوں کے درمیان بات چیت کا درجہ رکھتی ہے۔ اُسے اُس مسرت کا وہم و گمان تک نہیں ہوتا جو ہمیں اپنی اس گفتگو میں حاصل ہو جاتی ہے —— وہ گفتگو جس کی زبان کو وہ سمجھ نہیں سکتا، جسے وہ سُن نہیں سکتا —— وہ زبان جس کے باضابطہ الفاظ نہیں ہیں بلکہ جس میں جذبات جذبات کا جواب دیتے ہیں۔

اِس میں حیرت کی کوئی بات نہیں کہ میں اُس امتنان کا اظہار چاہوں جس کے ساتھ میں نے اپنی زندگی کو یوں پھلتے پھولتے دیکھا ہے —— اپنی احسانمندی کا، محبت کے لئے، جس نے مجھے نہ صرف مسرور تر، بلکہ میں عاجزانہ اقرار کرتا ہوں کہ بہتر و بلند تر دل و دماغ عطا کیا ہے۔ مگر مجھے اس اظہار کے لئے اپنے عجزِ بیان کا اعتراف ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اگر میں شاعر ہوتا تو میرا بہترین شعر بھی پُوری صفائی سے اسے ادا نہ کر سکتا۔

میرا خیال ہے کہ ابھی ابھی میرے پیچھے کوئی سرسراہٹ سی ہوئی ہے۔ تھوڑی دیر میں میری بیوی آہستہ سے کمرے میں داخل ہوگی اور آہستہ سے میرے پاس آ کر کھڑی ہو جائے گی پھر ایک ہاتھ آہستہ سے میرے کندھے پر رکھے گی اور اُس کا دوسرا ہاتھ میرے اُس بازو تک بڑھ جائے گا جس سے میں یہ خط لکھ رہا ہوں، یہاں تک کہ وہ نرمی سے مگر اس نرمی میں محبت کی قوت ہوگی، میرے اُس ہاتھ کو پکڑ لے گی جس میں قلم ہے۔ اور میں کہوں گا "بس آخری الفاظ، ولیم اور اُس کی بیوی کے لئے، پیاری" اور وہ میرے ہاتھ کو چھوڑ دے گی اور اپنا ہاتھ اٹھا کر، میرا خیال ہے، کہ میرے کنپٹی پر کے سفید بالوں کے گچھے کو چھوئے گی، یوں جیسے اُس کو ان پر رحم آ رہا ہو کہ یہ بھی اُس کی ایک ادا ہے، اور وہ کہے گی، "میرا بھی اُن کو سلام لکھنا اور کہنا کہ اِس کرسمس پر وہ ضرور ہمارے ہاں آئیں۔ میں اُن کو دکھانا چاہتی ہوں کہ ہمارا وِلی کتنا بڑا ہو گیا ہے۔" اور جب "ہمارا وِلی" کہے گی تو اُس کا وہ ہاتھ جو میرے کندھے پر ہے بے اختیار ذرا سا بند ہو جائے گا؛ اور وہ ہنس دے گی اور میں مڑ کر اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دوں گا۔

پیارے دوست صبر کرو یہاں تک کہ میں تمہیں بتا چکوں کہ یہ خط میں نے کیوں لکھا ہے اور اس کا مطلب کیا ہے۔ ایک بات میں نے تم سے گزشتہ چھ ماہ سے چھپائے رکھی ہے۔ مجھے دل کی بیماری ہے اور ڈاکٹر نے مجھے بتایا ہے کہ ہر لمحہ تمہاری موت کا امکان ہے۔ مجھے خیال ہو رہا ہے ——— مجھے یقین ہو رہا ہے کہ وہ لمحہ اب قریب ہے۔ میں جلد ہی اپنے بستر پر چلا جاؤں گا جو دروازے کے دائیں طرف بچھا ہے، اور مجھے یقین نہیں کہ صبح میں بیدار ہوں گا۔ اور آفتاب کی کرنیں میری آنکھوں کو یہ دکھانے کے لئے روشن کریں گی کہ میرا رفیق مجھ سے جدا ہو چکا ہے۔

کیونکہ میں اُسی پرانے کمرے میں ہوں جیسا کہ تمہیں علم ہے، اور تمہیں یہاں سے گئے دس سال نہیں ہوئے بلکہ دو دن ہوئے ہیں۔ وہ تصویر جو اِن صفحات کو لکھتے وقت مجھے حقیقی نظر آ رہی تھی اب آہستہ آہستہ ماند پڑتی جا رہی ہے، اور شمع کی لو تھرتھرا تھرتھرا کر ڈوبی جاتی ہے۔ صبح قریب ہے اُس کے ہنگاموں کا آغاز ہے۔ ہوا بخاری میں داخل ہو کر ہانپ رہی ہے اور تڑپ رہی ہے اور نیچے آتشدان میں آ کر سفید راکھ کو اُڑا رہی ہے۔ میں نے ابھی ابھی اپنی نظمیں اور ڈراما جلا دیا ہے۔ اب میز کی دونوں درازیں خالی ہیں، اور بہت جلد دونوں خالی کرسیاں میز کی دونوں اطراف سے ایک دوسری کی طرف تکتی رہ جائیں گی۔ اس عظیم خلو میں میرے تصور نے کتنا وحشت ناک خواب دیکھا ہے! ابھی ابھی میں اسے حقیقت سمجھ رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ میں نے اپنے پیچھے کسی عورت کے قدموں کی چاپ سنی ہے، اور اس لئے میں مڑ کر دیکھ رہا تھا۔

میرا پُر محبت سلام لو، میں اب سونے کے لئے جا رہا ہوں۔ شاید میں اس خواب کو ایک بار پھر دیکھوں، اور اُن دھیمے قدموں کی آواز کو ایک مرتبہ پھر سنوں، جب رات پلٹنے لگے جب پھٹے پُرانے پردوں میں سے پیلی پیلی روشنی نمودار ہونے لگے اور جب اس طویل تنہائی کا انجام آ پہنچے۔

جب میں مر جاؤں تو میں چاہتا ہوں کہ تمہارے خیال میں مَیں وہ نہ ہوں جو میں تھا بلکہ وہ ہوں جو میں بننا چاہتا تھا۔ میں نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ تمہاری رفاقت میں مَیں نے امید اور چاہت کی اُس سے ایک خوش تر اور محبوب تر زندگی بسر کی ہے جسے تم نے دیکھا ہے۔ مَیں نے تمہارے تصور کے لئے اپنی ایک ایسی تصویر چھوڑ جانے کی کوشش کی ہے کہ جب اُس دوست کی یاد کے لئے جسے تم اچھی طرح جانتے تھے اور جسے شاید اُس کے مرنے کے بعد تم بہتر طریق پر جاننے لگو تمہیں سکون اور تنہائی کی ایک ساعت میسّر آ جائے تو تمہیں اُس کو اپنی نظروں کے سامنے لانے میں کوئی تکلف نہ ہو۔

ریجی نلڈ بار کلے

پارہ

(۱۸-نومبر ۱۸۹۳ء کے "نیویارک ہیرلڈ" سے لیا گیا)

ریچی نلڈ بارکلے، ایک اخبار نویس، کل صبح اپنے بستر میں مردہ پایا گیا۔ موت کا باعث دریافت کرنے کے لئے کوئی طبی تحقیقات نہیں کی گئی کیونکہ اُسے اختلاج قلب کا عارضہ تھا اور اُس کی موت غیر متوقع نہ تھی۔ مرحوم ایک ہونہار نوجوان اخبار نویس تھا۔ چند سال تک وہ "مارننگ ریکارڈ" کے شہری عملے میں کام کرتا رہا اور کئی ایک غیر مقامی اخبارات کا نامہ نگار بھی رہا۔ اُس کے مضامین نظم و نثر ماہوار رسالوں میں بھی چھپتے رہے ہیں جن سے کسی حد تک اُس کی دماغی قابلیت کا پتہ چلتا ہے۔ بارکلے کی عمر تیس سال کے قریب تھی اور ابھی اُس کی شادی نہیں ہوئی تھی۔

منصور احمد

گزرتا ہُوا لمحہ

ٹھہر جا ٹھہر جا گزرنے والے لمحے، ذرا ٹھہر جا دنیا سے یوں بے نصیب نہ جا میں تجھے مالا مال کر دوں گا، تجھ میں معنی کا آبِ حیات بھر دوں گا تجھے حسین بنا دونگا ذرا تو ٹھہر! کیا تیرے تجھ سے پہلے آنے والوں بھائیوں نے میری کوئی غیبت تو نہیں کی کہ تو یوں مجھ سے خائف ہے؟ ذرا ٹھہر! نہیں میں کسی کی یاد میں تجھے نہ ڈبوؤں گا۔ ہرگز تجھے حسن و عشق کی گلفروشیوں کی نذر نہ کروں گا! ذرا دم لے!

مجھے معلوم ہے کہ تو وہ "اچھا وقت" نہیں جس کا سب کو انتظار ہے مگر مجھے اس علم سے کوئی بے چینی نہیں۔ تجھے معلوم ہے کہ میں وہ استاد نہیں جو تجھے کوئی غیر فانی انا الحق کا سبق سکھلا دے۔ تو بھی معمولی ایک لمحہ ہے، فانی، ان پڑھ، جلدی کا مارا میں بھی ایک معمولی انسان ہوں ظالم جاہل، بے سمجھوں کا شکار مگر جو ہم دو دل بیٹھیں، مل کر کچھ کام کریں تو کیا ممکن نہیں کہ گاہ باشد کہ کودکے ناداں از غلط بر ہدف زند تیرے

آ، مجھ سے مل! مجھے یقین ہے اے گزرنے والے بھولے بھالے لمحے، کہ تیرا ستارہ چمکے گا۔ اس ستارے کو بہت آنکھیں دیکھیں گی بیٹھتا نہیں تو تھوڑی دیر کھڑا رہ! ہاں سُن مجھ سے میرے ایمان کی شرطیں سن۔ کہنے کو یہ شرطیں ہیں مگر جو تو انہیں اپنا لباس سمجھے اور اسے نہ اتارے تو خدا جانے تو کیا بن جائیگا۔

لے اب سن۔

اول۔ میں شہادت دیتا ہوں کہ خدا کو ہر ذی روح یکساں عزیز ہے۔ دوم میں شہادت دیتا ہوں کہ خدا کو پتہ بھی نہیں کہ گناہ کیا چیز ہے۔ سوم میں شہادت دیتا ہوں کہ دکھ انسانوں پہ مرتے رہتے ہیں۔ میں شہادت دیتا ہوں کہ ہر انسان قسما قسم کے دکھ درد کا چلتا پھرتا قبرستان ہے چہارم۔ میں شہادت دیتا ہوں کہ دکھ انسان میں ہے مگر انسان دکھ میں نہیں۔ پنجم۔ میں شہادت دیتا ہوں کہ سکھ انسانوں میں جنم لیتے رہتے ہیں مگر ہر انسان انہیں بغیر پالے پوسے اُن کے اپنے گھر سے نکالتا رہتا ہے۔ ششم۔ میں شہادت دیتا ہوں کہ خدا انسان کو پکار پکار کر کہہ رہا ہے۔

گر تو نمی پسندی تغییر کن قضا را

تو سُن، جھکا! حاسے کر رہا دے۔

ا ۔ ۔ ۔ ا

پُوجا

میں پجاری ہوں پُجاری!

جب میں ابھی بچہ تھا چُپ چاپ مریض منحنی اور میرے ماں باپ میرے بچپن سے گھبرتے تھے تو میں اپنی نانی اور خالہ اور نانا سے لپٹا رہتا!

جب میں نے ہوش سنبھالا اور مجھے ہم عمروں میں آوارہ گردی کی اجازت نہ ملی تو میں اپنی آپا اپنی الماری اپنے کمرے اور اُس کے ایک ایک کونے سے چمٹا رہتا!

جب میرے دماغ میں اب ت ڈالی گئی اور خشک کتابوں کی بیڑیوں نے مجھے جکڑ لیا تو میں نے مذہب و شاعری سے ربط و ضبط پیدا کر کے اُن کو اپنا تنہا رازداں بنالیا!

میں جو پجاری ہوں ہمیشہ پُجاری ہی تھا!

جب میرے لڑکپن کے دل میں جذبات کی موج اٹھی اور میرے دماغ میں زندگی کا عکس پڑا تو حسن و محبت کی دنیا نے اِس چھپی سی بات کو مجھے معلوم نہ تھا جانا یا نہ جانا کہ میری بے تاب ہستی عبارت ہے اُس کی پاکیزہ پرستش سے مگر تھا یوں ہی!

جب شباب اپنے طوفان لے کر آیا اور میری کشتی ڈگمگاتی ہوئی اُس کی تیز و تند رَو میں بہ نکلی تو جس کے بھرے یا رُوکھے سُوکھے ٹنڈ منڈ میں بھی میری کشتی جا لگی میں نے اُسی کو تمناؤں کا گھاٹ سمجھ کر وہاں ڈیرے ڈال دینے چاہے!

لیکن زمانے کا بہاؤ زبردست تھا اور میری قوت کمزور ـ میں بہ گیا بہے گیا اور بہے گیا اور جب اَور کوئی بُت نہ ملا تو اپنے رنج والم ہی کی مورتی کے آگے ہاتھ جوڑ کر یوں گر پڑا کہ آسمانوں پر اک نیا پکار اٹھی کہ دیکھیو دیکھیو یہ پجاری ہے پجاری!

پھر قسمت نے اَور چکمہ چلا اور میری فطرت نے اِک اَور فریب کھایا ـ کسی کی کمائی ہوئی دولت میری ہو گئی جس نے مجھے اپنی تنگ آغوش میں لے لیا ـ تو میرا کیا تھا میں گوشہ گیر اُس سے وہی ہمکنار ہو گیا!

پھر جب اِک رفیقِ زندگی کو حاصل کیا تو محض اُس کی خوشی اپنا معمول ہو گیا ـ اُس کے نام پر ایک مندر کھڑا کر دیا لیکن شاید ایک ہی مجسّم بتِ نیکی کی پرستش مجھ بے وفا (؟) پجاری کو کافی نہ ہوئی ـ سو میں نے مندر کے نزدیک و دور اپنے تصورات و توہمات کا ایک بے پایاں باغ و صحرا پھیلا دیا جس میں خیالوں کے پھولوں کی اور ابھی ابھی کچھ کچھ کانٹوں کے دنتوں کی پوجا میں نے بڑے شدّو مد سے شروع کر دی!

میں جو ہمیشہ اک پُجاری تھا اب بھی اک پُجاری ہی ہوں!

پجاری

جامِ صہبائی

(۱)

ہے عجزِ جودی کا اک کیوں سجود؟
پردے ہی جمالات میں ہیں پردے معبود
تیری ہی تجلّی سے ہے رونقِ ہنگامۂ دیر
ہے تو ہی حقیقت اور تو ہی مقصود

(۲)

ہے محفلِ دہر سب، محفل تو ہے
ہے منزلِ کائنات حاصل تو ہے
منزل کی تلاش میں ہے کیوں سرگرداں
سرگردۂ راہ اپنی منزل تو ہے

(۳)

اے شعلۂ برق جانِ شمعِ محفل ہو جا
غارت گرِ تاریکیِ باطل ہو جا
دل حاصلِ کشتِ زندگانی ہے اثر
خاشاکِ خرد کو پھونک کر دل ہو جا

(۴)

اک سعی ہے ہر امر جس کا حاصل ہی نہیں
اک جادہ ہے کہ روشناسِ منزل ہی نہیں
اک قلزمِ خیال ہی تمنّائے سکوں
اس بحرِ حیات کا تو ساحل ہی نہیں

اثر صہبائی

رباعیات

(۱)

مشکل کی طلب ہو جس کو عظمت ہے وہی
خطروں میں جو کود پڑے شجاعت ہے وہی
منزل ہے وہ جس کی ہو تلاش پیہم
جس کا نہ پتہ چلے حقیقت ہے وہی!

(۲)

اس علم کو تو بہت نہ جان اے انجان
اس عقل کو تو بہت نہ مان اے نادان
کیا سمجھیں گے علم و عقل اسرار حیات
یہ زندگی وقت وقت کی ہے پہچان!

(۳)

تھوڑا ہو بہت ہو اُتنا ہو یا اِتنا
کیا اس سے کسی کو کس لئے یہ کیا ہے کتنا؟
ذرے میں بھی ہو نور تو خورشید ہے وہ
خوش خو ہے جو جس طرح کا جیسا جتنا!

(۴)

ہر چیز کو دیکھتی ہے چشم بینا
ہر شے کا خزینہ ہے بشر کا سینہ
ہر شخص میں ہیں قوتیں ساری مرکوز
ہر شخص ہے کائنات کا آئینہ!

ل ب

پپیہے کی صدا

(عالمِ خیال میں)

جب پپیہا باغ میں گاتا ہے آکر پی کہاں؟ ۔۔۔ چُپ سی لگ جاتی ہے مجھ کو لب پہ لا کر پی کہاں!
زخم آرے کر دیئے ظالم نے گا کر پی کہاں ۔۔۔ دل میں لالے بو دیئے دم بھر سنا کر پی کہاں

او پپیہے گائے جا من میں سما کر، پی کہاں
آگ سی تن میں لگائے جا سُنا کر پی کہاں

آہ وہ بھُولے ہوئے غم یاد آتے ہیں مجھے ۔۔۔ آہ وہ گزرے ہوئے دم یاد آتے ہیں مجھے
آہ وہ ایامِ ماتم یاد آتے ہیں مجھے ۔۔۔ آہ وہ گیسوئے برہم یاد آتے ہیں مجھے

او پپیہے گائے جا من میں سما کر، پی کہاں
آگ سی تن میں لگائے جا سنا کر پی کہاں

یُوں نظر آتی نہیں سنجوگ کی صُورت مجھے ۔۔۔ تُو کبھی مرنے بھی دے گی آہ اے فرقت مجھے؟
تیس دن بے چین ہوں اک پل نہیں راحت مجھے ۔۔۔ دکھ، مصیبت، درد، غم، سب کچھ ملا ات گت مجھے

او پپیہے گائے جا من میں سما کر، پی کہاں
آگ سی تن میں لگائے جا سنا کر پی کہاں

کھو چکی کھونا تھا جو تکرار کیوں ناحق کروں ۔۔۔ پا چکی پانا تھا جو، انکار کیوں ناحق کروں
غم سے کیا حاصل، غمِ دلدار کیوں ناحق کروں ۔۔۔ بات ہی بس کی نہیں بسیار کیوں ناحق کروں

او پپیہے گائے جا من میں سما کر، پی کہاں
آگ سی تن میں لگائے جا سنا کر پی کہاں

من کو چھوڑا ہے پیت، آنکھیں کھول اب پیتم کہاں ۔۔۔ آہ وہ دمساز، وہ ہمراز، وہ ہمدم کہاں
دم تھا جس کے دم سے، وہ ہمدم نہیں تو دم کہاں ۔۔۔ دُور یار! اے زندگانی تُو کہاں اور ہم کہاں

او پپیہے گائے جا من میں سما کر، پی کہاں
آگ سی تن میں لگائے جا سنا کر پی کہاں

حامد علی خاں

عالم خیال میں

وہ جس نے ڈال رکھا ہے زمانے کو تحیر میں

آئینۂ حیرت

وہ جس نے ڈال رکھا ہے زمانے کو تحیّر میں　　　وہ جو محبوس ہو سکتا نہیں قیدِ تصوّر میں

وہی ہے جس سے اے نُورِ نظر حیران ہے تُو بھی!

مجھے حیرت پہ حیرت ہے کہ تُو ہو وقفِ حیرانی　　　یہ حیرانی تری ہے مجھ کو وجہِ صد پریشانی

اگر آئینہ بے حس ہے تو کیا بے جان ہے تُو بھی؟

کہوں کیا راگ کیسا کھیلتا ہے تیرے مکھڑے میں　　　کہ دُکھیارے کا جی لگتا نہیں اب اپنے دُکھڑے میں

خدائی جس سے ہو مدہوش سی وہ تان ہے تُو بھی!

کرشمے سینکڑوں نُدرت کے ہیں جس طرح فطرت میں　　　سُبک نازک حسیں نایاب بس اس طرح فطرت میں

قضا کی آن ہے تو بھی خدا کی شان ہے تُو بھی!

جو کوئی غور سے دیکھے تو اک اک شے کو حیرت ہے،　　　وہ حیرت جو دلِ کون و مکاں کو وجہِ غیرت ہے،

میں سمجھا ہاں میں سمجھا کس لئے حیران ہے تُو بھی!

سمجھ ہی میں نہ آیا تجھ کو دل کی آرزو کیا ہے؟　　　خودی کی زندگی میں یہ کسی کی جستجو کیا ہے؟

جو سمجھے بھی تو کیا سمجھے کہ اک انسان ہے تُو بھی!

ب ل

"مُن سُکھی اور سندر سنگھ کا قصّہ"

کسی قوم کی ادبی زندگی میں اس سے زیادہ افسوس ناک بات کوئی نہیں کہ بلند پایہ تصانیف سے اُس کا سرمایہ خالی ہو۔ کسی قوم کی ادبی زندگی میں اس سے زیادہ شرمناک بات کوئی نہیں کہ نہایت بلند پایہ تصانیف اُس کے سرمائے میں موجود ہوں مگر اُن کی صحیح قدر و قیمت پہچاننے کی توفیق بھی اُسے میسّر نہ ہو۔ لولوئے شاہوار گھر میں نہیں ہے تو نہ سہی لیکن لولوئے شاہوار کا گھر میں ہونا اور پھر کوڑے کرکٹ کے ڈھیر میں پڑے رہنا یقیناً اہلِ خانہ کی کور ذوقی کا ثبوت ہے۔ "من سکھی اور سندر سنگھ کا قصّہ" بھی ایک ایسا ہی موتی ہے جو ہماری غفلت اور ہنر ناشناسی کی خاک دھول میں اٹا ہوا آج تک کُنجِ گمنامی میں پڑا رہا ہے اور خدا جانے ابھی کب تک پڑا رہے گا۔

کچھ عرصہ گزرا راقم الحروف کو اپنے ایک عزیز کے مکان پر چند گھنٹے بسر کرنے کا اتفاق ہوا۔ وقت گزارنے کے لئے کسی اچھی کتاب کی تلاش ہوئی تو اُن کے ذخیرۂ کتب پر نگاہ دوڑانی شروع کی۔ اُن کتابوں کے پیچھے جو اس لئے اچھی سمجھی جاتی ہیں کہ نئی ہیں سررشتۂ تعلیم پنجاب کی کچھ پرانی درسی کتابوں کا الٹا سیدھا انبار بھی لگا تھا۔ اس پر ہاتھ مارا تو ایک فرسودہ سی کتاب نکل آئی جسے اس سے پہلے دیکھنے کا اتفاق کبھی نہ ہوا تھا۔ اس کتاب میں دوسری چیزوں کے علاوہ تین قصّے تھے۔ ایک نادیدہ مگر بظاہر معمولی چیز سے انسان کو جو معتدل سی دلچسپی ہو سکتی ہے اُسی کے ساتھ پہلا قصہ پڑھنا شروع کیا۔ یہ قصّہ کتاب کے ساٹھ صفحوں پر پھیلا ہوا تھا۔ لیکن اس کے ابتدائی چند صفحے ہی چونکا دینے کے لئے کافی تھے۔ اور جوں جوں طے سے آگے بڑھا، استعجاب اور فریفتگی اور پھر استعجاب رہ رہ کر پیدا ہوتا گیا۔ یہ "من سکھی اور سندر سنگھ کا قصّہ" تھا۔ اس قصّے کے مطالعے سے راقم الحروف کو جو تجربہ ہوا وہ بلا مبالغہ ایک نئی دنیا کے انکشاف سے کم نہ تھا۔ اور اس کی کم سے کم تعریف جو کی جا سکتی ہے، یہ ہے کہ یہ قصّہ اپنی نوعیت میں بے نظیر ہے۔

کتاب کے تین قصّوں میں سے ایک ہندوستان کی اسلامی معاشرت اور باقی دو ہندوؤں کی معاشرت کے متعلق ہیں۔ ایک سرسری نظر سے بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ معاشرتی افسانوں کی یہ دوگانہ تقسیم دو مختلف قلموں کی شرمندۂ احسان ہے، اور یہ بھی بالکل ظاہر ہے کہ اسلامی معاشرت کے ترجمان کو وہ کمالِ فن عطا نہیں ہوا جو اُس کے ہم قلم

کے حصے میں آیا ہے۔ معاشرتِ ہنود کے مصور کی قوتِ اظہار میں اِس بلا کی شدت اور فراوانی و برجستگی ہے اور اُس کا مُوقلم تصویر کے پردے پر بغیر کسی کوشش کے اِس صفائی کے ساتھ جنبش کرتا ہے کہ اس خاص وصف میں اُس کا کمال انگلستان کے سب سے بڑے ڈراما نویس شیکسپیئر کی یاد دلاتا ہے۔

تینوں قصّوں کے نام علی الترتیب یہ ہیں:۔

(۱) من سکھی اور سندر سنگھ کا قصہ۔

(۲) خوشحال چند اور ہیرا، دولت رام اور مونگا، کروڑی مل اور گنگی کا قصہ۔

(۳) جہاں آرا بیگم اور محمد یوسف، گیتی آرا بیگم اور محمد جمیل الدین کا قصہ۔

دریافت کرنے پر معلوم ہوا ہے کہ پہلے دو قصے رائے بہادر لالہ پیارے لال دہلوی کی تصنیف ہیں جو مسٹر من گوپال ایم اے جج ہائی کورٹ کے بڑے بھائی اور لالہ سری رام صاحب مولفِ "خمخانۂ جاوید" کے تایا تھے۔ تیسرا قصہ باعتبارِ فن سب میں فروتر ہے اور مولوی کریم الدین صاحب پانی پتی کا لکھا ہوا ہے۔

"رسومِ ہند" جس میں یہ قصے شامل ہیں اُردو نثر کے دورِ جدید کی بہت ابتدائی کتابوں میں سے ہے۔ اور یہ غالباً اُسی زمانے میں لکھی گئی جب لاہور میں نئی شاعری کا آغاز ہوا۔ پنجاب کے مشہور ناظمِ سررشتۂ تعلیمات کرنل ہالرائڈ کا نام کئی حیثیتوں سے محسنانِ اردو کی فہرست میں آبِ زر سے لکھے جانے کے قابل ہے اور اردو زبان کے بہی خواہ اُن کو ہمیشہ محبت اور شکر گزاری سے یاد رکھیں گے۔ تاریخِ ادبِ اردو میں یہ نیک نفس انگریز ایک زبردست مصلح بلکہ مجددِ اول کا مرتبہ رکھتا ہے۔ اُسی کے مشورہ و ہدایت کے ماتحت پہلے پہل حالیؔ اور آزادؔ نے اردو نظم میں ایک بالکل نئے طرز وفکر کی داغ بیل ڈالی جو آج ہماری شاعری کا عام انداز ہے اور غالباً اِن معجزاتِ نثر کے لئے بھی جن کا ذکر اب ہو رہا ہے ہم اردو ادب کے اِسی مسیحا کے ممنونِ فیض ہیں۔ قیاس سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ کرنل ہالرائڈ نے جب اردو نظم و نثر میں افسانوں کا عام انداز دیکھا کہ وہ تقریباً سب کے سب بے جان شہزادوں اور شہزادیوں کے بے رنگ عشق و محبت کے بے لطف سوانگ سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتے تو انہوں نے مسٹر پیارے لال اور مولوی کریم الدین کو قصہ نویسی کے فن میں اُسی طرح ایک نئی راہ نکالنے کی ہدایت کی جس طرح اُن کی رہنمائی میں حالیؔ اور آزادؔ نے شاعری کی کایا پلٹ دی تھی۔

اِس بے مثل کتاب کو قلم بند ہوئے غالباً نصف صدی سے زیادہ کا عرصہ منقضی ہو چکا ہے۔ یہ ایک مدت تک محکمۂ تعلیم پنجاب کے نصاب میں داخل رہی مگر تعجب ہے، کہ ہزاروں پڑھنے والوں کے ہاتھوں سے گزرنے کے باوجود بھی

اِس کی حقیقی عظمت و اہمیت کا اندازہ قائم نہ ہوسکا اور اس کے کم ازکم ایک قصّے کو ادب اردو میں وہ مستقل حیثیت نہ ملی جو یقیناً اُس کا جائز حق تھی یعنی سکھی اور سندر سنگھ کا قصّہ'' ایک ایسا گراں مایہ اور نادر کارنامہ ہے کہ مغرب میں اِس صنفِ ادب کے بہترین استادانِ فن کے سامنے ہم اِسے فخر کے ساتھ پیش کر سکتے ہیں۔

کہانیوں کے اِس مجموعے کے نام ہی سے ظاہر ہوجاتا ہے کہ کرنل ہالرائڈ فنِ قصہ نویسی کے کس پہلو پر سب سے زیادہ زور دینا چاہتے تھے جن ہندوستانی قصّوں کی فضا اور تمام متعلقات بطورِ تصنّع ایرانی کہانیوں کے مخصوص لوازم سے مستعار لئے گئے ہوں وہ محض بے حقیقت ہیں۔ اچھا قصہ وہ ہے جو غیر ملکی حالات کی نقّالی پر مبنی نہ ہو بلکہ سچائی اور خلوص کے ساتھ اپنے ہی ملک کے حالات و واقعات رسم و رواج اور طرزِ معاشرت کا آئینہ دار ہو، کیونکہ یہ چیزیں قصے میں ایک عجیب روح پھونک دیتی ہیں جس کے بغیر وہ بالکل پھیکا اور بے جان رہ جاتا ہے۔ قصہ نویس کو چاہئے کہ اپنے ملک کی رسم و تمدّن کا غور سے مشاہدہ کرے اور یہی چیزیں اُس کی تحریروں سے خود بخود جھلک پڑیں۔

اِس مقصد کو لئے ہوئے مسٹر پیارے لال اور مولوی کریم الدین نے اپنا کام شروع کیا اور یہ ایک دلچسپ بات ہے کہ اِن دونوں بزرگوں میں بلحاظِ کامیابی جو فرقِ مراتب ہے وہ بالکل اُس فرق کے متناسب ہے جو نظم کے میدان میں حالی اور آزاد کے درمیان قائم ہے۔ مسٹر پیارے لال ایک زبردست صنّاع کی طرح اپنے مقصد پر غالب آگئے ہیں لیکن مولوی کریم الدین پر خود اُن کا مقصد غالب آگیا ہے اور اُن کا قصّہ صحیح معنوں میں قصّہ نہیں رہا۔ مولوی کریم الدین کے قصّے میں واقعات اس لئے پیدا کئے گئے ہیں کہ رسوم کا اظہار ہو۔ مسٹر پیارے لال کے دونوں قصّوں میں رسوم کا اظہار واقعات کے ضمن میں خود بخود ہوتا چلا جاتا ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ مصنّف کا قصد محض ایک دل نشیں داستان سنا کر ہمارا دل بہلانا ہے نہ کہ کسی اور نیت سے ہم پر حملہ آور ہونا۔ مولوی کریم الدین کے واقعات میں ایک پریشانی و آشفتگی ہے کیونکہ قصّہ بجائے خود اُن کے لئے اتنا اہم نہیں ہے جتنا رسوم کا بیان۔ بخلاف اس کے مسٹر پیارے لال کے واقعات کا تسلسل بالکل قدرتی معلوم ہوتا ہے کیونکہ ایک استادِ فن کی طرح اول سے لے کر آخر تک قصّے کی تمام جزئیات اُن کے دماغ میں قائم اور روشن ہیں۔ اپنے قصّے کے افراد پر اُن کی گرفت غیر معمولی طور پر مضبوط ہے اور وہ اُسی قدر سلیقے سے اُنہیں حرکت میں لاتے ہیں۔ مولوی کریم الدین کے افراد بے جان لعبتیں ہیں جو مصنوعی کل پُرزوں کے بل پر متحرک ہوتی ہیں۔ مسٹر پیارے لال کے افراد زندہ ہیں۔ ہمیں اُن کی نبض کی تڑپ اور دل کی دھڑکن محسوس ہوتی ہے۔ کیونکہ جو الفاظ اُن کی زبان سے نکلتے ہیں اُن سے اُن کی کسی نہ کسی مخصوص طرزِ فکر و عمل کا اظہار ہوتا ہے یعنی وہ الفاظ ایسے نہیں ہوتے کہ اُن خاص حالات میں

ہرکسی کی زبان سے لازماً وہی اداہوں سیرت نگاری اسی کا نام ہے یہی وجہ ہے کہ پورا قصہ پڑھ چکنے کے بعد من سکھی، پاربتی، چندرکور، سندر سنگھ، گیان چند اور سجان سنگھ سب کی واضح تصویریں ہمارے ذہن میں رہ جاتی ہیں اور ہم اُن کے ساتھ الگ الگ اسی طرح واقف ہوجاتے ہیں جس طرح اپنی جان پہچان کے زندہ آدمیوں کے ساتھ۔ یہ اس لئے کہ مصنف اپنے قصّے کے واقعات بیان کرتا ہؤا قلم کی ذرا ذراسی جنبشوں میں اُن کے خدوخال نمایاں کرتا چلا گیا ہے۔

مولوی کریم الدین کا قصہ سیرت نگاری کے لحاظ سے بالکل ساقط الاعتبار ہے۔ مثلاً پوری داستان کو شروع سے لے کر اخیر تک پڑھ جانے کے بعد بھی اگر ہم یہ سوچنا چاہیں کہ جہاں آرا بیگم، گیتی آرا بیگم اور دل افروز بیگم میں بحیثیت مختلف انسانی افراد ہونے کے کون کون سے امتیازی اوصاف ہیں تو کوئی مابہ الامتیاز ہمارے تصور میں نہیں آتا۔ یہ سب دھندلی سی شکلیں ہیں جن میں سب سے بڑی وجہ امتیاز یہی ہے کہ اُن کے نام مختلف ہیں۔ ان کاٹھ کی پتلیوں کی مسرت وغم سے ہمارا دل بالکل غیر متاثر رہتا ہے کیونکہ ہم اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ یہ سب ایک فریب، ایک کھیل ہے لیکن من سکھی اور سندر سنگھ کی قسمت کے ساتھ ہمیں اُتنی ہی دلچسپی ہے جتنی دو زندہ انسانوں کے ساتھ ہو سکتی ہے۔ جو جو تفصیل ان دونوں کے متعلق مصنف کا قلم ہمیں دیتا ہے ہم اسے شکریے کے ساتھ قبول کرتے ہیں۔ رسوم کا بیان اِس قصّے میں ہمیں ناگوار نہیں ہوتا بلکہ ہم اُن کی تفصیلاتِ متعلقہ کو دلچسپی سے پڑھتے ہیں اس لئے کہ خود من سکھی اور سندر سنگھ کے ساتھ ہمیں نہایت گہری دلچسپی ہے۔ ہندو تیوہاروں اور مندروں کی تصویریں بھی اسی ضمن میں آتی ہیں کیونکہ اِن کو جلا دینے کے لئے زندہ انسانوں کی صُورتیں اِن میں حرکت کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ یہ بات آگے چل کر مثالوں کے ذریعے سے زیادہ واضح طور پر سمجھ میں آسکے گی۔

مسٹر پیارے لال کا دوسرا قصّہ یعنی "قصّۂ خوشحال چند وغیرہ" بھی ادبی پائے کے لحاظ سے من سکھی اور سندر سنگھ کی کہانی کو نہیں پہنچتا۔ الگ الگ طور پر وہ سب خوبیاں اس میں بھی موجود ہیں جو من سکھی اور سندر سنگھ کے قصّے کا طغرائے امتیاز ہیں۔ یہاں بھی مصنف کا قلم ایک سیر حاصل دماغ کے اشاروں پر اُسی حیرت انگیز چابک دستی کے ساتھ سانس لیتی اور حرکت کرتی ہوئی زندگی کو صفحۂ قرطاس پر منتقل کرتا چلا جاتا ہے اور مصنف کے تخیل کی تازگی اور پاکیزگی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ لیکن باعتبارِ فن اس قصّے میں ایک نقص ہے اور یہ نقص قصے کے نام ہی سے ظاہر ہے۔ یہ کہانی ایک کنبے کی تین مسلسل نسلوں کی داستان ہے اس کا اثر یہ ہؤا ہے کہ کہانی کی بنیاد جس نقشے پر قائم ہے اُس کے توازن میں خلل آگیا ہے۔ توازن میں خلل آجانے سے مراد یہ ہے کہ کہانی کے نقشے میں کوئی ایسی

وحدتِ مرکزی موجود نہیں رہ سکی جو قصے کے تمام منتشر اجزا کی شیرازہ بندی ہو جاتی۔ اِس وحدت کے بغیر قصے اور روزنامچے میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ یہ سچ ہے کہ ایک قسم کی وحدت کہانی کے نقشے کی موجودہ صورت میں بھی پائی جاتی ہے کیونکہ سب واقعات ایک ہی گھرانے کی تین نسلوں کو پیش آئے ہیں لیکن یہ وحدت محض مصنوعی ہے اور بہ لحاظِ فن قصے میں اس کا وجود و عدم تقریباً یکساں ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ اس کنبے کی تینوں نسلیں براہِ راست باہم ملی ہوئی ہیں لیکن بایں ہمہ کہانی کے نقشے میں اس سے جو وحدت پیدا ہوتی ہے اُس کی نوعیت محض خارجی ہے جو پوری کہانی کو کوئی ایک روح نہیں دے سکی۔ بخلاف اِس کے من سکھی اور سندر سنگھ کے قصے میں وحدتِ معنوی کی وجہ سے ایک نئی شان پائی جاتی ہے۔ وہ بنیاد جس پر اِس لاجواب قصے کی ادبی وحدت قائم ہے من سکھی اور سندر سنگھ کی محبت ہے۔ یہی وہ محور ہے جس کے گرد اول سے لے کر آخر تک قصے کے تمام واقعات پھیلتے، چکر کھاتے اور سمٹتے ہیں۔ "رسومِ ہند" کے باقی دونوں قصوں میں یہ بات نہیں۔ پس من سکھی اور سندر سنگھ کا قصہ بہر حال اس مجموعے کا بہترین قصہ ہے۔

اِس قصے کو اردو افسانہ نویسی بلکہ اردو نثر میں ایک تاریخی حیثیت حاصل ہے۔ اردو ادب کا وہ نیا دَور جس کا زمانہ غالب کی وفات کے بعد سے شروع ہوا، قدیم ادبی روایات سے ہماری بغاوت کا دور ہے۔ "من سکھی اور سندر سنگھ کا قصہ" اس بغاوت کا اولین نقیب نہیں تو اولین نقیبوں میں ضرور ہے۔ اس کو ایک نگاہ دیکھنا ہی یہ جان لینے کے لئے کافی تھا کہ ایک نئی نثر دفعتہً وجود میں آگئی ہے جس طرح اُسی زمانے میں حالی کے ہاتھوں ایک نئی نظم دفعتہً وجود میں آئی۔ "دفعتہً" کا لفظ یہاں اضافی حیثیت سے استعمال کیا گیا ہے ورنہ ظاہر ہے کہ حیاتِ انسانی کے کسی شعبے میں کوئی نئی ترقی ترقیاتِ ماسبق سے بالکل بے نیاز نہیں ہو سکتی۔ بایں ہمہ یہ بہت بڑا انقلاب ہے کہ درباروں اور محلوں سے نکل کر افسانہ یک بیک دیہات کے جھونپڑوں میں پہنچ جائے۔ عجائب و غرائب کی سحر کاریوں اور طلسم بندیوں کی ہوش ربا داستانیں اور اُن کی ژولیدہ بیانیاں یہاں ختم ہو جاتی ہیں۔ یہ سیدھے سادھے لوگوں کی کہانی ہے جو سیدھی سادھی طرح لکھی گئی ہے۔ اس میں نہ مبالغے کو دخل ہے نہ بناوٹ کو۔ یہ ہندوستانی کسانوں اور اُن کی عورتوں اور بچوں کی زندگی کی سچی تصویر ہے۔ ایسی سیدھی سی حکایت کو ہنگامہ خیز اور سنسنی پیدا کرنے والے عناصر کی مدد کے بغیر دلچسپ بنا دینا مصنف کا اعجاز ہے۔ کہانی یوں ہے کہ ایک امیر کی لڑکی من سکھی جس نے بچپن ہی میں یتیم ہو جانے کے بعد اپنے چچا سجان سنگھ اور چچی چندر کور کے گھر میں پرورش پائی تھی جب پورے پندرہ برس کی ہو گئی تو سندر سنگھ نام ایک شریف اور صالح نوجوان سے اُس کی شادی ہو گئی۔ دونوں کی طبیعتیں ایک دوسرے کے لئے اِس قدر

موزوں تھیں کہ بہ حالاتِ ظاہر ایک لمبی اور پُرمسرت زندگی اِس نئے بیاہے جوڑے کا خیر مقدم کر رہی تھی۔ لیکن تقدیر کی نیرنگی نے اِن سب امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ یہ ہے من سکھی اور سندر رنگھ کے قصے کا سیدھا سادھا خاکا۔ اور بہ ظاہر اس میں کوئی بات غیر معمولی معلوم نہیں ہوتی لیکن جس طریقے سے مصنّف نے یہ معمولی سے واقعات بیان کر دیئے ہیں اُس نے ان میں ایک روح پھونک دی ہے، اور یہی وجہ ہے کہ دنیا کے بہت بڑے بڑے ڈراما نگاروں اور شاعروں نے جن کی مغربی مثالوں میں ہومر اور شیکسپیئر اور ملٹن اور مشرقی مثالوں میں کالی داس اور والمیک اور فردوسی جیسوں کے نام آتے ہیں کبھی اس بات کی پروا نہیں کی کہ جس داستان کو وہ ہاتھ میں لے رہے ہیں طبع زاد ہے یا مستعار لی گئی ہے، یا اس میں حیران و ششدر کر دینے والے عجیب و غریب واقعات ہیں یا نہیں کہانی بجائے خود اس قدر اہم نہیں ہوتی جس قدر وہ انداز جس میں کہانی بیان کی جاتی ہے[۱]۔

سب سے بڑی خوبی اِس کہانی میں یہ ہے کہ یہ ہندوستان کی کہانی ہے۔ اور اِس خوبی کے لئے ہندوستانی اس کی جتنی قدر کریں کم ہے۔ بہت زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ روسیوں کو اہلِ فرنگ ایک جاہل اور غیر متمدن قوم سمجھ کر نظرِ حقارت سے دیکھتے تھے۔ لیکن اس کے بعد جب روس نے گزشتہ صدی میں بعض معرکے کے فسانہ نگار اور شعرا پیدا کئے جنھوں نے روس کا دل چیر کر دنیا کے سامنے رکھ دیا اور روسی معاشرت کی تصویر کھینچ کر اغیار کو دکھا دی تو اہلِ روس کے متعلق وہ پرانا تعصّب یورپ کے دل سے نکل گیا۔ روسی افسانے کی ایک ممتاز خصوصیت یہ ہے کہ افسانے کے مصنّف اور افسانے کے افراد کی مخصوص قومی سیرت اور مخصوص قومی حالات افسانے میں سے چھلکے پڑتے ہیں۔ یہی بات شاہنامۂ فردوسی کا ایک نمایاں وصف ہے بلکہ بڑے بڑے اساتذۂ فن جب اقوامِ غیر کی کسی داستان کو بھی لیتے ہیں تو اُن کی اپنی قومیّت کی روح، اپنی پوری زندگی اور تازگی کے ساتھ اُس میں سے ابل پڑتی ہے شیکسپیئر اِس دعویٰ کی زندۂ جاوید مثال ہے اور خود اردو میں انیسؔ و دبیرؔ اور دوسرے مرثیہ نگار خلوص اور تاثیر کی جس شان کے حامل ہیں، اُس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ اہلِ بیت کی زندگی کو ہندوستان کے مسلمان شرفا کی زندگی میں دیکھتے ہیں۔

ہماری ادبیات کا دور جدید ترجمے کا دور ہے، یعنی آج کل ہم اقوامِ غیر سے مطالب کا سرمایہ اخذ کر رہے ہیں اور غیر زبانوں کے ظاہری و معنوی محاسن کو اپنی زبان میں منتقل کرنے کے عمل میں مصروف ہیں۔ یہ زمانہ بحیثیتِ عمومی ادبی "تخلیق" کا زمانہ نہیں کہلا سکتا۔ مختصر افسانہ جو آج کل اردو ادب کی مقبول ترین صنف ہے اِسی ترجمانہ

---

[۱] "کہانی" اور "کہانی کے اندازِ بیان" کے درمیان یہ تفریق اکثر ماہرینِ فن کے نزدیک واقعی طور پر ممکن نہیں ہے لیکن تفہیم کی غرض سے بہ طور تو ضیح اختیار کرنا پڑتا ہے۔

ماک کا پروردہ ہے۔ اسی لئے افسانوں میں عام طور پر ایک بڑا عیب یہ نظر آتا ہے کہ ہندوستان کی قومی خصوصیات
بمقامی حالات یا تو سرے سے غائب ہوتے ہیں اور یا کافی حد تک واضح نہیں ہوتے۔ جو افسانے "طبع زاد" بیان
ئے جاتے ہیں اُن میں بھی بسا اوقات فسانہ نگار کا دماغ کسی ناموجود ماحول کی ترجمانی کرتا رہتا ہے، حالانکہ کسی خلاق
ماغ کو کبھی نقالی یا مترجمانہ اندازِ فکر و تحریر سے تشفی نہیں ہو سکتی۔ من سکھی اور سندر سنگھ کے قصے کو جب ہم
خالص ہندوستان کی کہانی کہا تو اس کا یہی مطلب تھا کہ یہ ایک زبردست صناع کے دماغ کی خلاقی کا کرشمہ
اور اس کا مصدر خود اُس کی اپنی ذات اور اُس کا اپنا مشاہدۂ حیاتِ انسانی ہے۔ ایران یا انگلستان کی
ی غلامی کی مہر اس قصے پر ثبت نہیں ہوئی۔

ہمارے اُن مختصر افسانوں پر بھی جو زمانۂ حال کی متمدن ہندوستانی زندگی کے واقعی مشاہدے پر مبنی ہوتے
ہیں، زمانے کے عام مترجمانہ میلان کا سایہ پڑے بغیر نہیں رہا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ موجودہ ہندوستانی زندگی
دمغربی زندگی کا ترجمہ ہے، اور یہ ترجمہ بھی ابھی تکمیل کو نہیں پہنچا۔ ہماری تہذیب ایک منزل سے نکل کر دوسری
زل میں داخل ہو رہی ہے اور ہم نہیں کہہ سکتے کہ ہمارے موجود الوقت تمدن کے کون کون سے عناصر کو خالص
ندوستانی معاشرت اپنے اندر جذب کرے گی اور کون کون سے عناصر کو بالآخر رد کر دے گی۔ بہ الفاظِ دیگر اس وقت
ندوستان میں اعلیٰ طبقوں کا تمدن کسی پائدار قومی بنیاد پر قائم نہیں ہے۔ اس لئے اگر ہمیں ہندوستان کے دل
ک پہنچنا ہو تو اِس مصنوعی زندگی کی تصویر کو، خواہ وہ بجائے خود کتنی ہی سچی اور صحیح ہو، ہم اپنے مقصد کے لئے
نام پائیں گے۔ اس کے علاوہ عالمانہ طرزِ گفتگو عام انسانی جذبات اور وارداتِ قلب کی تصویر کھینچنے کے
ئے ہمیشہ غیر تشفی بخش سمجھا گیا ہے۔ کسی قوم کی زندہ تصویر دیکھنی ہو تو اعلیٰ طبقے کے لوگوں سے، جو بڑی حد تک
سانیت کے مصنوعی نمونے بن جاتے ہیں، قطعِ نظر کر کے اُس طبقے کی طرف آنا چاہئے جو بجا طور پر قوم کی ریڑھ
ہڈی کہلاتا ہے۔ کسان تصنع سے آزاد ہوتے ہیں۔ اُن کا طرزِ گفتگو صاف اور قدرتی ہوتا ہے۔ اُن کی ایک ایک حرکت
، اُن کی فطرت بے نقاب ہوتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اُن کے پاس جو کچھ ہے، سب اپنا ہے۔ نقل یا ملمع کو یہاں کوئی
ل نہیں۔ یہی باعث ہے کہ قدیم یونانی تہذیب کے زمانے سے لے کر اب تک مغربی ادیبوں کو ملک کے اِس طبقے کے
س دلچسپی رہی ہے، یہاں تک کہ ادبیاتِ مغرب میں "دہقانی شاعری" نے ایک مستقل صنفِ ادب کی صورت اختیار کی
، بحیثیتِ صناع مصنف کے وجدانِ صحیح کا ثبوت یہی ہے کہ من سکھی اور سندر سنگھ کے قصے میں بادشاہ اور اُس کے
ر غائب ہو جاتے ہیں اور ہندوستان کے امیر اور امیرنیاں منصۂ عمل پر حرکت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ قصہ اس طریقے

پر ہندوستان کی مخصوص قومی سیرت میں دُہری طرح ڈوبا ہُوا مصنف کے دماغ سے اُبھرتا ہے۔

قصے کا پہلا نظارہ ہی ہمیں بتا دیتا ہے کہ ہم ہندوستان میں کھڑے ہیں۔ اہیرپور گاؤں میں سیتلا کا بڑا میلا ہے۔ جاڑے کا موسم نکل چکا ہے۔ گاؤں کے پیچھے جو جنگل پھیلا ہُوا ہے، اُس میں طرح طرح کے بیل بُوٹے اور رنگ رنگ کے پھول کھلنے لگے ہیں۔ صبح ہی صبح گھر کے کام دھندے سے فارغ ہو کر، اپنے اپنے گھروں کے دروازے بند کر کے، گاؤں کے سب چھوٹے بڑے باہر نکل آئے ہیں۔ تمام عورتیں اور مرد ہاتھوں میں پُوجا پاٹ لئے سیتلا کے مندر کو جا رہے ہیں۔ نوعمر لڑکیاں مل جل کر اپنے چھوٹے بھائی بہنوں کو ساتھ لے کر چل رہی ہیں۔ بعض آپس میں ہنس بول رہی ہیں اور بعض سیتلا کے سٹیلے[1] گاتی چلی جاتی ہیں۔ یہاں مصنف ہمیں دو ہم عمر لڑکیوں کی باہمی گفتگو کا نقشہ دکھاتا ہے:-

من سکھی نے پاربتی کو دیکھتے ہی اُس کا ہاتھ پکڑ لیا، اور دونوں کی باتیں ہونے لگیں۔ اس میں پاربتی نے کہا "من سکھی! تیرے بیاہ کو تو پانچ برس ہوگئے ہونگے اور تُو بھی پندرہ برس کی ہوئی۔ اب گونا کب ہوگا؟" اُس نے جواب دیا "ابکے بیساکھ میں بتاویں ہیں۔" پھر پاربتی نے کہا "جی جی[2] تیرا بنرا تو بڑا سندر ہے۔" یہ بات سن کر من سکھی مسکرائی اور کہنے لگی "ہاں جی جی! میں نے بھی اُسے کئی بیر چھپ چھپا کے دیکھا تھا۔ مجھے بھی اُس کی صُورت بھلی لگی تھی۔" پاربتی نے کہا "من سکھی! اب تو تیرے گونے کا مہینا ہی بھر رہ گیا ہے۔ جب تو اپنے بنرے کے ساتھ چلی جائے گی۔ تو مجھ سے کاہے کو ملے گی؟ چھ سات مہینے پیچھے کبھی آئی۔ دو چار دن رہ گئی۔ پھر تُو کہاں اور ہم کہاں!"

یہ پورا منظر جس میں دو دہاتی لڑکیوں کی بول چال کی یہ تصویر دکھائی گئی ہے پہلے ہی ایک صفحے میں گزر جاتا ہے اور پڑھنے والا شروع ہی میں چوکنا ہو جاتا ہے کہ اُسے معمولی قوتِ بیان کے کسی قصّہ نویس سے سابقہ نہیں پڑا۔ پھر مندر میں پہنچ جانے کے بعد یہ عجیب وغریب تصویر آتی ہے:

من سکھی کے چچا نے اپنی بیوی سے کہا "ے موہن کی ماں! پجا پاٹ کال اور چھورے کے ہاتھ سے چھوا کے مہارانی پر چڑھائے۔ اور بھگت جی کو جوڑا پہنائے۔ اور بچھڑے کو چھوڑ دے۔" من سکھی کی چچی نے سب پجا پاٹ چڑھا دیا۔ پھر سب کے سب مندر کے باہر نکلے۔ ایک بھنگی نے آتے ہی مرغ پھڑپھڑایا۔ اور کہا "داتا کی خیر! صدقے کا پیسہ دلاؤ۔" دوسری طرف سے ایک اور بھنگی سؤر کا بچّہ ہاتھ میں لئے ہوئے آیا۔ اور دو چار دفعہ لڑکے کے سر پر وار کے چھوڑ دیا اور کہا "گھیٹے کی چھوڑوائی کا پیسہ مل جائے!" چندر کور نے ان دونوں کو ایک ایک پیسہ دے دیا۔ ذرا ہی آگے بڑھے ہونگے کہ ایک عورت مٹی کی مورت لئے ہوئے سامنے سے نظر پڑی۔ اور چندر کور کو دیکھ کر بولی "کلیجے والی کی بھی بھیٹ چڑھاتی جا" ایک اور

---

[1] تعریف کے گیت [2] اکثر ہندو بہن کو جی جی اور بہنوئی کو جیجا کہتے ہیں۔

بولی "پھپھولے والی سے بھی ڈر" ایک نے کہا "کھلی ماتا کا بھی پیسہ رکھتی جا" من سکھی کی چھپی ایسی خوفناک آوازیں سن کر کانپتی تھی اور ہر ایک کے آگے پیسہ رکھتی جاتی تھی۔ آخر کار جب پیسے دیتے دیتے حیران ہوگئی تو جلدی سے پیچھا چھڑا کر ایک طرف کو چلی اور وہیں کسی درخت کے تلے سب نے جمع ہو کر باسی کھانا کھایا۔

ذرا اس ایک لفظ باسی پر غور کرو۔ اس کے بغیر بھی قصہ بجائے خود قصہ ہی رہتا مگر اس ذرا سی تفصیل نے بات کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ اِن حقیر جزئیات کو سبھی دیکھتے ہیں مگر کتنے ہیں جن کے دل پر ان کا کوئی مستقل نقش رہ جاتا ہے؟ اِس سیدھے سے لفظ کا اضافہ یہاں کسی استاد کا قلم ہی کر سکتا تھا۔ ہندوستان کی دیہاتی معاشرت کے متعلق واقعات کا ایک پورا سلسلہ اس میں پنہاں ہے۔ اِس سے کہیں یہ نتیجہ نہ نکال لیا جائے کہ من سکھی اور سندر سنگھ کے قصے کا مصنف تمام حقیر اور ناقابلِ اعتنا جزئیات کو قابلِ توجہ سمجھتا ہے۔ اُن باتوں کے متعلق جن کے گرد فرومایہ فسانہ نگار رہ رہ کر چکر کاٹتے ہیں اور جن کی تفصیلات دینے میں اُن کے صفحوں کے صفحے سیاہ ہو جاتے ہیں، اِس قصے کا مصنف محض ایک اشارہ کر کے گزر جاتا ہے۔ لیکن یہ اُس کا خاص فن ہے (جو اُس کے کمال کی دلیل ہے) کہ ایک بہت بڑے میلے کے حالات بیان کرتا ہے اور کسی شاندار مندر کے جگ مگ جگ مگ کرتے ہوئے چراغ ہمیں دکھا دیتا ہے۔ گھنٹے، گھڑیال اور سنکھ کی آوازیں سنتے ہیں۔ مندر کے پجاری کا خاموش اور باوقار پیکر، اور پتھر کی مورتوں کے گرد آہستہ آہستہ اُس کا چراغ پھرانا ہمیں نظر آتا ہے۔ مذہبی رسوم کو ایک شانِ تقدیس کے ساتھ ادا ہوتے ہوئے ہم دیکھتے ہیں اور بھجنوں کے دھیمے دھیمے سُر جو سننے والوں کی روح کو احترام و عقیدت سے لبریز کر دیتے ہیں، ہمارے کانوں میں پڑتے ہیں۔ اِس کے بعد دفعتہً ہمیں یہ الفاظ نظر آتے ہیں:

سجان سنگھ نے دو پیسے اس مندر پر چڑھائے

باسی کھانے، یا دو پیسوں کی تفصیل دینا ہر کس و ناکس کا کام نہیں۔ اس قسم کی تفصیلات کو دیکھنے سے ہمیں اندازہ ہو سکتا ہے کہ مصنف اپنے کام سے خود بھی کس قدر لطف اندوز ہو رہا ہے اور اپنے فن کے استعمال سے لطف اندوز ہونا ایک بڑے صنّاع کی امتیازی نشانیوں میں سے ہے۔

مندروں کے متعلق اوپر جو دو اقتباس دیئے گئے ہیں اُن کو پڑھ کر اس مضمون کے ناظرین میں سے جنہوں نے ذرا بھی غور کیا ہوگا اُن کا ذہن فوراً اس حقیقت کی طرف منتقل ہو گیا ہوگا کہ جس شخص کے قلم سے یہ الفاظ نکلے ہیں اُس کا عام اندازِ تحریر ظرافت کی ایک لطیف سی چاشنی سے خالی نہ رہتا ہوگا۔ یہاں ظرافت اور تمسخر کا فرق سمجھ لینا ضروری ہے۔ ظرافت نگاری سے مراد محض ہنسی ٹھٹھا نہیں بلکہ یہ ایک برتر چیز ہے جس کے معیار پر مصنف کے ظرف کی وسعت و بلندی،

ا کی دقیقہ رسی وتیز بینی، فہم کے توازن واستقامت اور ذوق کی لطافت وپاکیزگی کا امتحان ہوجاتا ہے۔ دو
ں کے باہمی عدمِ توافق کو محسوس کرلینا ظرافت کی اصل بنیاد ہے۔ موٹے الفاظ میں ظرافت کی عام تعریف یہ ہے
نام ہے بوالعجبیوں کے احساس کا۔ اِن بوالعجبیوں کی نوعیت اِس لحاظ سے کہ اِن سے مصنف کی دلچسپیوں کے وسیع
دود ہونے کے متعلق کیا پتا چلتا ہے اور پھر اِن بوالعجبیوں کے احساس کی نوعیت کہ مصنف کا ذوق کس حد تک سلیم
یف یا اسکے برعکس ہے، اِس بات کا فیصلہ کرتی ہے کہ ظرافت نگاری کی صف میں مصنف کا پایہ کیا ہے۔ پیارے لال
رافت نگاری میں جو پاکیزگی اور بے ساختگی ہے کوئی شخص اُس کو فی الفور محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ان صفحات
میں ظرافت کی وہ بے اختیارانہ شدت کہیں نہیں ملتی جو پیٹ میں بل ڈال دیتی ہے۔ ایک خاموش ظرافت
ع سے آخر تک قصے کے صفحات کو روشن کررہی ہے۔ ظرافت نگاری کا یہ بہت بڑا کمال ہو کہ تمام قصے میں غالبًا
ں بھی قصے کے افراد کھلکھلاکر ہنستے ہوئے نظر نہیں آتے بلکہ اُن کو غالبًا یہ احساس بھی نہیں ہوتا کہ اُن سے کوئی
لکہ خیز حرکت سرزد ہورہی ہے، لیکن پھر بھی ہم محسوس کرتے ہیں کہ ظرافت کے لطیف ترین جوہر قصے میں موجود
، اس لئے کہ خود مصنف اُن کی بوالعجبیوں پر ایک ملاطفت آمیز تبسّم کی نظر ڈالتا ہوا گزرتا چلا جاتا ہے۔ رام چند
کے شاندار مندر پر دو پیسے چڑھانے میں سجان سنگھ کو کوئی بات خلافِ معمول نظر نہیں آتی۔ لیکن ہم اس پر مسکراتے
یہ اُس "وضع الشئی فی غیر محلہ" کی نہایت عمدہ مثال ہے جس سے ظرافت نگار کا احساس اپنا بہترین سرمایہ
ل کرتا ہے۔ بڑی بات یہ ہے کہ ہم کو ہنسانے کے لئے مصنف واقعات کی تحریف نہیں کرتا نہ حقائق کی صورت
تا ہے۔ کسی مندر پر دو پیسے چڑھانا ایک دہاتی کے لئے کوئی عجیب بات نہیں ہے۔ مصنف نے صرف اُس
عجبی کو کسی قدر واضح کردیا ہے جو اس فعل میں چھپی ہوئی ہے۔

تشریحِ بالا سے یہ ظاہر ہوگیا ہوگا کہ مصنف کا احساسِ ظرافت کس قدر پاکیزہ اور سلجھا ہوا ہے، اور اس کی
فت بعض بعض جگہ اس قدر مصفّا ہے کہ پڑھنے والے کا احساس اگر مساوی طور پر لطیف نہ ہو تو اِس کا نظرانداز ہو
بھی بالکل ممکن ہے۔ اب ہم یہ دیکھیں گے کہ وہ بوالعجبیاں جو مصنف کے احساسِ ظرافت کے لئے موجبِ کشش ہیں
نف کی دلچسپیوں کے وسیع یا محدود ہونے کے متعلق ہمیں کیا پتا دیتی ہیں۔ امیرپور کے مندر میں من سکھی کی چچی کو جو واقعہ
آیا وہ ظرافت نگاری کا ایک اور عمدہ نمونہ ہے۔ بلکہ یہاں مصنف کا ظریفانہ کنایہ صاف اور غیرمشتبہ ہے۔ اس سے ہمیں
ہ ہوسکتا ہے کہ مصنف چھوٹی چھوٹی، تنگ نظرانہ انفرادی اور منتشر جزئیات کو سرِشق ظرافت نہیں بناتا بلکہ
نت کے لئے اُس کی نظر اُتنی ہی وسیع ہے جتنی ہندو قوم۔ وہ اُس رسم ورواج پر مسکراتا ہے جو اُس کی قوم کو

ایک پیچ در پیچ جال میں مضبوطی سے جکڑے ہوئے ہیں۔ جو مذہبی یا معاشرتی رسوم اپنا وقت گزار چکی ہوں اور اُن کی اصل روح فنا ہو چکی ہو وہ مٹی کے بے جان بُت ہیں جنہیں خدا کا نور رخصت ہو کر مُردہ چھوڑ گیا ہے۔ اس کے باوجود ان بے روح پیکروں کی پرستش کرتے چلے جانا ایک مضحکہ خیز بات ہے۔ ظرافت نگار اہلِ قلم اس بوالعجبی کو سب سے پہلے اور سب سے زیادہ شدت کے ساتھ محسوس کرتا ہے۔ خود لطف اٹھاتا ہے اور دوسروں کو اس لطف میں شریک کرتا ہے ہندوستان آج کل اپنی قومی زندگی کے جس دور میں سے گزر رہا ہے اس میں ہندوستانی مصنفین کو ظرافت کا سب سے بڑا سرمایہ رائج الوقت رسوم و اوہام میں مل سکتا ہے۔ پیارے لال کی ظرافت نگاری کا رخ زیادہ تر انہیں چیزوں کی طرف مائل ہے۔ ہم یہاں صرف ایک مثال پیش کرتے ہیں لیکن قصے کو جوں جوں ہم آگے پڑھیں گے، اور مثالیں بھی ضمناً آتی جائیں گی۔

سجان سنگھ اور اُس کا پروہت گیان چند مشر گنگا جی کے کنارے پھر رہے ہیں۔ ایک مندر میں سجان سنگھ ایک مورت دیکھتا ہے اور گیان چند سے پوچھتا ہے "یہ کس کی مورت ہے؟"

گیان چند نے کہا "بھائی سجان سنگھ اس مورت کی بڑی کتھا ہے۔ ارجن کے بھائی راجہ بھیم نے جو بڑے بلوان تھے جب دیکھا کہ اس سنسار میں اُس سے کوئی لڑنے والا نہیں رہا تو اُس کے بازو کھجلانے لگے۔ اور اُس نے اپنے دل میں بچارا کہ میں مہادیو جی کی پوجا کروں تو وہ ضرور مجھ سے آکر لڑیں گے۔ جب مہادیو جی مہاراج اُس سے پرسن ہوئے تو بھینسے کا روپ دھار کر اُس کے سامنے آکھڑے ہوئے۔ بھیم نے چاہا کہ اُن سے لڑے۔ وہ بھاگ نکلے بھیم نے اُن کا پیچھا کیا۔ مہادیو جی زمین میں گھس گئے۔ یہ دیکھ کر بھیم نے اُن کی پونچھ خوب زور سے پکڑ لی۔ اور کہا مہاراج! بھاگ کر کہاں جاتے ہو؟ اب تو میں نہ جانے دوں گا۔ سو پونچھ اور پچھلا دھڑ تو بھیم کے ہاتھ میں رہ گیا اور منہ نیپال کے پہاڑ میں جا نکلا۔ اب منہ کی پوجا نیپال میں ہوتی ہے اور پونچھ اور پچھلے دھڑ کی کدارناتھ جی میں۔ سو یہ کدار ناتھ جی کی مورت ہے۔" سجان سنگھ نے یہ بات سُن کر کہا "مہاراج مہادیو جی بڑے بھولے ہیں! دیکھو! بھگت کے کارن کیا روپ دھارا ہے۔"

لیکن مصنف نے رسمی پابندیوں کو جہاں ہدفِ بذلہ سنجی بنایا ہے، وہاں اُس درد و تاثیر کو بھی جا بجا نمایاں کیا ہے جو ان قدیم رسوم میں چھپی ہوئی ہے۔ بچاری من سکھی کی شادی ہو رہی ہے:

دولھا کے گاؤں میں آتے ہی من سکھی نے گھر سے باہر نکلنا چھوڑ دیا۔ جو کبھی نکلتی بھی۔ تو رات کے وقت ہجولیوں سے ملنے جاتی اور خوب گلے مل مل کر روتی۔ وہ سب کی سب اسے سمجھاتیں "کیوں روتی ہے؟ پندرہ دن پیچھے تیرے چاچا چاچی تجھے بلالیں گے۔"

اور پٹّا پھیر کی رسم میں

جس وقت نائی نے پٹڑوں کو بدلنے کے لئے اٹھایا۔ تو پاربتی جو وہاں کھڑی ہوئی تھی۔ اُس سے کہنے لگی "دیکھ رے! یہ پٹڑے آپس میں ٹکراویں نہیں۔ جو ایسا ہوا تو من سکھی اور جیجا میں سدا کھٹا پٹی رہے گی"۔

ہنسی کھیل کی ان باتوں کے بعد فوراً ہی درد کی اس تصویر کا تضاد کس قدر اثر انگیز ہے:

جب وداع کی تیاری ہوئی من سکھی اپنے سارے رشتہ داروں اور سہیلیوں سے مل کر خوب روئی اور موہن کو گود میں اٹھا کر کہنے لگی: "بھائی تو چاچی سے کہتا رہیو۔ جیجی کو جلدی بلا لے"۔

یہ آخری الفاظ کتنے سچے اور اثر میں ڈوبے ہوئے ہیں!

من سکھی اور سندر سنگھ کی شادی سے پہلے ہی مصنف نے ایک صناعانہ چابک دستی کے ساتھ اُس آنے والے واقعے کی طرف اشارہ کر دیا ہے جو اس دولھا دلھن کی زندگیوں کا رخ پھیر دینے والا ہے۔ واقعات اس طرح ترتیب دیئے گئے ہیں کہ شادی سے فوراً پہلے اور شادی سے فوراً بعد قصے میں وہ تاریک سایہ نمودار ہوتا ہے جو اس شادی پر منڈلا رہا ہے۔ سیتلا کے میلے کی شام کو پہلی مرتبہ سجان سنگھ اپنی بھتیجی کی شادی کے بارے میں اپنی بیوی سے صلاح مشورہ کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے اور ابھی یہ رات گزری ہی ہے کہ صبح ہی صبح وہ شخص کہانی میں داخل ہوتا ہے جسے تقدیر نے نوجوان دولھا دلھن کی قسمت پلٹ دینے کے لئے بھیجا ہے:

جب صبح ہوئی تو نمبردار چارپائی سے اٹھ کر اپنی چلم بھر ماچے پر آبیٹھا اور حقہ پینے لگا۔ تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ ایک فقیر جٹا دھاری کندھے پر مرگ چھالا ڈالے ہاتھ میں چمٹا لئے ہوئے اس طرف سے گزرا اور نمبردار کو ماچے پر بیٹھا ہوا دیکھ کر چپ چاپ اس کے سرہانے آبیٹھا۔ نمبردار نے کہا "مہاراج کہاں سے آنا ہوا؟ کیا چاہئے؟" فقیر نے کچھ جواب نہ دیا۔ نمبردار بولا "مہاراج! کچھ کہئے؟ کیا اچھا ہے؟" فقیر نے کہا "بابا کچھ اچھا نہیں۔ جو تیرا جی چاہے تو ایک سلفا پلوا دے"۔ نمبردار نے اپنے حقے پر سے چلم اتار کر فقیر کے حوالے کی۔ اُس نے ایک ایسا دم لگایا کہ لَو اُٹھ آئی۔ یہ دیکھ کر نمبردار نے کہا۔ "مہاراج! کیا تمبا کو کی چاندی ہی کر دوگے"؟[۱] فقیر نے جواب دیا "سائیں کے بھنڈار میں کچھ کمی نہیں ہے۔ جو تیری یہ مرضی ہے تو ایسا ہی ہو جائے گا"۔ فقیر تو یہ کہہ کر چل دیا اور نمبردار کو گھڑی بھر کے بعد جب پھر حقے کی طلب ہوئی تو وہ چلم بھرنے گیا اور جوں ہی چلم الٹی۔ ایک چاندی کی ڈلی اس میں سے نکل پڑی۔ یہ دیکھ کر نمبردار حیران ہو گیا اور دفعتہً پکار اُٹھا "موہن کی ماں دوڑیو! موہن کی ماں دوڑیو!"

---

[۱] جس وقت حقے کا ایسا دم لگاتے ہیں کہ تمبا کو جل کر راکھ ہو جاتا ہے اُس وقت کہا کرتے ہیں کہ تمبا کو چاندی ہو گیا۔

ہندوستان کے فقیر کی کیسی ہو بہو تصویر ہے! وہ جہالت اور خوش اعتقادی جو ان فقیروں کی پشت و پناہ ہے، سجان سنگھ کی اِس ایک متحیرانہ اضطراری جنبش اور ان چند الفاظ میں اختصار کے ساتھ ظاہر کر دی گئی ہے۔

اجمال سے کام لینا مصنف کے فن کی ایک نمایاں خصوصیت ہے اور اس کے ذریعے سے مصنف نے بڑے بڑے استادانہ کارنامے انجام دیئے ہیں۔ یہ خصوصیت اُن ناظرین کو جو قصے کے اقتباسات مابعد کو توجہ کر پڑھیں کے جا بجا از خود نظر آ جائے گی۔ سندر سنگھ کی اپنی سسرال سے جو نا چاقی ہوئی اُس کا ذکر شادی کی سرگزشت کے ساتھ ہی ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

سندر سنگھ اپنی سسرال میں رہنے لگا۔ مگر وہاں رہنے سے اس کی طبیعت کچھ خوش نہ ہوئی۔ کیونکہ سجان سنگھ اس کو حقیر سمجھ کر ہر وقت طعنے دیتا اور کبھی کبھی یہ کلام بھی اپنی زبان پر لاتا "من سکھی بڑی بھاگی ہے جو تجھ سے نردھن کے پلے پڑی"

اور پھر اِن چند فقروں کے فوراً ابعد وہی مکّار فقیر جو ایک بڑے فتنے کا سرچشمہ ثابت ہونے والا ہے اُسی پہلی خاموشی کے ساتھ دوبارہ نمودار ہوتا ہے۔ شادی کو یقیناً کچھ عرصہ گزر چکا ہے لیکن اس عرصے کی کوئی تفصیلات مصنف نے ہمیں نہیں دیں[۱]۔ اس لئے قصے میں جس ہنرمندی کے ساتھ شادی سے فوراً پہلے اور فوراً ابعد فقیر کا ناگہانی ظہور دکھایا گیا ہے اُس سے ناشاد دولہا دلہن کی بدقسمتی کے متعلق ہمارا احساس زیادہ واضح اور قوی ہو جاتا ہے۔ سجان سنگھ جاہل ہے اور چندر کور اپنے شوہر سے زیادہ جاہل۔ دونوں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر اس فقیر کی مدارات کرتے ہیں۔ سندر سنگھ جو اس قسم کے لٹیروں سے بہت بدگمان ہے پاس بیٹھا سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ فقیر اُس کی نظروں سے بھانپ جاتا ہے کہ یہ میری دال یہاں نہ گلنے دے گا۔ اس پر جس ادا سے وہ رخصت ہوتا ہے وہ مصنف کا اعجاز ہے۔ یہ بات ناظرین کی توجہ میں اکثر آئی ہوگی کہ ہمارے پرانے قصوں میں دو مختلف آدمیوں کے اندازِ گفتگو میں بالعموم کوئی فرق ملحوظ نہ رکھا جاتا تھا۔ کہانیوں میں مکالمے کا جزو اس قدر ناقابلِ التفات خیال کیا جاتا تھا کہ عورت اور مرد، جوگی اور گرہستی، گنوار اور شہری، شاہ اور گدا سب کی زبان ایک ہوتی تھی۔ اِس قصے کی یہ ایک بڑی ادبی فتح اور اصلاحی کارنامہ ہے کہ قصے کے افراد بعینہٖ اسی طرح بولتے ہیں جس طرح واقعی زندگی میں انہیں بولنا چاہئے اور اُن کی ایک ایک بات سے اعلیٰ درجے کی سیرت نگاری کے لوازم پورے ہو رہے ہیں۔ اس کے

---

[۱] یہ مصنف کی انتہائی قرینہ شناسی کا ثبوت ہے کہ کہانی کے اخیر میں چل کر وہ ہمیں بتاتا ہے کہ شادی کے بعد کے زمانے میں کس طرح من سکھی اور سندر سنگھ کا انس بڑھتے بڑھتے عشق کے درجے کو پہنچ گیا۔ اور وہاں اِن تفصیلات نے کہانی میں غضب کی تاثیر اور نوشت بھر دی ہے۔

بعض نمونے محولۂ بالا اقتباسات میں بھی گزر چکے ہیں لیکن یہاں فقیر چلتے چلتے جو بات کہہ جاتا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ "من سکھی اور سندر سنگھ کا قصہ" ڈراما نہیں ہے محض ایک کہانی ہے لیکن فقیر کے یہ الفاظ خود بخود بولتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں اور فقیر سامنے کھڑا دکھائی دیتا ہے:

لے بابا سجان سنگھ فقیر کے دل میں موج آگئی تھی جو تیرے پاس آنکلا تھا۔ اب ہم رمتے ہیں پر ایک بات تجھ سے کہے جاتے ہیں۔ شاید تجھ کو کڑوی معلوم ہو۔ پر یہ بھی کہا ہے۔ آئی بات کو من میں نہ رکھئے۔ یہ لڑکا سندر سنگھ جو تیرا جانا ہے۔ اس کا یہاں رہنا تیرے واسطے اچھا نہ ہوگا۔ ہم نے تو کچھ اور چاہا تھا۔ پر ہونی بلوان ہے۔ اپنا چاہا ہوتا نہیں۔

فقیر کے چلے جانے سے سجان سنگھ غصے میں آجاتا ہے اور سندر سنگھ کو بھی ایک آدھ جلی کٹی سنا دیتا ہے:

سندر سنگھ جو وہیں کھڑا ہوا تھا یہ بات سن کر نہایت ناراض ہوا۔ اور آنسو بھر کر کہنے لگا "اس پاکھنڈی کا جانا تمہارے اچھا ہوا۔ جو میں آج نہ ہوتا تو یہ ضرور تمہارا ستیاناس کر جاتا۔ اور ایسا لوٹتا کہ بدن پر ایک لتا بھی نہ چھوڑتا" سجان سنگھ سندر سنگھ کی طرف مخاطب ہو کر بولا "ارے نربھاگ کیوں جھک مارے ہے۔ میں نے تو تجھ کو اسی دن جان لیا تھا جس دن تیرے ساتھ چھوری کے پھیرے ہونے تھے۔ پر کیا کروں۔ کرموں کی ریکھ امٹ ہے۔ نہیں تو اور میرا گھر"۔ جب سجان سنگھ نے سندر سنگھ کو ایسی سخت باتیں سنائیں، تو وہ بھی بھر آیا اور افسوس کر کے کہنے لگا "بھگوان سب پر دیا رکھے! کسی کو بگاڑے نہیں! جب میں تیرے گھر آکے رہا تو تو نے مجھے یہ باتیں سنائیں۔ لے اب تو جان اور تیرا گھر" یہ کہہ کر سندر سنگھ غصے میں بھرا ہوا مکان کے باہر آیا۔ اور جنگل میں جا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

سندر سنگھ سے ہم یہاں پہلی مرتبہ دو چار ہوتے ہیں لیکن مصنف کے قلم کی چند پے در پے جنبشوں میں اس نیک نہاد نوجوان کی ایک روشن تصویر نگاہ کے آگے آجاتی ہے۔ نیکی کا بدلہ بدی ملتے دیکھ کر رنج کے مارے اس کا آنکھوں میں آنسو بھر لانا اور ایک نئے طعنے پر غصے سے بے تاب ہو کر صرف یہ کہنا کہ "بھگوان سب پر دیا رکھے" پھر اسی غصے میں تیزی کے ساتھ گھر سے نکل جانا اور جنگل میں الگ بیٹھ کر رونا، امور متوقعہ نہیں ہیں بلکہ نئے انکشافات ہیں یعنی ہم اس صورت حالات میں ہر انسان کے متعلق یہ پیش گوئی نہیں کرسکتے کہ وہ اٹھ کر جنگل میں جائے گا اور پھوٹ پھوٹ کر روئے گا۔ یہ ہمیں ایک خاص طبیعت کے آدمی کی کیفیت معلوم ہوتی ہے اور یہی تخصیص و تعیین سیرت نگاری کا کمال ہے۔ ایک اچھا صناع جب اپنی داستان کے افراد کی تخلیق کرتا ہے تو ہر ایک کو ایک جداگانہ سیرت دیتا ہے جو قدرت کے انتظام کے بالکل مطابق ہوتی ہے۔ مثلاً سجان سنگھ کے متعلق ہم یہ تصور نہیں کرسکتے کہ وہ بھی غصے میں یہی طرز عمل اختیار کرتا۔ اُسے غصہ آتا تو وہ غالباً سب سے پہلے اپنا لٹھ سنبھالنے کے لئے دوڑتا۔

اِس واقعے کے بعد سندر سنگھ تہیّہ کر لیتا ہے کہ وہ سجان سنگھ کے گھر میں نہیں رہے گا۔ اور جا کر سپاہیوں میں بھرتی ہو جائے گا۔ من سکھی اُس کا یہ ارادہ سُن کر روتی ہے اور بے اختیار پکار اُٹھتی ہے :

اے تو مرے با باجی! تجھ میں یہ گن تھے۔ تو میرے دھنی کو مجھ سے بچھاڑنے آیا تھا۔ تیرا ستیاناس جائے! آگ لگاؤں تیری جٹاؤں میں۔ پھونک دوں تیرے سونے چاندی کو۔

یہاں من سکھی اور سندر سنگھ کی جو گفتگو ہے وہ فطرت کی ترجمانی کا ایک نیا معجزہ ہے۔ اس میں غور کرنے والوں کے لئے معانی کے دفتر پنہاں ہیں :

پھر سندر سنگھ سے کہنے لگی "کیا تو چلا جائے گا اور مجھے چھوڑ جائے گا؟ دیکھ میں کہے دوں ہوں۔ جو ایسا کیا، تو میری صورت ہی کو ترستا پھرے گا۔ بس دیکھ لی تیری پریت جو پیٹھ دیئے جائے ہے"! سندر سنگھ نے من سکھی سے کہا "تو ہی بتا۔ اب میرا یہاں رہنا کیسے ہو سکتا ہے۔ کیا تو اس بات کو اچھا جانے ہے۔ کہ تیرے چاچا کے روز روز کے طعنے مہنے سنوں؟ دھرکار ہے میرے ایسے رہنے پر۔ نام کو تو میں جمائی تھا، پر تیرے چاچا نے تو کتّے کے برابر بھی آدر نہ دیا۔ اب میں یہاں رہ کر کیا کروں۔ میرا یہاں سے جانا تجھے بھی اچھا ہو گا۔ دیکھ تو بھگوان کیا کرے ہے۔ کیسے دلدر پار ہو ویں ہیں۔ بہت سا روپیہ کماؤں گا اور تیرے واسطے اچھے اچھے گہنے اور اوڑھنیاں بھیجوں گا۔ اور تھوڑے دنوں پیچھے تجھے بھی اپنے پاس بلا لوں گا"

من سکھی نے کہا "جو تو جائے ہے تو مجھے تھوڑا سا بس دیتا جا اور اپنے ہاتھ سے میری کفن کاٹھی کرتا جا۔ پھر جہاں تیرے من میں آئے، چلا جائیو"

سُندر سنگھ کے جانے کے بعد پاربتی آتی ہے :

پاربتی فوراً من سکھی کی کوٹھڑی میں گئی اور کہا "جی جی! آج کیا ہے؟ جو تو ایسی اداس پڑی ہے"! من سکھی اسے دیکھ کر رو پڑی اور کہنے لگی "اس سے تو مرجانا ہی اچھا ہے تَیں نے سنا نہیں؟ آج تیرا جیجا نکل گیا۔ پاربتی! دکھ میں کوئی کسی کا ساتھی نہیں۔ کس کا چاچا کس کی چاچی۔ جو آج میرے ماں باپ ہوتے تو میں ایسی نرآدری کیوں ہوتی"!

"تَیں نے سنا نہیں؟ آج تیرا جیجا نکل گیا"! صرف یہی الفاظ من سکھی اور سندر سنگھ کے مصوّر کی استادی کا لوہا منوانے کے لئے کافی ہیں۔

ایک بہت بڑی خوبی جو کسی فسانہ نگار میں ہو سکتی ہے، یہ ہے کہ اُسے اپنے قلم پر قابو اور اپنے جذبات پر ضبط حاصل ہو یعنی اپنی داستان میں کسی خاص موقعے کی اہمیّت اُس کو اِس درجہ متاثر نہ کرے کہ اُس کے بیان میں بے محابا پھیلاؤ پیدا ہو جائے۔ اِس وصف میں بہت کم مصنف پیارے لال پر تفوق رکھنے کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔ من سکھی اور سندر سنگھ کے سینے

میں جذبات کا جو سمندر موجیں مار رہا ہے اُس کی ایک جھلک اُس نے ہم کو دکھا دی ہے لیکن اس کے بعد اُس کے خاص انداز فن سے یہ بعید ہے کہ وہ رہ رہ کر اسی موضوع کے گرد چکر کاٹتا رہے۔ اس کے بعد نئی دلچسپیاں اور نئے واقعات بہ ظاہر اُس کی توجہ کو تمام تر اپنی طرف جذب کر لیتے ہیں۔ من سکھی کا چچیرا بھائی جو موہن سے چھوٹا ہے چیچک کا شکار ہو کر چل بستا ہے۔ سجان سنگھ اپنے کنبے سمیت گنگا اشنان کو روانہ ہوتا ہے۔ گاؤں کے اور لوگ بھی چھکڑوں کا ایک قافلہ بنا کر اسی طرف کو روانہ ہوتے ہیں۔ عورتیں راگ گاتی ہوئی نکلتی ہیں؛

رام!
جمنا اُرے گنگا پرے اور بیچ بہے دریاؤ
رادھا پیاری ہے!
لینا جھکولے ٹھنڈے نیر کے
پہلا جھکولا میرے رام کا جن یہ سرشٹ اپائے
رادھا پیاری ہے!
لینا جھکولے ٹھنڈے نیر کے
دوجا جھکولا میرے باپ کا جن منڈھا چھوایا
رادھا پیاری ہے!
لینا جھکولے ٹھنڈے نیر کے

اسی طرح سات آٹھ جھکولے گزر جاتے ہیں اور ہم سمجھتے ہیں کہ مصنف کی توجہ انہیں نئی دلچسپیوں میں غرق ہے لیکن ایکا ایکی وہ ہم کو اس بات کا ثبوت دے کر چونکا دیتا ہے کہ صرف ایک زبردست قوت سے اُس نے اپنے قلم کو تھام رکھا تھا، ورنہ من سکھی کے متعلق خود اُس کے احساسات بھی اُسی قدر بیدار تھے جس قدر اُس کے قصّے کے ناظرین کے۔ عورتیں گاتے گاتے نویں جھکولے تک پہنچتی ہیں:

نواں جھکولا میرے پُرکھ کا جو لایا تھا سودھر موڑ
رادھا پیاری ہے!
لینا جھکولے ٹھنڈے نیر کے

اس کے بعد ہم ناگہاں یہ عبارت پڑھتے ہیں:

من سکھی بھی اس راگ کے گانے میں شریک تھی مگر اُس کی آواز میں کچھ خوشی نہیں پائی جاتی تھی۔ اور جب نویں جھکولے میں

پڑیک کا نام آیا تو یکایک اُس کے آنسو نکل پڑے۔

مصنف نے صرف ان چند آنسوؤں سے من سکھی کے متعلق اپنی خاموشی کی پُوری تلافی کردی ہے۔ یہ کمالِ فن کی انتہا ہے من سکھی کے نہ مٹنے والے رنج کا جیسا نقشہ اس طریقے پر پیشِ نظر آگیا ہے ویسا شاید تفصیلات کے بیان کر دینے سے بھی نہ آتا۔ ان دو چار آنسوؤں نے ایک پورے صفحے کو جگمگا دیا ہے۔

گنگا جانے والوں کی کیفیت بجائے خود ایک نادر چیز ہے اور اس کی سطر سطر سے ہندوستان کے مقامی حالات کی تصویر کھنچتی چلی جاتی ہے۔ کھیتوں سے گھرے ہوئے میدانوں میں چھکڑوں کی قطار، مسافروں کا شور، بیل ہانکنے والوں کی پکار، گنگا مائی کے جیکارے، کچھ پیادہ پا لوگوں کا ہاتھ میں لاٹھی لئے ہوئے اور بعض کا گھوڑوں پر سوار ہو کر ساتھ چلنا، پھر دو گھڑی دن رہے پڑاؤ پر پہنچنا اور بیلوں کا کھولنا، صبح توپ چلنے پر چھکڑوں کی روانگی، سب اگرچہ نہایت دلچسپ ہیں لیکن اسی سفر کے ایک پڑاؤ میں ہندوستان کی خانگی زندگی کا ایک شیریں اور دلنشیں نظارہ جو مصنف نے دکھایا ہے وہ اپنی لطافت میں حیرت انگیز اور لاجواب ہے:

من سکھی اور پاربتی بھی گانے میں شریک تھیں۔ مگر موہن ہر گھڑی اُن کے بیچ میں آبیٹھتا اور غل مچانے لگتا۔ من سکھی نے پاربتی سے کہا "جی جی! پہلے میں اپنے بھائی کو سُلا آؤں۔ پھر آکے گاؤں گی۔" یہ کہہ کر موہن کو گود میں لے گئی اور چھکڑے میں لٹا دیا۔ مگر وہ اٹھ کر ضد کرنے لگا اور بولا "میں سو رہوں گا تو تُو پھر وہیں چلی جائے گی۔" من سکھی نے کہا "نہیں بیرن! لے میں ایک پہیلی کہوں۔ بتاوے گا؟" موہن نے کہا "کہہ"۔ من سکھی بولی "کھیت میں اپجے سب کوئی کھائے۔ گھر میں ہوئے تو گھر بہ جائے۔" موہن نے جواب دیا "بھلی پہیلی کہی۔ یہ تو پھوٹ ہے پھوٹ۔" پھر من سکھی نے کہا "اچھا! یہ بتا۔ ہری تھی من بھری تھی سوا لاکھ موتی جڑی تھی۔ راجہ جی کے باغ میں دوشالہ اوڑھے کھڑی تھی۔" موہن نے کہا "جی جی! یہ تو نہیں بتائی جائے۔ تو ہی بتادے۔" وہ بولی "کہہ ہارا۔ جھک مارا۔ کوئیں کا پنہارا۔" موہن نے کہا "یہ تو نہیں کہوں۔" من سکھی نے کہا "اچھا تو بتا ہی دوں۔ کوکڑی ہے۔" اس کے بعد من سکھی نے اور بہت سی پہیلیاں کہیں۔ پھر موہن نے کہا "جی جی اب تو کوئی کہانی کہہ۔" من سکھی نے اس کے آگے ایک کہانی کہنی شروع کی۔ اتنے میں موہن کی آنکھ لگ گئی۔ اور من سکھی اُٹھ کر پاربتی کے پاس جا گانے میں شریک ہوگئی۔

انہیں تفصیلات میں کئی صفحے گزر جاتے ہیں لیکن مصنف پھر اچانک ہمیں یاد دلا دیتا ہے کہ اُس نے اپنی کہانی کے اصل موضوع کو فراموش نہیں کیا۔ من سکھی یکایک پاربتی سے کہتی ہے کہ وہ بھی دوسری عورتوں کی طرح پیپل کی پوجا کرے گی:

من سکھی نے کہا "رے تو جی جی! اب تو جا کے تھوڑا سا دود لاتے ہیں کوئیں پر سے پانی لاؤں ہوں" جب دود اور

پانی آگیا تو من سکھی نے دونوں کو ملا کر۔ اُس میں پھول۔ بتاسے اور رولی ڈالی۔ پھر اُسے پیپل پر چڑھا کر اُس کے آگے گھی کا ایک چراغ روشن کر دیا۔ اور آپ ہاتھ باندھ کر بیٹھ گئی۔ اور کہنے لگی۔ "ہے پیپل دیوتا! جو میرا مالک آجائے تو میں تجھے ہر سنیچر دھاؤں گی۔"

پوجا کی رسم کی تمام تفصیلات متعلقہ کو ہم دلچسپی سے پڑھتے ہیں اس لئے کہ اس تمام عمل میں من سکھی کی جو قلبی کیفیت ہے وہ ہمارے لئے موجب دلچسپی ہے۔

گڑھ مکتیسر کے میلے میں سجان سنگھ کی مڈبھیڑ پھر اُسی پاکھنڈی فقیر سے ہوتی ہے اور یہ مژدہ وہ آکر اپنی بیوی کو سناتا ہے۔ چندر کور یہ بات سن کر بہت خوش ہوئی مگر من سکھی نے جس وقت باباجی کا نام سنا اپنے دل میں ہزاروں گالیاں دیں۔ اور پاربتی سے کہا۔ "پہلے تو یہ کچھ کر گیا اب اس کا کھوجڑا جائے جانے کیا کرے گا؟"

سجان سنگھ فقیر کو اپنے پاس روکنا چاہتا ہے کس قدر سیدھے سادے الفاظ یہاں استعمال کئے گئے ہیں۔ مگر یہ الفاظ نہیں ہیں، یہ ایک متحرک تصویر ہے۔ چھکڑوں کی قطار پاس سے گزرتی جارہی ہے لیکن سجان سنگھ اور فقیر الگ ایک درخت کے تلے کھڑے گفتگو میں محو ہیں۔ سجان سنگھ ہمہ تن شوق ہے اور فقیر ہمہ تن انکار۔ اور جہالت کا ذوق عقیدت جس قدر زیادہ بیتاب ہوتا ہے، خرقہ پوش زہد اپنے شکار کو قابو میں پاکر اُسی قدر زیادہ استغنا اور تمرد کا ثبوت دیتا ہے غرور و خود پسندی اور عجز و الحاح دُو بدو کھڑے ہیں۔ یہ موقع ہے جب ایکا ایکی

سجان سنگھ فقیر کے قدموں پر گر پڑا۔ فقیر نے کہا "سجان سنگھ! کیوں دیر کرتا ہے؟ میلا تو نکلا جاتا ہے!" اُس نے کہا "مہاراج! میں کہاں جاؤں؟ ...."

اس ضمن میں مصنف سجان سنگھ کے پروہت گیان چند کو اپنی لطیف اور بے ہیش ظرافت کا ہدف بناتا ہے:

گیان چند چھکڑے پر بیٹھا ہوا دل ہی دل میں جلتا تھا اور کہتا تھا "دیکھو سجان سنگھ کیا پاگل ہوا ہے۔ چھکڑا چھوڑ کر فقیر کے ساتھ پیدل ہو لیا ہے بھلا اس پاکھنڈی میں کیا رکھا ہے جو اس کی اتنی چاپلوسی کرتا ہے۔ آخر لٹے گا بھلا کس جلا ہے کے ساتھ ہو لیا ہے۔ جو کسی پنڈت کی سیوا کرتا تو اچھا بھی تھا۔"

لیکن مصنف کی ظرافت نگاری کا نقطۂ کمال وہ مقام ہے جہاں قصے کی دردناکی قصہ لکھنے والے کی پاکیزہ ظرافت کے ساتھ مل جاتی ہے:

فقیر سب سے الگ ہو کر ایک کونے میں جو بیٹھا اور ظاہر میں خدا کا دھیان کرنے لگا سجان سنگھ اس عرصے میں پوری جمع کرتا رہا۔ من سکھی نے جو مہمانوں کو کھانا کھلا رہی تھی۔ دُور سے فقیر کو دیکھ کر کہا "مرجانا بگلا بھگت بن کے بیٹھا ہے۔"

اگر یہ ممکن ہے کہ کسی طرح الفاظ میں جادو بھر دیا جائے تو وہ اِس آخری جملے میں ہے۔ بولنے والی کا نوخیز چہرہ آن واحد میں اُبھر کر ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے اور پھر سیرت کے اظہار میں بھی اِن چند الفاظ کا رتبہ اِس قدر بلند ہے کہ پورے قصے میں بہت کم فقرے اس اعتبار سے اِن کی ہمسری کر سکتے ہیں۔ یہ الفاظ من سکھی کے جس درد والم کا پتہ دیتے ہیں اُس کے باوجود ہم تصور میں سب اُس کی پیشانی کی شکنیں دیکھتے ہیں تو مسکرائے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اور یہ مصنف کے کمالِ فن کی دلیل ہے۔

اس کے بعد کی رات کو من سکھی کا خواب عجیب بے مثال چیز ہے اور پڑھنے کے قابل ہے۔ یہاں قصے کا آخری حصہ آپہنچا ہے۔ اب واقعات کی رفتار میں بالکل قدرتی طور پر یک بیک سرعت آگئی ہے اور قصہ اپنے انجام کی طرف تیزی سے بڑھنے لگا ہے۔ فقیر کا رات کی تاریکی میں دبے پاؤں آنا اور چوری چوری موہن کا ہاتھ کھینچنا من سکھی کا جاگ اٹھنا اور شور مچانا، فقیر کا اُس کی کنپٹی پر لاٹھی کا ایک تلا ہوا وار کر کے اُسے بے ہوش چھوڑ جانا اور موہن کو چُرا لے جانا، سندر سنگھ سے مڈبھیڑ اور موہن کی نجات یہ سب باتیں ڈیڑھ دو صفحوں کے اندر اندر گزر جاتی ہیں۔ مصنف حسب معمول من سکھی کے متعلق کچھ نہیں بتاتا کہ اُس کا زخم خطرناک ہے یا معمولی۔ اس کے بعد ہم سجان سنگھ کو سندر سنگھ سے باتیں کرتے ہوئے دیکھتے ہیں اور اِس گفتگو میں اچانک سجان سنگھ کے یہ الفاظ سُن کر چونک اُٹھتے ہیں:

تمہارا کہنا سچ نکلا۔ اس چنڈال بیراگی نے ہمارا گہنا بھی لوٹا اور پھر چھورے کو لے کر بھاگا۔ اور کیا کہوں چھوری کے ایسا سونٹا مارا کہ اس کا بچنا بھی دوبھر ہے۔

عرصے کی جدائی کے بعد دولہا دلہن پھر ملتے ہیں مگر اس حالت میں کہ دلہن مجروح ہو کر ایک چھکڑے کے نیچے زمین پر پڑی ہے۔ چہرے کا رنگ اڑ گیا ہے اور لمبے لمبے بال خاک میں کھلے ہوئے پڑے ہیں۔

من سکھی نے اُس وقت آنکھیں کھول دیں اور سندر سنگھ کی طرف نظر پڑی۔ تو اُس کی آنکھیں بھر آئیں۔ اور چاہا کہ اُس کے چہرے کی طرف دیکھتی رہے۔ مگر لحاظ کے سبب سے اپنا منہ پھیر لیا۔ جب چندر کور نے یہ حال دیکھا۔ تو اُس نے اپنے خاوند اور سب لوگوں کو جو وہاں کھڑے تھے اشارے سے ٹال دیا۔

گزری ہوئی باتیں اِس وقت تصویر کی طرح سندر سنگھ کے ذہن میں پھر جاتی ہیں:

سندر سنگھ حیران بت سا کھڑا تھا اور دل میں کہتا تھا۔ ہائے کیا تھا کیا ہو گیا! کبھی اسے اپنی شادی کی امنگ اور من سکھی کے ساتھ کنگنا کھیلنے کا دھیان آتا۔ کبھی شوخی اور چھپلاہٹ سے اُس کے یہ کہنے کا خیال آتا کہ "دیکھیں پہلے کنگنا کون لے"! کبھی من سکھی کا اُس کی ماں کے روبرو بیروں پڑنا۔ اور گھر کے سب آدمیوں کا ادب کرنے اور سب چھوٹے بڑوں کو خوش رکھنے کا تصور بندھ جاتا۔ کبھی اس کا پیار سے یہ کہنا۔ کہ "مجھے جگ میں

تجھ سے زیادہ کون ہے" یاد آتا۔ اور کبھی یہ سوچتا۔ کہ جب میں کھیت پر جاتا تھا تو یہ میری راہ دیکھا کرتی۔ اور تھوڑی سی دیر میں غم کے مارے مرجھا جاتی۔ اور پھر جب میں اس کے پاس آتا تو مجھے دیکھ کر کھل جاتی۔ کبھی اپنے دل میں یہ کہتا کہ ہائے! یہ وہی من سکھی ہے۔ کہ جب میں سجان سنگھ کے طعنے سُن کر جنگل میں جا کر رہا۔ اور پھر اُس سے ملنے گیا تو چیخ مار کر بولی "جو تو جائے ہے تو مجھے تھوڑا سا بس دیتا جا"

سندر سنگھ کے بے اختیار نکلنے والے آنسو اس حیرت کا طلسم توڑ دیتے ہیں:

آخر کار وہ اپنا منہ ڈھانپ کر بے اختیار رو پڑا اور زمین پر گر کر من سکھی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہنے لگا "ہائے! میں تجھے اس واسطے چھوڑ کر گیا تھا۔ کہ یہ دن دیکھوں۔ جو میں یہاں رہتا۔ تو تیرا یہ حال کاہے کو ہوتا۔ وہ کون سی بُری گھڑی تھی جب میں یہاں سے گیا۔ اب ذرا آنکھ کھول اور دیکھ تیرا سندر سنگھ آگیا۔ اور اب تجھے چھوڑ کر کہیں نہیں جائے گا۔ پر تو اسے چھوڑ کر چلی"

من سکھی اپنا ہاتھ اُس کی گردن میں ڈال دیتی ہے:

"میں تو کتنے دن سے تیری باٹ دیکھ رہی تھی۔ اب مجھے مرجانے کا تو کچھ فکر نہیں ہے پر یہ سوچ تھا کہ تیرے ملے بدوں مرجاؤں گی۔ سو بھگوان نے تجھے بھی بھیج دیا"

یہ بات سُن کر سندر سنگھ کا کلیجا پھٹتا ہے اور وہ اپنی بیوی کو تسلّی دینا چاہتا ہے:

..... من سکھی نے کہا تو کیوں چنتا کرے ہے؟ تھوڑے دن پیچھے تیرا دوسرا بیاہ ہو جائے گا۔ اور سارا دکھ جاتا رہے گا۔ پر بچاری من سکھی کہاں!"

لیکن سندر سنگھ پھر کوشش کرتا ہے کہ اپنی کامیابیوں کی داستان سُنا کر من سکھی کے دل کو مطمئن کر دے:

دیکھ۔ اب تو بھگوان نے دن بھی پھیر دئے ہیں۔ سجان سنگھ جو پہلے طعنے دیا کرتا تھا۔ اب موم ہو گیا ہے۔ اور بڑی خوشامد کرے ہے۔ اور روپے بھی ہمارے ہاتھ گھنے سے لگے ہیں۔ اب میں تیرے پاس سے پل بھر کو نہیں ٹلوں گا۔ اور تجھے اپنی جان کے برابر رکھوں گا۔ یہ بات سُن کر من سکھی کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اور کہنے لگی۔

"جو میں جیتی رہتی تو تُو بھی دیکھتا پریت کیسی ہووے ہے۔ پر میری زندگی مت سمجھیو۔ میں تو دھرتی پر یوں ہی آئی اور یوں ہی چلی۔ جب بالک تھی تو ماں باپ مر گئے۔ اور جب بڑی ہوئی اور تجھ سے ملی۔ تو یہ سمجھی کہ اس جگت میں آنے کا پھل مل گیا۔ پر رام چاہے سو کرے۔ یہ بھی بڑی بات ہے کہ تیرے ہاتھ سے مٹی تو ٹھکانے لگ جائیگی"

خاتمہ کتنا موثر اور حسرت ناک ہے۔

پھر من سکھی نے سندر سنگھ کا ہاتھ اپنے منہ پر رکھ لیا۔ اور چپ چاپ آنکھیں بند کئے ہوئے پڑی رہی۔ جب اس طرح پڑے ہوئے تھوڑی سی دیر ہوگئی۔ اور سندر سنگھ نے اس کے جسم میں کچھ حرکت نہ پائی اور نہ سانس آتا جاتا دیکھا تو گھبرا کر اُسے پکارنے لگا۔ اور بہت سی قسمیں دلائیں۔ مگر کچھ جواب نہ پایا۔ تب تو بے قرار ہو کر اُس کے ہونٹوں پر ہونٹ رکھ دیئے اور ایک بارگی چلا اُٹھا "لوگو! میں لٹ گیا"۔

زرد و حسرت کی اِس تصویر کے ساتھ انسانی خود غرضی اور شقاوت کے حسب ذیل مظاہرے کا تضاد کس قدر واقعیت کا رنگ لئے ہوئے ہے۔ من سکھی کے مرجانے کے بعد سب لوگ اُس کی لاش کے پاس جاتے ہیں:

پاربتی نے بھی وہاں جانے کا ارادہ کیا۔ مگر اُس کی ماں نے یہ اندیشہ کیا کہ ایسا نہ ہو۔ مردے کے پاس جانے سے اس کو کچھ ہو جائے اور یہ سوچ کر اس سے کہا۔ "تو موہن کو لئے بیٹھی رہ"۔

یہ واقعہ مصنّف کی بے دردانہ حقیقت نگاری کی دلیل ہے۔ من سکھی کو بھی یہی حقیقت پرستی موت کے گھاٹ اتار دیتی ہے۔ اور کمزوری کا کوئی جذبہ مقتضیاتِ فن کے خلاف مصنّف پر غالب نہیں آسکتا۔ یہی اصول قصّے کے انجام تک مصنّف کی رہنمائی کرتا ہے۔

من سکھی کی موت کے بعد کے واقعات مصنّف نے کسی قسم کی رنگ آمیزی و جذبہ آرائی کے بغیر نہایت سادگی سے بیان کئے ہیں:

سندر سنگھ وہاں سے اٹھ کر ایک طرف جا بیٹھا۔ و دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ جب سب کو روتے پیٹتے گھنٹہ بھر ہو گیا۔ تو گیان چند نے کہا۔ "روؤ گے تو ساری عمر۔ پر اس کی مٹی تو ٹھکانے لگاؤ۔ گنگا یہاں سے دور ہے۔ سورج چھپنے سے پہلے اس کو پھونکنا چاہیئے"۔

گیان چند ہمیشہ سمجھ کی بات کرتا ہے اور باوجود اِس کے کہ وہ قصّے کے زیادہ اہم افراد میں سے نہیں ہے، اُس کی سیرت کافی حد تک واضح معیّن اور یک رنگ ہے۔ قصے کے آغاز میں جب سجان سنگھ نے سندر سنگھ کو اپنے گھر سے رخصت ہو جانے پر مجبور کر دیا تو

گیان چند مشر نے جس وقت یہ حال سنا۔ فوراً سجان سنگھ کے پاس دوڑا گیا اور کہا۔ "چودھری جی یہ بات تمہارے جوگ تھی۔ کہ تم اپنے بھائی کو نکال دو؟ بھائی کسی کا ایک سا سا نہیں رہا۔ کیا تمہیں اس کا آدھ سیر آٹا دوبھر تھا؟ ان دنوں کو بھول گئے؟ جب تمہارا امیر پور کا گاؤں اُس کے دادا کی چودھرایت میں تھا۔ بھائی کیا ٹوٹا

آجاتا؟ جواہیر کا چھورا اپنے کرڑے کیلئے دن ہمارے گھر کاٹ جاتا؟"

اسی طرح جس وقت فقیر کے جھانسے میں آکر سجان سنگھ موہن کا زیور زبردستی اتارنا چاہتا ہے، گیان چند پاس سے گزرتے گزرتے رک جاتا ہے اور موہن کو اٹھا کر سجان سنگھ سے یُوں مخاطب ہوتا ہے:

"چودھری جا بھی۔ کیوں ہٹ کر رہے ہے۔ ناحق لڑکے کو دکھی کر رکھا ہے۔ اس کی روتے روتے ہچکیاں بھی بندھ گئی ہیں۔"

پُورے قصّے کو پڑھنے پر چندر کور تنک کی ایک نمایاں انفرادی سیرت تصور میں قائم ہو جاتی ہے اور یہ اس قدر صاف ہے کہ ہر شخص قصّے کو پڑھ کر بطور خود اسے سمجھ سکتا ہے۔

من سکھی کی موت کے بعد کی رسوم سندر سنگھ کے ہاتھوں ادا ہوتی ہیں مگر یہ سب باتیں اصل قصّے کے ساتھ پڑھنے کی ہیں۔ جب سندر سنگھ کریا کرم سے فارغ ہو جاتا ہے تو سجان سنگھ چاہتا ہے کہ اُس کو اب اپنے ہی پاس رکھے لیکن سندر سنگھ یہ بات نہیں مانتا:

اتنے میں پاربتی بھی آگئی اور دیر تک یہ باتیں سنتی رہی۔ پھر کہا "جیجا! ادھر آ۔ میں تجھ سے ایک بات کہوں۔" سندر سنگھ اُٹھ کر اس کی طرف چلا گیا۔ وہ بولی "اب جیجا! تو یہاں سے کیوں جاتے ہے۔ رسالے میں جا کر کیا کرے گا؟ تُو تو یہیں کھیتی کیاری کیا کر۔ یا اپنے باپو کے گھر جا رہیو۔" سندر سنگھ نے کہا "واہ تو تو جان بوجھ کر ایسی باتیں کہے ہے۔ بھلا اب جی کر کیا کروں گا؟" پھر پاربتی نے کہا "جیجا ایسی بات نہیں کہیں ہیں۔ اب تو تیرے پاس گھنے روپے ہیں۔ اور تیرے ماں باپ بھی تیرے لئے روتے ہوں گے۔ اب جا اور ان کو سکھ دے۔ دیکھ۔ ان کی آومت لے۔" یہ سن کر سندر سنگھ نے کہا "میں تجھے کہاں تک سمجھاؤں؟ تو تو جانے ہے مجھ کو تیری بہن سے کیسی پریت تھی۔ ..."

"میں تجھے کہاں تک سمجھاؤں!" یہ جملہ کتنا حسرت بھرا ہے۔ بچارے سادہ دل اہیر نے سمجھایا کچھ بھی نہیں مگر سمجھتا یہی ہے کہ میں نے سب کچھ سمجھا دیا، اس لئے کہ خود اس کے دل میں اپنی لازوال محبت کے متعلق تشریحات کی ناگفتہ داستانیں چھپی ہوئی ہیں۔ لیکن اس کے بعد اس کا رنج عظیم خود ہی اُسے طاقتِ اظہار دے دیتا ہے:

"میرا جینا تو اُس کے ساتھ تھا۔ اب بھگوان نے اُسے اٹھا لیا۔" بس اتنا ہی کہا تھا کہ اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور پھر رُک کر کہنے لگا "پاربتی میں کیا کروں؟ میرا دل میرے بس میں نہیں ہے۔ تیری بہن کی صورت آٹھ پہر میرے من میں بسی رہے ہے۔ مجھے نہ دن کو چین ہے۔ نہ رات کو نیند۔ اور اس گاؤں میں جس چیز کو میں دیکھتا ہوں۔ مجھے سب اُس کی یاد دلاویں ہیں۔"

رخصت کے وقت اُس کے الفاظ میں وہ تاثیر ہے جیسے درد دل اور خلوص ایک دہقان کی زبان میں ہی۔

پیدا کر سکتے ہیں:

چلتے وقت موہن کو گود میں اٹھا کر پیار کیا۔ اور ایک روپیہ اس کے ہاتھ پر رکھ کر کہا "جو تجھے جان کے برابر رکھے تھی۔ وہ تو مرگئی۔ اب تو اُسے اور مجھے یاد رکھیو" اور پھر پاربتی کو بلا کر کہا "لے رام رام پاربتی! جیسی پریت تیں نے اُس کے ساتھ کی۔ اور جیسی تیں نے میری دھیر بندھائی۔ بھگوان تجھے راضی رکھے۔ اب ہمارا تیرا ملنا نہیں ہوئیگا۔ جہاں تو اُسے یاد کرے وہاں مجھے بھی یاد کر لیجیو۔ اب میرے جینے کا بھی کچھ بھروسا نہیں ہے۔"

قصّے کے انجام میں بھی حقیقت و صداقت کے ساتھ مصنّف کی وابستگی اُسی پہلی بے رحمانہ سختی سے قائم رہی ہے۔ اور کوئی بیرونی خیال اُسے مقتضیاتِ فن سے سرتابی کرنے پر آمادہ نہیں کر سکا۔ یہ آنکھوں میں آنسو بھر لانے والا نوجوان جو قصّے کے آغاز میں سجان سنگھ کے گھر سے رخصت ہوا تھا، اب خود قصّے میں سے اُس شان کے ساتھ رخصت ہوتا ہے جو اُس کا حق ہے۔ انجام اگر یوں نہ ہوتا۔ تو وہ آب جو قصّے کی موجودہ صورت میں ہم کو نظر آتی ہے یقیناً کسی حد تک ماند پڑ جاتی۔ ایک کسان لڑکی اور کسان لڑکے کی سیدھی سادھی محبت کی داستان کو ایک رزمیہ نظم کے تخیل کی عظمت و شان سے کوئی خاص مناسبت معلوم نہیں ہوتی۔ لیکن داستان کے آخری واقعے کی اہمیت اور پھر اندازِ بیان کی وہ خاموشی جس سے یہاں کام لیا گیا ہے بے اختیار انگریزی کی سب سے بڑی رزمیہ نظم کے خاتمے کی یاد دلا دیتی ہے۔ پیارے لال کی خاموش اور شفّاف روانی کو ملٹن کے شکوہ و جلال سے کوئی نسبت نہیں ہو سکتی۔ بایں ہمہ درد و کرب کے ایک طوفان کو سمیٹتا ہوا جس سکون کے ساتھ یہ قصّہ انجام کو پہنچتا ہے اُس میں وہی ادا جھلکتی ہے جس سے انگریز شاعر نے آدم اور حوّا کے بہشت سے نکلنے کا ذکر کیا ہے:

پھر اہیر پور پر جہاں ایسے دکھ اٹھائے تھے آخر نظر ڈال کر اپنے رسالے میں چلا گیا۔ اور وہاں رات دن من سکھی کے خیال میں رہا۔ اور انجام کار اسی غم میں گھل گھل کر مرگیا۔

حمید احمد خاں

ضمیمہ

اس مضمون کا بیشتر حصّہ قلم بند ہو چکا تھا کہ راقم الحروف کو اسی سلسلے میں مولوی محمد یحیٰی صاحب تنہا کی "سیر المصنفین" جلد دوم کی طرف توجہ دلائی گئی جنہوں نے اپنی کتاب کے ایک حاشیے میں مسٹر پیارے لال کے لئے بھی تھوڑی سی جگہ نکالی ہے۔ اس طرح مسٹر پیارے لال کے متعلق کچھ نئی معلومات بہم پہنچیں جن کو پڑھ کر اپنی اس مجرمانہ غفلت پر اور زیادہ افسوس ہوا کہ ایک ایسے جوہرِ قابل کی ہستی اب تک کیوں گلدستۂ طاقِ نسیاں بنی رہی۔ پنجاب کی نوجوان نسل کے زمانۂ طالب علمی سے پہلے "رسوم ہند" نصابِ تعلیم سے خارج ہو چکی تھی اور بعد میں اسے کوئی

نقل ادبی حیثیت حاصل نہ ہونے کی وجہ سے رُوپوش ہونا پڑا۔ اس لئے اس کتاب سے ہماری ناواقفیت باعثِ تعجب نہیں۔ البتہ رنج کا مقام یہ ہے کہ اردو
یسری کتاب" یا "قصصِ ہند" جیسی کتابیں جو غالباً ہم سب نے پڑھی ہیں، اب تک ایک عام مغالطے کی بناپر بالعموم مولانا محمد حسین آزاد سے منسوب کی
تی رہیں حالانکہ ان کا حقِ تصنیف ماسٹر پیارے لال کو پہنچتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی خالی از دلچسپی نہیں کہ ماسٹر پیارے لال ہی کے رسوخ اور
ردانہ کوشش سے محکمۂ تعلیم پنجاب نے آزاد مرحوم کی قابلیت کو پہچان کر اُن کی قدردانی کی تھی (رہبر المصنفین جلد دوم صفحہ ۱۹۲-۱۹۳) ہمرکاری
ار "اتالیقِ پنجاب" ماسٹر پیارے لال کی اڈیٹری میں نکلتا تھا اور اس کے سب اڈیٹر آزاد مرحوم تھے۔ جب آزاد پروفیسر ہوگئے تو حالی مرحوم نے بھی
عرصے تک اِس اخبار کی سب اڈیٹری کی۔

ناظرین کی آگاہی اور دلچسپی کے لئے ہم "رہبر المصنفین" میں سے ماسٹر پیارے لال کے حالات یہاں نقل کرتے ہیں۔

"ماسٹر پیارے لال آشوب ۱۸۳۵ء میں بمقام دہلی پیدا ہوئے جو تین سو برس سے ان کے بزرگوں کا مسکن رہا ہے۔ ان کا نسبی سلسلہ
شاہِ اکبر کے مشہور وزیر راجہ ٹوڈرمل تک پہنچتا ہے۔ آپ پرانے دہلی کالج کے تمام درجے طے کرکے ۱۸۵۷ء میں تکمیلِ علم کے لئے آگرہ کالج میں داخل
ئے اور وہاں سے سند حاصل کرنے کے بعد ۱۸۵۸ء میں بریلی جاکر سرکاری ملازمت اختیار کی۔ مگر ایک سال کے بعد پنجاب چلے آئے۔ تھوڑے
صے تک گوڑ گانواں اور دہلی میں ہیڈ ماسٹر رہے۔ ۱۸۶۴ء میں دہلی سے تبدیل ہوکر لاہور پہنچے۔ اور وہاں کیوریٹر کے نازک عہدے کے اہم فرائض
۱۶-۱۷ برس تک نہایت ہوشیاری اور دیانت داری سے انجام دیا۔ ۱۸۸۴ء میں انسپکٹر مدارس ہوگئے اور ۱۸۹۵ء تک اس عہدے پر فائز المرام
ہے۔ قیامِ لاہور کے زمانے میں کئی برس تک سرکاری اخبار کے ایڈیٹر رہے۔ میجر فلر صاحب ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم ان سے بہت خوش تھے
ہ کے پاس کلکتہ یونیورسٹی سے سوال آیا کرتے تھے۔ اور وہ ان کے جواب میں اکثر رائے بہادر صاحب سے مشورہ کرلیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ کلکتہ یونیورسٹی
ے یہ سوال آیا کہ مسجع و مقفیٰ عبارت میں کیا فرق ہے، مع مثال بیان کرو۔ حسبِ معمول یہ سوال بھی رائے صاحب کے پاس بھیجا۔ رائے صاحب نے
سوال بجنسہٖ مرزا غالب کے پاس بھیج دیا جن کی خدمت میں رائے صاحب کو نیاز حاصل تھا اور مرزا صاحب اُن پر بہت مہربانی فرماتے تھے۔ انہوں
نے اس کا جواب مع امثال نظم میں لکھ کر بھیج دیا جس کا اخیر شعر یہ تھا ؎

تحریر ہے یہ غالبِ یزداں پرست کی   تاریخ اس کی آج نویں ہے اگست کی

لمہ ہے کہ پروفیسر آزاد اور مولانا حالی کو نیچرل شاعری کا شوق اور خیال آپ ہی کی صحبت میں ہوا اور آپ ہی سے اس کے متعلق معلومات حاصل کیں۔[1]
لبن ہمارے نزدیک جو کچھ شوق ہوا وہ کرنل ہالرائڈ ہی کی تحریک اور امداد سے ہوا۔ اب جو چاہے اپنا نام کرلے۔

آپ نے "رسومِ ہند" کے پہلے تین باب "قصصِ ہند" اول و سوم اردو کی تیسری کتاب" لکھی اور ترجمہ تاریخِ انگلستان کلاں کیا۔ نیز رسالہ
"اتالیقِ پنجاب" کے اکثر مضامین لکھے۔ ترجمہ دربارِ قیصری ۱۸۷۷ء مولفہ مسٹر ویلر شستہ و بامحاورہ بلکہ برجستہ و دل آویز کیا۔ اور اس کے
صلے میں آپ کو ایک تمغہ اور ایک جلد مطلا و مذہب مرحمت ہوئی۔ ۱۸۹۲ء میں آپ کو رائے بہادری کا خطاب ملا اور ۱۸۹۵ء میں ۳۶
سال کی ملازمت کے بعد پنشن لے لی۔ آپ ایک علم دوست آدمی تھے۔ عرصہ ہوا کہ آپ کا انتقال ہوچکا ہے۔ افسوس کہ صحیح تاریخِ
وفات معلوم نہیں ہوئی" +

---

[1] کاش کہ مولوی محمد یحییٰ صاحب اس روایت کے ماخذ کی تصریح فرما دیتے۔ اور ساتھ ہی یہ بھی ظاہر کر دیتے کہ کس سند پر وہ اس روایت
کی (جو واقعات پر غور کرنے سے بڑی حد تک قرینِ قیاس معلوم ہوتی ہے) اس شدت کے ساتھ تردید کرتے ہیں۔

نشاطِ رُوح

خونِ آرزو افشا ہو کسی بہانے سے
رنگ کچھ ٹپکتا ہے حُسن کے فسانے سے

اِس فضائے تیرہ کو گرم کر منوّر کر
داغِ دل نہیں کھلتا دیکھنے دکھانے سے

مسکرائے جاتا ہوں اشک بہتے جاتے ہیں
غم کا کام لیتا ہوں عیش کے ترانے سے

زخم آپ لیتا ہوں لذّتیں اُٹھاتا ہوں
تجھ کو یاد کرتا ہوں درد کے بہانے سے

اِک نگارِ محبوبی اشکِ خوں میں پنہاں ہے
حُسن کی نمائش ہی عشق کے بہانے سے

ایک ایک تنکے پر سو شکستگی طاری
برق بھی لرزتی ہے میرے آشیانے سے

اب جو کچھ گزرنا ہو جان پر گزر جائے
جھاڑ کر اُٹھے دامن اُسکے آستانے سے

جلوۂ مظاہر ہے دفترِ فنا آموز
نیند آئی جاتی ہی حُسن کے فسانے سے

روشنی ہو جگنو کی جیسے شبستاں میں
وہ نقاب کا عالم اُس کے مسکرانے سے

بیخودی کا عالم ہے محوِ جبہ سائی ہوں
اب نہ سر سے مطلب ہے اور نہ آستانے سے

اصغر
گونڈوی

قبرستان

خوشی کے چہچوں سے دُور یہ سنسان بستی ہے
یہاں ہر سمت ویرانی ہی ویرانی برستی ہے

قیامت کی سیاہی ہے، قیامت کا اندھیرا ہے
زمیں کو ہر طرف وحشت نے تاریکی نے گھیرا ہے

صدائیں گیدڑوں کی دُور میدانوں سے آتی ہیں
بلاؤں کی طرح ویرانیوں پر پھیل جاتی ہیں

زمیں پر خشک پتّوں کی اچانک سرسراہٹ سے
جھجھک اُٹھتے ہیں انسانی قدم اپنی ہی آہٹ سے

صدائے بُوم گونج اٹھتی ہے برگد کے درختوں پر
نحوست رو رہی ہے اِس جہاں کے تیرہ بختوں پر

بدن میں سنسنی پیدا ہے تاریکی کے اژدر سے
لرز جاتا ہے دل ہر گام پر آسیب کے ڈر سے

تم ان ٹوٹی ہوئی قبروں کی بربادی پہ مت جاؤ
حقیقت سے تمہیں آگاہ کرتا ہوں اِدھر آؤ

یہاں کے ساکنوں کی ظاہری حالت کو جانے دو
زمانہ گر نشاں اِن کے مٹاتا ہے مٹانے دو

جو سچ پُوچھو تو کتنی قابلِ رشک ان کی حالت ہے!
میسّر ان کو کتنا چین ہے کیسی فراغت ہے!

نہ دنیا کے بکھیڑے ہیں مصیبت ہے، نہ بیماری!
نہ آپس کی عداوت ہے، نہ چالاکی نہ مکّاری!

میسّر ہے یہاں عالم کی سب فکروں سے آزادی
خموشی اور سکوں کا گھر ہے یہ ویران آبادی

یہاں کی سرزمیں اک دوسرے عالم میں شامل ہے
یہاں غمناک روحوں کو دوامی عیش حاصل ہے

یہاں ٹوٹے دلوں کو مرہمِ تسکیں مہیّا ہے
یہاں کی نیند انسانی مصائب کا مداوا ہے

شکستہ خاطروں کی آخری منزل ہے یہ بستی
تھکے ہارے ہوؤں کی جاوداں محفل ہے یہ بستی

ذوقی

میری

(جاپان کی ایک سچی کہانی)

جاپان کی سرزمین کے چپے چپے میں قدرت کے ان گنت خزانے مدفون ہیں اور انسان کو اُس کے گوشے گوشے میں ہر آن پُراسرار خطروں کا دھڑکا لگا رہتا ہے۔ اُس کے تہذیب و تمدن اور جغرافیائی حالات سے اجنبیوں نے جو واقفیت حاصل کی ہے اُس کو محض بالائی سطح کی کھُرچن یا پت جھڑ کی رُت کے سوکھے پتّوں کے ڈھیر سے تشبیہ دی جاسکتی ہے۔ بالخصوص اس کے باشندوں کی سیرت اور عادات و اطوار کے متعلق تو کسی اجنبی کے لئے کوئی رائے قائم کرنا نہایت مشکل ہے۔ جاپانی مہذب اقوام میں سب سے زیادہ خاموش واقع ہوئے ہیں۔ غیر ملکی سیاح طویل سے طویل قیام کے بعد بھی جاپانیوں کے جذبات و احساسات کے علم سے بالکل کورے رہتے ہیں لیکن ایسا بھی اتفاق ہوتا ہے کہ کبھی کبھی کوئی غیر ملکی باشندہ اپنے ہمدردانہ طرزِ عمل سے جاپانیوں کے دل میں جگہ حاصل کرکے اُن چھپے ہوئے حقائق سے واقف ہو جاتا ہے جو نہ صرف اغیار سے بلکہ اکثر خود جاپانیوں سے بھی اُسی طرح پوشیدہ رہتے ہیں جس طرح عام نظروں سے لومڑی کا بھٹ یا وہ تاریک بانبی جہاں ناگ کی زہریلی آنکھوں میں بھی گھڑی دو گھڑی کیلئے نیند کا امرت گھل مل جاتا ہے۔ جاپانی اہلِ قلم بھی اپنی مخصوص ذہنیت کے باعث اپنے ہم وطنوں کی سیرت کی حقیقی تصویریں پیش نہیں کرتے۔ چیخوف کی طرح کسی جاپانی مصنّف نے اپنے ادب کو اپنے اہلِ ملک کی سیرت کے مرقعوں سے مالا مال نہیں کیا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ جدید تہذیب و تمدن کے گھمنڈ میں جاپانی اپنے پسماندہ ہمجنسوں کے حالات کو قابلِ ذکر ہی نہ سمجھتے ہوں، اسی لئے کسی جاپانی مصنف نے اُس قسم کا ذخیرۂ ادب بہم نہیں پہنچایا جس قسم کا میکسم گورکی نے روسیوں کی زندگی اور معاشرت کی صحیح صحیح تصویریں پیش کرکے فراہم کیا ہے۔ جاپانی مصنف کم از کم معرضِ تحریر میں کوئی ایسی بات نہیں لاتے جو نا قابلِ توجیہ ہو اور جس سے اہلِ ملک پر اوہام پرستی کا الزام عائد ہونے کی گنجائش نکل سکے۔ ان حالات کی موجودگی میں کوئی غیر ملکی سیاح خواہ وہ کیسا ہی صاحبِ بصیرت کیوں نہ ہو طویل سے طویل قیام کے باوجود بھی اہلِ جاپان کی زندگی اور سیرت کے متعلق بھول بھلیاں میں پڑا رہتا ہے۔

جاپانیوں کے متعلق یہ نظریہ جو میں نے پیش کیا ہے کچھ زیادہ واضح نہیں مگر فی الحال میرا مقصد صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ اس عظیم الشان ایشیائی ملک کی زندگی میں دلچسپ اور پُراسرار واقعات اور خوفناک حقائق بہت کثرت

سے موجود ہیں لیکن اِس کے باشندوں کے قدیم یا جدید تمدن و معاشرت کے عام مطالعے سے اِن پوشیدہ حقائق پر کچھ زیادہ روشنی نہیں پڑتی۔

میں جو دردناک داستان ذیل میں سپردِ قلم کر رہا ہوں اُس کے ماخذ تک میری رسائی محض اتفاقی طور پر ہو گئی تھی۔ اِس داستان کا تعلق میرے ایک جاپانی دوست اور سابق شاگرد سے ہے جو جدید تہذیب و تمدن سے بدرجۂ اتم بہرہ مند ہے۔ اُس کی وضع وقطع ایرانہ ہے اور اُس کے زرد چہرے سے فطری ذہانت کے آثار صاف نظر آتے ہیں۔ اپنے لباس اور آدابِ معاشرت سے وہ بالکل یورپین معلوم ہوتا ہے جب وہ کالج میں پڑھتا تھا تو مجھے اُس کی انگریزی تحریریں دیکھ کر اُس سے خاص دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ اِس کے علاوہ اُس کی خوش آئند سیرت نے رفتہ رفتہ مجھے اُس کا گرویدہ بنا لیا تھا۔ چنانچہ اکثر شام کو ہم مل کر سیر کے لئے جایا کرتے تھے اور اُس کے ذریعہ سے مجھے جاپان کے قدیم آثار و مقامات کے متعلق نہایت دلچسپ اور اہم معلومات حاصل ہوا کرتی تھیں۔

وقتاً فوقتاً وہ اپنے مضامین میں اپنے دُور افتادہ کوہستانی گاؤں اور اُس کے مضافاتی علاقے کے مرقعے بھی پیش کیا کرتا تھا۔ اِن مضامین کے پڑھنے سے میرے دل میں اُن مقامات کو دیکھنے کی غیر معمولی خواہش پیدا ہو گئی۔

آخر ایک دفعہ موسمِ بہار کی تعطیل میں اُس نے مجھے اپنے پہاڑی مسکن میں کچھ دن گزارنے کے لئے مدعو کیا اور میں نے اُس کی دعوت کو بخوشی قبول کر لیا۔ ہم نے اپنے شہر سے جو بحیرۂ جاپان کے ساحل پر واقع ہے تین گھنٹے تک ریل کا سفر کیا۔ اس کے بعد ہم برقی گاڑی پر سوار ہوئے۔ اس قسم کی برقی گاڑیاں جدید جاپانی معاشرت کا ایک لازمہ ہیں۔ سرِ شام ہم ایک سٹیشن پر پہنچے جو ایک پُرشور پہاڑی ندی کے کنارے واقع تھا۔ ندی کو ایک چھوٹے پل کے ذریعے سے عبور کر کے ہم ایک گاؤں میں پہنچے جس میں ایک لمبا بازار دُور تک چلا گیا تھا۔ ہماری نظروں کے سامنے کچھ فاصلے پر ایک دراز سلسلۂ کوہستان پھیلا ہوا تھا جس کی بلند ترین چوٹی ہکوسان بارہ مہینے برف سے ڈھپی رہتی ہے۔ میرے شاگرد نے کسی دوکان سے ایک قندیل جلا کر ساتھ لے لی۔ اِس کے بعد اُس نے اُس طویل سلسلۂ کوہستان کے دامن کا رخ کیا جس کے پیچھے ہکوسان کی فلک بوس چوٹی ثریا کو ثریا سے ملا رہی تھی۔

کچھ عرصے کے بعد ہم ایک گھنے جنگل میں داخل ہوئے۔ اس وقت رات کے گھٹا ٹوپ اندھیرے نے چاروں کھونٹ چھاؤنی چھالی تھی اور ہم اس تنگ پتھریلی سڑک پر چراغ کی مدد سے بمشکل اپنی راہ کا پتہ چلا رہے تھے۔ میرے شاگرد نے مجھے بتایا کہ یہ سڑک آٹھ سو سال قبل اُن کے مندر کے ساتھ ہی تعمیر ہوئی تھی۔ سالہا سال

سے برف وباراں کا طوفان پتھروں کو اپنی جگہ سے ہٹا رہا ہے۔ اسی وجہ سے سڑک کے آثار قریب قریب مفقود ہو رہے ہیں۔

کچھ عرصے کے بعد ہم ایک گنبد کے پاس پہنچے یہاں اُس نے بہ ادب اپنا سر جھکایا اور کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد جب ہم اُس کے گھر کے بالکل قریب پہنچ گئے تو اُس نے ایک درخت پر اپنی کاغذی قندیل سے روشنی ڈال کر مجھے بتایا کہ اِس کے نیچے شاکا سا مایعنی مہاتما بدھ روحانی ریاضت کے لئے بیٹھے تھے۔

آخر ہم اُس کے گھر کی تاریک عمارت میں داخل ہوئے جہاں اُس کے سن رسیدہ باپ نے جو مندر کا محافظ اور مذہبی پیشوا تھا نہایت تعظیم و تکریم سے ہمارا استقبال کیا۔ اُس کی ماں مختصر قدو قامت کی ایک غریب مزاج خاتون تھی اُس کے چہرے سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ اُس نے نہایت محنت اور مشقت کی زندگی بسر کی ہے۔ میرے دوست کے والدین فرطِ احترام سے میرے سامنے بات بھی نہ کرتے تھے۔ اُن کے دل میں اپنے بیٹے کی غیر معمولی عزت اور وقعت تھی اور میں نہ صرف اُس کا استاد تھا بلکہ وہ پہلا اجنبی شخص بھی تھا جس نے اُن کی دہلیز پر قدم رکھا۔ اِس دوگونہ اتفاق نے اُن کے دل میں میری جگہ اس قدر بلند بنا دی تھی کہ میں کئی مرتبہ کی کوشش کے باوجود کسی طرح اپنے ہبوط پر قادر نہ ہو سکا۔ انہوں نے میری آسائش کے لئے بہتر سے بہتر اہتمام کیا اور مجھے نہایت اعلیٰ درجہ کی خوراک بہم پہنچائی۔ سچ تو یہ ہے کہ اس پہاڑی گاؤں میں مجھے اِن تکلفات کا وہم و گمان بھی نہ تھا۔

صبح کے وقت مجھے معلوم ہوا کہ آس پاس کوہسار کا منظر نہایت دلکشا ہے۔ جا بجا پرانی عمارتوں کے کھنڈر بھی نظر آتے تھے۔ مجھے بتایا گیا کہ کبھی اِن عمارتوں میں چھ ہزار سے زائد بدھ بھکشو آباد تھے، مگر اب انقلاب روزگار نے بجز ایک مندر کے اور کچھ نہ چھوڑا تھا۔ پھر مجھے میرا شاگرد ایک مربع کمرے میں لے گیا۔ یہاں مندر کے تاریخی تحائف کا ایک حیرت انگیز خزانہ میری نظروں سے گزرا۔ میرے سوال پر اُس نے مجھے بتایا کہ کوئی شخص اس بیش بہا خزانے کے سرقے کا خیال دل میں بھی نہیں لا سکتا اور یہ اس ویرانے میں کامل طور پر محفوظ ہے۔

آفتاب ڈھل چکا تھا اور میں اپنے جاپانی شاگرد کے قلبی احساسات سے بالکل بے خبر بیٹھا ہوا سردی سے ٹھٹھر رہا تھا۔

اُن کے گھر پر بلکہ تمام جنگل پر اُداسی اور افسردگی سی چھا رہی تھی۔ شاید اِس کی وجہ یہ ہو کہ ابھی موسم سرما کو گزرے زیادہ عرصہ نہ ہوا تھا۔ پالا ابھی وہاں اِس غضب کا پڑتا ہے کہ چھتوں تک برف کی تہ پہنچ جاتی ہے اور اُس کے سفید فرش پر جنگلی ہرنوں، سوروں اور ریچھوں کے نقشِ رہگذار کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا۔

شہر میں واپس آنے کے بعد کچھ عرصے تک کام کی کثرت اور اپنی مصروفیت کے باعث ہم دونوں کو کالج سے باہر ملاقات کا موقع نہ ملا۔ آخر ایک دن میں نے اپنے طلبہ سے خواب کے موضوع پر مضمون لکھنے کی فرمائش کی۔ معلوم نہیں نوجوان طلبہ کے دلوں میں صبح کے سہانے وقت اور سہانے منظر نے کوئی خاص کیفیت پیدا کر دی یا وہ کسی افسون کے زیر اثر اپنی دلی کیفیات کے اظہار پر مجبور ہوگئے مگر جو کچھ انہوں نے لکھا وہ میرے لئے انتہائی حیرت اور دلچسپی کا موجب ہوا۔ بعض طلبہ نے اپنے بزرگوں کے خواب بیان کئے تھے، اور یہ خواب بھی جاپان کے عہد قدیم سے تعلق رکھتے تھے جس کو انہوں نے دوبارہ عالم خواب میں دیکھا تھا۔ انسانی جذبات کے ان مرقعوں میں سے بعض اس قدر پُر اثر بلکہ سحر آلود تھے کہ اُن کو پڑھ کر میری طبیعت میں ایک قسم کا ہیجان پیدا ہوگیا۔ چنانچہ میں نے یوہارا کو کہ میرے اس شاگرد کا نام یہی تھا شام کا وقت اپنے پاس گزارنے کی دعوت دی لیکن مجھے کچھ معلوم نہ تھا کہ میری یہ دعوت کیا نتائج پیدا کرنے والی ہے۔

ہم دونوں دیر تک خواب کے موضوع پر گفتگو کرتے رہے۔ اس کے بعد کچھ عرصے کے لئے خاموشی طاری ہو گئی تو میرے تصور نے مجھے ایک دفعہ پھر جنگل میں اس مندر کے ایک بالائی کمرے میں تنہا پایا۔ کوہستانی ہواؤں کی وہی سائیں سائیں اور جنگلی درختوں کی ٹہنیوں کی وہی کڑکڑاہٹ سنائی دے رہی تھی۔

اس کے بعد میرے حافظے میں دفعتہً ایک واقعہ تازہ ہوگیا جس کو میں اپنا ایک پریشاں خواب سمجھ کر بالکل فراموش کر چکا تھا۔

جنگل کے قیام کی آخری شب کو میرے میزبانوں نے کھانے پینے کا غیر معمولی اہتمام کیا تھا۔ میں رات کے وقت سادہ غذا کھانے کا عادی ہوں۔ لیکن اس کے بجائے انہوں نے مجھے ازراہِ تواضع بہ اصرار اس قدر مچھلی اور ہرن کا بھنا ہوا گوشت کھلا دیا کہ میں رات کو دیر تک نہ سو سکا۔ بیداری کے اُن طویل لمحوں میں میرا تصور برابر کام کرتا رہا اور میں اپنے جنگلی ماحول اور ارد گرد کی اُن ویران اور خوفناک گھاٹیوں سے ایک دم غافل نہ ہوا جو ہمارے اور اُس بے برگ و گیاہ کوہستان کے درمیان پھیلی ہوئی تھیں جس کی سفید برف پوش چوٹی تاروں بھری رات میں ہمارے مسکن سے نو ہزار فٹ کی بلندی پر جھلملا رہی تھی۔

تقریباً دو بجے میں سویا۔ اس کے بعد مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ میں دفعتہً چونک کر اٹھ بیٹھا، یا میں نے ایک ہراس انگیز خواب دیکھا۔ مجھے یوں معلوم ہوتا تھا کہ میں نے کسی خوفناک چیز کے غرّانے کی آواز سنی ہے جس کی وجہ سے میرا تمام جسم کانپ رہا تھا۔ اسی طرح مجھے کسی ایسی نہایت دہشت ناک چیز کے قرب کا بھی احساس ہوا جس کے بیان سے

الفاظ قاصر ہیں۔ لیکن میں نے اپنے دل کو اِس خیال سے تسلّی دی کہ یہ سب کچھ میرے جسم اور بستر کی غیر معمولی گرمی کا نتیجہ ہے۔ میں پسینے میں شرابور ہو رہا تھا لیکن احساسِ خوف کی شدّت کے باعث میں بستر سے نکل کر دیا سلائی سے چراغ جلانے کی ہمّت بھی نہ کر سکا۔

پھر میں نے صاف الفاظ میں ایک انسانی آواز سنی۔ یہ کسی لڑکی کی آواز تھی۔ یُوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ انتہائی دہشت کے درد و کرب میں بے دم ہو کر چلّا رہی ہے "اچن، ہیاکو، کروشیائی" بھائی جلدی کرو۔ میں یہ برداشت نہیں کر سکتی۔ اِس کے بعد دوبارہ ویسی ہی غرّانے کی آواز سنائی دی جس کو سُن کر میں جاگ اٹھا تھا۔ پھر میں نے رونے اور کراہنے کی دبی دبی سی آواز سنی جس کے بعد دوبارہ بالکل خاموشی چھا گئی۔

میں اُس وقت تک بالکل دم بخود لیٹا ہُوا تھا۔ اب مجھے لمبے سانس کھینچنے کا خیال آیا اور تھوڑی دیر کے بعد میں نے اپنے حواس پر قابو پالیا۔ پھر میں نے دل میں خیال کیا کہ یہ غالباً میرے شاگرد کی بہن کے خواب میں رونے اور چلّانے کی آواز تھی جو نیچے کی منزل میں سو رہی تھی۔

دوسرے دن صبح میں دیر سے اٹھا۔ سورج کی کرنیں میرے کمرے میں داخل ہو رہی تھیں جنگل کے پرندے گا رہے تھے اور کوہستانی ندیوں کا شور بہت دلکش معلوم ہوتا تھا۔ چنانچہ رات کا واقعہ میرے ذہن سے بالکل اتر گیا اور آج معلوم نہیں میرے شاگرد کے قلبی حسیات کے تصرّف سے، یا کس طرح، مجھے اُس رات کی ایک ایک بات پھر صاف یاد آگئی۔

میں نے محض برسبیلِ تذکرہ اس واقعے کا ذکر کیا تھا لیکن جب میری زبان پر وہ الفاظ آئے جو اس رات میں نے سنے تھے: "اچن، ہیاکو، کروشیائی" تو میرے شاگرد کے چہرے پر جو تغیر نمودار ہُوا وہ مجھے عمر بھر نہ بھولے گا۔ مجھے یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ بے ہوش ہو کر کرسی سے نیچے گر پڑے گا۔ اُس کا چہرہ جو ہمیشہ زرد رہتا تھا اب بالکل سفید پڑ گیا تھا اور اس کی سانس رک رک کر چل رہی تھی۔ پھر اُس نے اپنا دایاں ہاتھ سہارا ڈھونڈنے کے لئے پھیلایا۔ میں نے اُس کا ہاتھ جو متشنج معلوم ہوتا تھا اپنے ہاتھ میں لیا اور اُسے بستر پر لٹانا چاہا لیکن اُس نے لیٹنے سے انکار کر دیا۔ پھر وہ یکلخت اٹھ بیٹھا اور نگاہیں گاڑ کر میری طرف دیکھنے لگا۔ یُوں معلوم ہوتا تھا کہ اُس کو میرے پیچھے، کوئی نہایت ہی ہولناک چیز نظر آرہی ہے۔

میں اُس کے اِس طرزِ عمل سے کچھ مضطرب سا ہو گیا چنانچہ میں نے مڑ کر اپنے پیچھے کی کھڑکی کھول دی۔ باہر موسلا دھار بارش ہو رہی تھی، اس لئے میں نے اُس سے کہا کہ تم اب رات یہیں گزار لو۔ اُس نے میرا شکریہ ادا کیا اور اپنے طرزِ عمل کے لئے معذرت کی۔ میں نے شرمندگی سے کہا کہ آپ لوگ جس قدر تواضع اور مدارات کے ساتھ مجھ سے پیش آتے رہے

میرا دل ہی جانتا ہے اور مجھے افسوس ہے کہ میں نے اس واقعے کو بیان کر کے تمہیں ناحق اذیت دی حالانکہ یہ ایک پریشان خواب تھا جس کو میں خود بھول چکا تھا۔

اُس نے کہا یہ پریشان خواب نہ تھا بلکہ سرے سے یہ خواب تھا ہی نہیں۔ پھر اُس نے جیب سے یادداشت کی ایک سیاہ کتاب نکالی اور اُس میں سے حنائی کاغذ کا ایک بوسیدہ سا ٹکڑا نکال کر مجھے دکھایا۔ اس پہ خون کے حروف میں کسی بچے کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایسا فقرہ دیکھ کر میں تصویرِ حیرت بن گیا: "اخن، ہیا کو، اکروشیائی"

اس دردناک التجا کو اپنے سامنے دیکھ کر خود میرا جسم نامعلوم طور پر سرد ہو گیا اور مجھے یوں محسوس ہوا گویا میرا دل غم و اندوہ کے ایک بے پایاں طوفان میں ڈوب گیا ہے۔

میں نے اُس سے پوچھا "آخر یہ کیا بات ہے؟"

پھر اُس نے درد بھری آواز سے خلافِ معمول مجھے جاپانی زبان میں یہ واقعہ سنانا شروع کیا، اور اُس کے بیان کے ابتدائی الفاظ ہی کو سُن کر میں درد و غم کا پیکرِ مجسم بن گیا۔

اُس نے کہا "آپ کو معلوم ہے میری ایک چھوٹی بہن ہے" ان الفاظ کو سُن کر مجھے وہ تیرہ چودہ سال کی شرمیلی لڑکی یاد آ گئی جس کی ایک آدھ جھلک مجھے اپنے دورانِ قیام میں اُس پہاڑی مکان کے دروازوں کے پیچھے سے وقتاً فوقتاً نظر آ جاتی تھی۔

اس کے بعد اُس نے کہا "وہ اب بالکل تنہا رہ گئی ہے" پھر کچھ دیر کے لئے وہ خاموش ہو گیا۔ اُس وقت اُس کی نظر زمین کی طرف جھکی ہوئی تھی۔ اس کے بعد اُس نے کہا "گزشتہ سال اُس کی ایک سہیلی بھی تھی جو اُس کے ساتھ کھیلا کرتی تھی اور وہ دونوں ایک دوسری کے ساتھ بہت خوش رہا کرتی تھیں۔ اس کا نام مِکی تھا لیکن میں اُسے میری کہا کرتا تھا کیونکہ مجھے اس سے محبّت تھی۔

"اس کے والدین کا انتقال ہو چکا تھا اور کچھ مدت سے وہ ہمارے گھر میں رہنے لگی تھی کیونکہ وہ میری بہن فیومی کی نہایت عزیز سہیلی تھی۔ میرے والدین اگرچہ غریب ہیں لیکن انہوں نے اس کی پرورش اور نگہداشت اپنی بچّی کی طرح کی، اور چونکہ وہ اُن کو بہت پسند تھی اِس لئے وہ اُس کو آئندہ اپنی بہو بنا لینے کا ارادہ رکھتے تھے۔

"وہ میری بہن کے مقابلہ میں بہت زیادہ ذہین تھی اور غیر ممالک کی ہر چیز سے گہری دلچسپی لیا کرتی تھی، مثلاً وہ انگریزی آدابِ معاشرت، انگریزی گفتگو اور پیانو وغیرہ بجانا بخوشی سیکھ لیتی، حالانکہ اس دور و دراز پہاڑی گاؤں میں ایسی باتیں خواب و خیال سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتیں۔

"پس آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ جب میں تعطیل کے زمانے میں اپنے گھر جاتا تھا تو ہم سب آپس میں مل کر کس قدر خوش

ہوتے ہونگے۔ اِن موقعوں پر وہ مجھ سے تمام نئی باتیں جو میں کالج سے سیکھ کر آیا کرتا تھا پوچھ لئے بغیر دم نہ لیتی تھی۔"

اس ذہین لڑکی کے حالات سُن کر میرا دل نہایت رنج محسوس کر رہا تھا۔ مجھے پختہ یقین ہو چکا تھا کہ اب اس دنیا سے وہ ہمیشہ کے لئے مفقود ہو چکی ہے۔

میرے شاگرد نے اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا "آخری مرتبہ میری سے میری ملاقات ستمبر کے مہینے میں ہوئی۔ میری، فیومی اور میں، ہم تینوں سیر و تفریح کے لئے صبح کے وقت گھر سے نکلے۔ ہم نے پہاڑ کے دامن کا راستہ لیا۔ اِس زمانے میں یہ پہاڑی راستہ بالکل ویران ہو جاتا ہے۔ ہم نے اپنے ساتھ کھانے پینے کا سامان بھی لے لیا تھا۔ پھر بڑی پگڈنڈی کو چھوڑ کر ہم ندی کے کنارے کنارے ہو لئے۔ ہم ایک آبشار کو دیکھنے کے لئے جانا چاہتے تھے جس سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ صبح کا تمام وقت ہم نے وہاں دھوپ میں بیٹھ کر گزارا۔ کبھی کبھی لڑکیاں اُٹھ کر ریت پر چلنے کا لطف اٹھاتی تھیں اور ہم سب مل کر خوشی سے گیت گاتے تھے۔ آخر جب سورج پہاڑوں کے پیچھے چھپنے لگا تو ہم نے گھر واپس جانے کا ارادہ کیا۔ ہم ندی کے کنارے کنارے واپس چلے آ رہے تھے اور ابھی بمشکل چند سو گز کا فاصلہ طے کرنے پائے تھے جب میری کو یاد آیا کہ وہ اپنے تصویر دار کارڈوں کا مجموعہ ایک چٹان کے پیچھے بھول آئی ہے۔ وہ اپنے کارڈ لانے کے لئے بھاگتی ہوئی گئی اور ہم اُس کے انتظار میں ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ اُس وقت جنگل کا منظر نہایت سہانا معلوم ہوتا تھا۔ درختوں کی ٹہنیوں میں پھُدکیاں خوشی سے چہچہا رہی تھیں اور بہک بہک کر ایک دوسری کی طرف جا رہی تھیں۔

دفعتہً ہمیں ایک خوف زدہ چیخ سنائی دی اور ہم خطرے کا احساس کر کے واپس بھاگے۔ ہمارا خیال تھا کہ میری کسی بندر وغیرہ سے ڈر گئی ہے۔ لیکن آبشار کے پاس پہنچنے پر وہ ہمیں کہیں نظر نہ آئی۔ تصویر دار کارڈ آس پاس اس طرح بکھر رہے تھے جیسے کسی نے انہیں زور سے زمین پر پٹک دیا ہو۔"

اس کے بعد اُس نے اپنی یادداشت کے ورق دوبارہ الٹے اور اُس میں سے دو کیچڑ سے بھرے ہوئے کارڈ نکال کر مجھے دکھائے جن پر بعض مشہور مغربی مصوروں کے ہاتھ کی تصویریں تھیں۔

پھر اُس نے کہا "وہاں ہمیں اور کوئی چیز نظر نہ آئی۔ اس مقام سے باہر جانے کا دوسرا کوئی راستہ بھی نہ تھا تینوں طرف بلند اور دشوار گزار چٹانوں کی سنگلاخ دیواریں کھڑی تھیں ہم نے میری کو ہر طرف ڈھونڈا۔ ہم بار بار بہ آوازِ بلند اُس کا نام لے کر اُسے پکارتے رہے لیکن گرتے ہوئے آبشار کے شور کے سوا جواب میں ہمیں کوئی دوسری آواز سنائی نہ دی۔ صرف ایک دفعہ ہم نے ایک عجیب و غریب آواز سنی جو جنگل کی ہوا میں ریل کے انجن کی سیٹی کی طرح

گونجی۔ میں نے ایسی آواز اس سے پہلے کبھی نہ سنی تھی اور میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ کسی ہرن کی آواز تھی یا ریچھ کی۔

"تاریکی دمبدم چھا رہی تھی اور ہماری سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا کہ کیا کریں فیومی گھبرا کر رو رہی تھی اور میں اُسے نہ تنہا چھوڑ سکتا تھا اور نہ اکیلے گھر جانے کی اجازت دے سکتا تھا۔ اس ہولناک سانحے نے اُس کے ہوش و حواس بالکل گم کر دیئے تھے۔

"ناچار ہم گھر کو واپس گئے جہاں ہماری والدہ نہایت بے قراری سے ہمارا انتظار کر رہی تھیں۔ میں فیومی کو گھر میں پہنچانے کے بعد فوراً گاؤں کی طرف بھاگا اور لوگوں کو اطلاع دی۔ وہاں سے کئی لوگ میری مدد کے لئے چراغ ہاتھوں میں لے کر آئے۔ ہم وہ تمام رات اور پھر دوسرا تمام دن جنگلوں میں میری کو ڈھونڈتے رہے لیکن ہمیں اُس کا کوئی سراغ نہ ملا۔ میری کا اس طرح گم ہو جانا سب لوگوں کے لئے ایک ناقابلِ فہم راز تھا۔ چند دنوں کے بعد مجھے کالج میں حاضر ہونا تھا لیکن روانگی سے قبل میں نے گرد و نواح کی تمام صحرائی آبادی میں پھر کر لوگوں کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ حتی المقدور میری کی تلاش جاری رکھیں۔

"میری بہن کے خط مجھے باقاعدہ ملتے رہتے تھے لیکن اُن میں بجز حسرت و یاس کے اور کچھ نہ ہوتا تھا۔ آخر نومبر کے مہینے میں ایک دن مجھے ایک تار ملا کہ مجھے فوراً گھر کو روانہ ہو جانا چاہیے۔ دن بھر میں سخت مضطرب الحال رہا اور رات کو جب میں گھر پہنچا تو گھر والوں نے میرے ہاتھ میں کاغذ کا یہ بوسیدہ ٹکڑا دیا جو میں نے ابھی آپ کو دکھایا ہے۔ یہ کاغذ ایک شکاری کو پہاڑ کی بلندی پر اُس مقام سے دس میل کے فاصلے پر، جہاں ہم نے میری کو کھویا تھا صنوبر کے کسی درخت کی شاخ میں اٹکا ہوا ملا تھا!"

میرے شاگرد کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ وہ میرا خواب سن کر کیوں اس قدر آسیمہ حال ہو گیا تھا۔

پھر اُس نے کہا "میری کے متعلق سب سے آخری اطلاع جو ہمیں حاصل ہوئی ہے وہ یہی ہے، بشرطیکہ وہ، بشرطیکہ وہ ——"

اُس کی آواز بھرّا گئی اور وہ اپنا مافی الضمیر زبان سے ادا نہ کر سکا۔

اب مجھے اس ہولناک واقعے کا پوری طرح سے احساس ہو گیا۔ یہ لڑکی انسان سے کسی ادنیٰ درجے کے ذی روح کی گرفت میں اب تک کہیں زندہ موجود تھی اور اُس رات وہ کسی طرح بھاگ کر اپنی اُس تنہا جائے پناہ کی طرف آئی تھی لیکن اُس کے دروازے اُس کے لئے نہ کھل سکے اور وہ پھر اُسی بلا کے پنجے میں گرفتار ہو گئی۔ ہمارے چہرے زرد

پڑگئے تھے اور ہم دونوں ایک دوسرے کی طرف خوف بھری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے، اُس کا سنگیتر اور میں۔
اس واقعے کو بھی ایک مہینے کا عرصہ گزر چکا تھا لیکن کسی نے اب تک اُس کی رہائی کے لئے کوئی کوشش نہ کی تھی۔
پھر میں نے کہا "کیا اس معاملہ میں پولیس یا فوج کا محکمہ کوئی مدد نہیں دے سکتا؟"
اُس نے جواب دیا "افسوس یہ ممکن نہیں آپ ان پہاڑوں سے واقف نہیں ہیں وہاں پولیس اور فوج کے دستوں کے دستے غائب ہوسکتے ہیں۔ اس کے علاوہ جو لوگ اِن پہاڑوں سے بخوبی واقف ہیں وہ اپنی انتہائی کوشش صرف کرچکے ہیں مگر کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ لیکن اب آپ نے جو کچھ بتایا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میری تی ابھی تک زندہ ہے۔ میں علی الصباح گھر کو روانہ ہوجاؤں گا۔ اور تمام کوہستانی نواح میں اِس واقعے کی خبر پہنچا دوں گا"
میں نے اُس کے ارادے کی تائید کی اور پھر اس سے کہا کہ "اگر میں کالج کے لڑکوں سے اس بات کا تذکرہ کروں تو میرا خیال ہے کہ بہت سے طلبہ تلاش میں مدد دینے کے لئے بخوشی آمادہ ہوجائیں گے۔
اُس نے کہا "مگر اس سے کچھ فائدہ نہیں ہوسکتا وہ خود پہاڑوں میں کھو جائیں گے۔ کیونکہ بارہا ایسے اتفاقات پیش آچکے ہیں"!
صبح پو پھٹنے سے قبل میں اسے سٹیشن پر پہنچا آیا۔ ہم دونوں بھرے ہوئے دل کے ساتھ ایک دوسرے سے رخصت ہوئے۔
ایک ہفتے کے بعد وہ واپس آیا۔ وہ بہت دبلا معلوم ہوتا تھا اور اُس کا چہرہ تمازتِ آفتاب سے جلا ہوا تھا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ دو پہاڑی رہنماؤں کی مدد سے دن رات پھر کر اُس نے پہاڑوں کا ایک ایک گوشہ دیکھا ہے لیکن بجز مایوسی کے کچھ حاصل نہیں ہوا۔ اس پر میرے دل میں ایک نیا خیال جاگزیں ہوا۔ میں نے ارادہ کیا کہ موسم گرما کی تعطیل کا تمام زمانہ اُن پہاڑوں میں گزاروں گا اور یوہارا کے گھر سے دُور دُور کے علاقے میں جستجو جاری رکھوں گا۔
میں نے اپنے شاگردوں میں سے دو کو اپنا ہمراہی منتخب کیا۔ ایک کا نام کاموری تھا۔ جو نباتیات سے گہرا شغف رکھنے کے باعث جاپان کے اُن عظیم الشان پہاڑوں کے چپے چپے پر پھر چکا تھا اور دوسرے شاگرد کا نام ردکو متسو تھا۔ وہ ایک پہاڑی گاؤں کا رہنے والا تھا اور اُس کا شمار اس سلسلۂ کوہستان کے بہترین واقفوں میں کیا جاسکتا تھا۔
ہم نے اپنے ساتھ ایک خیمہ بستر اور چند ضروری اشیا رکھ لیں۔ اس کے علاوہ ہم نے تقریباً ایک درجن اشخاص کی خدمات حاصل کیں جو ہمیں آس پاس کی خبریں اور کھانے پینے کا سامان بہم پہنچاتے تھے۔ پہاڑ پر ہمیں آئے

دن جو عجیب و غریب اور دلچسپ تجربے حاصل ہوتے رہے اُن کے بیان کے لئے ایک الگ مضمون کی ضرورت ہے۔ کاموری پہاڑی جڑی بوٹیوں سے بے انتہا دلچسپی لیتا رہا اور روکومٹسو نے اپنے شوق کے مطابق پہاڑوں کا گوشہ گوشہ چھان مارا۔ جب کبھی وہ پہاڑوں میں غائب ہوجاتا اور ہم اس کو ڈھونڈ نہ سکتے تھے تو وہ اپنی بندوق کی آواز سے ہمیں اپنے متعلق اطلاع دیا کرتا تھا۔ ادھر سے میں اپنی بندوق کے ساتھ جو ہمیں تازہ شکار بھی بہم پہنچایا کرتی تھی اُس کے اشارے کا جواب دیا کرتا تھا۔

ایک دن سہ پہر کے وقت کاموری پیچھے خیمے میں رہا اور روکومٹسو اور میں دونوں ایک طرف دُور نکل گئے۔ دو میل کے فاصلہ پر جاپان کا سب سے بڑا آبشار تھا جو دو ہزار فٹ بلند ہے۔ ہم اس کو دیکھنے کے لئے آگے جارہے تھے کہ راستہ میں ہم ایک نہایت خوبصورت مقام پر پہنچے، جہاں مصفّا پانی کے ایک چشمے کے کنارے ہم اپنا کھانا، جس میں چاول، بھنے ہوئے تیتر اور کچھ آلوچے شامل تھے کھانے کے لئے بیٹھے۔ جس وقت میں توشہ دان کھول رہا تھا روکومٹسو کچھ فاصلہ پر زمین کو کھودنے لگا۔ دفعتہً اُس نے میری طرف متوجہ ہوکر دھیمی لیکن مضطرب آواز سے کہا "جناب ذرا یہ دیکھئے"۔ اس کے بعد اُس نے معمولی سرخ فلالین کا ایک ٹکڑا میرے ہاتھ میں دے کر کہا "یہ کسی عورت کے لہنگے کا حصّہ ہے"۔

میں نے حیرت سے اس ٹکڑے کو دیکھا اور پھر اُس سے پوچھا کیا تمہیں پورا یقین ہے؟

اُس نے اثبات میں جواب دیا اور پھر چشمے کے کنارے انسانی پاؤں کے کچھ نشانات کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے اُسی وقت دوبارہ توشہ دان کو بند کردیا اور پھر ہم دونوں نہایت احتیاط سے چاروں طرف دیکھنے لگے۔ لیکن اَور کہیں نہ تو ہمیں کوئی نقشِ قدم نظر پڑا اور نہ کہیں کسی قسم کا دھواں وغیرہ دکھائی دیا۔ آخر ہم نے چلنا شروع کیا۔ تابہ مقدور ہم چٹانوں کی آڑ میں ہوکر چلتے تھے۔ قدم قدم پر ہمیں خطرے کا احساس تھا لیکن اُس ویرانے میں پہاڑی چنڈولوں کی پھڑپھڑاہٹ کے سوا اور کسی قسم کی آواز یا آہٹ سنائی نہ دیتی تھی۔ آخر جب ہم ایک ذرا کھلے مقام پر پہنچے جس کے چاروں طرف چھوٹی چھوٹی چٹانیں کھڑی تھیں اور جو بلندی میں قدِ آدم سے بھی کم ہونگی تو یکایک ہوا میں ایک سیٹی کی آواز گونجی اور اس کے بعد ایک گرانڈیل پتھر ایک سخت چٹان پر اس زور سے آکر گرا کہ اس میں سے آگ کے شرارے پیدا ہوگئے۔ میں اس قدر نزدیک تھا کہ اس طرح جس گیس کا اخراج ہوا اُس کی بُو مجھے محسوس ہوئی۔ میں نے فوراً اوپر نظر اُٹھائی۔ ہم سے پچاس فٹ کی بلندی پر ایک جھکی ہوئی چٹان کے سامنے میں ہمیں ایک جھونپڑا سا دکھائی دیا جو کسی جنگلی جانور کے بھٹ سے مشابہ تھا اور جس پر درختوں کی سوکھی ٹہنیاں پٹی ہوئی تھیں۔

اس کے سامنے ہمیں انسانی صورت میں ایک ہولناک اور عظیم الجثہ پیکر استادہ نظر آیا۔ وہ عام انسانوں سے کہیں زیادہ بلند قامت تھا اور اس کے بڑے بڑے اور گندے گندمی اعضا بغایت مکروہ اور بغایت گھناؤنے تھے۔ اس کے ڈراؤنے چہرہ کے گرد جو دیوانگی اور غضبناکی کا مجسمہ تھا اس کے لمبے لمبے مٹیالے بال لٹک رہے تھے۔ اس کی کمر کے گرد ریچھ کی ایک کھال لپٹی ہوئی تھی اور اس کی بن مانس کی سی برہنہ چھاتی کے گھنے گھنے بال اس کی اس پوستین سے بالکل ملے جلے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔

وہ دانت پیس رہا تھا اور بھیڑیوں کی طرح غرا رہا تھا۔ یکایک مجھے یاد آیا کہ یہی وہ آواز ہے جس نے مجھے جنگل کی اس خوفناک رات میں اس مندر کے اندر نیند سے چونکا دیا تھا اور وہاں بھی اس وقت کھلی ہوا اور سورج کی روشنی میں میرا جسم کانپ اٹھا۔

اسی وقت جھونپڑے کے پست اور تاریک سے دروازے میں جو محض ایک موکھا سا تھا ہمیں ایک اور چہرہ دکھائی دیا۔ چہرے پر سورج کی روشنی پڑ رہی تھی اور ایک زرد رو اور مصیبت زدہ لڑکی صاف نظر آ رہی تھی۔ اس کی نظر پہاڑوں پر ادھر ادھر دوڑ رہی تھی۔ پھر دفعتاً اس کی متحیر نگاہ ہم پر جم گئی۔ اس وقت اس کے منہ سے ایک چیخ نکلی لیکن وہ وحشی درندہ اس کی طرف مڑ کر فرطِ غضب سے غرایا اور وہ ڈر کر اندر چلی گئی۔ اس کے بعد وہ ایک لگڑ بگڑ کی طرح چیختا، چلاتا اور شور مچاتا، سیدھا ہماری طرف نیچے کو اترنے لگا۔ وہ اپنی انسانی ہیئت کے باعث اور بھی زیادہ خوفناک معلوم ہوتا تھا۔ اب ہمارے لئے بجز فائر کرنے کے اور کوئی چارۂ کار نہ تھا۔ چنانچہ میں نے گولی مار کر دائیں کندھے میں اسے زخمی کیا۔

وہ چند قدم آگے بڑھا اور اس کے بعد پیچ و تاب کھاتا ہوا اور زہریلے ناگ کی طرح پھنکارتا ہوا لڑھک کر نیچے پتھروں پر آ پڑا۔ میں نے روکو منٹسو سے چلا کر کہا کہ اگر وہ ذرا بھی جنبش کرے تو وہ بڑا پتھر گرا کر اسے کچل دو! اس کے بعد خود میں نے جھونپڑے کا رخ کیا۔ اوپر نظر اٹھانے پر مجھے وہ خوفزدہ چہرہ بھٹ سے نکلتا ہوا دکھائی دیا۔

"میں نے پکار کر کہا "میری آؤ اب تم بالکل محفوظ ہو" لیکن اس نے دیوانوں کی طرح مجھ پر ایک ہراساں نگاہ ڈالی اور بھاگ کر چٹانوں میں چھپ گئی۔ اس کے نحیف اور حسرت زدہ جسم پر چیتھڑے لٹک رہے تھے۔

میں نے روکو منٹسو سے چلا کر کہا اس کے پیچھے بھاگو وہ مجھ سے ڈر رہی ہے۔

روکو منٹسو چند جستوں میں اس ڈھلوان پہاڑی کو طے کر گیا اور میں واپس وہاں پہنچا جہاں وہ دیو قامت عفریت گرا ہوا تھا۔ وہ اب بھی غراتا اور دانت پیستا تھا۔ تناسب اعضا کے لحاظ سے بلاشبہ

وہ انسان تھا لیکن اعضا کے فوق الانسانی نشوونما اور اُس کی سانڈ جیسی گردن کو دیکھ کر بے اختیار اتنی گھن آتی تھی کہ الفاظ میں بیان نہیں ہوسکتی۔ کچھ دیر کے بعد لیٹے لیٹے اُس کا چہرہ اوپر کی طرف اٹھا تو اُس کی خوفناک آنکھوں، مہیب دانتوں اور اُس نفرت انگیز گڑھے کو دیکھ کر جہاں ناک ہونی چاہئے تھی میں اپنے تحفظ کے لئے بالکل چوکس ہوکر کھڑا ہوگیا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ بے ہوشی کی حالت سے بیدار ہو رہا ہے اور اب مجھے یہ احساس ہونے لگا کہ گولی نے اُسے کچھ اتنا زیادہ نقصان نہیں پہنچایا بلکہ گرنے کے صدمے سے اُس کے حواس معطل ہوگئے ہیں۔ اُس نے ہاتھوں کے بل اٹھنا چاہا لیکن پھر درد سے کراہنے لگا۔ اس پر میں نے اپنی بندوق اٹھائی جس کو دیکھ کر وہ خاموشی سے پھر زمین پر لیٹ گیا۔ لیکن چند ہی لمحوں کے بعد وہ دفعتہً کنگرو کی طرح اچھل کر اٹھا اور زقندیں لگاتا اور چٹانوں کے بیابان کو پھاندتا ہوا نکل گیا اور پھر دو چار وحشیانہ جستوں میں کوہستان کی دشوار گزار چوٹیوں پر پہنچ کر کہیں غائب ہوگیا۔ اب کسی قسم کا خطرہ باقی نہ رہا تھا۔

اِدھر وہ بلائے مہیب نظروں سے غائب ہوئی اور اُدھر مجھے رو کو منٹسو ایک مشتِ استخواں کو ہاتھوں میں لئے آتا دکھائی دیا۔ میں بھاگ کر اُس کی طرف گیا۔ وہ بیہوش تھی اور اُس کا سر پیچھے کو لٹک گیا تھا۔ پھٹے ہوئے کپڑوں میں سے اُس کے منحنی جسم پر جابجا زخموں کے نشان نظر آرہے تھے۔ اُس کی حالت اس قدر زار تھی کہ رو کو منٹسو جیسا سنگین دل پہاڑی لڑکا بھی اُس کو دیکھ کر آنسو بہائے بغیر نہ رہ سکا۔ میں نے اُس بھٹ میں نظر ڈالی لیکن وہاں جانوروں کے پروں اور ہڈیوں کے انباروں کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ انسانی ضروریات کی کوئی چیز مجھے وہاں نظر نہ آئی۔

میں نے میری کو رو کو منٹسو کی پیٹھ پر باندھ دیا اور چشمے پر پہنچ کر ہم نے اُس کے چہرے پر سرد پانی کے چھینٹے دیئے جس کے بعد اُس نے اپنی آنکھیں کھولیں۔ اب ہمیں اس کے متعلق کوئی شبہ نہ رہا کیونکہ اُس نے دوبارہ اپنی آنکھیں بند کرتے ہوئے دھیمی آواز میں یہ الفاظ گنگنائے "آ! کروشی! آ! میں یہ برداشت نہیں کرسکتی!"

وہاں سے روانہ ہوکر ہم سہ پہر کے تین بجے واپس اپنے خیمے میں پہنچے۔ کاموری کو اس قدر حیرت ہوئی کہ وہ کئی لمحوں تک اسے اپنی نگاہ کا فریب سمجھتا رہا۔ اس کے بعد وہ بھاگا ہوا گیا اور دُور پہنچ کر بندوق کے متواتر فائروں کے مقررشدہ اشارے سے اپنے اُن بارہ مددگاروں کو کامیابی کی اطلاع دی۔ چنانچہ اُن بارہ میں سے چار غروبِ آفتاب کے قریب ہم سے آملے۔ اس اثنا میں ہم نے میری کو گرم شوربے اور بعض

محرکات کا استعمال کرایا، اور وہ گہری نیند سوگئی۔ رات بھر کاموری اور میں اُس کی خبرگیری کرتے رہے۔ خیمہ سے باہر ہمارے آدمی آگ کے الاؤ کے پاس بیٹھے اُس دیو قامت حیوان کے متعلق بحث کر رہے تھے۔ آخر رو کو مشو کے اِس بیان پر سب نے اتفاق کیا کہ اُس کا تعلق کُشتی گروں کی اُس عجیب و غریب قدیم نسل سے ہے جو پہاڑوں کے اُس پار بعض جنگلی علاقوں میں آباد ہے۔ وہاں کے باشندے بالعموم عظیم الجسامت اور عادات و اطوار میں بالکل وحشی ہوتے ہیں۔ لیکن بعض اوقات ان میں سے بھی کوئی فرد اپنی فوق العادت وحشیانہ درندگی میں اتنی سبقت لے جاتا ہے کہ دوسرے لوگ اُس کی تندخوئی کے باعث اُسے آبادی میں رہنے کے قابل نہیں سمجھتے۔ ایسے لوگ جب قید یا موت سے بچنا چاہیں تو تنہا بھاگ کر پہاڑوں کی طرف نکل آتے ہیں۔ اُن کی خونخواری کے خوف سے کوئی شخص اُن کا ساتھ دینے کی جرات نہیں کرسکتا۔

پو پھٹ رہی تھی، جب مجھ پر کچھ غنودگی طاری تھی اور باقی سب لوگ سو رہے تھے۔ اُس وقت میری دفعتہً اُٹھ بیٹھی اور میری طرف درد انگیز نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ اُس کی نظروں میں وحشت اور اُس کی آنکھوں میں دیوانوں کی سی چمک نظر آتی تھی۔ پھر کچھ دیر تک وہ کھانستی رہی۔ اِس کے بعد اُس کے منہ سے ذرا سا خون نکلا اور دوبارہ بستر پر گر کر وہ ہمیشہ کی نیند سوگئی۔

گجردم ہم نے اُس کی ارتھی بنائی اور اُسے اٹھا کر دو دن تک پتھریلے پہاڑی راستوں پر چلتے رہے آخر یو موٹو کے گرم چشموں کے پاس ٹھہر کر ہم نے ایک دن آرام کیا اور پھر دوبارہ اُس کو اٹھا کر جنگل میں اُسی مندر کی طرف اُس کے آخری مسکن کو روانہ ہوئے جہاں میں نے پہلے پہل اُس کی وہ یاس انگیز پکار سُنی تھی جس کی طرف کوئی ملتفت نہ ہوا تھا۔ اب وہیں مندر کے قریب ایک بڑے درخت کے نیچے اُس کی قبر نظر آتی ہے جس کی لوح پر میری کا لفظ کندہ ہے۔

رقم زدۂ پروفیسر ای۔ ای سپیٹ

تلخیص و ترجمہ

از

حامد علی خاں

اِن کاوشوں کا ماحصل

ہر گل میں ہر شجر میں ترا رنگ و بو سہی
ہر لعل ہر گہر میں تری آبرو سہی

سب مہر و ماہ تیرے ہی آئینہ دار ہیں
تیری ضیا فروغِ نظر سو بسو سہی

ہر مہوش نے حسن کی تیرے ہی لی زکوٰۃ
محتاج تیرے نور کا ہر ماہرو سہی

معصومیوں میں تیری ہی عصمت سے جلوہ ریز
روئے ہلال و چشمِ ستارہ میں تو سہی

مانا کہ تو ہے اول و آخر کا مبتدیٰ
اور منتہیٰ بھی اول و آخر کا تو سہی

مانا اجارہ دارِ بقا ایک تو ہی ہے
اور نفیِ ماسوا کی تجھے آرزو سہی

اپنے سوا ہر اک کو گھٹانے کی آرزو
اپنے سوا ہر اک کو مٹانے کی خو سہی

محتاج بھی غلام بھی قیدی بھی ہوں ترا
میں بستۂ رسن بھی ترا مو بمو سہی

کچھ تیرے سامنے نہیں یارائے دم زدن
میں خود نہیں ہوں کچھ بھی جو کچھ ہے سو تو سہی

لیکن یہ بے نتیجہ تڑپ کیوں ملی مجھے
وجہِ سکونِ روح مری ہائے و ہو سہی

میں صبحِ کن فکاں سے ہوں ناکامِ جستجو
عالم کے ذرّے ذرّے میں تیری نمو سہی

میرے نصیب کیوں تری تمثال ہی فقط
ہر بزم کا فروغ ترا عکسِ رو سہی

وہ جلوہ کیوں نہیں ہے کہ تیرا کہوں جسے
ہر آئنہ میں عکس ترا ہو بہو سہی

ہر شے ترے بغیر ہے کھوئے ہوئے قرار
چرچا ترا تلاش تری کو بکو سہی

ہر قطرہ موجِ بحر کا تجھ بن ہے مضطرب
ہر ذرۂ زمین کو تری جستجو سہی

ہر آبشار تیری ہی جانب روانہ ہے
تیری تلاش ہی میں ہر اک آبجو سہی

تو پردۂ خفا میں ہو ہرچند گوشہ گیر
سب تجھ پہ مر مٹیں یہ تجھے آرزو سہی

اِن کاوشوں کا ماحصل اے رازداں بتا
وجہِ حجاب کیا ہے؟ یہ سرِّ نہاں بتا

غزل

وہ دل نہیں، کس دل سی جفا کیجئے اُس سے
جو اُس نے کیا ورنہ سوا کیجئے اُس سے

پھرتے ہو اب آوارہ و افسردہ و تنہا
کہتے نہ تھے سب کم ہی ملا کیجئے اُس سے

اس روح کو اس تن سی جُدا کیجئے اوّل
گر چاہئے، پھر مجھ کو جُدا کیجئے اُس سے

کیوں حضرتِ دل ہمّتِ پروانہ بھی دیکھی؟
وہ جل گیا اب آپ جلا کیجئے اُس سے

ہوگا نہ وہ مائل بہ وفا ذکرِ وفا سے
اپنی سی نہ بے سود کہا کیجئے اُس سے

دشمن ہی سو دشمن ہی، جو ہے دوست سو دشمن
اب اس سے گلہ کیجئے یا کیجئے اُس سے؟

جس بے سروساماں سی کسی نے نہ وفا کی
لازم نہیں اب آپ دغا کیجئے اُس سے

بُت خانے میں دل ہار گئے حضرتِ واعظ
وہ آپ کا اللہ ہے؟ دُعا کیجئے اُس سے

حامد علی خاں

پھول پتیاں

زندگی کے دن جوں جوں گزرتے جاتے ہیں جو شے مجھے روز بروز زیادہ عزیز ہوتی جاتی ہے وہ دنیا کی الفت وملاحت اور نزاکت ہی، نہ کہ اُس کا عقل وہنر اور اُس کے علم کی عظمت نہیں بلکہ ننھے ننھے بچوں کے قہقہے اور دوستوں کی دوستی اور باہمی گفت وشنید ایک گھر کے آرام دہ کمرے میں اور حسین پھولوں کے منظر اور موسیقی کے نغمے!

کیا حاصل ہے اِس تاروں بھرے آسمان اور گردش کرتے ہوئے سیاروں کا اور آفرینش کی اِس تمام محنت و مشقت کا جو ازل سے آج تک ہوتی رہی ہے اگر وہ انسان کو اس قابل نہ بنا سکے کہ وہ آزادی اور خوشی سے اپنے دائرۂ زندگی میں چست بن کر عمر بسر کرے!

انسان کی زندگی! انسان ایک شیشۂ بلّوریں ہے۔ زندگی پانی ہے اس کمزور برتن کے اندر پڑا ہوا۔ گناہ موت لاتا ہے۔ موت اس شیشے کو توڑ دیتی ہے پھر پانی بہ جاتا ہے۔ بس یہ ہے خاتمہ!

میں خوشی کے ساتھ میل بھر چلا۔ وہ سارا رستہ بولتی رہی لیکن اُس کی گفتگو سے میری قابلیت میں کچھ اضافہ نہ ہوا۔
میں غم کے ساتھ میل بھر چلا اور اُس نے ایک لفظ منہ سے نہ نکالا لیکن کیا کہوں کہ میں نے کیا کچھ نہ سیکھا جب غم یوں میرے ہمراہ تھا۔

محبت اُسے ملی تھی اُن جھونپڑیوں میں جہاں مفلس رہتے ہیں اُس کے روزمرہ کے سبق دینے والے جنگل اور ندی نالے تھے اور وہ خاموشی جو تاروں بھرے آسمان میں ہو اور وہ نیند جو دُور تنہا کوہساروں میں میسر آئے۔

کیسے شیریں ہیں وہ خیال جو قناعت کی رنگ و بو میں بسے ہوئے ہوں ایک مطمئن دل شاہی تاج سے زیادہ بیش بہا ہے
کیسی سہانی ہیں وہ راتیں جو بے فکری کے خواب میں بسر ہوں۔ ایک مفلس کا گھر زر و حشمت کے غصے سے بھری نگاہوں کو حقارت سے دیکھتا ہے۔ ایسی شیریں قناعت کی فضا لیے دل و دماغ ایسی نیند اور ایسی برکت!

عقل اکثر اُس وقت ہمارے قریب ہوتی ہے جب ہم جھکیں نہ کہ جب ہم اُڑیں۔

اپنے خیالوں کا نگہبان بن کیونکہ خیال آسمانوں میں سنائی دیتے ہیں۔

(ترجمہ)

بشیر احمد بیگم

قبر کا بھید

یہ ہے "عفریت قبر کا بھید چھپائے ہوئے"!

کوئی بھید نہ تھا جسے انسان نے کھول کے رکھ نہ دینا چاہا۔ کوئی بات نہ تھی جس کی کنہ اُس نے دریافت نہ کی۔ کوئی خیال نہ تھا جو اُس کے وہم میں نہ آیا۔ کوئی ذرّہ تک نہیں جس کو اُس نے ہزار ٹکڑے کر کے اُس کے اندر کی دنیا باہر نہ کر دی!

یوں تو اُس نے لَا عِلْمَ لَنَا اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا سُن کر بظاہر سرِ نیاز جھکا دیا لیکن لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی کے ارشاد پر اُس نے سرِ طغیان و جوش کو پھر اُٹھایا اور کرنی نہ کرنی سب کرنی چاہی! پہاڑ اکھاڑ کر رکھ دیئے زمین کے پیٹ میں سلاخیں گاڑ دیں آسمان کی فضا میں ہوائی بھوت اڑا دیئے، اونچے سے اونچے پہاڑ کی چوٹی پر جا دھمکا، گہرے سے گہرے سمندر کی تہ تک جا پہنچا، بڑے سے بڑے لق و دق صحرا کی تنہائیوں میں خلل انداز ہو گیا —— یہ انسانِ ضعیف البنیان!

یہ تو خیر درست تھا مناسب تھا روا تھا شاید مقدر تھا لیکن اُس نے نادرست کو درست نامناسب کو مناسب اور ناروا کو روا کر دینا چاہا اور غیر مقررہ کو مقدر بلکہ مستور کو منظور کر دینے کی ٹھان لی —— دنیا ڈر گئی سہم گئی دبک کے بیٹھ رہی، تارے تارے میں سرگوشیاں ہونے لگیں، کائنات کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ایک کھلبلی پڑ گئی کہ خدا کی خدائی آشکار ہو چلی، لپٹی ہوئی کھولی گئی چھپی ہوئی پائی گئی، جانی گئی پہچانی گئی!

دفتر دفتر کے محافظ بڑھے لپکے دوڑے کہ اس ڈاکو کو روکیں پکڑیں باندھ لیں لیکن یہ بادی جو رہ زمین و آسمان کا ناتیا بھیل روکے کب رُکتا تھا باندھے کب بندھتا تھا اُچھلا پھاندا کُودا دوڑا اور کہیں کا کہیں نکل گیا!

خدا جو ہمہ تن نیکی ہے جسے دنیا جہان کی بہبود مدِ نظر ہے اُس نے اِس سرفراز و سرکش کو سرزنش اور عقوبت کا چابک لگایا اور محض دوڑانے کی خاطر خوب دوڑایا بھگایا کہ اُس کے حواس ٹھکانے نہ رہیں اور یہ وقت سے پہلے اَن دیکھی چیزیں دیکھنے اَن کرنے کام کرنے کے پیچھے نہ پڑا رہے —— لیکن اس وعدہ ناوفا پر اب اعتبار کیا ہوتا نیکی کے سردار نے بُری بھدّی بھیانک سی ہستیوں کو اُبھارا کہ وہ اُس بھید کو جس کا ابھی بھید بنے رہنا ہی سب کے لئے مفید و مناسب ہے، اپنے سربمہر ظرف میں چھپائے رکھیں!

اے انسان! تُو بھی ابھی موت کا راز چھپا ہی رہنے دے تاکہ تجھ پر زندگی کے صحیح معنی آشکار ہوں!

ل ب

قلم کا بھید
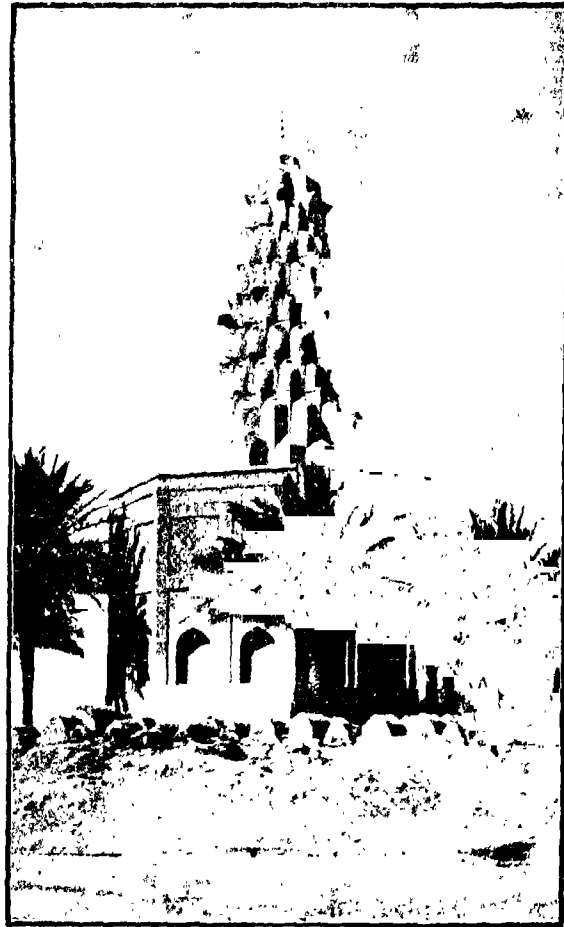
مقبرۂ ببل

مقبرۂ زُبیدہ

خلیفہ جعفر بن منصور کی بیٹی اور خلیفہ ہارون الرشید کی بیوی زبیدہ کا مقبرہ مدینۂ بغداد کے اُس مشہور حصّے میں واقع ہے جو دجلہ کے دائیں کنارے پر آباد ہے اور "الکرخ" کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اس حصے کو مدینۃ المنصور بھی کہتے ہیں، کیونکہ یہ خلیفۂ منصور کے عہد میں دارالعاصمہ رہ چکا ہے۔ مقبرہ بغداد ریلوے کے اسٹیشن سے تقریباً دوسو قدم کے فاصلہ پر واقع ہے۔ اِس کے قرب وجوار میں بہت سے اولیا و علما کے مزار بھی ہیں، جن میں سے چند قابلِ ذکر یہ ہیں:-

حضرت الشیخ الکرخی۔ حضرتِ منصور ابن حلّاج۔ حضرتِ عون و حضرتِ بہلول۔
مزار وزارۃ الاوقاف کی حفاظت میں ہے اور اُس کی موجودہ حالت اچھّی ہے۔

ہارون کی عمر اُس وقت اُنیس برس کی تھی جب اُس نے شہزادی زبیدہ سے شادی کی جو ایک نہایت دانشمند اور فیاض خاتون تھی، اور جو ہارون کی وفات کے بعد تیس سال تک زندہ رہی۔ اُس کی فیاضی کی زندہ شہادت وہ نہریں، تالاب، پُل اور مہماں سرائیں ہیں جن کو اُس نے اپنی جیبِ خاص سے لاکھوں روپے خرچ کر کے تعمیر کرایا۔ حجاز میں ملکہ زبیدہ کے قابلِ ذکر و رود کی یادگاریں اب تک باقی ہیں (سنہ ۸۰۵ء)۔ یہ دیکھ کر کہ پانی کی قلّت کی وجہ سے اہلِ مکّہ کو بڑی مصیبت کا سامنا کرنا پڑتا ہے اُس نے وہ مشہور نہر تعمیر کرائی جو آج تک اس شہر کے رہنے والوں کے لئے بے اندازہ رحمت و برکت کا موجب ہو رہی ہے۔

زبیدہ کی طبیعت میں فطرت نے ایجاد و اختراع کا مادہ بھی ودیعت کر رکھا تھا چنانچہ معاشرت اور آرائش میں اُس نے کئی نئی باتیں رائج کیں۔ آرام کرسی، طلائی جھُومر، مرصّع جُوتے اور زرنگار کمربندُ اسی کے ایجاد ہیں +

منصور احمد

جھن من جھن من جھن جھنکار

ناچیں کودیں گاتے گائیں اپنے اپنے من کی سُنائیں
پیار کریں آ باہم پیار
جھن من جھن من جھن جھنکار
جھن من جھن من جھن جھنکار

گانے گانا یہ کب تک ؟ ہنسنا ہنسانا یہ کب تک ؟
کب تک الفت کب تک پیار؟
جھن من جھن من جھن جھنکار
جھن من جھن من جھن جھنکار!

بستی دنیا کی دو دن مستی دنیا کی دو دن

اس مستی سے ہوں بیدار

جھن من جھن من جھن جھنکار

جھن من جھن من جھن جھنکار!

رنگیں پھولوں سے کھیلیں سیمیں جھولوں سے کھیلیں

دل ہو اُلفت کی چہکار

جھن من جھن من جھن جھنکار

جھن من جھن من جھن جھنکار!

تن من دھن سے منہ موڑیں رشتہ دُنیا سے توڑیں

ہوکر عشرت سے بیزار

پیار کریں آباہم پیار

جھن من جھن من جھن جھنکار

جھن من جھن من جھن جھنکار

پریمی

ناکام فاتح

شام کی خاموشی میں جب رات کے دھندلے دھندلے سائے گہرے ہو چلے تھے محنت کش سپاہی چند ساعتوں کے لئے اپنے درشت کام کی کوفت سے آزاد ہو کر گھر میں داخل ہوا۔

اُس کی بیوی اپنا شام کا کھانا پکانے میں مصروف تھی۔ سیلی لکڑیوں کے دھوئیں سے اُس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور اُس کا اترا ہوا زرد چہرہ جس پر گہری سوچ بچار اور آئے دن کی ناکامیوں نے کئی خط کھینچ دیئے تھے دھوئیں کی کثیف تاریکی میں دھندلا سا نظر آتا تھا۔

سپاہی نے اپنی وردی اتار دی اور چراغ روشن کرنے کے بعد ایک لکڑی کی چوکی چولہے کے نزدیک سرکا کر آگ تاپنے کے لئے بیٹھ گیا۔

اُس کے بیٹے کا زخمی پاؤں ابھی تک اچھا نہیں ہوا تھا۔ غریب لڑکے کی جوتیاں پھٹ گئی تھیں اور ٹھوکریں کھا کھا کر یہ زخم پیدا ہو گیا تھا۔ اُس کا دوسرا لڑکا مہینوں کی بیماری کے بعد اچھا ہوا تھا۔ لیکن سردی آگئی اور اُسے گرم کپڑا تک میسر نہ ہوا اور اب اُسے کھانسی ہو رہی تھی۔ اُس کی ننھی بچی اپنی تمام جسمانی تکلیفوں کو بھول کر صرف ایک لکڑی کی گڑیا کے لئے کس قدر آرزومند تھی۔ لیکن ہفتے گزر گئے اور ابھی تک وہ لکڑی کا بے حقیقت سا کھلونا بھی گھر میں نہ آسکا تھا۔

اُس سے کم رتبہ سپاہی۔ سست اور نااہل اُس کے مقابلے میں کتنی ترقی حاصل کر چکے تھے۔ لیکن وہ اپنے افسر کے سنگدلانہ مشاغل کی دلچسپیوں میں کوئی حصہ نہ لینے کا مجرم تھا اور ابھی تک وہیں اُس کے بے جا عتاب کی سختیاں جھیل رہا تھا۔ اُس کے افسر کی رائے اُس کی نسبت ہمیشہ سے یہی تھی کہ یہ بودے جذبات کا رفیق انقلاب غلام سپاہی بننے کے بجائے کسی گوشۂ عزلت میں پڑے پڑے سسکیاں بھرتا ہوا زیادہ موزوں معلوم ہوتا۔

مگر آج ان سب باتوں کا خیال ہمیشہ کی طرح اُس کی روح کا سوہان نہیں بن رہا تھا۔ جب درد کا درماں ہاتھ لگ جائے تو اذیت آدھی بھی نہیں رہتی۔ اسی طرح اُس کے خوشگوار مستقبل نے آج ماضی کی تلخیوں کے نقوش اُس کے دل پر دھندلے کر دیئے تھے۔

اپنی بیوی کے افسردہ انداز سے اُس کی تمام رکی ہوئی احتیاجوں کا اندازہ لگاتے ہوئے اُس نے کہا

"میرے دل میں بھی کئی آرزوئیں ہیں"۔ اور پھر اپنی جیب کو ٹٹول کر اُس نے اطمینان کا ایک لمبا سانس لیا۔ آخر اُس نے قاتل کا سراغ پا لیا تھا اور سرکار سے دس ہزار کا مقررشدہ انعام حاصل کر لینے میں چند گھنٹے ہی تو باقی رہ گئے تھے۔ اور اب اُسے اپنے عہدے کی ترقی یقینی تو نہیں لیکن ایک حد تک لازمی امر ضرور معلوم ہو رہی تھی۔ اُس نے خیال کیا "کیا تقدیر کی رسائی اسی کو نہیں کہتے؟ بڑے بڑے سراغ رسان جس راز کا پتہ نہ چلا سکے، اس وقت وہ میری جیب کے اندر محفوظ پڑا ہے۔ سفاک قاتل جس نے سرکار کو بھی پریشان کر دیا تھا کس صفائی سے اب تک لوگوں کو اپنے فریب میں مبتلا کئے رہا بلکہ الٹا اس واقعہ کے بعد اُس نے بعض حلقوں میں ایک خاص وقعت حاصل کر لی۔ وہ مہینے بھر سے اِسی شہر میں فروکش ہے اور آج کے بعد سب سے پہلا جہاز جو یہاں سے روانہ ہوگا اُس میں سیر و سیاحت کے بہانے کسی غیر ملک کو نکل جانے والا ہے جہاں وہ قانون کی زد سے باہر ہوگا۔ آزاد، اور اپنے سفاکانہ جرم کے باوجود مدتوں پھر اُسی دنیا کی فضا میں سانس لیتا رہے گا جسے ایک بار اُس کا گناہ اُس کے لئے حرام کر چکا ہے۔

لیکن کل جب اُس کا سفر سفرِ آخرت میں تبدیل ہو چکا ہوگا اُس وقت کون ہے جو میری عقل و دانش کی داد دیئے بغیر رہ سکے گا۔ پُراسرار راز جس قدر آسانی سے مجھے حاصل ہو گیا اتنا ہی حقیقت میں اُس کا حصول دشوار تھا۔ اور یہ سب قدرت کا کوئی کرشمہ ہے ورنہ میں کون ہوں؟ ایک غریب اور بے وسیلہ سپاہی!" اُس کی نظر بار بار اپنی جیب کی طرف اٹھتی تھی اور وہ خیال کرتا "اس کاغذ کے پرچے کو دیکھ لینے کے بعد بھی قاتل کے جرم میں کسی شبہ کی گنجائش باقی رہ سکتی ہے؟"

اُس نے جلد جلد اپنا سادہ سا کھانا ختم کر لیا۔ گزشتہ رات جو کہانی وہ بچوں کو سنا رہا تھا ابھی وہ انجام کو نہیں پہنچی تھی اور اب بچے باقی ماندہ کہانی سننے کے لئے ضد کر رہے تھے۔ لیکن وہ اُن سے چھپ کر گھر سے نکل گیا۔ بیوی کے استفسار پر کئی بار اصل بات اُس کے ہونٹوں تک آتے آتے رک گئی تھی ـــــــ قاتل کا سراغ ـــــــ دس ہزار ـــــــ شہرت ـــــــ اور ترقی ـــــــ کئی الفاظ اُس کی زبان تک آئے اور وہیں رک گئے۔ خدانخواستہ اگر وہ ناکام رہا تو اس امید کے منقطع ہونے کے بعد اُس کی بیوی جیتے جی مر جائے گی۔ اگرچہ ناکامی کا اِس معاملے میں بالکل ہی احتمال نہ تھا لیکن پھر بھی وہ ابھی اس کے متعلق کچھ نہیں کہنا چاہتا تھا۔

قصر نما عمارتوں کے سایوں میں سے گزرتا ہوا اب وہ جلد جلد کوتوالِ شہر کے مکان کی جانب قدم بڑھا رہا تھا۔ لیکن دفعتہً وہ رکا اور سڑک کے دائیں ہاتھ مڑ کر اُس نے بے تابی سے ایک وسیع بنگلے کے بورڈ کو پڑھا۔ مکان کے

بیرونی حصہ میں کوئی دھیمی سی سرخ روشنی جل رہی تھی۔لمحہ بھر کے لئے اُس پر ایک عجیب ہیبت سی طاری ہوگئی۔ یہی قاتل کی قیام گاہ تھی۔اور یہی مکان گزشتہ چند ساعتوں سے ایک غریب سپاہی کی امید کا مرکز بنا ہؤا تھا۔

پھر اُس نے آہستہ سے اپنی جیب کو ٹٹولا ـــــ دس ہزار ـــــ اور اُس نے اپنی مسکراہٹ کو زیرِ لب چھپاتے ہوئے کہا "اب مجھے زیادہ دیر نہ کرنی چاہئے۔وقت تیزی سے گزرا جا رہا ہے"۔پھر وہ شاہراہ کی طرف مڑنے لگا لیکن کسی نے آہستہ سے اُس کے کان میں کہہ دیا "پہلے ایک نظر اپنے شکار کو دیکھ تو لو" اُس نے کہا "میں اپنی زندگی کے کئی قیمتی موقعے انہیں بے حاصل باتوں میں کھو چکا ہوں اور آج مجھے ایک لمحہ بھی ضائع نہ کرنا چاہئے"۔ لیکن کسی کمرے سے کلاک نے گھنٹہ بجا کر کہہ دیا ـــــ "وقت ابھی کافی پڑا ہے"۔ مکان کی کھڑکیوں میں سے روشنی باہر جھانک جھانک کر اُسے دعوت دینے لگی "آؤ آخر ایک نظر دیکھ لینے میں کون سی دیر ہو جائے گی"۔ ایک زبردست خواہش جو بے تابی سے کچھ ہی کم تھی اُس کی روح پر غالب آگئی۔

پھاٹک کھلا ہؤا تھا اور اب روشنی کو چھوڑ کر وہ تاریکی کی طرف بڑھا۔مکان کے عقب میں تاریکی تھی اور وہاں صحن کے ایک تنگ سے گلی جیسے حصہ میں نیم کے بڑے بڑے درختوں نے سیاہی کو اور بھی گہرا کر دیا تھا لیکن کمروں کی کئی کھڑکیاں ادھر کو کھلتی تھیں۔اُس نے کان لگا کر کچھ سنا اور لپک کر اُس طرف کو بڑھا جدھر سے دھیمی دھیمی آوازیں اور کسی بچے کی ہنسی سنائی دے رہی تھی۔کھڑکی میں ایک چھوٹا سا شگاف تھا جس سے کمرے کا اندرونی حصہ بآسانی نظر آسکتا تھا۔اُس نے دیوار کے ساتھ لگ کر اندر کی طرف جھانکا بجلی کی جگمگاتی ہوئی روشنی میں کمرے کا بیش قیمت سامان اُس کی نگاہ کے سامنے تھا اور اس کے بعد سب سے پہلے اُسے کمرے کے وسط میں ایک نوعمر عورت نظر آئی جس کا چہرہ حزن کی ایک چھپی ہوئی جھلک کے باوجود بھی دمکتا ہؤا معلوم ہوتا تھا۔اور اُس کے بالمقابل فربہ جسم کا ایک دراز قامت شخص بیٹھا تھا۔اُس کا بشرہ پُر عزم تھا لیکن اُس کے چہرے سے اطمینانِ قلب کے گہرے آثار کے باوجود سپاہی نے جرم کا پیغام پڑھ لیا۔یہی قاتل تھا اور وہ اُس کی بیوی تھی۔ایک چھوٹی سی لڑکی جس کے گھنگھریالے بالوں میں سرخ فیتہ بندھا ہؤا تھا فرش پر اپنی چینی کی گڑیا کو تھپکا تھپکا کر سُلا رہی تھی۔اور اُس کا باپ اپنی انگلیوں سے آہستہ آہستہ اُس کے بالوں کو چھیڑ رہا تھا۔ اور ایک لڑکا جس کا چہرہ معصوم اور پیارا تھا اپنے زعم میں اپنی بہن کی گڑیا کو جگا دینے کے لئے تالیاں بجا بجا کر شرارت سے ہنس رہا تھا۔

کسی ناگہانی جذبے سے مغلوب ہو کر سپاہی نے اپنی آنکھیں اُدھر سے پھیر لیں۔عالمِ خیال میں اُس نے مسلح سپاہیوں کے ایک دستے کو اس کمرے میں داخل ہوتے دیکھا۔وہ قاتل کو ہتھکڑی پہناتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

"تمہیں ابھی ہمارے ساتھ چلنا ہوگا"ـــــ اور اُس کی بیوی کا رنگ اب کاغذ کی مانند سفید پڑ گیا تھا۔ خوف کی ایک ہلکی سی چیخ اُس کے منہ سے نکل گئی تھی ـــــ اور اُس کا بیٹا سہم کر اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں میں اپنے چہرے کو چھپا رہا تھا ـــــ اُس کی بیٹی کی گڑیا فرش پر اوندھے منہ گری تھی اور وہ روتے ہوئے اُس کے کوٹ کا دامن اپنی طرف کھینچ کر کہہ رہی تھی "ابا میں تم کو نہ جانے دوں گی"ـــــ یہ تمام واقعہ گزر گیا اور اب وہ خود دس ہزار روپیہ کا چک لے کر خوشی خوشی اپنے گھر کو جا رہا تھا۔ اُس کے عہدے میں ترقی ہو چکی تھی۔ سرکار میں اُس کی توقیر بڑھ گئی تھی۔ ہر طرف عوام میں اس واقعے کے چرچے تھے اور اب وہ اپنے افسر کے جور و جفا سے آزاد تھا۔ اُس کی بیوی کے دل پر اُس کی اس دانشمندانہ کارروائی کا فخر آمیز اثر تھا اور اُس کے بچے اس واقعہ کو ہمیشہ ناز سے بیان کیا کرتے۔

اُس نے جست بھر کر وہاں سے نکل جانا چاہا۔ کیونکہ اب دیر ہوئی جا رہی تھی اور اُسے بہت جلد کوتوال شہر سے ملنا تھا۔ لیکن پھر اُسے اپنے پاؤں تاریکی میں کھڑکی کے نیچے جمے ہوئے محسوس ہوتے اور دفعتہً پھر ایک نظارہ اُس کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ کوئی قاتل پھانسی کے پھندے میں تڑپ تڑپ کر جان دے رہا تھا۔ اور ایک چھوٹی سی لڑکی جس کے گھونگریالے بالوں میں سرخ فیتہ بندھا ہوا تھا عالم مایوسی میں اپنی ماں کے بازوؤں میں گری ہوئی سسکیاں لے رہی تھی۔ اور ایک یتیم لڑکا جس کی آنکھیں شدت خوف و ہراس سے پتھرائی جا رہی تھیں لوگوں کی قہر آلود نظروں کا شکار ہو رہا تھا وہ اسے جھڑک جھڑک کر کہہ رہے تھے ـــــ "تیرا باپ قاتل تھا اور تو خدا جانے کیا ہوگا" اور کوئی ناشاد عورت حسرت و حرمان کی تصویر بنی ہوئی اپنے سیاہ خانے میں درد و کرب کی راتیں بسر کر رہی تھی۔

بجلی کی سی سرعت کے ساتھ ایک خیال اُسکے دل و دماغ پر محیط ہوتا گیا۔ لیکن پھر اُس کے اپنے ہی دل کی آواز نے للکار کر کہا "بزدل تجھے سپاہی کس نے بنایا تھا وہ قاتل ہے اور اُس کے لئے اپنے جرم کی سزا پانا ضرور ہے"

پھر عالم تصوّر میں اُسے اپنے بیٹے کا زخمی پاؤں نظر آیا۔ اُس کا پنجہ پھٹے ہوئے جوتے سے باہر نکل کر لہولہان ہو رہا تھا اور درد کی تکلیف سے اُس کے رخساروں پر آنسو بہہ رہے تھے۔ اور اُس کا چھوٹا لڑکا نحیف و ناتوان ـــــ اُسے کس قدر کھانسی تھی! اپنے بچّے کی شدید کھانسی کی آواز پھر اُس کے دل پر ضربیں لگانے لگی ـــــ اور اُس کی ننھی بچی اپنے برف کے سے سرد ہاتھوں کے ساتھ اُس کے شانوں کو ہلا ہلا کر کہہ رہی تھی "آج بھی تم میری گڑیا نہیں لائے"۔ اور اُس کی زرد رُو بیوی چراغ کی دھیمی روشنی میں جھکی ہوئی اپنے بوسیدہ لباس کو پیوند لگا رہی تھی

سیلی لکڑیوں کے دھوئیں نے ابھی تک اُس کی آنکھوں کو سرخ کر رکھا تھا۔

اُس نے فیصلہ کن لہجے میں اپنے دل سے کہا کچھ بھی ہو اب مجھے فوراً کوتوال سے ملنا چاہئے لیکن ایک بار پھر کسی مقناطیسی طاقت نے اُس کی آنکھوں کو کھڑکی کے شگاف سے لگا دیا۔ چھوٹی بچی اب گڑیا کو چھوڑ کر ننھے ننھے بازو اپنے باپ کی گردن کے گرد حمائل کئے ہوئے تھی اور اُسے چوم چوم کر کہہ رہی تھی "ابا میں تمہاری بیٹی ہوں" اور اُس کا بیٹا اُس کے زانو پر سر رکھے اب مسکرا رہا تھا۔ وہ قاتل تھا لیکن جب وہ نظر بھر کر اپنے بچوں کو دیکھتا تو محبت نُور کی شعاعوں کے مانند اُس کی آنکھوں میں جگمگا اٹھتی۔ اور کون تھا جو اس نور کی موجودگی میں اُس کے گناہ کی تاریکی کو ان آنکھوں میں ڈھونڈ لیتا؟

ایک لمحہ کے لئے پھر وہ ساکت و صامت کھڑا رہ گیا۔ پھر اُس کا سر چکرانے لگا اور اُس نے محسوس کیا کہ اُس کی ہیئت کسی خبیث روح کے پیکر میں تبدیل ہو گئی ہے جو اپنے گھناونے چہرے میں لمبے لمبے تیز دانتوں کو چھپائے ہوئے بچوں کی معصوم مسرتوں کو تہ و بالا کرنے کے لئے کسی کونے میں چھپی کھڑی ہو۔

بچے اُس کے آگے اپنے ننھے ننھے ہاتھ جوڑ کر کہہ رہے تھے "ہماری خوشیاں ہمیں کو ٹے ڈال۔ کیا تیرے بچوں کے پاس اس شے کی کمی ہے جو تُو ہم سے چھینے لیتا ہے؟"

لیکن وہ اُن کی معصوم تمناؤں کو روندے ڈالتا تھا اور جب وہ ننھے بچوں کے دل توڑ چکنے کے بعد اُن کی تمام خوشیوں کو سمیٹ کر، اپنے گھر میں داخل ہُوا تو اُس کی بیوی اُسے ملامت آمیز نظروں سے گھور رہی تھی "ہٹو تمہیں مرد کس نے بنایا تھا۔ تمہیں اپنے بچوں کا خیال بھی نہ آیا۔ جاؤ میں یہ ظلم کی کمائی اپنے بچوں پر صرف نہ کروں گی" اور اب اُس کا سر شرم سے جھکا ہُوا تھا اور اُس کے کانوں میں بچوں کی آہ و زاری اب تک حشر برپا کر رہی تھی۔

پھر وہ اپنے مستقبل کے متعلق سب کچھ بھول گیا۔ بچوں کی خوشیوں کے مقابلے میں ساری دنیا اُسے ہیچ نظر آنے لگی۔ اُس نے کہا وہ قاتل ہے تو ہُوا کرے۔ بچوں کی مسرت اسی کے دم سے وابستہ ہے اور میں کون ہوں جو چاندی کی چند ٹکلیوں کے عوض میں اس بیش بہا شے کو تباہ کرنے پر تُلا کھڑا ہوں" وہ سپاہی تھا لیکن جوشِ جذبات سے اُس کے جسم پر کپکپی طاری تھی۔

دوسرے لمحے میں وہ صحن کی دیوار سے باہر تھا۔ سائے کی اوٹ میں اُس نے بے صبری سے اپنی جیب پر ہاتھ ڈالا۔ وہ کاغذ جسے وہ اتنی احتیاط سے کئی تہوں کے اندر چھپا کر لایا تھا، بچوں کی مسرت کے مقابلے میں اُس کی حقیقت ہی کیا تھی! وہ حقارت کے انداز سے مسکرایا۔ اُسے خوف معلوم ہونے لگا کہ تاریکی میں کوتوال کا ہاتھ

بڑھ کر اُس سے یہ کاغذ چھین نہ لے جائے۔ اُس نے جیب سے دیا سلائی نکالی اور آہستہ سے رگڑ کر کاغذ کو آگ دکھا دی۔ پھر ایک بار عظیم اُسے اپنے سینے پر سے اترتا ہُوا محسوس ہوا۔ اُس نے کہا "بچوں کی خوشیوں کی حفاظت مجھ پر لازم تھی۔ اور اسی لئے یہ کاغذ خدائے قدیر نے صرف میرے سپرد کیا تھا"

مکان کے اندر سے بچوں کے قہقہوں کی آواز سنائی دی۔ اُس نے کہا "اب وہ مجھ سے خوش ہیں"

عالمِ تصور میں پھر اک بار اُسے وہ چھوٹی سی لڑکی نظر آئی جس کے گھونگر یالے بالوں میں سرخ فیتہ بندھا ہُوا تھا۔ وہ مسکرا رہی تھی اور کہہ رہی تھی "میاں سپاہی تم نے بہت اچھا کام کیا"

چاند اب نکل آیا تھا اُس کے پاس روپیہ تھا نہ شہرت اور نہ ترقی لیکن ایک فاتح کے انداز میں بے پایاں مسرت کا ہیجان دل میں لئے ہوئے وہ گھر کی جانب جا رہا تھا تا کہ اگر اُس کے بچے ابھی تک جاگ رہے ہوں تو وہ باقی ماندہ کہانی انہیں آج ہی سنا دے۔

ز۔ ب

خدا کا صرف ایک ہی نام ہے خدا! نیکی کا صرف ایک ہی بدلہ ہے نیکی! کسی کو دوست بنانے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے خود دوست بن جانا!

دوستی روح کی بقا کی طرح اتنی اچھی اور پیاری شے ہے کہ اُس کا یقین نہیں آتا!

جو میری سنتا ہے جو میری سمجھ لیتا ہے وہ میرا ہو جاتا ہے میرا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے!

ہم دنیا میں یوں اکیلے گھومتے رہتے ہیں، دوست جیسے کہ ہم چاہتے ہیں محض سپنے ہیں اور کہانیاں لیکن ایک عظیم الشان امید ہر لحظہ باوفا دل کا جی لگائے رکھتی ہے کہ کہیں اَور عالمگیر طاقت کے دوسرے عالموں میں اب اس گھڑی ہی ایسی روحیں ہیں کام کرنے دُکھ بھرنے ہمت دکھانے والی جو ہم سے محبت کر سکتی ہیں اور جن سے ہم محبت کر سکتے ہیں۔

گلچیں

نذرانۂ رُوح

عفوِ تقصیر کرانے کے لئے آیا ہے
تیری درگاہ میں اک بے کس و بے بس مجبُور
نذر کرنے کے لئے لختِ جگر لایا ہے
ارمغاں رُوح کا کرلے مرے مولا منظُور

دِل میں ہے اک نگہِ لطف کی حسرت باقی
رُخِ انور کی ضیا سے ہو یہ سینہ معمُور
جامِ وحدت کا مُجھے بھی ہو عطا اے ساقی
دل کے پردہ سے ہو تاریکیٔ غفلت کافُور

پانی ہو ہو کے بہے ذوقِ شہادت میں جگر
لُطفِ امرت کا دکھا زہرِ ہلاہل میں مجھے
وہ تصوّر ہو عطا چشمِ بصیرت کو مگر
نقشِ باطل نظر آئے نہ کوئی دل میں مجھے

نگہِ شوق میں ہر ذرّہ ہو رشکِ خورشید
جزو میں کل کا تماشا نظر آجائے مجھے
پیش خیمہ ہو امیدوں کا مری ہر امید
یعنی ہر قطرہ میں دریا نظر آجائے مجھے

اندرجیت شرما

تجلّیات

آنکھوں سے دل میں روح میں دل سے سما گیا
کیا جانے کس لئے مجھے اتنا وہ بھا گیا

ہر آرزو کو فتنۂ محشر بنا گیا
آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے جادو جگا گیا

جلوہ تو اُس کا دیکھ لیا چشمِ شوق نے
پروا نہیں ہے اس کی اگر دل گیا گیا

ہر سمت دیکھتا ہوں اُسی کے جمال کو
اتنا مری نگاہ میں کوئی سما گیا

آیا نہ تھا زباں پہ ابھی حرفِ مدعا
وہ مدعائے دل مری نظروں سے پا گیا

"آتے ہی اُن کے دُور ہوئیں کلفتیں تمام"
جاتے ہی اُن کے زیست کا سارا مزا گیا

آغوشِ انتظار ابھی وا ہے اور وہ
آغوشِ انتظار میں آیا چلا گیا

اس دلربا ادائے محبت سے پُوچھئے
مجھ سے یہ بار بار نہ کہئے کہ کیا گیا

ہمدم جو پھر کہوں تو کہوں کس امید پر
سو بار اُن سے حالِ تمنّا کہا گیا

ہر زخم دل کا پھوٹ کے ناسور ہو گیا
یہ موسمِ بہار عجب گُل کھلا گیا

وہ! اور وعدہ ہائے وفا و کرم! غلط!!!
قاصد بنا گیا! مجھے قاصد بنا گیا!!

اکبر ملول رہتے ہو کس کے فراق میں
یہ کون راہ موت کی تم کو بتا گیا

اکبر
سردری

مس پنڈرہ

میں پہاڑ پر اس لئے تو نہیں آیا تھا کہ ہسپتال میں پڑے پڑے اپنا تمام وقت گزار دوں!" انند کمار نے شکوہ کے انداز میں کہا۔

ڈاکٹر نے جواب دیا "بے شک نہایت افسوس کا مقام ہے لیکن مجبوری کا کیا علاج۔ اور وہ ہسپتال نہیں نرسنگ ہوم ہے۔ شاید اس لئے کہ یہ نام ہسپتال سے زیادہ آرام دہ معلوم ہوتا ہے ——————"

"ہسپتال کا نام کچھ بھی رکھ لو۔ مجھے تو اس کے خیال سے وہی ایتھر اور آئڈو فارم کی بُو کا احساس ہوتا ہے۔ لیکن کیا یہیں ہوٹل میں میرا علاج نہیں ہو سکتا؟"

"ہو تو سکتا ہے لیکن ہوٹل کے دیگر مہمان ڈاکٹروں اور نرسوں کے ہر وقت آنے جانے کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے اور مریض کے لئے بھی یہاں اُس قدر سہولت میسّر ہونا مشکل ہے۔"

"نرسیں! —— آپ نے مجھے جنگ کا زمانہ یاد دلا دیا جب میں طالب علم تھا —— لیکن اگر نرس رکھنا ہی ہے تو خدا کے لئے مجھے کسی یورپین حسینہ کے حوالے نہ کر دینا۔ اول تو ہر منٹ وہ چاہے گی کہ میں اُس کی اداؤں کی تعریف کروں۔ اس پر کہیں ہندوستان میں دنگا فساد ہو گیا تو یہ کہہ کر مجھے چھوڑ کے چل دے گی کہ "ہم کالا آدمی کا علاج نہیں کرتا" میں صاف کہے دیتا ہوں ڈاکٹر صاحب کہ مجھ میں اس وقت ناز اُٹھانے کی طاقت نہیں ہے۔"

ڈاکٹر نے مسکرا کر کہا "آپ بے فکر رہیں آپ کو نازبرداری کی ضرورت نہ ہوگی۔ وہاں زیادہ تر نرسیں یورپین ہیں لیکن میں نے چند روز ہوئے سنا تھا کہ ایک ہندوستانی خاتون نرسنگ کا امتحان پاس کرنے کے بعد مشق کی غرض سے آئی ہوئی ہے اور گو ابھی اسے زیادہ تجربہ نہیں تاہم اپنا کام خوب ہوشیاری اور دلدہی سے کرتی ہے۔ اگر ممکن ہو سکا تو میں اُسے آپ کے لئے مقرر کرا دوں گا ——————"

"وہ حسین تو نہیں ہے؟"

"نہیں اِس قدر حسین نہیں کہ آپ کو اندیشہ ہو۔ اور غالباً کسی معزز خاندان سے ہے یہ کام فقط شوقیہ سیکھ رہی ہے۔"

"خیر تو اُن سے کہہ دینا کہ اگر یہ شرائط پوری نہیں ہو سکتیں تو میں وہاں رہ کر علاج نہیں کراؤں گا!"

ڈاکٹر نے مسکراہٹ ضبط کرتے ہوئے کہا "بہت اچھا۔ بہت اچھا۔ امید ہے انتظام ہو جائے گا" لیکن واقعہ یہ ہے کہ ڈاکٹر رابنسن کو اس نوجوان لکھ پتی کی باتوں پر ہنسی کو روکنے میں نہایت مشکل کا سامنا ہوتا تھا۔ اور اس کے خیال میں ان امیر لوگوں کو جو ضدی بچّوں کی طرح ہوتے ہیں کبھی کبھی اِس بات کا احساس ہونے کی ضرورت تھی کہ روپے سے دنیا کی ہر ایک چیز نہیں خریدی جا سکتی بلکہ اصلیت میں وہ تمام اشیاء جو حقیقی معنوں میں قابلِ حصول ہوتی ہیں روپے کے عوض نہیں ملتیں۔ ورنہ جس نرسنگ ہوم میں انند کمار کو رکھے جانے کا خیال تھا وہ قصبہ راج پور سے اوپر کی جانب ایک خوبصورت علیحدہ پہاڑی پر چونکہ ابھی تھوڑا ہی عرصہ ہُوا کھولا گیا تھا اُس کی یورپین مالکہ ایک ایسے متموّل آدمی کو اپنے یہاں رکھنے کے لئے ملک کا کونہ کونہ چھان مارتی اور کہیں سے اُس کے مزاج کے مطابق ہندوستانی نرس ڈھونڈ نکالتی۔

سچ پوچھیے تو انند کمار کی حالت واقعی قابلِ رحم تھی۔ طالب علمی کے جھمیلوں سے فراغت پا کر تین چار سال میں ہی سخت محنت کر کے اُس نے ثابت کر دیا تھا کہ مرحوم باپ کی کثیر جائداد اور تجارت کا کاروبار سنبھالنے کی اُس میں غیر معمولی قابلیّت تھی۔ اور خود مختار ہونے کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ وہ موسمِ گرما پہاڑ پر بسر کر کے کچھ آرام لینے کی فکر میں گھر سے روانہ ہُوا تھا۔ اب اسے مشیت کہئے یا اتفاق ڈیرہ دون میں آئے دو ہی دن ہوئے تھے اور آگے منصوری جانے کا خیال تھا کہ صبح کے وقت خود موٹر چلاتے ہوئے چند بے فکرے نوجوانوں کی موٹر کے ساتھ دوڑ ہو گئی۔ چونکہ رستے سے واقفیت نہ تھی جونہی اُس کی موٹر اُن سے آگے نکلی ایک بہت ٹیڑھے موڑ پر چھوٹا سا پُل سامنے آ گیا۔ جگہ اِس قدر تنگ تھی کہ موٹر رک نہ سکتی تھی جنگلا توڑ کر نالے میں اوندھی ہو گئی۔ دوسری موٹر والے بیہوش انند کمار کو اٹھا کر ہوٹل میں لائے ڈاکٹر رابنسن سول سرجن کو بلایا۔ دو پسلیاں ٹوٹ گئی تھیں۔ سر میں کئی جگہ چوٹیں تھیں تمام بدن کی کوئی جگہ خالی نہ تھی جہاں چوٹ زخم یا کم از کم خراش نہ ہو۔ کئی گھنٹے کے بعد ہوش آنے پر ڈاکٹر سے مندرجہ بالا گفتگو ہو رہی تھی۔

ڈاکٹر نے احتیاطاً انند کمار کو ایک خواب آور دوا پلا دی اور خواب کی حالت میں ہی اُسے موٹر میں رکھ کر نرسنگ ہوم پہنچا دیا گیا۔ اس لئے جب شام کے قریب وہ بیدار ہُوا تو بالائی منزل کے ایک نہایت صاف ستھرے ہوادار کمرے میں ڈوبتے ہوئے سورج کی سنہری کرنیں روپہلی کناروں والے گلابی اور بنفشئی بادلوں میں سے چھن کر اُس کے بستر پر پڑ رہی تھیں۔ اور بارش کے بعد دھلے ہوئے سبزہ کا سماں۔ اور دُور پہاڑیوں کے سیاہ دامنوں پر چھوٹے بڑے روئی کے سفید گالوں کی استراحت کا نظارہ پیشِ نظر تھا۔

وہ دیر تک خاموشی سے بے حس و حرکت پڑا ہُوا اس منظر کا لطف اٹھاتا رہا۔ پھر پلنگ کی پائنتی کی جانب نظر

اٹھائی تو دیکھا کہ اس طرف بھی ایک بہت بڑی کھڑکی ہے جس کے پٹ کھلے ہیں اور سامنے کے پہاڑوں پر بے شمار روشنیاں کپورتھلہ کی کوٹھی کے بڑے لمپ سے لے کر لنڈور بازار تک تھوڑے تھوڑے عرصہ کے بعد ٹمٹماتی ہوئی ظاہر ہوتی جارہی ہیں۔گویا منصوری کی پہاڑی حسینہ اپنے شبانہ لہو ولعب کے لئے جھپکتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ آہستہ آہستہ خواب ناز سے بیدار ہو رہی ہے۔

یک لخت سٹفل کے یہاں کی روشنیاں گلابی ریشم کے اوندھے کنول سے مشابہ شیڈوں میں اردگرد کے سفید ستاروں کے درمیان بہت سے مریخوں کی طرح خون آشام دلوں کا سرخ رنگ لئے ہوئے چمکیں اور انند کمار کے دل کا جمع شدہ غبار اُس کے منہ سے انگریزی کے اُس پُرمعنی لفظ کی شکل میں پھوٹ نکلا جس سے بہتر پامال شدہ آرزوؤں کے بے ساختہ اظہار کے لئے اردو زبان میں کوئی ایک لفظ نہیں ہے ———

"ڈیم! ......"

اب باوجود اس کے کہ یہ لفظ ایک خاص کیفیتِ قلب کے اظہار کے واسطے انگریزی زبان میں بھی لاجواب ہے، اہلِ زبان اسے فصیح نہیں کہتے۔یہاں تک کہ مستورات کی موجودگی میں اُسے منہ سے نکالنا سخت معیوب خیال کیا جاتا ہے، یہ وجہ تھی کہ انند کمار جو اپنے آپ کو کمرہ میں اکیلا سمجھے ہوئے تھا گھبرا کر محجوب سا ہو گیا جب کچھ آہٹ ہوئی اور کمرے کی دیوار کی جانب دھندلی تاریکی میں سے ایک صورت نرس کے لباس میں آکر اُس کی آنکھوں اور منصوری کے نظارے کے درمیان حائل ہو گئی ——— اور پوچھا

"آپ بیدار ہو گئے کیا؟ اب مزاج کیسا ہے؟"

تھوڑی دیر رک کر انند کمار نے بھی سوال ہی کیا "جو کچھ میں کہہ رہا تھا کیا تم نے سنا؟"

جواب ملا "ہاں سنا تو ———"

"امید ہے تمہیں سُن کر بہت صدمہ نہیں ہوا ہوگا۔کیونکہ وہ مزاج ہی کی کیفیت تو تھی جو میرے منہ سے نکلی ——"

"خیر کوئی حرج نہیں۔اب مجھے آپ کا ٹمپریچر لینا ہے۔لیکن پہلے یہ بتائیے کہ کوئی اور کام ایسا تو نہیں جو آپ چاہتے ہوں میں پہلے کرلوں؟"

"ہے تو سہی" انند کمار نے کہا "میں چاہتا ہوں کہ تم مجھے سوفا پر بٹھا کر سامنے کی سرخ روشنیوں والی عمارت کے اندر بال روم میں پہنچا دو۔اُسی کی جھلک نے میری طبیعت کو زیادہ خراب کر دیا ہے۔کیونکہ میں نے اسے طالب علمی کی بندشوں کے زمانہ میں دیکھا تھا آزادی سے دیکھنے کی آرزو تھی ——— لیکن یہ آرزو اب غالباً کبھی پوری نہ ہو سکے گی"

"کیوں؟"

"اس لئے کہ اب میرا صحت پاجانا محال ہے۔ جب ڈاکٹر بھی اس قدر تسلیم کرتا ہے کہ میری حالت خطرناک ہے تو اِس کے معنی یہ ہیں کہ زندگی کی کوئی امید نہیں۔ مجھ سے زیادہ بدنصیب بھی دنیا میں کوئی نہ ہوگا ———"

"آپ کا خیال غلط ہے۔ دنیا میں بہت سی ایسی ہستیاں موجود ہیں جنہیں امراض سے اتنی فرصت ہی نہیں کہ اپنی بدنصیبی پر غور کرسکیں"

"ہونگی ——— لیکن میرے خیال میں ایسا کوئی نہیں ہوگا جس کے ساتھ قسمت نے اِس قدر ستم ظریفی کا برتاؤ کیا ہو جیسا میرے ساتھ کیا ہے۔ میری جگہ اگر کوئی غیر بھی ہوتا تو مجھے اُس کی حالت پر رونا آتا ———"

"لیکن اگر یہیں اس نرسنگ ہوم میں ہی کسی کی حالت آپ سے زیادہ خراب ہو۔ اور آپ بھی اسے تسلیم کرلیں تو ———؟"

"ناممکن ہے۔ میں شرطیہ کہہ سکتا ہوں کہ ایسا کوئی نہ ہوگا"

"مجھے یہاں کے ضوابط شرط لگانے کی اجازت نہیں دیتے۔ ورنہ جیت لینے میں کوئی دقت نہ ہوتی"

"تو کیا کوئی خاص کیس مدِنظر ہے؟ ——— ویسے تو غالباً مجھے بھی یہاں کے لوگ "کیس" ہی کہتے ہونگے اور مجھے اِس لفظ سے سخت نفرت ہے۔ گویا کسی بے جان چیز کا ذکر ہورہا ہے ——— اور مجھے اِس سے بہتر کوئی نام رکھوانے کا حق بھی کیا ہے۔ مُردوں سے بدتر ہوں ——— مرجاتا تو اچھا رہتا۔ چھٹکارا ہوجاتا۔ اب خدا جانے کب تک اِسی طرح پڑا رہوں گا ——— اور نتیجہ پھر وہی۔ صحت تو ہونے سے رہی۔ علاج کرنے سے کیا حاصل ———!"

نرس نے دوبارہ اُس کے خیالات کو پلٹنے کی کوشش کی "سنئے تو۔ ایک خاص کیس مدِنظر ہے اور وہ بھی بہت عجیب ———"

"مرد ہے یا عورت؟"

"عورت ہے ——— عورت بھی کیا نوجوان لڑکی ہے۔ اُس کے حالات آپ سنیں گے تو اپنی تکالیف بھول جائیں گے ———"

اتنے میں دروازے کے باہر آہٹ ہوئی۔ نرس نے جلدی سے یہ کہہ کر "باقی کل بتاؤں گی" بجلی کا لمپ جو اندھیرا کے نظارے کا لطف اٹھانے کے لئے اب تک جلانے نہیں دیا تھا روشن کردیا۔ دروازہ کھلا۔ ایک اور نرس اور ڈاکٹر اندر آگئے۔ اور یہ نرس دروازے کے پاس ڈاکٹر سے کچھ گفتگو کرکے چلی گئی۔

ڈاکٹر نے نبض دیکھی تھرمامیٹر لگایا ——— حرارت بڑھنے لگی تھی ——— اور مرہم پٹی کو جہاں جہاں ضرورت

تھی درست کرکے تسلی دینے کی کوشش کرنے لگا۔

"امید ہے آپ کو جلدی صحت ہو جائے گی۔ آپ کے قویٰ مضبوط ہیں اور یہاں کی آب و ہوا نہایت اچھی ہے ـــــ"

انند کمار نے جھنجھلا کر کہا "اجی چھوڑو بھی ڈاکٹر صاحب۔ مجھے دھوکا دینے سے کیا حاصل! صاف کیوں نہیں کہہ دیتے کہ ہفتہ عشرہ کا مہمان ہوں ـــــ؟"

"واہ صاحب آپ ہمت کیوں ہارے دیتے ہیں؟ آپ ایسے نوجوان تو جنگِ عظیم میں میں نے کئی مرتبہ دیکھا مر کر زندہ ہو ہو گئے ہیں۔ اور آپ کے تو کوئی زیادہ خطرناک چوٹ بھی نہیں آئی۔ اعضائے رئیسہ صحیح وسالم ہیں۔ بس چار پانچ روز کی بات ہے۔ جہاں زخم درست ہونا شروع ہوئے طبیعت بحال ہو جائے گی۔ اور ابھی تو پہلا دن ہے۔ رات میں غالباً بخار بڑھ جائے گا اور زخموں میں درد بھی محسوس ہوگا۔ اگر ابھی سے آپ گھبرا گئے تو بیماری کیسے کٹے گی ـــــ!"

غرض اسی طرح کی چند باتیں کرکے ڈاکٹر چلا گیا اور انند کمار نے بخار کی حدت اور درد اور بے چینی کی وجہ سے رات آنکھوں میں کاٹی۔ صرف صبح کے وقت ایک دو گھڑی کے لئے بمشکل اس کی آنکھ لگی۔

دن کافی نکل چکا تھا کہ انند کمار جاگا اور سب سے پہلے اس کی نظر سامنے کے پہاڑوں پر پڑی جہاں پیلی پیلی دھوپ ہرے ہرے لہلہاتے ہوئے سبزے کے ساتھ کھیل رہی تھی۔ فرطِ مسرت سے اچھل کر پلنگ پر بیٹھ جانے کو تھا کہ بجلی کے شرارے کی طرح درد کی ایک لہر سر کی طرف سے اٹھی اور پاؤں کی طرف سے نکل گئی۔ اور گزشتہ رات کا خیال آنے سے اس کی تمام امنگ پر پانی پھر گیا۔

اس نے پھر آنکھیں بند کرلیں اور رات کے واقعات ایک ایک کرکے اس کے خیال میں گزرنے لگے۔ وہ موٹر کی دوڑ ـــ پل کا سامنے آجانا ـــ بے خبری۔ ہوٹل کا کمرہ اور ڈاکٹر ـــ نرسنگ ہوم۔ شام اور ـــ نرس ـــ ہاں نرس ـــ حسین تو نہ تھی ـــ لیکن اس نے اس کی صورت ہی کب دیکھی تھی ـــ صرف اندھیرے میں۔ آسمان کے مقابل ـــ چہرے کے خطوط برے نہ تھے لیکن ہندوستانی تھی ـــ غالباً کالی ہوگی۔ اور کالی بھی وہ جسے پنجابی "شاہ کالی" کہتے ہیں ـــ مدراس یا بمبئی کی رہنے والی ـــ گو معلوم ہوتا ہے تعلیم یافتہ تھی ـــ اور ہمدرد ـــ ہاں ہمدرد ضرور تھی ـــ وہ کسی لڑکی کا ذکر بھی تو کر رہی تھی جو بہت بیمار ہے ـــ مجھ سے بھی زیادہ ـــ شاید یورپین نرس اتنی ہمدرد نہ ہوتی۔ وہ تو یہ چاہتی کہ میں اس کے حسن کی تعریف کروں ـــ ـــ ـــ

ـــ کسی نے اس کے شانے پہ ہاتھ رکھا ـــ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ نرس کھڑی تھی ـــ وہی! ہاں

غالبًا وہی ——— لیکن یہ کالی تو نہ تھی ——— اور آنکھیں ——— اُف کتنی بڑی بڑی! اور ان میں ———

"آج مزاج کیسا ہے؟" نرس کی آواز آئی۔

"بہت بُرا ———"

"کیوں؟ کیا تکلیف ہے؟"

"یہی کہ میں اُن پہاڑوں پر جانے کے ناقابل ہوں۔" اور اُس نے آنکھ سے کھڑکی کی طرف اشارہ کیا۔

"اس کا وقت بھی آجائے گا۔ آپ کو اتنا بے صبر نہیں ہونا چاہیئے۔"

اِس گفتگو کے بعد ڈاکٹر آگیا۔ مرہم پٹی ہوئی۔ خوراک دی گئی وغیرہ ——— اور جب سب چلے گئے تو انند کمار نے نرس سے پُوچھا۔

"نرس تمہارا نام کیا ہے؟"

"مجھے یہاں نرس بملا کہتے ہیں۔"

"وطن ——— ؟"

"گجرات"

"گجرات؟" انند کمار نے حیرانی سے کہا۔ "کاٹھیاوار؟"

"نہیں تو۔ گجرات پنجاب۔"

"اچھا ——— ابھی ———"

"ابھی کیا؟"

"کچھ نہیں۔" جلدی سے بات ٹال کر انند کمار نے کہا۔ "تم کل کسی لڑکی کا ذکر بھی تو کر رہی تھیں جو اسی نرسنگ ہوم میں ہے۔ اور مجھ سے زیادہ بیمار ہے ———"

"ـــ ـــ ہاں کر رہی تھی ——— لیکن ہمیں مریضوں کا حال ایک دوسرے سے کہنے کی اجازت نہیں۔ اور ممکن ہے اُس کے متعلق سُن کر آپ کی طبیعت پر اثر ہو اور ٹمپریچر بڑھ جائے ———"

"واہ! کسی عورت کا حال سننے سے میرا ٹمپریچر بڑھ جائے۔ وہ جنّت کی حُور بھی ہو تو یہ ممکن نہیں۔ اُس کا نام کیا ہے؟"

"صُورت تو واقعی ایسی ہے کہ حوروں کی بھی نہ ہوگی۔ لیکن نام یا پتہ کسی کو معلوم نہیں۔ اور ہوتا بھی تو نرسنگ ہوم میں مریضوں کو اُن کے نام سے یاد نہیں کیا جاتا۔ کمرے کے نمبر پر مریض کا نام ہوتا ہے!"

"یعنی ؟"

"یعنی اُس کا نام مس پندرہ ہے۔ کیونکہ وہ پندرہ نمبر کے کمرے میں ہے"

"اور میں؟"

"آپ نمبر آٹھ یا مسٹر آٹھ ہیں"

"اچھا تو اُس کا نام یا پتہ کسی کو معلوم نہیں ؟ کیوں ؟"

"یہ بھی ایک افسانہ ہے۔ وہ کل آپ کے آنے سے پہلے یہاں لائی گئی تھی۔ ڈیرہ دون کے سٹیشن پر اکیلی ریل سے اتری اور اُترتے ہی بیہوش ہو کر گر گئی۔ لباس سے کسی معزز اور امیر گھرانے کی معلوم ہوتی تھی۔ صرف ایک بیگ ساتھ تھا۔ اب تک اُسے پورا ہوش نہیں آیا اور بہکی بہکی باتیں کرتی ہے"

"ہندو ہے یا مسلمان ؟"

"یہ بھی کسی کو علم نہیں بے حد کمزور ہے اور جب کبھی آنکھیں کھولتی ہے۔ سخت خوف زدہ معلوم ہوتی ہے۔

"آخر بات کیا ہے ؟"

"کچھ پتہ نہیں۔ اب آپ زیادہ گفتگو نہ کریں۔ سر میں درد ہو جائے گا۔ ڈاکٹر منع کر گیا ہے۔ سونے کی کوشش کیجئے۔ رات بھی آپ بہت کم سوئے ہیں۔ اور جن حالات کا آج شام کو پتہ چلے گا کل آپ کو بتاؤں گی۔ لیکن ایک بات کا خیال رکھنے کی ضرورت ہے۔ وہ یہ کہ ڈاکٹر یا کسی دوسری سسٹر کبھی مس پندرہ کی نسبت دریافت نہ کیجئے گا۔ ورنہ اول تو میٹرن مجھ سے ناراض ہوگی کہ میں نے ایک مریض کا حال دوسرے سے کہا۔ اور ——— ایک وجہ اور بھی ہے جو پھر کبھی بتاؤں گی ———"

انند کمار نے سر کے اشارے سے 'اچھا' کہا۔ اور آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرنے لگا۔ اُس کے منتشر خیالات کے ہجوم میں حسین مس پندرہ کی کہانی اور اِس کی بے بسی کے ساتھ نرس بملا کے رازدارانہ انداز اور بڑی بڑی پُراسرار آنکھوں کا دھندلا سا تصور بھی وقتاً فوقتاً سینما کے نظاروں کی طرح پردے پر آتا اور غائب ہو جاتا۔

تیسرے روز جب ڈاکٹر آ کر چلا گیا تو انند کمار رات کی تکالیف کے بعد حسبِ معمول اپنی بدنصیبی پر تاسّف اور قسمت سے گلا کرنے میں مشغول تھا کہ نرس بملا نے کہا

"رات سے وہ پورے ہوش میں ہے ———"

"کون ہوش میں ہے ؟"

"مس پندرہ"

"تو میں کیا کروں ــــ!"

"اچھا مجھے تو خیال تھا کہ شاید آپ کی وجہ سے اس کی جان بچ جائے۔ لیکن آپ کو کسی کی تکلیف یا راحت کا احساس ہی نہیں۔"

"میری وجہ سے؟"

"ہاں آپ کی وجہ سے۔ گزشتہ رات میں اُس کے پاس تقریباً ایک گھنٹے تک بیٹھی رہی۔ وہ کسی سے بے حد خوفزدہ ہے اور اس خوف کے باعث ہی اپنا نام پتہ یا حالات نہیں بتاتی۔ اب معلوم ہوا ہے کہ اُس نے سٹیشن پر اترنے سے پہلے ایک زہریلی دوائی کھائی تھی گویا خودکشی کرنا چاہتی تھی جو حسن اتفاق سے بیہوش ہوگئی اور یہاں پہنچتے ہی اُس کا علاج شروع ہوگیا۔ میں سمجھتی تھی کہ اگر کوئی آپ ایسا با اثر نوجوان جو تھوڑے بہت خطرے سے نہ گھبراتا ہو اُس کی امداد پر تیار ہو جائے تو ممکن ہے اُس کی جان بچ سکے ورنہ یقینی امر ہے کہ ہر وقت روتے رہنے۔ ذرا ذرا سی آہٹ پر اچھل پڑنے اور دروازے کی طرف اس طرح دیکھنے سے گویا موت کا پیام آیا چاہتا ہے وہ گھل گھل کر چند روز میں ختم ہو جائے گی۔"

"لیکن میں تو اپنی جان سے بیزار اور خدا جانے کتنے دنوں کا خود مہمان ہوں۔ میں اُس کی کیا مدد کر سکتا ہوں!"

"یہ آپ کا وہم ہے۔ اگر آپ کوشش کریں تو ہفتہ عشرہ میں بھلے چنگے ہو سکتے ہیں۔ ہاں البتہ اگر آپ کسی کے لئے خطرے میں نہ پڑنا چاہیں تو دوسری بات ہے ــــــ"

"نہیں جو کچھ مجھ سے ہو سکے گا میں اُس کے لئے تیار ہوں لیکن میرے صحت پانے تک وہ یہاں کیوں پڑی رہے گی؟"

"اس کی میں ذمہ دار ہوں میں اسے سمجھا بجھا کر راضی کرلوں گی کیونکہ اُس کے زندہ رہنے کا غالباً فقط یہی ایک ذریعہ ہے۔"

اس کے بعد انند کمار کے چند عزیز آگئے اور یہ گفتگو یہیں ختم ہوگئی۔ لیکن شام کو رخصت ہونے سے پہلے نرس بملا نے مسکرا کر مس پندرہ کی امداد پر تیار ہو جانے کے لئے اس کا شکریہ ادا کیا۔ مسکرانے میں اُس کے ہونٹوں کے دونو طرف کچھ فاصلے پر دو چھوٹے چھوٹے گہرے گڑھے پیدا ہو گئے۔ جو رات میں نیم خواب کی حالت میں بار بار انند کمار کی آنکھوں کے سامنے آجاتے۔ وہ حیران تھا کہ کیوں ــــــ

اسی طرح دو ہفتے گزر گئے۔ مس پندرہ اور انند کمار کے درمیان نامہ و پیام کا سلسلہ نرس بملا کی وساطت سے جاری رہا اور آخر میں ایک دفعہ انند کمار نے ایک تحریر بھی اپنے ہاتھ سے لکھ کر بھیجی جس کا جواب نہایت خوبصورت گول گول حروف میں لکھا ہوا اُسے ملا۔ لیکن مس پندرہ نے بہت بہت شکریہ پر ہی اکتفا کی تھی۔ اپنا نام پتہ اور مزید حالات

بتانے کا وعدہ انندکمار کو صحت ہونے پر تھا۔ وہ بھی اب جلدی صحت یاب ہو جانے کے لئے بے چین تھا۔ اور ہر روز ڈاکٹر سے بار بار یہ پوچھ کر اُس کا ناطقہ بند کر دیتا کہ کب تک نرسنگ ہوم چھوڑ دینے کے قابل ہو سکے گا۔ ڈاکٹر اور میٹرن مس بملا کے حد سے زیادہ مداح تھے کہ اُس نے انندکمار کی زندگی سے مایوسی کو کس طرح جلدی اٹھ کر چلنے پھرنے کی خواہش میں تبدیل کر دیا۔ جب وہ اُس سے یہ سوال کرتے تو وہ مسکرا کر چپ ہو رہتی۔

آخر وہ دن آ گیا جب انندکمار کو اپنا لباس پہن کر کمرے میں چلنے پھرنے اور آرام کرسی پر بیٹھنے کی اجازت ملی اُس روز نرس بملا کے ساتھ تنہا ہوتے ہی اُس نے مس پندرہ سے ملاقات کا تقاضا شروع کر دیا۔ نرس کچھ دیر تک تو سوچتی رہی۔ پھر اُٹھ کر کھڑکی کی طرف چلی گئی۔ اور رومال نکال کر منہ سے لگا لیا۔ انندکمار نے غور سے دیکھا تو معلوم ہُوا کہ آنسو بہ رہے ہیں۔ اور باوجود سخت کوشش کے نہیں رکتے۔ ایک دریا ہے کہ اُمڈا چلا آتا ہے۔ حیران تھا کہ یہ ماجرا کیا ہے ———

وہ اٹھا اور نرس کے بازو کو سہارا دے کر اُسے آہستہ سے کرسی پر بٹھا دیا۔ اور تھوڑی دیر کے بعد پُوچھا۔

"دیکھو تو بملا بات کیا ہے؟ کیا مس پندرہ پھر زیادہ بیمار ہو گئی ہے؟"

نرس بملا نے ننھا سا لیس دار رومال جو آنسوؤں سے بالکل تر ہو گیا تھا ہٹا یا۔ اور آنکھیں اٹھا کر انندکمار کی طرف دیکھا۔ بڑی بڑی آنکھیں جو پہلے ہی بڑی تھیں اب اور بھی زیادہ طویل و عریض معلوم ہوتی تھیں۔ اُن کی سفیدیوں میں سرخ سرخ ڈوروں کا جال سا بچھا ہُوا تھا اور کہیں کہیں آنسو لمبی خمیدہ پلکوں میں۔ مکڑی کے جالے میں شبنم کے موتیوں کی طرح پروئے ہوئے دکھائی دیتے تھے ——— اور جواب دیا۔

"مس پندرہ ہوتی تو جھگڑا ہی کس بات کا تھا؟"

"تو کیا ——— وہ کہیں چلی گئی؟"

"تھی کہاں؟"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ یہ کُل ایک فرضی افسانہ تھا" نرس بملا نے بڑی مشکل سے آنسوؤں کو ضبط کر کے کہا گو اب بھی ہچکی آ کر گاہے گاہے اُس کے فقروں کو توڑ دیتی تھی "لیکن آپ کی حالت اس قدر خراب تھی ——— اور آپ کے ہر وقت کے تفکرات اور صحت سے مایوسی ——— اُن سے آپ کی جان کا خطرہ تھا ——— "

"تو گویا کُل نرسنگ ہوم والوں نے مل کر مجھے دھوکا دینے کے لئے یہ افسانہ گھڑا تھا؟"

"نہیں تو ۔۔۔۔ اس میں اور کسی کا قصور نہیں۔ اور میں جانتی ہوں کہ یہ قصور قابلِ معافی نہیں لیکن پہلے تو صرف آپ کی توجہ اپنی تکالیف اور بدقسمتی کی طرف سے ہٹانے کے لئے میں نے مس پنا رہ کا ذکر چھیڑا تھا لیکن بعد میں آپ کے سوالات ۔ اور اپنے پہلے جھوٹ کو قائم رکھنے کی ضرورت نے مجھے مزید جھوٹ بولنے پر مجبور کر دیا ۔ یہاں تک کہ معاملہ بہت دور پہنچ گیا ۔ یہی وہ دوسری وجہ تھی جس کے لئے میں نے کسی اور سے مس پنا رہ کی نسبت دریافت نہ کرنے کی آپ سے درخواست کی تھی ۔۔۔۔۔"

"اور وہ خط ؟"

"میرا لکھا ہوا تھا ۔۔۔۔"

کچھ عرصے تک تو انند کمار چپ چاپ سوچتا رہا ۔ پھر یک لخت قہقہہ لگا کر ہنس دیا ۔ اور کہا "تو گویا تم نے میری جان بچائی ؟ اکیلی تم نے ۔۔۔۔ یہ کیوں ؟

نرس بملا نے آنکھیں نیچی کرلیں اور کچھ جواب نہ دیا ۔ انند کمار نے تھوڑے وقفہ کے بعد پھر کہا "اچھا تو اب اس میری جان بچانے کے قصور کی سزا کیا ہونا چاہیئے ؟"

اُسی طرح آنکھیں نیچی کئے ہوئے بملا نے جواب دیا "جو آپ کا دل چاہے"

"سزا یہ ہے ۔۔۔۔" انند کمار نے مسکرا کر اُس کی ٹھوڑی کو انگلی سے اٹھاتے ہوئے اُس کا چہرہ اپنے مقابل کر کے کہا "۔۔۔۔ کہ تم مستقل طور پر میری تیمارداری اپنے ذمے لے لو ۔۔۔۔"

بملا نے ایک دفعہ آنکھیں اٹھا کر پھر انند کمار کی طرف دیکھا ۔ ہونٹوں سے کچھ دور دونوں طرف وہی گڑھے پیدا ہوگئے جن کے انند کمار خواب دیکھا کرتا تھا ۔ آنکھیں نیچی ہوگئیں اور بملا نے آہستہ سے کہا

"جس طرح آپ کی مرضی ۔۔۔۔"

اِس سے تقریباً ایک ماہ بعد مسٹر اور مسز انند کمار منصوری پرسٹفل کے بال روم میں بیٹھے چائے پی رہے تھے اور چاروں طرف بجلی کی قمقمیاں گلابی ریشم کے اوندھے کنول سے مشابہ شیڈوں میں سینکڑوں خون آشام دلوں کا رنگ لئے ہوئے آویزاں تھیں +

عطاءالرحمٰن

داستانِ دل

زندہ انہیں کے دم سے ہے نام و نشانِ دل | جذباتِ حسن و عشق ہیں روح و روانِ دل

نازونیاز میں بھی یہ ہے پاسِ حسن و عشق | اک آستانِ دل ہے تو اک پاسبانِ دل

معنائے حسن، خوبی و نیکی ہے بالیقیں | اس کے سوا کہے تو غلط ہے بیانِ دل

ہے عشق کیا طلب ہے فقط نیک و خوب کی | جو اس سے منحرف ہیں وہ ہیں دشمنانِ دل

تہذیب جس کے ساتھ ہو اخلاق جس کے پاس | وہ عشق پاک و صاف ہے شایانِ شانِ دل

سیرِ مجاز چھوڑ! فریبِ نظر ہے یہ | اٹھ!! بامِ معرفت پہ لگا نردبانِ دل

اللہ رے عاشقانِ حقیقی کی ہمتیں | دیتے ہیں ہنس کے جان دمِ امتحانِ دل

موت اُن کی، زندگی ہے۔ فنا اُن کی ہے بقا | ہے رشکِ عیش اُن کو غمِ جاودانِ دل

باغِ خلیل، آتشِ نمرود بن گئی | تھی ایک یہ کرامتِ سوزِ نہانِ دل

یہ ذکر اگرچہ لائقِ تفصیل ہے مگر | تھوڑا ہے وقت اور بڑی داستانِ دل

زندہ رہا تو پھر کبھی احسن سناؤں گا
بن کر زبانِ حال سے میں ترجمانِ دل

احسن
مارہروی

غزل

عجب کیا ہے جو سن لے اب کوئی دم میں خدا میری
کہ تیری ضد سے ٹکرائی ہے برسوں التجا میری

توجہ کے کبھی قابل نہ ہوگی التجا میری
کہ تعلیمِ تغافل اُن کو دیتی ہے وفا میری

توقع کچھ اگر رکھوں سراسر ہے خطا میری
کہ اُن کے رُوبرُو میں کیا ہوں اور کیا التجا میری

بہانہ چاہیئے تجھ کو نہ مجھ کو عذر کی حاجت
مُسلّم ہے زمانے میں کرم تیرا خطا میری

عبث احباب مجھ سے کرتے ہیں اظہارِ ہمدردی
نہ وہ میرا مرض سمجھیں نہ وہ جانیں دوا میری

نہ تُو نے کی کمی کوئی نہ میں ثابت ہوا قاصر
رہیں دست و گریباں ہی جفا تیری وفا میری

نہ سمجھو تم تو میرا مدعا اک حرفِ باطل ہے
اگر سمجھو تو پھر میری خموشی ہی صدا میری

ترے نازِ بلا انگیز سے فریاد کرتا ہوں
تری ایک ایک ادا او فتنہ پیکر ہے قضا میری

کبھی تو گوشۂ ابرو کو جنبش کی اجازت دے
بہت اندوہ گیں رہتی ہے جانِ مبتلا میری

یہی بہتر ہے اپنے کام سب تقدیر پر چھوڑوں
کہ وحشت ہو چکی اب کوششوں کی انتہا میری

رضا علی
وحشت

افکارِ رعنا

ملتے ہی آنکھ جامِ محبت پلا دیا — یہ تم نے اِک نظر میں مجھے کیا دکھا دیا

جاں کیا تھی جان ڈال دی اُس میں خیال نے — دِل کیا تھا آرزو نے اُسے دل بنا دیا

کس دل سے دُوں دعائیں نشاطِ خیال کو — دنیا کو میرے واسطے جنت بنا دیا

قدرت کی بخششوں کا بھلا کیا شمار ہو — سب کچھ دیا کہ اِک دلِ بے مدعا دیا

یُوں رنگ لائی میری پشیمانیٔ گناہ — رکھ دی جہاں جبیں وہیں کعبہ بنا دیا

اظہارِ دردِ دل سے سوا دردِ دل ہوا
رعناؔ غضب کیا کہ یہ پردہ اُٹھا دیا

ملک سلطانہ رعناؔ

غزل

نہ چھیڑو، کیا ستم کرتے ہو۔ اِک بسمل کے ٹکڑے ہیں — جسے شیشہ سمجھتے ہو، یہ میرے دل کے ٹکڑے ہیں

بہت رونا مجھے آتا ہے غنچوں کے تبسم پر — فقط۔ کھلنے ہی کی ہو دیر ساری کھل کے ٹکڑے ہیں

فدا ہے گُل پہ بلبل مَیں ترے ہونٹوں پہ مرتا ہوں — وہ اُس کے دل کے ٹکڑے ہیں یہ میرے دل کے ٹکڑے ہیں

مزا دیتی ہے کیا کیا۔ روز کی یہ چارہ فرمائی
مرے زخموں کے پھاہے دامنِ قاتل کے ٹکڑے ہیں

آغا شاعرؔ دہلوی

محفلِ ادب

اختلافاتِ السنہ

یہ پتہ لگانا بہت دشوار ہے کہ ابتدائے تمدن میں ایک ہی زبان بولی جاتی تھی یا کئی - جن اقوام کا یہ مذہب
ہے کہ تمام انسان ایک ہی ابوالبشر کی اولاد سے ہیں - خواہ وہ یہود و نصاریٰ و اہلِ اسلام کے خیال کے مطابق
آدم علیہ السلام ہوں یا مجوسیوں کے قول کے مطابق "مہ آباد" یا ہندوؤں کے اعتقاد کے مطابق "سویمبھو منو" یہ
اس بات کے قائل ہیں کہ ابتدا میں ایک ہی زبان تھی جس سے دیگر السنہ مشتق ہوئی ہیں - لیکن وہ ابتدائی زبان
سی تھی اور اس کی ہیئتِ کذائی کیا تھی؟ اِس کے جواب میں تو ہیں مختلف الآرا ہیں - ہر قوم اپنے خیالی مورث
کی زبان کو تمام دیگر السنہ کا ماخذ قرار دیتی ہے - کوئی 'سریانی' کو، کوئی 'ارامی' کو، کوئی 'سنسکرت' کو اور کوئی 'اُستا
کو ام الالسنہ، قرار دیتا ہے - ساسانی مجوسیوں کا قول ہے کہ 'مہ آباد' نے جس کی زبان استاوی تھی، اپنے شاگرد
مختلف زبانوں کی تعلیم دے کر مختلف ممالک میں بھیجا - اس طرح مختلف قطعاتِ ارض میں مختلف زبانیں بولی
لگیں - اگر یہ واقعہ سچ بھی ہو تو وہ اختلافِ زبان کی وجہ قرار نہیں دیا جا سکتا، بلکہ اس سے تو یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا
کہ مختلف قطعاتِ ارض پہلے سے آباد تھے - اور ہر جگہ کی زبان الگ الگ تھی - اِس لئے ہر ملک کے لوگوں کو ا
کی زبان میں اصولِ مذہب کی تعلیم دینے کے لئے 'مہ آباد' نے اپنے شاگردوں کو مختلف زبانیں سکھائیں - دورِ حاضر
دانایانِ فرنگ کا خیال ہے کہ انسان کسی فردِ واحد کی اولاد نہیں ہے، بلکہ اُس نے جسمِ حیوانی سے رفتہ رفتہ ترقی کر
اور ارتقا کے بے شمار مدارج طے کرنے کے بعد، جامۂ انسانی زیبِ تن کیا ہے - لہذا اُن کا خیال ہے کہ ابتدائے
ہی میں دُور دراز ممالک کے وحشی انسان مختلف زبانیں بولتے ہونگے - بہرحال اگر یہ مسئلہ غیر فیصل ہی چھوڑ دیا جا
ابتداً انسان کی زبان ایک تھی یا متعدد، تو بھی یہ امر مسلّم ہے کہ اُس وقت آج کل کی طرح لاکھوں زبانیں نہیں
جاتی تھیں -

علمی لحاظ سے اختلافِ السنہ کی سب سے بڑی وجہ متفرق ممالک کی آب و ہوا اور دیگر جغرافی خصائص کا اختل
ہے - جب مادرِ وطن میں اُس کے تمام فرزندوں کے لئے کافی جگہ اور گنجائش باقی نہیں رہی تو فاضل آبادی دوسرے

میں ہجرت کرنے لگی۔ مثلاً آریاؤں کا قدیم وطن وسطِ ایشیا تھا لیکن عمران و آبادی کی کثرت نے انہیں وطن کو خیرباد کہہ کر دوسرے ملکوں میں جا بسنے پر مجبور کیا۔ اُن کا اکثر و بیشتر حصّہ مغرب کی جانب تلاشِ معاش میں چل کر تمام یورپ پر چھا گیا۔ کچھ لوگ جنوب کی طرف روانہ ہو کر ایران اور ہندوستان میں آ بسے۔ یہی حال دوسری نسلوں کا ہؤا۔ الغرض مرکزی وطن سے ہجرت مختلف قطعاتِ زمین کی آبادی کا باعث ہوئی۔ اُس زمانے میں آج کل کی طرح دُور دُور ملکوں کے درمیان رسل و ترسیل اور حمل و نقل کے ذرائع موجود نہ تھے۔ اس لئے ایک ہی نسل کے لوگوں کے جو مختلف بلاد میں جا بسے تھے باہمی تعلقات منقطع ہو گئے۔ متفرق ممالک کی آب و ہوا اور دیگر جغرافی خصائص کے زیرِ اثر نہ صرف مختلف قوموں کے عادات و خصائل، میلانات و رجحانات، ضروریات و خصوصیات، رسم و رواج ہی ایک دوسرے سے متغائر ہو گئے بلکہ اُن کے قد و قامت، جسمانی ساخت، آلاتِ گویائی کی بناوٹ، منہ، زبان، ناک، دانتوں، حلق، ہونٹوں اور صوتی نلیوں وغیرہ کی ہیئت اور ساخت میں بھی فرق پیدا ہوتا گیا۔ لہٰذا اُن کے لب و لہجہ، آواز و اصوات، مخارج و تلفظ، طرزِ ادا، اسلوبِ بیان وغیرہ بھی ایک دوسرے سے متبائن ہو گئے۔ مثلاً پہاڑی علاقوں کے لوگوں کی آواز میں خشونت، میدانی قطعات کے باشندوں کی آواز میں ہمواری، سلاست اور روانی، تری کے رہنے والوں کی زبان میں نرمی اور لوچ، معتدل آب و ہوا میں زندگی بسر کرنے والوں کی بولی میں شیرینی اور حلاوت پیدا ہو گئی۔ یہ تو لب و لہجہ کا تغیر ہؤا، ایسی ہی تبدیلیاں مخارج اور تلفظ میں بھی رونما ہوئیں۔ مختلف مرز بوم کی آب و ہوا کے زیرِ اثر بعض قوموں کے آلاتِ گویائی کی ساخت میں کچھ ایسا بگوگ آ پڑا کہ وہ بعض آوازوں کے بولنے سے قاصر ہو گئے۔ مثلاً پ۔ چ۔ ژ۔ ڑ۔ ڈ۔ گ وغیرہ کا تلفظ عربوں کے لئے ناممکن ہے۔ اسی طرح انگریز ت، ع، غ، خ، ق وغیرہ کا تلفظ نہیں کر سکتے۔ بھ، پھ، تھ، دھ، کھ، اور ٹ، ڈ، ڑ وغیرہ خاص ہندی النسل اصوات ہیں۔ جن کے ادا کرنے سے دنیا کی اکثر قومیں معذور ہیں۔ اِس اختلافِ تلفّظ کی وجہ سے ایک ہی لفظ نے مختلف ممالک میں پہنچ کر مختلف شکلیں اختیار کر لیں، مثلاً ایران کی دختر ہندوستان میں آکر "دوہتر" اور انگلستان میں پہنچ کر "ڈاٹر" بن گئی۔ "باپ" کو لاطینی میں "پاٹر" فارسی میں "پدر" سنسکرت میں "پتر" اور انگریزی میں "فادر" کہتے ہیں۔ اسی طرح گائے کو فارسی میں "گاؤ" سنسکرت میں "گئو" اور انگریزی میں "کاؤ" کہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ابتدا میں یہ ایک ہی لفظ تھے لیکن مختلف مرز بوم کی آب و ہوا نے تلفظ اور لب و لہجہ میں تفریق پیدا کر دی۔ پس ایک ہی لفظ کا تلفظ مختلف قوموں میں جا کر مختلف ہو گیا۔ علاوہ بریں ایک ہی ملک میں بھی کسی زبان کے الفاظ بمرورِ زمانہ منجھے اور شستہ ہوتے اور تراش خراش پاتے رہتے ہیں۔ اس لئے زبان کی ہیئت بتدریج بدلتی رہتی ہے۔ الزبتھ کے عہد کی انگریزی اور موجودہ انگریزی یا سترہویں صدی کے اواخر کی ریختہ اور آج کل کی اردو میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ زبان کے اختلاف کی ایک بڑی وجہ نئے الفاظ کی توضیع و تشکیک ہے۔

مادرِ وطن میں جگہ کی قلّت اور ذریعۂ معاش کی تنگی کے باعث ایک نسل کے لوگ ابتدائے تمدّن ہی میں ایک دوسرے سے الگ ہو گئے تھے۔ چونکہ اُس وقت اُن کی ضروریات نہایت سادہ اور معلومات محدود تھیں، اِس لئے اُن کے الفاظ کا ذخیرہ بھی نہایت قلیل تھا لیکن جُوں جُوں تمدّن بڑھتا گیا اور ضروریات اور احتیاجات میں اضافہ اور معلومات و خیالات میں وسعت پیدا ہوتی گئی، مختلف ملکوں میں اشیا کے لئے نئے نئے نام اور ادائے مطلب کے لئے نئے نئے اسالیبِ بیان گھڑے گئے۔ چونکہ اُس وقت سلسلۂ مواصلت و نامہ و پیام مفقود تھا۔ اِس لئے ہر جگہ کی بولی اور اسلوبِ بیان جداگانہ ہوتا گیا۔ یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ ایک ملک کی بعض نباتی، حیوانی اور جمادی پیداواریں دوسرے ملک کی پیداواروں سے متباین ہوتی ہیں۔ اس لئے کسی ملک کی مخصوص چیزوں کے لئے جو نام وہاں مقرر ہوئے وہ دوسرے ملک کی زبان میں ناپید تھے جس طرح مختلف ممالک کے باشندے وہاں کی آب و ہوا اور ملکی خصائص کے زیرِ اثر بلحاظِ قد و قامت، خط و خال، جسمانی ساخت صورت شکل، ایک دوسرے سے نہیں ملتے، اُسی طرح مختلف قوموں کے خیالات و افکار، مذاق اور پسند بھی جداگانہ ہوتے ہیں۔ ہر قوم نے اپنے افکار و آرا کے اظہار کے لئے اپنے مذاق کے مطابق ایک علیحدہ طرزِ ادا اور اسلوبِ بیان اختیار کیا۔ بہر کیف مندرجہ بالا تمام وجوہات کی بنا پر ہزاروں زبانیں معرضِ وجود میں آئیں اور جُوں جُوں زمانہ گزرتا جائے گا آئندہ بھی آتی رہیں گی۔ دورِ حاضر میں حمل و نقل کی سہولت اور تجارت کی ترقی کے باعث مختلف اقوام کو ایک دوسرے سے ملنے جلنے اور تبادلۂ خیالات کا موقع ہاتھ آتا ہے۔ آپس میں کاروبار چلانے اور لین دین جاری رکھنے کے لئے ایسے وسائل کی ضرورت پڑتی ہے جنہیں سب سمجھ سکیں۔ لہذا مختلف زبانوں کے باہمی تصادم سے اُن پر اثر و تاثر کا عمل شروع ہوتا ہے۔ رفتہ رفتہ ان زبانوں کے اختلاط سے ایک نئی زبان معرضِ وجود میں آتی ہے۔ اول اول یہ محض کاروباری اور بول چال کی زبان ہوتی ہے لیکن بتدریج مستقل حیثیت اختیار کر لیتی ہے اور اُس کا دامن علمی اور فنی جواہر ریزوں سے بھرنے لگتا ہے۔ آخرش اُس کا بھی شمار دنیا کی اہم علمی زبانوں میں ہونے لگتا ہے۔ چنانچہ اُردو اِسی قسم کی ایک زبان ہے جو مختلف السنہ کے باہمی اختلاط سے پیدا ہوئی ہے واضح رہے کہ ان زبانوں کے اختلافات کا سلسلہ ختم نہیں ہوا ہے بلکہ آئے دن نت نئی زبانیں ظہور پذیر ہوتی رہتی ہیں۔ الغرض تمدّن کی ترقی، عمران اور آبادی کی فراوانی، معاملات و معاشرت کی پیچیدگی کے باعث ربعِ مسکوں کا ہر حصہ آباد ہو گیا ہے۔ بامتدادِ زمانہ نہ صرف زبانوں کی تعداد میں اضافہ ہوا بلکہ طرزِ ادا اور اسلوبِ بیان میں شستگی اور رنگا رنگی بھی پیدا ہوتی گئی۔

"اردو"

ایک ہندی غزل

جس کو اکیلے میں آ کر دھیان نیارا رہ کے ستائے ـــ چپکے بیٹھا روئے، آنسو پونچھے اور رہ جائے

گُھم گُھم بات پہیلی ایسی، بس وہی بُوجھے جس کو بجھائے ـــ بھید نہ پائے تو گھبرائے، پھیر جو پائے تو گھبرائے

مجھ سا باتیں بنانے والا ہنس کے ہنسائے رو کے رلائے
جب وہ بلائیں اسے کیا کہئے، جائے تو منہ تکتا رہ جائے

ساری کہانی بے چینی کی ماتھے پر لکھ دیتی ہے
ایسی بات کہ گھٹتے گھٹتے منہ تک آئے اور رہ جائے

اُس کے منہ کو تکنے کو نہ پوچھو آس بھی جس کی ہراس بھی ہے
منہ سے نکالے تو پچھتائے جی میں رکھے تو پچھتائے

چُپ سے چھپے گی چاہت کیونکر جب اُس میں یہ کھٹکا ہے
اپنی بیتی ایک کہے اور جگ بیتی کا بھرم کھل جائے

ایک نہ سننے والے سے کہنا پتھر سے ٹکرانا ہے
بات بھی وہ جو ڈرتے ڈرتے ہو کے ادھوری منہ تک آئے

چھیڑ کے پوچھو، پوچھ کے سمجھو، سُن کے نہ ایسی بات بناؤ
آس لگا کر کہنے والا اپنا سا منہ لے کر رہ جائے

ہائے کی چوٹ نہ سہنے والا کھوٹ بھی کرتے ڈرتا ہے
جیسے بے بس سانپ چپیلا پلٹے کھا کھا کر رہ جائے

آرزو ایسے یوں بہتیرے ہنس مکھ پتھر کوئی نہیں ہے
چین سمجھ لے بے چینی کو، ہائے کرے اور ہنستا جائے

"نیرنگ خیال"

مصوّری اور اسلام

دنیا کی تمام قوموں کے تشکیلی فنون کی ابتدا جذبۂ پرستش سے ہوئی ہے اور اُن کا نشو و نما اُن کے مذاہب کے ساتھ بالکل نہیں تو ایک بڑی حد تک وابستہ رہا ہے۔ شوقِ سجود سے مجبور ہو کر انسان نے مختلف آب و ہوا میں مختلف تخیلات کے مطابق مختلف قسم کی ایسی شکلیں اختراع کیں جن کو وہ پیکرِ ایزدی کا مرقع سمجھ کر اُن کے سامنے سرِ نیاز خم کرے اور اپنے بنانے والے اور اس کے قوانین و مظاہر کی طرف سے جو ہیبت اور محبت کے جذبات اس کے سینے میں مشتعل ہوتے ہیں اُن کا اظہار اپنی بندگی کے اعتراف سے کرے۔ وحشی اقوام کے فنّی کارنامے اس خیال کے اسی طرح حامل ہیں جس طرح کہ پرانے تمدنوں کے قدیم آثار۔ ہمارے پاس مصر، چین، ہندوستان، یونان کی مثالیں ایک طرف اور افریقہ کی وحشی اقوام کے تراشے ہوئے بت دوسری طرف اس قول کی تائید کے لئے موجود ہیں۔ انسانی تخیل نے ذاتِ ایزدی کو ہندوستان میں اگر چہار دست شیوا یا تری مورتی کی صورت میں پیش کیا تو یونان میں انسانی حسن کے انتہائی امکانات کی صورت میں جس کی مثالیں اپالو، زہرہ اور بے شمار دوسرے مجسمے ہیں۔ آج دیکھنے اور غور کرنے سے ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ شوقِ سجود میں جس درجہ بے تابی اور جبیں سائی میں جس درجہ انہماک ایک قوم میں پایا جاتا تھا اسی درجہ اس کی اختراع کردہ اشکال واقعی مظہر ہوتی تھیں ذاتِ خداوندی کی، اس کے جلال، اس کی رحمت اس کی عظمت کی! انسان کی صورت میں اوتار ہوئے ہوں یا نہ ہوئے ہوں لیکن ان پتھروں کی صورت میں اوتار ضرور ہو جاتے تھے اور سجدوں کا جو تلاطم ہندوستان کی پیشانی میں مضمر تھا وہ نہ یونان کو نصیب تھا نہ مصر کو اور یہی وجہ ہے کہ جس پایہ کی شکلیں ہندوستان نے تراشی ہیں کسی دوسرے ملک سے ممکن نہ ہوئیں اور تخیل کی جو جسارت اس میں پیدا ہے کہیں اور پیدا نہیں۔ لیکن شوقِ سجدہ سے جو تخلیقِ صورت وابستہ ہے اس کی علت در رہنما انسان کے مذہبی ولولے ہوتے ہیں اور اُن میں

ذہنی عنصر کی رہبری سے حصولِ حسن اور جمال آفرینی کا دانستہ دخل معدوم یا کالعدم ہوتا ہے۔ ان کا مسلک حسن آفرینی نہ تھا اور وہ حسن کے لذتِ حسن کی خاطر متلاشی نہ تھے۔ اس کے معنی یہ ہرگز نہیں کہ ہم کو اُن کے کارناموں میں اکثر انتہائی حسن کے نمونے نہیں ملتے بلکہ کہنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ وہ دانستہ اس عنصر کے متلاشی نہ تھے برخلاف اِن اقوام کے جب ہم مسلمانوں کی طرف رجوع کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ یہ الست کے متوالے اپنی وارفتگیٔ توحید میں بتانِ آذر سے دست و گریباں ہوئے اور یہ نہ سمجھے کہ "مانو تو بُت، نہیں تو پتھر" یا نہ ماننے تو پتھر نہیں تو بُت۔ اسلام میں منع ہؤا یعنی بحکم قرآن یا بحکم حدیث تصویر کشی یا شکل تراشی ممنوع ہو یا نہ ہو لیکن اس کے ولولۂ توحید کا اقتضا شروع شروع لازمی طور پر یہ تھا کہ انسان اپنی شبیہ بنانے سے کنارہ کش رہے۔ چنانچہ اُن کی حُسن آفرینی کی امنگ جو فطرتِ انسانی کا ایک لازمی عنصر ہے، ایک عرصہ تک فنِ نقاشی، خوشنویسی، خطاطی اور اسی قسم کی دوسری صنعتوں میں ظہور پذیر ہوئی جن میں وہ دنیا میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ قلمی کتابوں کے بے شمار نمونے فارس وزرکی قالینوں کے ڈزائن مثال کے طور پر اس قول کے شاہد ہیں مزید براں یہی وجہ ہے کہ جو کامیابی فنِ تعمیر میں مسلمانوں نے حاصل کی وہ شاید کسی دوسری قوم کو نصیب نہیں ہوئی کیونکہ بڑے پیمانے پر چل کر اُن کی حُسن آفرینی کی امنگ کا بھی ایک جولانگاہ تھا۔ مابہ الامتیاز مسلمانوں کی مصوری اور دوسری اقوام کی مصوری میں یہ رہا ہے کہ مسلمان پہلی وہ قوم تھے جس نے جمالیات کو آرٹ میں معیارِ اوّل اور معیارِ آخر قرار دیا اور نہایت دانستہ، اور پُورے احساس کے ساتھ حسن آفرینی میں سرگرداں ہوئے۔ تصویر میں خدا پرستی چونکہ مذہبًا ناممکن تھی اِس لئے انہوں نے حسن پرستی اپنا مسلک ٹھہرایا۔ مسلمان نہ صرف ہندوستان بلکہ ساری دنیا کے فنّی نقادِ نظر میں سے خالص جمالیاتی نقطۂ نظر کے بانی ہیں یہی اُن کا تمغۂ امتیاز ہے اور یہی فن کی رو سے اُن کے وجود کا کفارہ ہے لیکن اس کل کی بات کو خود ہندوستان کے اکثر تنگ نظر نقاد زبان پر لانے سے گریز کرتے ہیں اور آج وہ دنیا کے لئے ایک بھُولا ہؤا خواب ہیں اور اس سے زیادہ نہیں +

"جامعہ"

جاؤ میدانِ زندگی میں سرگرمِ عمل ہو جاؤ

اے میرے بیٹو! تم امیر باپ کے لختِ جگر ہو۔ اُس کی آنکھوں کا نور اور سرور ہو، عیش کرو۔ خوشی کی زندگی بسر کرو تمہارے باپ کا دل مردہ ہو چکا ہے۔ سفید بالوں کی سپیدی نے اُس کے جذبات کی گھنگھور گھٹا کو روشن کر دیا ہے۔ آہ! یہ دل جو کبھی عیش وعشرت کی جولانگاہ تھا آج اس میں خاک اڑ رہی ہے، تم مجھے نہ چھیڑو۔ میرا خون سرد ہو چکا ہے اور تمہارا خون گرم ہے، جاؤ تم زندگی کی سردی میں اپنے خون کی گرمی کو آزماؤ۔ یہ تمہارا وقت ہے۔ مَیں تمہیں نہیں روکتا جاؤ میدانِ زندگی میں سرگرمِ عمل ہو جاؤ۔ اور مجھے میرے حال پر چھوڑ دو مَیں اسی میں خوش ہوں۔ وہ وقت اب خواب و خیال ہو گیا جب ہم عطر میں بس کر نکلا کرتے تھے۔ لوگوں کی انگلیاں ہماری طرف اٹھا کرتی تھیں دزدیدہ نگاہوں سے کسی کا دیکھنا اور دیکھ دیکھ

کر مسکرانا دل میں ایک قیامت برپا کر دیتا تھا۔ اب مجھے پھولوں سے نفرت ہے، خوشبو سے نفرت ہے۔ دوستوں کی محفلوں سے نفرت ہے۔ بلکہ مجھے خود اپنے سے بھی نفرت ہے۔

اب میں اپنے باقی دن سادگی میں گزارنا چاہتا ہوں۔ جاؤ۔ جاؤ مجھے نہ ستاؤ۔

"ادبی دنیا"

باجا

پڑوس میں کسی بچے نے باجا بجایا۔

بچے نے اپنی ماں سے کہا "ماں! مجھے بھی ویسا ہی ایک باجا دے"

غریب ماں کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اُس نے اپنے دل کے ٹکڑے کو چھاتی سے لگا کر کہا۔ "گیت نہ سنو گے بیٹا؟"

بچے نے کہا "نہ ماں! مجھے بھی ویسا ہی ایک باجا لا دے۔ میں بجاؤں تب تُو گا"

ماں نے کہا "وہ تو امیروں کا باجا ہے"

بچے نے "اوں" "اوں" کر کے کہا "نہ ماں! مجھے تو وہی باجا دے میں "ٹھاکر جی کے "مندر" میں بجاؤں گا"

وہ زمین پر لوٹ لوٹ کر رونے لگا۔ غریبنی کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

یکایک بچہ جیسے سوتے سے چونک کر بول اٹھا ——"ماں! ماں! "میلا" باجا دیکھے گی؟"

وہ دوڑ کر سامنے سے ایک آم کی گٹھلی اٹھا لایا۔ پتھر پر گھسنے کے بعد پھونکتے ہی اُس کی روح بیدار ہو گئی دل کی گہرائیوں سے آواز نکلی اور ساری فضا گونج اٹھی۔

"اب گاؤ ماں! میرے اس باجے پر گاؤ" یہ کہتا ہوا بچہ اور زور سے گٹھلی میں اپنی جان ڈالنے لگا۔

ممتا کی ماری ماں کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو چھلکنے لگے۔ وہ محبت آمیز نظروں سے اپنے بچے کو دیکھتی رہی۔ اُس کے دل میں نہ جانے کتنے گیتوں کے بھاؤ رس برسا رہے تھے لیکن اس باجے سے وہ اپنی آواز کیسے ملائے!

مہار رشی

دوست

دوست! ہماری روح کا آئینہ ہے۔ وہ ہماری آرزوؤں اور امیدوں کا مرکز ہے۔ سچا دوست خدا کی نعمت ہے۔

جس کو ایک سچا دوست مل گیا اُس کے سامنے تمام دنیا کی نعمتیں کچھ بھی نہیں۔

بحرِ حیات کے تھپیڑے کھائی ہوئی روح دوستی کی آغوش میں لیٹ کر جنت کی خوشی حاصل کرتی ہے۔ باپ کے دروازے سے دھتکارے ہوئے بچے کو ممتا کی ماری ماں کی گود جتنی پیاری لگتی ہے، جیٹھ کی دوپہر میں سفر کرنے والے مسافر کو درخت کا سایہ جتنا طراوت بخش ہوتا ہے اُتنی ہاں اتنی ہی راحت دوست کی دوستی میں ملتی ہے۔

دوست ماں ہے۔ دوست باپ ہے۔ دوست بھائی ہے۔ دوست بہن ہے۔ دوست استاد ہے۔ دوست کا رشتہ عالمگیر ہے لیکن دیکھو دوست دوست میں فرق ہے ——— اس سے بھی زیادہ فرق ہے جتنا دوست اور دشمن میں ہو سکتا ہے سچا دوست خدا ہے تو جھوٹا دوست شیطان ہے۔

میدانِ جنگ میں تلوار کا زخم کھانا ایک بات ہے لیکن ——— بستر میں سے سوئی یا کانٹے کا چُبھنا بالکل دوسری بات ہے۔ دوست کی چوٹ دشمن کی چوٹ سے زیادہ تکلیف دہ ہوتی ہے۔ آہ مت پُوچھو اُس شخص کی بدقسمتی کو جس نے کسی جھوٹے دوست سے دوستی کی۔

دوست کی چوٹ میں بھی ایک قسم کی لذت ہے۔ جان سے دوست کی چوٹ کھا کر بھی اگر تُو نہ سنبھل سکا تو اے دل! تیرا دوست کہلانا فضول ہے۔

سنسکرت

دیپک

اے دمکتے ہوئے دیپکو تم کس کو تلاش کرتے ہو ——— تم ضرور آنکھیں ہو ——— رات رات بھر جاگ کر صبح کر دینے والے کسی فرقت زدہ کی ——— یا کسی مہجورِ الم، ناکام تمنا عاشق کی!

میں نے باغ میں جا کر دیکھا کہ پھول اپنی خوشبو سے کسی کا خیر مقدم کر رہا ہے۔ درختوں کے جھرمٹ میں چھپی ہوئی کوئل پنچم سُر میں کسی کو پکار رہی ہے اور اب میں دیکھتا ہوں کہ اس گھر کے اندھیرے کونے میں دیپک کسی کو تلاش کر رہا ہے۔

دیپک نے جو کچھ کیا وہ صرف تیاگ (فنا) کے لئے۔ جل کر دنیا کو روشن کرنے کے لئے!

دیپک تیاگ کی مورتی ہے۔ یہ بہت سے پتنگے اُس کے پاس درسِ فنا پڑھ رہے ہیں۔

اے محبت کے دیوانے دنیا میں تو ہی اکیلا تکلیف میں نہیں ہے دیکھ دل میں محبت کی آگ روشن کرنے کی وجہ سے مٹی کے دیپک کو بھی جلنا پڑتا ہے۔

اے دل اگر تو یوں ہی رہ رہ کر بجھے گا تو پھر کسی کو کس طرح پائے گا سنیہی (عاشق) کے جلنے میں جو مزہ ہے وہ اس جلنے والے دیپک سے پوچھ۔

یہ نغمۂ حسن ہے یا پریم کا گیت؟ یہ مٹی کا بے زبان دیپک بھی کیسی دل گداز شاعری کر رہا ہے!

ہندی

تبصرہ

خمکدۂ سرور منشی درگا سہائے صاحب سرور جہان آبادی کا مجموعۂ کلام ہے جسے قاضی محمد غوث صاحب فضا حیدرآبادی نے ترتیب دے کر شائقینِ سرور پر خصوصاً اور دوسرے ادبی ذوق رکھنے والوں پر عموماً بڑا احسان کیا ہے۔ یہ مجموعہ سرور کے تقریباً جملہ مضامینِ نظم اور ایک مضمونِ نثر پر مشتمل ہے حجم تین سو صفحے، کاغذ اچھا اور لکھائی چھپائی معمولی ہے قیمت دو روپے آٹھ آنے مقرر کی گئی ہے۔

سادگی، روانی، خلوص، درد اور جوش سرور کے کلام کی خصوصیات ہیں۔ دورِ گزشتہ کی جھوٹی شاعری سے انہیں کوئی واسطہ نہیں اُن کا ہر خیال اصلیت اور احساس پر مبنی ہے۔ اُن کے کلام میں انتخابِ مضامین کا حیرت انگیز تنوع ہے۔ توحید و فلسفہ، وطنیت و قومیت جذبات و اخلاقیات مظاہرِ قدرت و فطرت، غرض کون سا موضوع ہے جس پر انہوں نے نہیں لکھا۔ اگر گنگا اور جمنا جیسی عظیم الشان نہریں اُن کی آنکھوں میں بسی ہوئی ہیں تو "بیر بہوٹی" جیسی حقیر اور نظر انداز ہو جانے والی مخلوق کو بھی نہیں بھولے۔ اگر وہ "تلاشِ حقیقت" میں سرگرداں ہیں تو "بچہ اور ہلال" کے کھیل سے بھی غافل نہیں ہیں۔

انہوں نے ایک طویل نظم "جمناجی" کے عنوان سے لکھی ہے۔ ذرا اس کے پہلے ہی دو شعروں کی دل کشی اور روانی ملاحظہ ہو۔

دھیمی دھیمی بہنے والی ایک نہرِ دل نشیں — آبجو چھوٹی سی اک نازک خرام و نازنیں
تشنگیٔ شوق گنگا میں بجھانے کے لئے — جا رہی ہے اپنی ہستی کو مٹانے کے لئے

اُن کے اشعار میں ہندی اور ایرانی دونوں رنگ جھلکتے ہیں۔ یہ امتزاج صرف الفاظ و تراکیب تک محدود نہیں بلکہ اس حد سے گزر کر احساسات اور مناظر تک پہنچتا ہے اور بعض مقامات پر بہت ہی بھلا معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً اسی نظم میں

یہ وہ جمنا ہے کہ رادھا سی حسین نے مدتوں — برج کی اک پاک دامن نازنیں نے مدتوں
بنسی والے کی جدائی میں اڑا کر سر پہ خاک — اپنے اشکوں سے کیا ہے دامنِ ساحل کو پاک
یہ وہ جمنا ہے جہاں اک بانوئے پردہ نشیں — آگرہ میں محوِ آسائش ہے جو زیرِ زمیں
رُخ سے آہستہ اُلٹ کر چادرِ آبِ رواں — دیکھتی تھی مسکرا کر منظرِ آبِ رواں

حُسن کے داخلی اور معنوی پہلو کی بجائے اُس کے خارجی اور مادی پہلو پر اُن کی نظر بہت زیادہ ہے۔ چنانچہ لکھنؤ کی شاعری کے انداز میں اُن کا کلام بھی زلف و رخ اور نقاب اور آنچل کے ذکر سے پر ہے۔ مثال کے طور پر "عروسِ برشگال" سے چند شعر یہاں درج کئے جاتے ہیں۔

اودی اودی اب گھٹاؤں کا وہ آنچل ہے کہاں — ہلکی پھلکی اب کہاں ہے وہ نقابِ شبنمیں
آسماں پر اب کہاں وہ لکۂ ابرِ سیاہ — دوشِ نازک پر کہاں اب آہ زلفِ عنبریں
اب کہاں آنکھوں میں ڈورے وہ شفق کے سرخ سرخ — اب وہ مستانہ نگاہیں ہیں نہ چشمِ سرمگیں
ہلکی ہلکی آہ وہ ساون کی جھڑیاں اب کہاں — اُبھرے سینے پر پسینے کے وہ چھینٹے اب نہیں

نیلگوں آنکھوں میں سرمے کے وہ ڈورے اب کہاں   سرمگوں اودی گھٹا سے اب کہاں چرخ بریں

سرور کے اُن شعروں میں جو مشہور و مقبول ہیں ضرور کوئی سحر ہے جو ہر خاص و عام کے دل کو یکساں طور پر موہ لیتا ہے۔ کون شخص ہے جس نے اُن کے اِن اشعار کو کئی کئی بار نہیں پڑھا — یا کم از کم نہیں سنا!

نہ وہ کیتکی کی پھبن رہی   نہ وہ موتیا کی ادا رہی
نہ وہ نسترن نہ سمن رہی   نہ وہ گل رہے نہ فضا رہی
نہ گلوں کے اب ہیں وہ قہقہے   نہ وہ بلبلوں کے ہیں چہچہے
نہ غزل سرا وہ کوئی رہے   نہ وہ قمریوں کی صدا رہی

کسی مستِ خواب کا ہے عبث انتظار سو جا   کہ گزر گئی شب آدھی دلِ بے قرار سو جا
یہ نسیم ٹھنڈی ٹھنڈی یہ ہوا کے سرد جھونکے   تجھے دے رہے ہیں لوری مرے غمگسار سو جا

غرض سرور کا کلام واقعی ایک خمکدہ ہے جو پڑھنے والے پر ایک کیف و سرور کی سی حالت طاری کر دیتا ہے لیکن اس کے باوجود جیسا کہ حضرتِ جوشؔ ملیح آبادی نے تمہید میں لکھا اس میں اکثر و بیشتر خامیاں موجود ہیں۔ مگر ان کی اس رائے سے بھی ہمیں اتفاق ہے کہ سرور کے سے شاعر کم پیدا ہوا کرتے ہیں ملنے کا پتہ ہے: قاضی محمد غوث صاحب فضاؔ، آڈیٹر انجمنہائے اتحادی، سنگاریڈی ضلع میدک (علاقہ حیدرآباد دکن)۔

فراست الید مصنفہ اشفاق احمد صاحب زاہدی۔ اِس کتاب میں ہاتھ کے خطوط کے ذریعہ سے انسان کی سیرت اور زندگی کے گزشتہ موجودہ اور آئندہ حالات دریافت کرنے کے طریقے لکھے ہیں۔ فراست الید ایک قدیم علم ہے جس کی ابتدا حضرتِ مسیح سے تین ہزار برس پہلے ملکِ چین میں ہوئی۔ جنابِ مصنف نے پہلے اسی صفحات میں چند مدلل اور مبسوط مضامین میں قوانینِ فطرت، تشریح الابدان اور نفسیات کی رُو سے ثابت کیا ہے کہ گو یہ علم قیافے ہی سے تعلق رکھتا ہے لیکن پھر بھی اس سے بڑی حد تک معرفتِ نفس حاصل ہوتی ہے اور اُن لوگوں کی سیرت معلوم ہوتی ہے جن سے انسان کو اپنی زندگی میں سابقہ پڑتا ہے۔ اس سے آگے خاص فنی ابواب شروع ہوتے ہیں جنہیں ایسے آسان اور سہل پیرائے میں لکھا گیا ہے کہ محض ایک دفعہ پڑھ جانے سے ہر شخص بلا تکلف ہاتھ دیکھنے لگتا ہے۔ مزید آسانی پیدا کرنے کے لئے جا بجا نقشے بھی دیئے ہیں حجم ساڑھے تین سو صفحات کے قریب ہے اور کتاب مجلد ہے قیمت درج نہیں کی گئی پتہ، اشفاق احمد صاحب زاہدی، کوچہ پنڈت، دہلی

گلدستۂ کشیدہ کاری، رسالہ "ہمایوں" کی تقطیع پر چالیس صفحات کا مرقع ہے جس میں کئی قسم کے پھولوں پتّوں اور بیلوں کے نقشے دیئے گئے ہیں۔ تمام نقشے نہایت خوبصورت اور صاف ہیں۔ جو بہنیں کشیدہ کاری کا شوق رکھتی ہیں انہیں یہ کتاب ضرور منگانی چاہیے۔ قیمت درج نہیں ہے۔ مینیجر دی کشیدہ ڈپو شملہ سے منگائیے۔

سالنامۂ نیرنگِ خیال اس دفعہ تقریباً دو سو صفحات مضامین اور دو درجن چھوٹی بڑی سہ رنگ و یک رنگ تصاویر پر مشتمل ہے۔ بعض چیزیں اس میں بہت اچھی ہیں۔ مثلاً مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب دہلوی کا مضمون "پرانی اور نئی تہذیب کی ٹکر" نور الٰہی محمد صاحبان کا ڈراما "نیم خانہ آفتاب" اور جنابِ حنیف ہاشمی کا مضمون "مضامین کس طرح لکھے جاتے ہیں" حضرتِ جوشؔ ملیح آبادی کی نظم "فرشتے کی سیر" اور حضرتِ آرزو لکھنوی کی "ایک ہندی غزل" قابلِ ذکر ہیں۔ ہم کارپردازانِ نیرنگِ خیال کو ایک اچھا پرچہ مرتب کرنے پر مبارکباد دیتے ہیں۔ اس پرچے کی قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے ہے۔ مینیجر نیرنگِ خیال، بارود خانہ لاہور سے طلب فرمائیے۔

تصاویر

ہندی خاتون کی تصویر میاں سر محمد شفیع صاحب [illegible] کے کول کمرے کی زینت ہے۔ یہ صوبۂ بمبئی کی ایک نوجوان خاتون مس منجولا بھنڈارکر کے سحر کار موقلم کا ایک دلاویز نقش ہے جسے انہوں نے بمبئی کی ایک نمائش میں پیش کیا۔ ہم اپنے محترم میاں صاحب کی اس نوازش کے ممنون ہیں کہ انہوں نے یہ تصویر ہمیں "ہمایوں" میں شائع کرنے کے لئے مرحمت فرمائی۔

میاں عبدالعزیز حضرت اعجاز دہلوی کا قول ہے کہ اگر ہمایوں صرف اک اسی غرض سے ظہور میں آتا کہ "فلک پیما" کے مضمون دنیا کے سامنے پیش کرے تو اس کی یہی اک ادبی خدمت اس کی ہستی کی اہمیت کو کافی تھی۔ "آج" ہمایوں کو اس بات کا فخر حاصل ہے کہ وہ بالآخر اپنی اس کوشش میں کامیاب ہوا ہے کہ اس کا "فلک پیما" بزم ہمایوں میں جو عموماً زمین پر منعقد ہوتی ہے عبدالعزیز بن کر بہ نفس نفیس موجود ہے۔ میاں صاحب دنیا کے لئے ڈپٹی کمشنر، مہتمم بندوبست، ممبر لیجسلیٹو اسمبلی وغیرہ سب کچھ ہوں اور بزم ہمایوں میں فلک پیما، آکاش کا جوگی، پرستار حسن، وغیرہ بنتے رہیں لیکن حق تو یہ ہے کہ وہ خود بھی یہی چاہتے ہیں کہ لے دے کے وہ سب میں ہر دلعزیز بنیں کہ حقیقت میں نگاہوں کو عزیز ہوں اور بس!

متین و شریر کی تصویریں کتاب "چائلڈ ان آرٹ اینڈ نیچر" سے لی گئی ہیں۔ پہلی تصویر متانت اور فراست کا مجسمہ ہے اور اس کی پیشانی سے ذہنی امارت اسی طرح جھلک رہی ہے جس طرح غریبوں کے بچوں کے چہروں سے عسرت نمایاں ہوا کرتی ہے۔ دوسرا بچہ مسرت کا خزانہ معلوم ہوتا ہے۔ اس کے نزدیک زندگی اور خوشی ہم معنی الفاظ ہیں۔ اسے کوئی غم نہیں ہے۔

سمندر کی چڑیاں نظارہ کرنے والی آنکھ کے لئے سمندر کے ان پرندوں کی اڑان ایک نہ ختم ہونے والا سحر ہے۔ مصور مسٹر آرتھر رکنگٹن نے یہاں انہیں ایک کشتی کے گرد چکر کاٹتے ہوئے دکھایا ہے۔ پرندوں کی وضعوں اور حالتوں میں ایک غیر معمولی تنوع ہے لیکن کسی وضع اور کسی حالت میں بھی مصور کے ہاتھ سے لطافت کا دامن نہیں چھوٹا۔

"وہ حسن نے ڈال رکھا ہے زمانے کو تحیر میں"۔ یہ تصویر سی ایم کیو آرچرڈسن کی بنائی ہوئی ہے جو انہوں نے رائل اکاڈمی کی ایک سو چالیسویں نمائش میں پیش کی۔ یہ مصور کے فن کا کمال ہے کہ اس نے تحیر کی ایک کامل فضا پیدا کرنے کے لئے سامنے آئینہ رکھ کر اپنے موضوع کے دونوں رخ دکھا دیئے۔

ہم خیال میں سیوریج کوپر کی مصوری کا ایک اثر آفریں نمونہ ہے۔ یہ تصویر رائل اکاڈمی کی ایک سو [illegible] نمائش میں پیش کی گئی تھی۔ بہار کی فراوانی اور [illegible] کا زیر و بم قابل دید ہے۔

قبر کا بھید عورت قبر کے راز کی حفاظت کر رہی ہے۔ یہ مجسمہ لکسم برگ (پیرس) کے عجائب خانے میں رکھا ہوا ہے۔ [illegible] سنگ تراش نے دس ماہ میں بنایا ہے۔

مقبرۂ زبیدہ کی تصویر کے لئے ہم میاں محمد اکبر صاحب کے ممنون ہیں، جو ایک عرصہ تک [illegible] بغداد میں اقامت پذیر رہے ہیں۔ یہ عمارت اسلامی فن تعمیر کا ایک انوکھا نمونہ ہے۔

سرورق میاں عبدالرحمن صاحب اعجاز [illegible] کی محنت کا دلکش نتیجہ ہے۔ ہم ان کے شکرگزار ہیں کہ انہوں نے ایک قلیل عرصے میں ہمیں اس قدر اچھا نقشہ بنا کر دیا۔ اس کی سب سے بڑی خوبی سادگی ہے۔ اس کی ہر بیل اور ہر پھول طبع زاد ہے اور یہ ایک ایسی صفت ہے جو کسی صناع کی سب سے بڑی خوبی سمجھی جا سکتی ہے۔

رجسٹرڈ نمبر ایل ۱۳۹۳

اٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا
(ہمایوں)

بیادگار علامہ فضیلت آنریبل جسٹس میاں محمد شاہدین صاحب ہمایوں مرحوم

اردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہمایوں

ایڈیٹر: بشیر احمد، بی۔ اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا
جائنٹ ایڈیٹر: منصور احمد
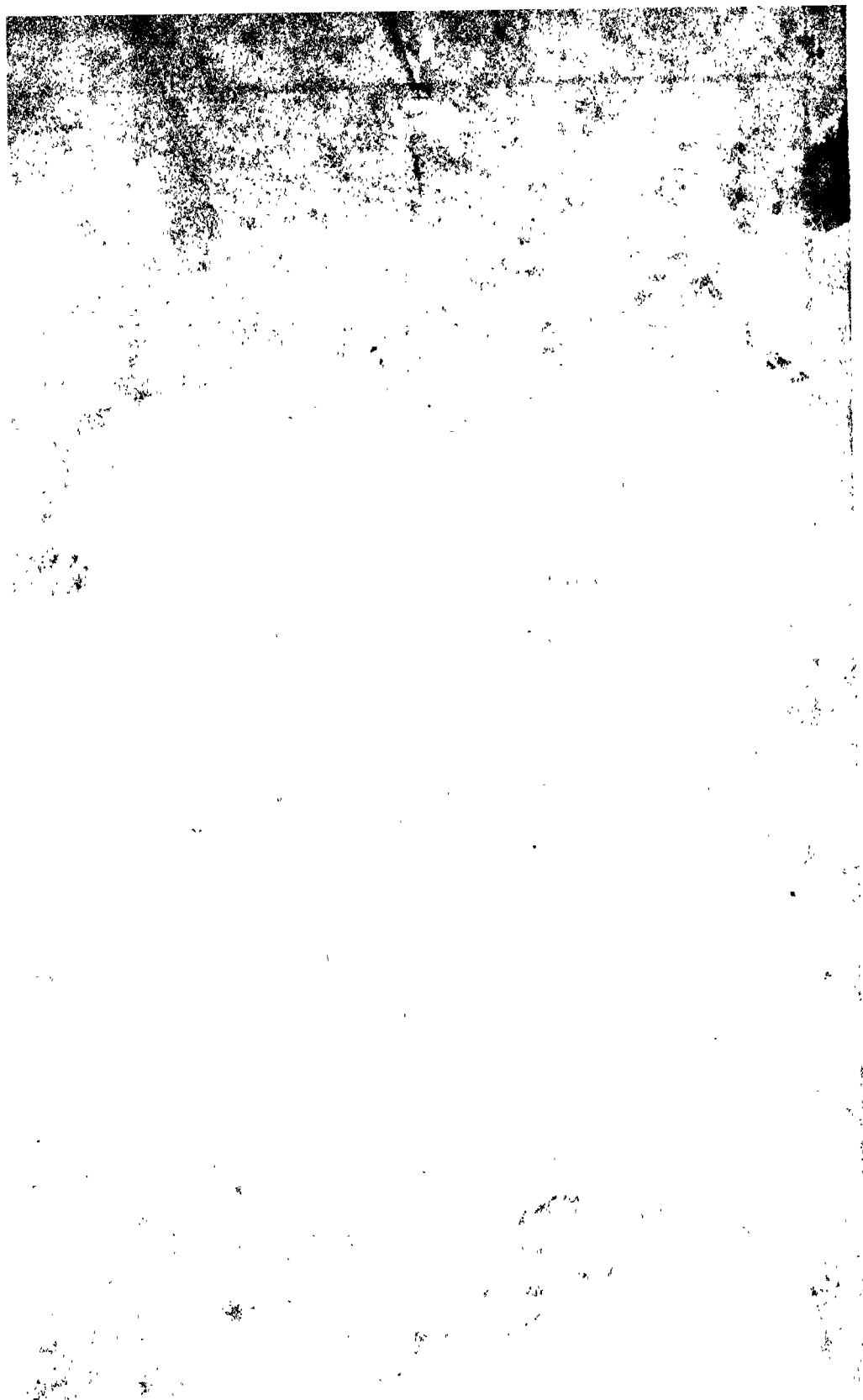
فہرستِ مضامین

جلد ۱۷ — بابت ماہِ مئی سنہ ۱۹۳۰ء — نمبر ۵

تصاویر
(۱) مولانا شبلی نعمانی مرحوم و مغفور
(۲) بغداد میں امامِ اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی مسجد

جہاں نما

تعلیم یافتہ نوجوانوں کے لئے والسرائے کی نصیحت

دہلی یونیورسٹی کی آٹھویں کانووکیشن کے موقع پر والسرائے نے اپنی صدارتی تقریر کے دوران میں کہا۔

"آج چند منٹ کے لئے میں آپ سے کہوں گا کہ آپ میرے ساتھ مل کر کتابوں کے متعلق کچھ غور و فکر کریں سوچیں کہ وہ ہمارے لئے کیا کچھ ہیں اور کیا کچھ ہو سکتی ہیں، اور اگر ہم عقل و دانش رکھتے ہیں تو معلوم کریں کہ ہماری زندگی کے معمولات میں انہیں کیا درجہ حاصل ہونا چاہئے۔

مطالعہ جس کی طرف میں آج آپ لوگوں کو توجہ دلانا چاہتا ہوں ایک بہت بڑی خوبی اپنے اندر یہ رکھتا ہے کہ اُس میں ایک ایسا غیر محدود تنوع موجود ہے جس سے ہم اپنی طبیعت اور خواہش کے مطابق چیزیں انتخاب کر سکتے ہیں۔

بعض وقت ہم پر بے دلی اور پریشانی سی مسلط ہوتی ہے اور ہمارا دل اُس تسلی اور تشفی کو چاہتا ہے جو فطرت اور اُس کے تصرفات سے حاصل ہوتی ہے، وہ فطرت جو انسانی دنیا کے شور و غوغا کے درمیان رہ کر بھی اُس سے غیر متاثر رہتی ہے۔ کتابوں میں یہ چیز بھی موجود ہے، کیونکہ ہر ملک اور ہر زمانے میں فطرت نے مفکر قلوب پر اپنا جادو کیا ہے۔ ورجل کی تمثیلات جن میں ہمیں حقائق کا جلوہ بہ طور تمام نظر آتا ہے وہ ہیں جو ہماری زندگی کی معمولی اور سادہ چیزوں سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہیں۔ مثلاً شہد کی مکھیاں، زخمی سانپ، آندھی میں ایک بڑا درخت، مرجھایا ہوا پھول وغیرہ۔ پرندے پھول اور قدرتی مناظر پر انگریزی اُدبا نے ایسی ایسی چیزیں لکھی ہیں کہ جب تک انگریزی زبان زندہ ہے وہ بھی زندہ رہیں گی۔

میں نے یہ کہتے ہوئے تقریر کی ابتدا کی تھی کہ میں اپنے سامعین میں سے نوجوانوں کو کچھ نصیحت کروں گا لیکن اب تک آپ کے فائدے سے زیادہ اپنی خوشی کے لئے میں اپنے حافظہ ہی کی وسعت میں بے مقصد چکر لگا تا رہا ہوں۔ اب میں اپنی عملی نصیحت صرف دو فقروں میں کہہ دینا چاہتا ہوں۔" اپنے آپ کو فرصت کے قیمتی لمحوں میں مطالعہ کرنے کی عادت ڈالو۔ اور جب تم پڑھو تو جس چیز کو تم پڑھ رہے ہو اپنی بساط کے مطابق اُس کی قدر و قیمت کو پہچاننے کی پیہم کوشش کرو۔"

کہا گیا ہے کہ ایک اچھی کتاب ہاتھ میں نہیں بلکہ زانو پر ہونی چاہیئے تاکہ جو کچھ ہم پڑھیں اُسے سوچنے، سمجھنے اور اُس پر تنقید کرنے کے لئے اکثر و بیشتر ٹھہر سکیں۔ ہمیں کسی کتاب کو ختم کرنے سے پہلے چھوڑ دینے پر کسی تنگ دل کے قول کی پروا نہیں ہونی چاہیئے۔ یہ سمجھ لینا کہ تمام کتابیں تمام طبیعتوں کے لئے اور تمام زمانوں کے لئے نہیں ہوتیں اور کسی ایسی چیز کی طرف رجوع ہو جانا جس سے ہم صحیح طور پر مسرت حاصل کر سکتے ہوں بہت ہی اچھا ہے۔ بڑی بات یہ ہے کہ ہم ایک آزاد مذاق پیدا کریں، وسیع مطالعہ کریں، اور اس طرح خیال اور علم کی حدود کو بڑھاتے جائیں۔ ہمیں اس سے یقیناً بڑا فائدہ ہوگا، اور میں سچ کہتا ہوں ہم دیکھیں گے کہ ہماری عام زندگی کے بہت کم پہلو ایسے ہیں جن میں ہماری اِس کوشش سے رنگینی اور دلچسپی پیدا نہیں ہو جاتی۔

لینن گراڈ لائبریری

اکیڈمی آف سائنس کی لائبریری روس میں سب سے پرانی اور سب سے عجیب لائبریری ہے۔ اس کے قیام کو آج پورے دو سو سال گزر چکے ہیں۔ حال ہی میں اس کی سالگرہ کے موقع پر ایک نمائش کی گئی تھی جس سے معلوم ہوا کہ اس میں نادر و نایاب کتابوں کا ایک بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے۔

اس لائبریری کی سب سے چھوٹی کتاب کرلاف کی حکایتوں کا مجموعہ ہے جسے ۱۸۵۵ء میں معمولی ڈاک کے ٹکٹ سے بھی چھوٹی تقطیع پر تیار کیا گیا تھا۔ اس کے بالمقابل وہاں ایسی بڑی بڑی کتابیں بھی موجود ہیں۔ جو لمبائی میں تین فٹ اور چوڑائی میں دو فٹ سے بھی بڑھ کر ہیں۔ اُن چالیس لاکھ کتابوں اور مسودوں میں جو اس لائبریری کی زینت ہیں ایسے مسودے بھی ملتے ہیں جو چمڑے کے کاغذ پر لکھے گئے ہیں اور جن کا زمانۂ تحریر گیارھویں سے تیرھویں صدی تک ہے۔

لائبریری کی قدیم ترین تحریروں میں سے ایک وہ حکم نامہ ہے جو بلگیرین زار آرسی نیوس ثانی نے ۱۲۳۰ء میں جاری کیا۔ بعض قدیم تحریروں سے کسی حد تک یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قرونِ وسطیٰ میں روس میں غلامی کا رواج تھا۔ چنانچہ کسی بڑے زمیندار کا ایک اجازت نامہ ہے جو ایک کسان لڑکی کی شادی کے لئے حاصل کیا گیا تھا؛ اور تین روبل کی ایک رسید ہے جو ایک تاتاری غلام کے لئے ادا کئے گئے تھے جسے بیچنے والے نے ایک کاسک سے خریدا تھا۔ کاسک اُن دنوں کریمیا کے ترکوں اور تاتاریوں سے برسرِ جنگ تھے۔

ادبی نوادر میں قابلِ ذکر پیٹر اعظم کے اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی ایک تحریر ہے، ایک کیلنڈر ہے جسے ایک شخص بر ساف نے روس میں طباعت کے رواج کے شروع شروع میں ترتیب دیا تھا، ایک بہت بڑا قدیم نقشہ ہے جس میں بحرِ مشرق کی حدود دکھائی گئی ہیں۔ یہ نقشہ پیٹر اعظم کے حکم سے ۱۷۱۸ء میں طبع کیا گیا تھا اور اُس زمانے کے چند روسی مدرسوں میں جغرافیے کے نصاب کے طور پر رائج تھا۔

حضرتِ مسیح کا نیا تصوّر

مشہور فلم ایکٹر چارلی چپلن کہتا ہے کہ "اگر میں مسیح کی کہانی کی فلم تیار کروں تو میں اُس کی شخصیت کو نہایت قوی نہایت نمایاں اور نہایت شاندار صورت میں پیش کروں، ایسی صورت جس سے ظاہر ہو کہ لوگ اُس کی عظمت و شان کو دیکھ کر اُس کے گرویدہ ہو جاتے تھے۔ جدھر وہ جا نکلے میں مردوں، عورتوں اور بچوں کو خوشی کے نعرے لگاتے ہوئے اُس کا خیر مقدم کرتے دکھاؤں۔

"میں اُن کو اُس سے زیادہ قریب ہونے کے لئے اور اُس کی مقناطیسیت کو محسوس کرنے کیلئے دھکا پیل کرتے دکھاؤں۔ اُس کے آس پاس کھڑے ہونے والوں میں سے کوئی اداس نہ ہو، کوئی غمگین نہ ہو۔

"میں اُس تمثیل میں کوئی ایسی بات شامل نہ کروں جس سے اُس کے متبعین کے دلوں میں کسی قسم کا خوف پیدا کر کے دکھایا جائے، بلکہ میں اُس کو لوگوں کے لئے انتہائی طمانیت، محبت، شرافت اور بطافت کا پیکر بناؤں۔

"مجھے امید نہیں کہ میں کبھی اس کہانی کو سینما کے پردے پر پیش کر سکوں کیونکہ یقیناً اِس سے تنقید و اعتراض کا ایک طوفان امنڈ پڑے گا، لیکن میں جانتا ہوں کہ اگر ایک ایسی تصویر تیار کی جائے تو وہ مذہب کے لئے ناقابل بیان حد تک مفید ثابت ہو، وہ بتلائے کہ مسیح یقیناً ایک ایسا شخص تھا کہ اس سے محبت کی جاتی اور وہ ایک حقیقی اور خوبصورت انسان تھا۔ میں نے ایک دفعہ مسیح کی ایک تصویر دیکھی۔ اب پھر میں اُسے نہیں دیکھنا چاہتا اُس میں حقیقت کا شائبہ بھی موجود نہ تھا۔"

کپلنگ کی ایک کہانی

انگریزی زبان کے مشہور مصنف رڈیارڈ کپلنگ کے اُس سفر کے دوران میں جس کا تذکرہ کتاب "فرام سی ٹو سی" میں موجود ہے جب وہ نیویارک پہنچے تو ہندوستانی کہانیوں کا ایک بھرا ہوا بستہ ان کے ساتھ

تھا۔ اِن کہانیوں کو وہ بہت سے ناشرین کے پاس لے گئے ۔ وہ انہیں پچاس ڈالر فی کہانی کے حساب
سے فروخت کر دینے پر آمادہ تھے، لیکن ہر جگہ انہیں یہی جواب ملا کہ ہندوستان سے کسی کو کچھ دلچسپی نہیں
مگر ایک ایڈیٹر کو سن کر شوق پیدا ہوا اور اُس نے ایک کہانی خرید لی، گو بعد میں اُسے اِس پر افسوس ہوا ۔
اُس نے مسودے کو بے کار سمجھ کر اپنی میز کی ایک دراز میں ڈال دیا اور شائع نہ کیا۔ چند سال کے بعد جب
کپلنگ کی تصانیف مقبول ہوئیں اور ہر زبان پر اُسی کا چرچا ہونے لگا تو ایک استقبال کے سلسلہ میں
اسی ایڈیٹر اور کپلنگ کی ملاقات پھر ہوئی ۔ کپلنگ نے کہا "ہم پہلے بھی ایک دفعہ ملے ہیں" ایڈیٹر نے
چونک کر کہا "کب؟" کپلنگ نے جب اُسے اچھی طرح بتایا تو وہ دوڑا ہوا اپنے دفتر میں گیا اور اُسی
دن اُس کہانی کو نہایت شان سے چھپوا دیا۔

دولت کا بہترین مصرف

آج تک کسی دولت مند نے اپنی دولت اُس سے بہتر مصرف کے لئے نہیں چھوڑی، جس کے لئے
ل سویڈن کا ایک انجنیر اور کیمیا دان الفریڈ بی نوبل اُسے چھوڑ گیا۔ اُس نے اپنی وفات سے پہلے اپنی
دلت کا ایک بڑا حصہ موجدوں، مفکّروں، مصنفوں اور حکیموں کو سال بہ سال انعامات دینے کے لئے وقف
دیا اور آج دنیا اس کے صرف سے دانش و حکمت میں ترقی کر رہی ہے۔
اس سال نوبل کا ادبی انعام مشہور جرمن مصنف تامس مین کو ملا ہے جو اس کا بجا طور پر مستحق تھا۔ اُسے
۹۲۰ پونڈ ملے۔
نوبل کے انعامات اٹھائیس سال سے تقسیم ہو رہے ہیں لیکن یہ ایک عجیب دلچسپ بات ہے کہ اس تمام
صے میں ایک دفعہ بھی ادبیات کا انعام کسی امریکا کے مصنف نے حاصل نہیں کیا۔
نوبل نے اٹھارہ لاکھ پونڈ اپنے پیچھے چھوڑے ۔ اِن کی آمدنی کا ۶۸ فی صدی ہر سال بہترین مفکّروں کو
امات دینے میں خرچ کیا جاتا ہے ۔ اِس سال پہلی دفعہ سویڈن کی حکومت نے نوبل فنڈ پر سے بہت سے
مولات اٹھا لئے ہیں جس سے انعامات کی رقوم اب بڑھائی جا سکیں گی۔

شبلی بحیثیتِ مصنّف

کسی شخص یا کسی شے کو بخوبی جاننے پہچاننے کے لئے ضروری ہے کہ اوّل و بیشتر اُس کی خصوصیتوں اور خوبیوں پر نظر ڈالی جائے اور ابتداءً اس سے قطع نظر کرلی جائے کہ اُس میں کون کون سی کمیاں اور نقائص ہیں اور کسی شخص کی خوبیاں کبھی نظر نہیں آسکتیں جب تک ہمیں اُس شخص سے پوری واقفیت نہ ہو جب تک ہم اُس کی زندگی میں دلچسپی نہ لیں جب تک ہم اُس سے اک نوع کا خواہ عارضی ہی ہو لیکن اک سچّا محبت وہمدردی کا رشتہ قائم نہ کرلیں + کارلائل اپنی کتاب "ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ" میں "ہیرو بحیثیتِ پیغمبر" کے تحت میں نکتہ چینوں کی معائب شماری کے جواب میں کہتا ہے کہ "سچ بات تو یہ ہے کہ ہم قصور و عیوب پر ضرورت سے زیادہ زور دیتے ہیں" پھر پکارتا ہے "قصور! میں کہتا ہوں کہ سب سے بڑا قصور یہی ہے کہ انسان اپنے قصوروں سے آگاہ نہ ہو" + اور پھر کہتا ہے کہ "اگر تم کسی کو جاننا چاہو تو اس کے محاسن کو دیکھو نہ کہ اُس کے عیوب کو" فیسر لنگ جو دنیا کے عظیم ترین زندہ مفکروں میں شمار ہوتا ہے کہتا ہے کہ "بلاشبہ ہر فرد بشر قطعی طور پر نرالا ہے" پھر ایک اور جگہ ہمیں یقین دلاتا ہے کہ انسان صرف اُسی کو سمجھ سکتا ہے جسے وہ محبت کرے + بڑے آدمی اور چھوٹے آدمی میں فرق یہ ہے کہ بڑے آدمی میں اُس کے نرالاپن کا ظہور ہوتا ہے۔ چھوٹے آدمی میں نہیں ہوتا۔ اس فطری نرالاپن کا اظہار کرنے والا اُسے عمدًا اپنی زندگی کا جزو بنانے والا اُسے بیشتر برتنے والا اُسے کار لانے والا آدمی ایک عظیم الشان انسان ہوتا ہے جس کی شخصیت کا اثر دور و نزدیک ہر جگہ پڑتا ہے +

شبلی ایک ایسا انسان تھا! آؤ دیکھیں کہ ہمارا شبلی کون تھا؟ اُس کے سوانحِ حیات پر نگاہ ڈالیں۔ وہ کیا تھا؟ اُس کی تصنیفات پر نگاہ ڈالیں۔ وہ کس لئے تھا؟ اُس کے مطمحِ نظر پر نگاہ دوڑائیں اور دیکھیں کہ اُس کے پیغام کے معنی ہمارے اور دنیا کے لئے کیا تھے اور کیا ہیں؟

حالاتِ زندگی۔ شبلی ۱۸۵۷ء یعنی بغاوتِ ہند کے سال میں صُوبہ متحدہ کے ضلع اعظم گڑھ میں بندول کے گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ان کا خاندان ایک معزز اور ممتاز خاندان تھا۔ اُن کے والد اعظم گڑھ میں وکالت کرتے تھے۔ خاندان میں علم کا چرچا تھا۔ پہلے فارسی تعلیم پائی پھر عربی۔ اعظم گڑھ سے رام پور، رام پور سے لاہور اور لاہور سے سہارنپور

مولانا شبلی نعمانی مرحوم ومغفور

CALCUTTA
ART PG WORKS
LAHORE
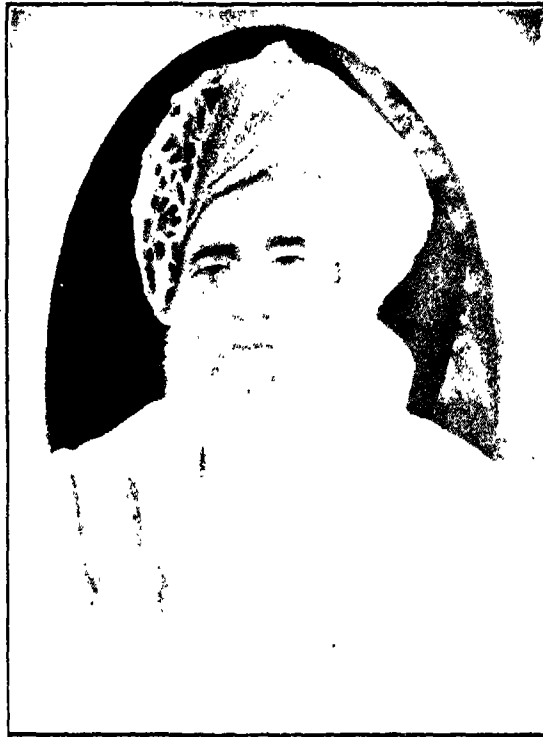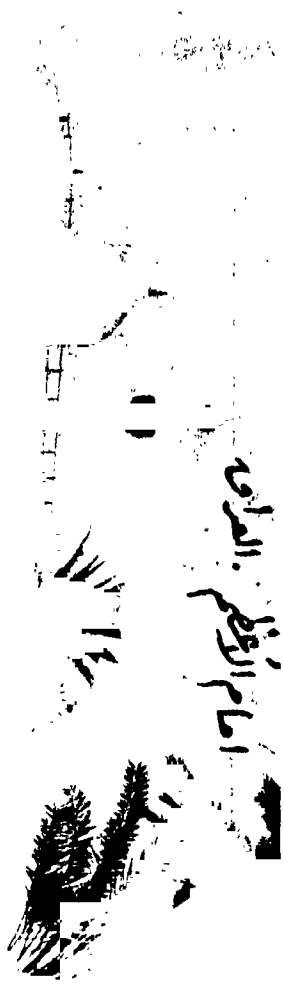
بغداد میں امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی مسجد

جہاں جہاں کسی مشہور عالم کی درس گاہ تھی اُس میں جاکر جملہ فارسی و عربی علوم کی تحصیل کی۔ لاہور میں آدر وقت میسّر نہ آتا تو مولوی فیض الحسن سے اورینٹل کالج سے آتے جاتے رستے میں پڑھ لیا کرتے تھے + اپنے ایک خط میں جو ۲۳۔ ستمبر ۱۹۱۲ء کا نوشتہ ہے لکھتے ہیں[۵۱]: "علمی شوق والد اور گھر کی تربیت کا اثر تھا۔ خاندان میں علم کا چرچا تھا اور تمام بزرگ مصروفِ علم تھے۔ اس زمانہ کی طالب علمی بہت مشکل تھی۔ یکہ پر سفر کرتے تھے۔ پیدل بھی چلنا پڑتا تھا یہ سب میں نے خوشی سے گوارا کیا تھا۔ دو دفعہ والد کی اجازت کے بغیر چپکے نکل گیا۔ یہ خاص التزام رہا اور اس میں میں منفرد تھا کہ ہر فن مثلاً ادب۔ منطق۔ حدیث۔ اصولِ فقہ کے لئے انہی علما کے پاس دور دراز کا سفر کرکے لیا جو ان علوم میں تمام ہندوستان میں ممتاز تھے۔ مثلاً حدیث کے لئے مولانا احمد علی سہارن پوری۔ ادب کے لئے مولانا فیض الحسن لاہور میں + والد بلکہ تمام خاندان کی مرضی بلکہ حکم تھا کہ میں علمی مشاغل کو چھوڑ کر وکالت اور ملازمت کرلوں چنانچہ مجبور ہو کر امتحان دیا اور کامیاب ہوا۔ چند روز وکالت کی۔ لیکن وکالت اور ملازمت سب چھوڑ دی اور علمی اشغال میں مصروف ہوا اور اس لئے معمولی معاوضہ پر اول علی گڈھ کی پروفیسری کی للعہ[۴] ماہوار پر۔

۱۸۷۶ء میں کہ ۱۹ سال کی عمر تھی حج کو گئے اور مکہ و مدینہ کے مناظر سے بغایت متاثر ہوئے۔ مدینے کے کتب خانوں میں جاکر حدیث کی بعض نایاب کتابیں دیکھیں جو بعد میں کہیں نظر سے نہ گذریں +

واپس آکر علم و شاعری کا مشغلہ لاحق ہوگیا۔ کتب بینی کی شروع سے عادت تھی۔ کہتے تھے کہ اعظم گڑھ میں رہتا تھا تو ایک کتب فروش کی بازار میں دکان تھی وہاں جاکر اردو فارسی کے دیوان دیکھا کرتا تھا کبھی کبھی گھر لے آتا تھا + مشاعروں میں حصہ لیتے تھے اور اُس وقت کے مشہور رسائل پیامِ یار اور اودھ پنچ کے پرچے بڑے شوق سے پڑھتے تھے +

مشاعروں کے علاوہ اُن کا شغل غیر مقلّدوں کی تردید اور شدید مخالفت تھا۔ اُن کا قول تھا کہ "انسان عیسائی ہوسکتا ہے لیکن غیر مقلّد نہیں ہوسکتا۔ اُن کا عربی رسالہ "اسکات المعتدی" اسی زمانے اور اسی مذہبی جوش و تعصب کی یادگار ہے + اُس وقت ہندی مسلمانوں میں جو حنفیت و وہابیت کی جنگ برپا تھی۔ وہ اس جنگ میں بڑے شد و مد سے شریک تھے۔ شرر لکھتے ہیں کہ[۵۲]:-

"مولانا نے جن درس گاہوں میں تعلیم پائی تھی اور جن اساتذہ سے پڑھا اُن کی صحبت نے ابتدا ہی میں انہیں سخت حنفی بنا دیا تھا۔ اسی غلو میں انہوں نے اپنے نام کے ساتھ نعمانی کا لقب لکھنا شروع کیا۔ جس کی وجہ سے بعض ناواقف لوگوں نے انہیں غلطی میں پڑ کر نسباً نعمانی یعنی امام اعظم ابو حنیفہ کوفی کی

[۵۱] معارف نومبر ۱۹۲۳ء ص ۴۹۲ [۵۲] مجموعۂ نظم شبلی اردو ص ۲۲۔

میں خیال کر لیا۔ مگر اس کی کوئی اصلیت وحقیقت نہیں ہے۔ وہ مسلّد حنفی تھے اور حنفیت میں اپنے آپ کو اوروں سے ممتاز ثابت کرنا چاہتے تھے"

وہ ایک مذہبی جابر تھے اور روایت ہے کہ بعض لڑکوں کو اس لئے کہ وہ آئندہ نماز پڑھنے کا وعدہ کریں انہوں نے دو دو گھنٹے مارا +

لیکن اس درس وتدریس اور فرقہ بندی اور مذہبی سختی سے گھر والوں کو تسلی نہ تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ شبلی کسی ایسے کام میں لگیں جو دنیاوی حیثیت سے بارآور ہو۔ پہلے زمینداری پھر وکالت پھر امانت کا کام نبھانا چاہا لیکن ایک شاعر مزاج مولانا سے یہ کام کیا سرانجام ہوسکتے ؛ ناچار سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر پھر مطالعہ وتدریس میں مصروف ہوگئے اور قصائد ورسائل لکھنے شروع کئے +

۱۸۸۲ء میں ۲۵ سال کی عمر میں وہ علی گڑھ کالج کی عربی فارسی کی پروفیسری حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے شرر لکھتے ہیں :-

"علی گڈھ میں سید صاحب نے انہیں اپنی کوٹھی کے احاطے کے اندر ایک چھوٹے سے مکان میں جگہ دی جو سب سے الگ بلکہ ہاہمہ اور بے ہمہ تھا اور ایک خاموش مقام تھا۔ اُن میں جستجو وتحقیق کا سچا مذاق دیکھ کر سید صاحب نے اُن سے ربط وضبط بڑھایا۔ اکثر کھانا ایک ساتھ کھاتے اور روزانہ بلا ناغہ مولانا اور سید صاحب میں گھنٹوں صحبت رہتی + سید صاحب ہمیشہ اعتقادی وکلامی مسائل اور مورخانہ تحقیق کے غور وخوض میں رہتے اور تحقیق وتدقیق کے لئے انہیں اکثر حدیث وفقہ وتاریخ وسیر کی کتابوں کے مطالعہ کی ضرورت پڑتی۔ اس کام کو انہوں نے مولانا شبلی سے لینا شروع کیا۔ اور مولوی شبلی نے اس خدمت کو ایسی خوبی اور قابلیت سے انجام دیا کہ جس قدر سید صاحب کی دقیقہ رسی اور وسعتِ نظر کے مولانا شبلی قائل ہوتے جاتے تھے اُس سے زیادہ سید صاحب اُن کی تلاش جستجو اور طلبِ روایات کے معتقد ومعترف ہوگئے تھے۔ اِس زمانہ میں مجھے بارہا مولانا شبلی کے پاس جاکے ٹھہرنے اور اُن کے ذریعہ سے خود سیّد صاحب کا مہمان بن جانے اور دونوں کے ساتھ ہفتوں کھانا کھانے اور شریکِ صحبت رہنے کا موقع ملا۔ مولانا سے اور مجھ سے حد درجہ کی بےتکلفی تھی۔ اور میں اس بات کو ہر صحبت میں محسوس کرتا تھا کہ وہ اور سید صاحب دونو کس قدر ایک دوسرے کے علمی کمالات کے معترف ہوتے جاتے ہیں۔ سید صاحب کے اعتراف کی تو یہ حالت تھی کہ کوئی کام بغیر اُن کے مشورہ کے نہ کرتے اور مولانا شبلی کے اعتراف کا یہ ثبوت ہے کہ میرے علم میں اُن کی سب سے پہلی نظم

جو اُن دنوں شائع ہوئی تھی "صبح امید" ہے، جس میں انہوں نے مسلمانوں کی غفلت اور سید صاحب کی برکت سے اُن کے بیدار ہونے کو نہایت ہی پُرلطف اور موثر الفاظ میں ظاہر کیا ہے"۔

شبلی کا قول ہے کہ میں سید صاحب کا کتب خانہ دیکھ کر باغ باغ ہوگیا۔ مصر و یورپ کی تمام جدید وقدیم مطبوعات الماریوں میں بالترتیب سجی ہوئی تھیں۔ وہ کئی کئی گھنٹے الماریوں کے پاس کھڑے رہتے تھے اور کبھی تھک کر انہیں الماریوں کے پاس زمین پر بیٹھ جاتے تھے۔

اُس زمانے میں اُس دائرہ علمیہ میں جس کے مرکز سرسید تھے مولانا حالی اور مسٹر آرنلڈ بھی شریک صحبت تھے۔ سرسید کے بعد شبلی سب سے زیادہ مسٹر آرنلڈ کے علمی خیالات سے متاثر ہوئے۔ ظاہر ہے کہ ادھر شبلی نے آرنلڈ کو اُن کی کتاب "دعوت اسلام" کی تصنیف وتہذیب میں بہت مدد دی اور اُدھر آرنلڈ نے شبلی کو مغربی علوم اور مغربی علمی تفتیش کے طریقوں سے آگاہ کیا۔ آرنلڈ نے شبلی سے عربی سیکھی تو شبلی نے آرنلڈ سے فرانسیسی زبان کا درس لیا۔

۱۸۸۲ء سے ۱۸۹۸ء تک سولہ سال شبلی علی گڈھ کالج میں رہے۔ مارچ ۹۸ء میں سرسید نے انتقال کیا مئی ۹۸ء میں شبلی نے کالج سے رخصت لی اور اعظم گڑھ پہنچ کر اپنا استعفا بھیج دیا۔ اس دوران میں قومی ترقی کی اس نئی فضا میں اُن کے قلم سے متعدد تصنیفات شائع ہوئیں۔ ۱۸۸۴ء میں مثنوی "صبح امید" لکھی جس میں علاوہ ادبی خوبیوں کے شبلی پر سرسید کے اثرات کا عکس صاف طور پر عیاں ہے۔ ۱۸۸۷ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے دوسرے اجلاس منعقدہ لکھنؤ میں انہوں نے "مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم" پر ایک فاضلانہ خطبہ پڑھا جس میں اول اول اُن کی علمیت اور اسلام سے محبت کا اظہار ہوا۔ ۱۸۸۹ء میں "رائل ہیروز آف اسلام" کے سلسلے کی پہلی کڑی "المامون" جو اُن کی سیرت نگاری کی پہلی زبردست کوشش تھی انہوں نے سرسید کی خدمت میں ہدیۃً پیش کی۔ اور غالباً اس کے عین بعد ہی "الجزیہ" اور "کتب خانہ اسکندریہ" کے رسالے لکھے۔ ۱۸۹۲ء میں انہوں نے روم ومصر وشام کا سفر کیا جس کا محرک اُن کا اسلامی اور علمی شوق تھا۔ ۱۸۹۳ء میں "سیرۃ النعمان" تکمیل کو پہنچی اور اس کے بعد دوستوں کے اصرار سے "سفرنامہ روم ومصر وشام" شائع ہوا۔ ۱۸۹۸ء میں "رسائل شبلی" ایک کتاب کی صورت میں طبع ہوئے۔ اسی سال مارچ میں سرسید کا انتقال ہوا اور ماہ مئی میں شبلی نے کالج سے رخصت لی اور اعظم گڑھ پہنچ کر پروفیسری سے استعفا دے دیا۔

یہاں کے نیشنل سکول کے انتظام وترقی میں کچھ دیر شبلی نے حصّہ لیا۔ اس کے بعد ۱۸۹۹ء میں کشمیر گئے جہاں صحت بد سے بدتر ہوتی گئی۔ "الفاروق" جو انہوں نے "المامون" کے بعد ہی لکھنی شروع کر دی تھی اور جس کے لئے علمی تحقیق کا خیال مصر وروم وشام کے سفر میں اُن کو برابر لگا رہا یہاں مکمل ہوئی جس روز اس مہتم بالشان تصنیف کی آخری

سطریں اُن کے قلم نے لکھیں وہ بستر پر دراز تھے اور گھنٹوں تک بیہوشی کی حالت طاری تھی۔

غالباً اسی سال سید علی بلگرامی کی تحریک پر وہ ریاست حیدر آباد میں شعبۂ علوم و فنون کے ناظم مقرر ہوئے سنہ ۱۹۰۲ء میں "الغزالی" اور اُس کے بعد "علم الکلام" چھپی۔ سنہ ۱۹۰۴ء میں "الکلام" اور پھر "موازنۂ انیس و دبیر" اور "سوانح مولانا روم" طبع ہوئیں۔

اس کے بعد شبلی نے حیدر آباد چھوڑ کر لکھنؤ کا رخ کیا۔ یہاں انہوں نے ندوۃ العلما کے ساتھ جس کی تحریک سنہ ۱۸۹۴ء میں شروع ہوئی تھی اور جس کے متعلق دارالعلوم انہیں کے خیال کے مطابق سنہ ۱۸۹۸ء میں قائم کیا گیا تھا اپنے آپ کو وابستہ کر لیا۔ سنہ ۱۹۱۳ء تک برابر نو سال شبلی نے ندوہ کی خدمت کی۔ جیسا کہ شبلی نے رسالہ "الندوہ" کے پرچے (سنہ ۱۳۲۲ھ مطابق سنہ ۱۹۰۴ء) میں ظاہر کیا انہوں نے محسوس کیا کہ "جدید تعلیم کے ساتھ اس بات کی بھی ضرورت اور سخت ضرورت ہے کہ ہمارے علوم و فنون ہمارا مذہب، ہماری قومی خصوصیات مٹ نہ جانے پائیں" سچ یہ ہے کہ اگرچہ ندوۃ العلماء کے قیام کا یہی مقصد قرار دیا گیا لیکن فی الحقیقت شبلی کی زندگی کا نصب العین بھی یہی تھا اور شبلی وہ عالم تھا جس کی زندگی اِس اصول پر عامل تھی کہ اسلام و اہلِ اسلام کی گئی گذری دنیاوی و روحانی و علمی عظمت کو از سرِ نو چمکایا جائے۔ ندوہ کے لئے وہ در بدر پھرے۔ ہندوستانی ریاستوں اور دیگر ذرائع سے سرمایہ جمع کیا یہاں تک کہ سنہ ۱۹۰۹ء میں ندوہ کی عظیم الشان عمارت کا بنیادی پتھر رکھا گیا۔ لیکن اس تعمیر کے ساتھ تخریب کا کام بھی جاری تھا یعنی وہ علماء کے اجتماع و تنظیم کا خواب ہمیشہ شبلی کے پیشِ نظر تھا اُن کی قدامت پسندی اور شکوک و شبہات نے آخرکار شبلی کو مجبور و مایوس کر دیا۔ اور وہ سنہ ۱۹۱۳ء میں لکھنؤ چھوڑ کر اعظم گڑھ چلے گئے۔ شبلی میں مذہبی و ادبی میلانات پہلو بہ پہلو موجود تھے۔ قیامِ ندوہ کے زمانے میں ہی انہوں نے اپنی مشہور تنقیدی تصنیف "شعر العجم" کا پہلا حصہ سنہ ۱۹۰۸ء میں شائع کیا اور "اورنگ زیب عالمگیر" بالاقساط رسالہ "الندوہ" میں شائع ہوتا رہا۔

اعظم گڑھ پہنچ کر انہوں نے "شعر العجم" کا کام جاری رکھا اور اُس کا دوسرا تیسرا اور چوتھا حصہ اردو دنیا کے سامنے پیش کیا۔ اس کا پانچواں حصہ اُن کی وفات کے چار سال بعد شائع ہوا۔ سنہ ۱۹۱۴ء میں شہرۂ آفاق کتاب "سیرۃ النبی" زیرِ تصنیف تھی کہ ۱۸ نومبر سنہ ۱۹۱۴ء کو موت اپنے مقررہ وقت پر آپہنچی۔ مولوی محمد یحیٰی تنہا لکھتے ہیں کہ "سنہ ۱۸۵۷ء میں پیدا ہوئے تھے اور ۵۷ ہی برس کی عمر پائی۔ ہنگامۂ مشرق (غدر) میں ظہور کیا اور ہنگامۂ مغرب (جنگِ یورپ) میں مخفی ہوئے۔" "بدء الاسلام" "سیرۃ نبوی" سے پہلے تصنیف کی اور سیرۃ نبوی پر آخر دم توڑا۔ مرنے سے کچھ دنوں پہلے کیا خوب فرمایا تھا ؎

عجم کی مدح کی عباسیوں کی داستاں لکھی　　مجھے چندے مقیم آستانِ غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرتِ پیغمبرِ خاتم　　خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا"

ان کی وفات کے بعد ۱۹۱۶ء میں مکاتیبِ شبلی حصہ اول ۱۹۱۷ء میں حصہ دوم ۱۹۱۸ء میں سیرۃ النبی حصہ اول ۱۹۲۰ء میں حصہ دوم (جن آخر الذکر دو کتابوں میں کہیں کہیں قوسین میں سیّد سلیمان ندوی کے اضافات مندرج ہیں) شائع ہوئیں۔ کلیاتِ شبلی اردو اور کلیاتِ شبلی فارسی اُن کی زندگی میں شائع ہو چکی تھیں۔ البتہ "مقالاتِ شبلی" کتابی صورت میں اُن کی وفات کے بعد شائع ہوئی +

دنیاوی حیثیت سے شبلی نے مختلف اطراف سے اپنی قابلیت کا اعتراف حاصل کیا + سفرِ روم کے دوران میں سلطانِ ترکی نے تمغۂ مجیدی عطا کیا۔ دو سال بعد برٹش گورنمنٹ نے شمس العلما کا خطاب دیا اور الہ آباد یونیورسٹی کا فیلو بنایا۔ سنہ ۱۹۰۹ء میں امیر عبدالرحمٰن خاں نے کابل میں ایک علمی خدمت پر بلایا مگر انہوں نے انکار کر دیا۔ اس کے علاوہ متعدد بار کانفرنسوں اور کمیٹیوں میں مدعو کئے گئے۔ حیدر آباد نے مدت تک اُن کی سرپرستی کی۔ اور یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ بیرونی ممالک مصر و شام و ترکی و جزائر ملایا بلکہ انگلستان پیرس اور برلن سے علمی سوالات اُن کی رائے کے لئے اور بغرضِ استفادہ اکثر آیا کرتے تھے +

قوم کی تمدنی و علمی ترقی ہمیشہ شبلی کے پیشِ نظر تھی۔ چنانچہ آخری عمر میں اُن سے دو بڑے کام سرانجام ہوئے + "قانونِ وقفِ اولاد" انہیں کی مساعی سے منظور و نافذ ہؤا اور انہوں نے مشہور علمی مجلس "دار المصنفین" کی بنا ڈالی اور اپنا مکان باغ اور کتب خانہ اس کے نشوونما اور قیام کے لئے وقف کر دیا +

وفات سے تقریباً دو سال پیشتر ایک خط (مورخہ ۲۳ ستمبر ۱۹۱۲ء) میں اپنی پبلک زندگی کے متعلق یوں لکھتے ہیں[۵۴]:

> "متعدد دفعہ حیدر آباد اور دیگر ریاستوں میں بیش قرار تنخواہ پر بلایا گیا لیکن علمی شغلہ کو چھوڑ کر نہ گیا حیدر آباد سے جو معمولی وظیفہ مقرر ہے اُس پر قناعت کی + ریاستوں نے صلے اور نذرانے دیئے اور دینے چاہے لیکن ہمیشہ انکار کیا اور واپس کر دیا + رائے میں ہمیشہ آزاد رہا۔ سرسید کے ساتھ ۱۶ برس رہا لیکن پولیٹیکل مسائل میں ہمیشہ اُن سے مخالف رہا اور کانگریس کو پسند کرتا رہا اور سرسید سے بارہا بحثیں رہیں + سفر ٹرکی و مصر صرف علمی تحقیقات کے لئے کیا اور تمام مصارف خود گوارا کئے۔ ریاست رام پور نے مصارف دینے چاہے۔ انکار کیا۔ بزرگوں نے قسطنطنیہ روپے بھیجے وہ بھی واپس کر دیئے + ہمیشہ بڑے بڑے اہم مقاصد پیشِ نظر رہے + وطن

---

[۵۴] "معارف" نومبر ۲۳ء ص ۳۹۴۔

یعنی اعظم گڈھ میں مسلمانوں کا کوئی اسکول نہ تھا اور مسلمان انگریزی سے بالکل الگ تھے۔ میں نے نیشنل
ہائی اسکول قائم کیا۔ اس کے اکثر مصارف خود ادا کئے + پھر ندوہ کی تحریک میں جزوِ غالب رہا۔ اور جب
ندوہ بالکل مرگیا تھا تو اُس کو از سرِ نو زندہ کر کے ترقی دی۔ تصنیفات میں خاص یہ خیال رہا کہ مستقل شاخیں
مکمل کروں۔ چنانچہ علم کلام، تاریخ، لٹریچر (موازنہ و شعر العجم) تین شاخوں پر سیریز تیار کردی + فارسی شاعری
میں زبان کو اہلِ زبان کے اصول پر برتا + ملازمت تو اکثر علمی ہی اختیار کی لیکن وکالت اور سرکاری ملازمت
کے زمانہ میں بھی درس و تدریس کا مشغلہ جاری رکھا اور یہ فطرت تھی بچپن سے میری صحبت بدچلن لوگوں
میں تھی اور وہ لوگ ہمیشہ ان مشاغل کی تحریک کرتے تھے لیکن کبھی ناچ رنگ بلکہ گانے میں بھی شریک نہ
ہوا + جب راجہ کرشن پرشاد وزیر ہوئے اور حسبِ دستور نذر دینے گیا تو اُن کے ایڈی کانگ نے کہا کہ آپ
نے تو تہنیت کا قصیدہ لکھا ہوگا۔ میں نے کہا یہ اَوروں کا پیشہ ہے۔ میں یہ کام نہیں کرتا۔ اس پر ردوبدل
ہوئی اور میں نے ناگواری کے ساتھ جواب دیا کہ "میں کسی کی مدح نہیں کرتا + قلمی اور نایاب کتابیں بہت بہم
پہنچائیں اور کثرت سے مطالعہ کیں۔ یہ سرسری باتیں لکھ دیں۔ خود اپنا آلھا کیا گاؤں؟

شبلی ۲۳ ستمبر ۱۹۱۲ء"

شبلی کی زندگی کے مختصر حالات تو ہم سُن چکے۔ اب ان حالات میں ہمیں اُن تغیرات کو ڈھونڈنا ہے جنہوں نے
شبلی کو شبلی بنایا + اِس دنیا میں جہاں حرکت زندگی ہے اور سکون موت وہی شخص زیادہ زندہ وہی شخص زیادہ پُرعظمت
ہے جس کی زندگی میں زیادہ سے زیادہ تحریک پائی جائے۔ شبلی کی زندگی میں کون سی تحریک یا تحریکیں تھیں اور اُس
کے یا اُن کے محرکات کیا تھے؟ ہم دیکھ چکے ہیں کہ شروع شروع میں وہ ایک پرانی وضع کے متشرع مسلمان تھے اور اُن
کی تنگ نظر اسلامیت اُن کے اِس قول سے مترشح ہوتی تھی کہ "انسان عیسائی ہوسکتا ہے لیکن غیر مقلد نہیں ہوسکتا"۔
البتہ یہ بھی ظاہر ہے کہ وہ نرے مُلّانے نہ تھے بلکہ اُن میں اسلام کے لئے ایک پُرجوش خلوص و عشق تھا جو ابھی اُس زمانے میں
جب انہوں نے ۱۹ سال کی عمر میں فریضۂ حج ادا کیا اور پھر مدینے میں درگاہِ رسول میں حاضر ہوئے اُن کے ہر قول و فعل
سے ٹپکا پڑتا تھا + لیکن پھر بھی قدامت پسندی نے ابھی انہیں گھیر رکھا تھا اور ابھی اُن میں وہ آزاد منشی اور زمانہ شناسی
کا جوہر نہ چمکا تھا جس کے اثر سے وہ یکتائے علم و فن بن گئے + اعظم گڑھ کا حسّاس نوجوان جب علی گڑھ پہنچا تو وہاں
اُسے اُس مردِ خدا سے پالا پڑا جس نے گذشتہ بارہ سال سے مسلمانوں کی قوم کو خوابِ گراں سے جگانے میں اپنی زندگی
کا ایک ایک لمحہ اور اپنے دل و دماغ کے سب جذبات و خیالات صرف کر دیئے تھے + سرسید کی صحبت و اثر نے شبلی کے تمام

اُن خوابیدہ اوصاف کو بیدار کر دیا جو فطرتاً اُن کی طبیعت میں موجود و مضمر تھے + وہ برگزیدہ ہستیاں جو سرسید کے اثر سے مسلمانوں کی قوم میں اچھے اور بڑے کاموں پر آمادہ ہوگئیں اور جنہوں نے ہندوستان کے مسلمانوں میں اسلام کی سچی روح پھونکنے میں اپنی زندگی وقف کر دی اُن میں ایک شبلی بھی تھے +

سرسیدؒ خود ایک زبردست قومی ضرورت سے متاثر تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ ہندوستان کے مسلمان تخت و تاج کھو کر حکومتِ وقت سے روٹھ کر قدامت پسندی زیاں کاری اور سہل انگاری کی دلدلوں میں پھنسے ہیں اور کسی طرح نکالے نہیں نکلتے + انہوں نے اک عرصہ اُن تجاویز پر غور کیا جن سے اِس برگشتہ قسمت قوم کو اس کی غفلت کے برے نتائج سے کما حقہٗ آگاہ کر کے اسے ترقی و تہذیب کے رستے پر لگایا جائے + اکتوبر سنہ ۱۸۷۰ء میں وہ ولایت سے واپس آئے اور پہنچنے کے جلد بعد انہوں نے مسلمانوں کو مغربی تہذیب سے مانوس کرنے اور اس کے ساتھ ہی اپنی قدیم تہذیب کے پھر پالینے کے لئے دو بڑے بڑے کام بیک وقت شروع کئے۔ ۲۴۔ دسمبر کو "تہذیب الاخلاق" کا پہلا نمبر شائع ہوا اور ۲۶۔ دسمبر کو کمیٹی "خواستگارِ ترقیِ تعلیم مسلمانانِ ہندوستان" قائم ہوئی۔ تہذیب الاخلاق کے ایڈیٹر اور اس کمیٹی کے سکرٹری سرسید بنے + تہذیب الاخلاق نے صرف مسلمانوں کے اخلاق کی تہذیب کا کام ہی نہیں کیا بلکہ اُس کے ذریعے سے مسلمانوں میں وہ مذہبی و قومی ترقی کی روح پھیلی جس کا نتیجہ آج اُن کی بدرجہا بہتر حالت میں عیاں ہے اور اردو زبان میں اُس سلاست و متانتِ ادب کی بنیاد پڑی جس پر آئندہ ساٹھ سال میں ایک خوش آئند عمارت قائم ہوگئی + اور کمیٹی مذکورہ کی مساعی کا نتیجہ آج "علی گڈھ یونیورسٹی" کے در و دیوار سے ظاہر ہے + سرسید کو قومی ترقی کی جو لو لگی ہوئی تھی وہ اُس دل گداز واقعہ سے ظاہر ہوتی ہے جسے نواب محسن الملک نے اِن لفظوں میں بیان کیا ہے[۵۵] کہ

> جس تاریخ کمیٹی مذکور کے انعقاد کے لئے جلسہ قرار پایا تھا اُس سے ایک روز پہلے میں بنارس میں پہنچ گیا تھا۔ رات کو سرسید نے میرا پلنگ بھی اپنے ہی کمرے میں بچھوایا تھا۔ گیارہ بارہ بجے تک مسلمانوں کی تعلیم کے متعلق باتیں ہوتی رہیں۔ اس کے بعد میری آنکھ لگ گئی۔ دو بجے کے قریب جو آنکھ کھلی، تو میں نے سرسید کو اُن کے پلنگ پر نہ پایا۔ میں اُن کے دیکھنے کو کمرے سے باہر نکلا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ برآمدے میں ٹہل رہے ہیں اور زار قطار روتے جاتے ہیں۔ میں نے گھبرا کر پوچھا کہ کیا خدانخواستہ کہیں سے کوئی افسوسناک خبر آئی ہے؟ یہ سن کر اور زیادہ رونے لگے اور کہا کہ "اس سے زیادہ اور کیا مصیبت ہوسکتی ہے" کہ مسلمان بگڑ گئے اور

---

۵۵ حیاتِ جاوید جلد ۱۔ ص ۱۲۳۔

بگڑتے جاتے ہیں اور کوئی صورت اُن کی بھلائی کی نظر نہیں آتی۔ پھر آپ ہی کہنے لگے کہ جو جلسہ کل ہونے والا ہے مجھے امید نہیں کہ اس سے کوئی عمدہ نتیجہ پیدا ہو۔ ساری رات اسی ادھیڑبن میں گزر گئی ہے کہ دیکھئے کل کے جلسہ کا کیا انجام ہوتا ہے اور کسی کے کان پر جوں چلتی ہے یا نہیں" نواب محسن الملک کہتے ہیں کہ "سرسید کی حالت دیکھ کر جو کیفیت میرے دل پر گذری اس کو بیان نہیں کر سکتا۔ اور جو عظمت اس شخص کی اُس دن سے میرے دل میں بیٹھی ہوئی ہے اُس کو میں ہی خوب جانتا ہوں"

ایک خط میں جو سرسید نے اپنے اِس ہمدرد اور دلی دوست کو ولایت سے لکھا ایک عربی مدرسے کا جو کہیں دہلی میں قائم کیا گیا تھا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں[۵۶]:-

"جانِ من و جنابِ من! ایسے ایسے مدرسوں سے کچھ فائدہ نہیں۔ افسوس ہے کہ مسلمان ہندوستان کے ڈوبے جاتے ہیں اور کوئی اُن کا نکالنے والا نہیں۔ ہائے افسوس! امرت تھوکتے ہیں اور زہر نگلتے ہیں۔ ہائے افسوس! ہاتھ پکڑنے والے کا ہاتھ جھٹک دیتے ہیں اور مگر کے منہ میں ہاتھ دیتے ہیں۔ اے بھائی مہدی کچھ فکر کرو اور یقین جان لو کہ مسلمانوں کے ہونٹوں تک پانی آ گیا ہے۔ اب ڈوبنے میں بہت ہی کم فاصلہ باقی ہے۔ اگر تم یہاں آتے تو دیکھتے کہ تربیت کس طرح ہوتی ہے؟ اور تعلیمِ اولاد کا کیا قاعدہ ہے؟ اور علم کیونکر آتا ہے؟ اور کس طرح پر کوئی قوم عزت حاصل کرتی ہے۔ انشا اللہ تعالیٰ میں یہاں سے واپس آن کر سب کچھ کہوں گا اور کروں گا۔ مگر مجھ کافر مردود، گردن مروڑی ہوئی مرغی کھانے والے، کفر کی کتابیں چھاپنے والے کی کون سنے گا؟"

قوم نے طوعاً و کرہاً سرسیّد کی زبردست آواز سنی اور اُس پر جن چند صاحب دلوں نے بزور لبیک کہی اُن میں ایک شبلی بھی تھے۔ وہ جوش و خروش وہ محبت و عقیدت کے جذبات جو سب کے سب سچائی اور نیک دلی پر مبنی تھے۔ کس طرح ممکن تھا کہ وہ بے اثر و بے نتیجہ رہتے! علی گڑھ کالج میں دو سال پروفیسری کرنے کے بعد جو مثنوی "صبح امید" کے نام سے انہوں نے لکھی اُس سے ظاہر ہے کہ سرسیّد کی تحریک کا اُن پر کیا کچھ اثر ہوا۔ زوالِ اسلام کا ایک پُر درد خاکہ کھینچنے کے بعد کہتے ہیں[۵۷]:

ماتم تھا یہی کہ آئی ناگاہ — اک سمت سے اک صدائے جانکاہ
اس شان سے تھی وہ آہ دلگیر — پہلو میں اثر، بغل میں تاثیر
دل ہاتھ سے لینے میں بلا تھی — جادو تھی؟ فسوں تھی؟ جانے کیا تھی

---

۵۶ حیاتِ جاوید جلد ۲ - ص ۵۷ + ۵۷ کلیاتِ شبلی اردو صفحات ۷۷، ۸ ، ۱۰

دیکھا تو وہاں بجاہ و تمکیں — آیا نظر ایک پیرِ دیریں
صورت سے عیاں جلالِ شاہی — چہرے پہ فروغِ صبحگاہی
وہ ریشِ دراز کی سپیدی — چھٹکی ہوئی چاندنی سحر کی
وہ ملک پہ جان دینے والا — وہ قوم کی ناؤ کھینے والا
اُٹھتے ہوئے جوش سے بہ رقت — ہے مرثیہ خوانِ قوم و ملت
تا دیر وہ قوم کا فدائی — وہ خضرِ طریقِ رہنمائی
اٹھتے ہوئے جوشِ دل سے پیہم — عبرت کا دکھا رہا تھا عالم
افسانۂ غم سنا کے ٹھہرا — سوتوں کو جگا جگا کے ٹھہرا
جادو کی بھری ہوئی وہ تقریر — ہونٹوں سے ٹپک رہی تھی تاثیر
باتوں میں اثر تھا کس بلا کا — اِک بار جو رخ پھرا ہوا کا
امید کی بڑھ گئی تگ و تاز — اونچی ہوئی حوصلوں کی پرواز
خواہش کے بدل گئے ارادے — ہمت نے قدم بڑھائے آگے
جو تھا وہ عجیب جوش میں تھا — مخمور بھی اب تو ہوش میں تھا
اب ملک کے ڈھنگ تھے نرالے — اخبار کہیں کہیں رسالے
تعلیم کے جابجا وہ جلسے — گھر گھر میں ترقیوں کے چرچے
بے تاب ہر ایک جزو کل تھا — ہر بار "بڑھے چلو" کا غل تھا

اخیر میں علمائے قوم کو خطاب کرکے تہدیداً کہتے ہیں ؎

اے مدعیانِ حبِ اسلام! — حجروں میں تو اب کرو نہ آرام!
دعوے ہیں تو کچھ ہنر دکھاؤ! — ہمت کے قدم ذرا بڑھاؤ!
موقع ہے یہی ہنر دکھاؤ — جو کہتے تھے، آج کر دکھاؤ!
کر دو جو گذشتہ کی تلافی — ثابت ہو زمانے پر کہ اب بھی!
گو دورِ فلک ہوا دگرگوں — پھر بھی تو رگوں میں ہے وہی خوں
اسلاف کے وہ اثر ہیں اب بھی — اس راکھ میں کچھ شرر ہیں اب بھی

اس جام میں ہے شراب باقی　　اب تک ہے گہر میں آب باقی
گو خوار ہیں طرز خو وہی ہے　　مرجھا گئے پھول بو وہی ہے
هٰذَا وَلَقَدْ بَلَغْتُ اَقْصَاہ　　فَاسْعَوْا اَوْ تَوَكَّلُوْا عَلَى اللّٰہ

شبلی کی پہلی اردو نثر کی تحریر یدہ علمی اسلامی مضمون ہے جو انہوں نے مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم کے عنوان سے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے دوسرے اجلاس میں پڑھا۔ اس میں انہوں نے بتایا کہ مسلمانوں نے علوم و فنون کس طرح حاصل کئے اور پھر دنیا کی تمام قوموں کو اُن علوم کی کیونکر تعلیم دی + اس مضمون کو ان فقروں پر ختم کرتے ہیں[۵۸]:۔

"میں نے اس آرٹیکل میں اس بات سے قصداً پرہیز کیا ہے کہ سلف کے کارنامے زیادہ آب و تاب سے لکھوں۔ قوم کی آج یہ حالت ہے کہ جتنا لکھا گیا یہ بھی اُس کے چہرے پر نہیں کھلتا۔ سلف کے مفاخر کا ہم کیا ذکر کر سکتے ہیں جب ہم نے خود کچھ نہیں کیا تو اس سے کیا حاصل کہ سلف نے بہت کچھ کیا تھا ؎

گرفتم کز حریفاں بیش یا کم میتواں گفتن　　"ز دست تا چہ آید" آخر ایں ہم میتواں گفتن

اس کے ڈیڑھ دو سال بعد شبلی نے مسلمانوں کے گذشتہ کارنامے اک گری ہوئی قوم کے سامنے پیش کرنے کا تہیہ کیا اور رائل ہیروز آف اسلام یعنی نامور فرمانروایانِ اسلام کے سلسلے میں سب سے پہلی کتاب "المامون" لکھ کر اُس کا حقِ تصنیف مدرسۃ العلوم علی گڑھ کو دے دیا + اس کے دوسرے ایڈیشن کے ساتھ جو اکتوبر ۱۸۸۹ء میں شائع ہوا سرسید نے دیباچہ لکھا جس میں وہ سلف کے کارناموں کو یاد رکھنے کی اہمیت جتا کر لکھتے ہیں[۵۹]:

ہم کو نہایت خوشی ہے کہ ہمارے دوست مخدوم اور ہمارے مدرسۃ العلوم کے پروفیسر مولانا مولوی محمد شبلی نعمانی نے اس کام کا بیڑا اٹھایا ہے اور ایک سلسلہ ہیروز آف اسلام کا لکھنا چاہا ہے۔ اسی سلسلہ میں کی ایک کتاب یہ ہے جو "المامون" کے نام سے موسوم ہے۔ انہوں نے خلفائے بنی عباس میں سے مامون الرشید ابن ہارون الرشید کو عباسی خلفا کا ہیرو قرار دیا ہے۔ اور اس کے عام کارنامے اچھے یا بُرے نہایت خوبی اور بے انتہا خوش اسلوبی سے اس میں لکھے ہیں"

الجزیہ، کتب خانہ اسکندریہ، سیرۃ النعمان، سفرنامہ روم و مصر و شام، رسائلِ شبلی سب علی گڑھ کے زمانے کی یادگار ہیں + علی گڑھ کا زمانہ شبلی کی پبلک زندگی کا پہلا دور تھا علی گڑھ ہی میں اُن کی تصنیف و تالیف کی ابتدا ہوئی۔

---

۵۸ "گذشتہ تعلیم" ص ۱۰۷ + ۵۹ المامون دیباچہ ص ۱

وہیں سرسید کی صحبت میں اُن پر جدید قومی رنگ چڑھا۔ وہیں انھوں نے مشرقیت و مغربیت کے صحیح امتزاج کی خوبی اور سودمندی دیکھی + اس ضمن میں اُن کے مذہبی خیالات میں بقولِ شرر ایک "نازک انقلاب" واقع ہوا، "شبلی جو اولاً نعمانی و حنفی تھے اب غیر مقلد معتزلی سرسید کے زیرِ اثر بغیر اس کے کہ غیر مقلد بنیں" بلا واسطہ نعمانی سے معتزلی بننے لگے اور آخر میں اس بات کی کوشش شروع کی کہ خود حنفیت کو اصلی اعتزال ثابت کریں"[۱] اس کے بعد شرر لکھتے ہیں:-

"اب اس کے ساتھ ہی اُن میں ایک دوسرا تغیر شروع ہوا۔ اُن میں باوجود انتہا درجے کے اخلاق کے خودداری کا خیال بہت بڑھا ہوا تھا۔ سید صاحب کی صحبت علی گڈھ کالج کی مرجعیت اور اُن کی ذاتی قابلیت نے انہیں ابتداً اس حیثیت سے پبلک میں انٹروڈیوس (متعارف) کرایا کہ سید صاحب کے گروہ کے ایک نامور بزرگ اور اُن کی فوج کے ایک نامی پہلوان ہیں خصوصاً جب وہ سید صاحب کے ہمراہ رکاب حیدرآباد گئے تو مسلمانوں میں اس خیال کو اور پختگی ہو گئی۔ مگر خود مولانا شبلی کی خودداری اس حیثیت کو (؟) اپنی اُن تصنیفوں اور نظموں کو تو وہ مٹا نہ سکتے تھے جن میں خود ہی اپنی اس حیثیت کو آشکارا کر چکے تھے۔ لیکن اب اس بات کو ناقابلِ برداشت دیکھ کے علی گڑھ کالج سے علیحدگی اختیار کر کے ندوۃ العلما میں شرکت کی اور سمجھے کہ اس ذریعہ سے میں علما کا سرتاج اور شیخ الکل بن کے اُس درجہ پر پہنچ جاؤں گا جو سید صاحب کے درجے سے بھی مافوق ہے۔ میں نے بارہا اُن کو اس خیال سے روکا اور اسی زمانہ میں کہہ دیا تھا کہ علما بس میں آنے والے نہیں ہیں۔"

اس علیحدگی کی شاید ایک وجہ یہ بھی ہو کہ سرسید کو اپنی عمر کے آخری حصے میں کالج سے کم تعلق تھا اور سید محمود کی بے بس تلون مزاجی بعض وقت خوددار کام کرنے والوں کے لئے اک سوہانِ روح ہو جاتی تھی + بہرحال وجہ کچھ بھی ہو یہ ظاہر ہے کہ علی گڑھ کی فضا اب شبلی کے کام کے لئے ناکافی یا غیر موزوں ہو گئی تھی + وہ محض اک کالج کے پروفیسر بنے رہنے پر راضی نہ تھے۔ اُن کی حد درجہ حساس اور خوددار اور انوکھی شخصیت اپنے اظہار و اتمام کے لئے آور نئے نئے ذریعے ڈھونڈنا چاہتی تھی۔ کالج کو چھوڑ کر اول اول نو سال ڈیڑھ سال تک وہ سب بندشوں سے آزاد رہے اور اسی آزادگی و علالت کے زمانے میں "الفاروق" کی سی زبردست تصنیف تکمیل کو پہنچائی + بعد میں وہ حیدرآباد کی علم نواز ریاست سے متعلق ہو گئے اور اُس کی سرپرستی میں انہوں نے تاریخ سے فلسفے اور فلسفے سے ادب کی طرف رجوع کیا + یہ شبلی کی مصنفانہ زندگی کا دوسرا دور تھا + معلوم ہوتا ہے کہ اب اُن کی طبیعت محض تاریخی بیانات و تحقیقات سے سیر ہو چکی تھی اور اپنی جودت و اجتہاد کے لئے نئے نئے میدان ڈھونڈتی تھی۔ لہذا پہلے "الغزالی" پھر "علم الکلام" پھر "الکلام" لکھی گئیں اور ان کے بعد ادبیات نے دل میں

---

[۱] مجموعۂ نظم شبلی اردو ص ۱۱

چٹکی لی تو پہلے "سوانحِ مولانا روم" اور پھر "موازنہ انیس و دبیر" تیار ہوئیں۔ لیکن یہ دوسرا دور جو یوں علی گڑھ کی طرح اک تصنیف و تالیف کا دور تھا مگر جس میں علی گڑھ کی سی کوئی قومی تحریک اپنی لہریں نہ لیتی تھی۔ شبلی کی شخصیت کے زور اور پھیلاؤ کے لئے ایک علمی تنگنائے ثابت ہوا اور اس لئے وہ چار سال کے بعد ہی حیدر آباد سے رخصت ہو کر چل دیئے۔

حقیقت یہ ہے کہ شبلی ایک آزاد روش عالم تھے۔ سرسیّد تھے جنہوں نے اُن کی آزاد منشی اور اجتہاد کو ابھارا اور علی گڑھ اور حیدر آباد میں اُن کی علمیّت و قابلیّت کو اپنے جوہر دکھانے کا موقع ضرور ملا لیکن اُن کی آزادگی اک نئی راہ بنانے اور بلا واسطہ خود کچھ کر سکنے کے لئے بے تاب تھی۔ بالآخر فکرِ معاش سے کچھ فارغ ہو کر انہوں نے اُس کام کو ہاتھ میں لیا جو انہیں جان و دل سے زیادہ عزیز تھا۔ یہ تھا ہندی مسلمانوں کے علما کو اک نئی راہ پر لے جانے اور لئے چلنے کا زبردست و نتیجہ خیز کام۔ شبلی نے محسوس کیا کہ وہ خاص اس کام کے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔ سرسیّد کو پیغمبرِ تعلیم کہہ کر پکارا گیا ہے۔ شبلی مسلمانانِ ہند کے مذہبی رہنما بننا چاہتے تھے۔ اک ایسے رہنما جس کی پُر درد آواز دماغ نہیں بلکہ دل پر اپنا اثر پیدا کرے اور سچ یہ ہے کہ شبلی میں اس کام کی قابلیّت بھی تھی۔

لیکن یہ کام اس قدر آسان نہ تھا جتنا وہ سمجھے تھے۔ اس میں کچھ شبہ نہیں کہ انہوں نے اس بارے میں سخت بلکہ انتہائی کوششیں کیں۔ دن رات محنت کی۔ ریاستوں سے روپیہ جمع کیا۔ در بدر گداگری کی۔ ندوہ کو ندوہ انہیں نے بنایا اور ایسے ایسے علما پیدا کر دیئے جن میں سے کسی کسی میں مشرقیت و مغربیت دونوں کی جھلک یکجا پائی جانے لگی۔ اور اس کے ساتھ اُن کی رہائش کے انتظام و اہتمام اور اُن کے اخلاق و اطوار پر ایک دقیق و نکتہ رس نظر تھی۔ غرض شبلی نے ہندوستان کے قدامت پسند مسلمانوں کو انہیں کے دل پسند حربوں سے ہر طرح مطیع و منقاد کرنا چاہا لیکن آخر میں علما کی انانیت اور کج روشی نے اُن کو مجبور کر دیا کہ اس کام سے قطعی طور پر ہاتھ اٹھا لیں۔ اس دوسرے دور میں علاوہ رسالہ الندوہ اور ندوہ کے دارالعلوم کو بوجوہِ احسن چلانے کے انہوں نے "شعرالعجم" کی تصنیف کی ابتدا کی۔ گومتی کے کنارے ندوۃ العلما کی شاندار عمارت آج تک اُن کی مساعی کو پکار پکار کر مشتہر کر رہی ہے۔

اس کے بعد شبلی پھر اعظم گڑھ چلے گئے۔ شعرالعجم ختم کی لیکن طبیعت کو قرار نہ تھا۔ چاہتے تھے کہ علاوہ اس انفرادی علمی کام کے کوئی اجتماعی قومی خدمت بھی سر انجام دیں۔ چنانچہ ایک طرف سیرۃ النبی کا مبارک کام ہاتھ میں لیا اور دوسری طرف اک زبردست ایثار کے ساتھ "دارالمصنفین" کی بنا ڈالی۔

زندگی کے دور۔ متذکرہ بالا بیان سے ظاہر ہو گیا ہو گا کہ شبلی کی زندگی چھ حصوں میں تقسیم کی جا سکتی ہے۔ اول ۱۸۵۷ء سے

سنہ ۱۸۸۲ء تک کا زمانہ جو تعلیم و تربیت اور جستجوئے معاش کا زمانہ تھا۔ اس وقت خیالات میں پرانی روش قائم تھی + دوسرا سنہ ۱۸۸۲ء سے سنہ ۱۸۹۸ء تک جب وہ سرسیّد کے زیرِ اثر آئے اور اُن میں وہ جوہر ابھرا جس سے اُن کی شخصیّت دنیا پر ہویدا ہونے والی تھی + تیسرا سنہ ۱۸۹۸ء سے سنہ ۱۸۹۹ء تک جب انہوں نے کچھ دیر علیحدگی میں تصنیف کا کام کیا + چوتھا سنہ ۱۸۹۹ء سے سنہ ۱۹۰۴ء تک جب حیدر آباد میں ناظمِ علوم و فنون کی حیثیت میں اُن کو وسیلۂ معاش ہی میں مشغلۂ تصنیف حاصل ہوگیا اور وہ نظام کی اعانت میں اطمینان سے اپنا مصنّفانہ کام کرتے رہے + پانچواں سنہ ۱۹۰۴ء سے سنہ ۱۹۱۳ء تک جب انہوں نے علما کی تہذیب و تربیت کا دشوار کام اپنے ذمے لیا اور اس کو جہاں تک ممکن تھا خوش اسلوبی کے ساتھ نباہا + چھٹا اور آخری زمانہ سنہ ۱۹۱۳ء سے سنہ ۱۹۱۴ء تک جب وہ بظاہر پبلک زندگی سے علیحدہ ہوگئے لیکن جب انہوں نے تصنیف میں سیرۃ النبی اور تنظیم میں دار المصنفین کی داغ بیل ڈالی جن کے نقش و نگار آج تک ہندوستان میں روزِ روشن کی طرح عیاں ہیں + اس تمام عرصے میں شبلی کی شخصیت ہم کو چھ مختلف مقامات پر اپنا کام کرتی نظر آتی ہے۔ اعظم گڑھ۔ علی گڑھ۔ کشمیر۔ حیدر آباد۔ لکھنؤ اور پھر اعظم گڑھ!

مصنّفانہ زندگی کی تبدیلیاں ۔ اب دیکھو کہ شبلی کی مصنّفانہ زندگی میں کیا کیا تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ شروع میں قدیم رنگ کی محدود دینداری کا اظہار ہے چنانچہ "اسکات المعتدی" کا شور و غل سنائی دیتا ہے + پھر علی گڑھ میں جا کر اسلامی وسیع نظری پیدا ہوتی ہے۔ "صبحِ امید" میں امید افزائی ہے۔ "گذشتہ تعلیم" میں علم کے عملی نمونے ہیں۔ "المامون" میں اسلامی تمدّن کے علم و فضل کا خاکہ ہے۔ "الجزیہ" اور "کتب خانہ اسکندریہ" میں ثابت کیا ہے کہ اسلام میں انتظامی و ملکی و علمی بہبود کا خیال تھا وہ تنگ نظری نہ تھی جس کا الزام مخالفین نے اُس کے سر تھوپا ہے + "سیرۃ النعمان" میں دکھایا ہے کہ حنفیت کیسی عقل پسندی اور توسیعِ خیال پر مبنی ہے + "سفرنامہ" میں بتایا ہے کہ کون سے اسلامی ملک میں ابھی قدامت پسندی کا رنگ غالب ہے اور کہاں نئی زندگی کے آثار ہویدا ہو رہے ہیں + "رسائلِ شبلی" میں جا بجا اشارے ہیں کہ مسلمانوں نے گذشتہ زمانوں میں کیسے اُن علوم مثلاً میکینکس میں ترقی کی جو موجودہ مغربی تہذیب کا مابہ الامتیاز سمجھے جاتے ہیں۔ مدعا یہ ہے کہ آج کل کے مسلمانوں کو پھر ادھر توجہ کرنی چاہئے + اس دورِ تصنیف کی بلند ترین چوٹی الفاروق ہے جس پر زیادہ تر یہی اعتراض کیا گیا ہے کہ اُس میں گذشتہ زمانے کے ملکی مالی اور فوجی انتظامات کو حال کے مغربی ادارات کے ہم پلّہ ثابت کرنے کی مصنوعی کوشش کی گئی ہے + یہ تھا اُس انتہائی وسعتِ نظر کا نتیجہ جو اسلام کے دائرے میں رہ کر شبلی کو حاصل ہوئی + اس کے بعد خالص علمی دور ہے جب معقولات و فلسفۂ اسلام کی طرف رجوع ہوتا ہے۔ "علم الکلام" زیرِ ترتیب تھی کہ متکلمین کے حالات کے ضمن میں امام غزالی کے حالاتِ زندگی اس قدر بسیط ہوگئے کہ اُن کو پہلے ہی سے ایک کتاب

کی شکل میں یکجا پڑا۔ اس تاریخ "علم الکلام" کے بعد شبلی نے موجودہ زمانے کے اقتضا کے مطابق ایک جدید علم الکلام کی
عمارت کھڑی کر دی جس کے اندر رہ کر اُن کے نزدیک اسلام موجودہ متشککین اور مادیین کے حملوں سے محفوظ رہ
سکتا ہے + اس کے بعد کا دور ایک خالص ادبی دور ہے + "سوانح مولانا روم" کے دیباچے میں لکھا ہے کہ[1]

"سلسلۂ کلامیہ کا یہ چوتھا نمبر ہے۔ تین حصے (علم الکلام۔ الکلام۔ الغزالی) پہلے شائع ہو چکے ہیں۔
مولانا روم کو دنیا جس حیثیت سے جانتی ہے وہ فقر و تصوف ہے۔ اور اس لحاظ سے متکلمین کے سلسلہ
میں اُن کو داخل کرنا اور اس حیثیت سے اُن کی سوانح عمری لکھنا۔ لوگوں کو موجب تعجب ہوگا۔ لیکن ہمارے
نزدیک اصلی علمِ کلام یہی ہے کہ اسلام کے عقاید کی اس طرح تشریح کی جائے اور اس کے حقائق و معارف
اس طرح بتائے جائیں کہ خود بخود دل نشین ہو جائیں۔ مولانا نے جس خوبی سے اس فرض کو ادا کیا ہے مشکل سے
اُس کی نظیر مل سکتی ہے۔ اس لئے ان کو زمرۂ متکلمین سے خارج کرنا ناانصافی ہے"

اس طریقے سے علم سے ادب کی طرف رجوع کیا + چنانچہ اس کے بعد "موازنۂ انیس و دبیر" لکھا جس میں ادب کو علم
و فلسفہ سے مطلق کچھ سروکار نہیں۔ اس کتاب میں پہلے پہل ظاہر ہوا کہ شبلی نرے مورخ نہیں نرے فلسفی نہیں نرے
مذہبی مجتہد نہیں بلکہ اُن کو ادب کا صحیح مذاق ہے اور وہ جو ہمیشہ سے خود اردو فارسی کے منظومات میں تخلیق کا کام کرتے
رہے ہیں اب وہیں تنقید سے بھی عہدہ برا ہونا چاہتے ہیں + چنانچہ "شعر العجم" جو تاریخی حیثیت سے ایک ناقص کتاب
پکاری گئی ہے تنقیدی حیثیت سے ایک زبردست اور خیال انگیز تصنیف ہے جس کا وجود اردو ادب کے لئے
فی الحقیقت مایۂ ناز ہے +

آخری دور پھر ایک پاکیزہ و شستہ دین داری پر ختم ہوتا ہے جو "سیرۃ النبی" میں آئینہ ہے +

ہمہ گیری۔ شبلی کا ایک بڑا وصف اور اُن کی مصنفانہ عظمت کی اک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ ادب
کے مختلف النوع شعبوں پر تقریباً مساوی طور پر حاوی تھے + وہ عربی کے ایک جید عالم، فارسی کے ایک زبردست انشاپرداز،
اردو کے ایک شاندار مصنف تھے۔ عربی فارسی، اردو وہ تینوں زبانوں میں بآسانی تقریر و تحریر اور خط و کتابت کرتے
تھے۔ اردو مکاتیب کی جمع و اشاعت کے خیال کو تو عموماً انہوں نے ناپسندیدگی ہی کی نگاہ سے دیکھا۔ ہاں اپنے فارسی خطوط کی
ترتیب و تہذیب کا انہیں شوق تھا + اس کے ساتھ وہ تھوڑی سی انگریزی بھی جانتے تھے اور فرانسیسی زبان سیکھنے میں
بھی انہوں نے کچھ وقت اور محنت صرف کی + انہوں نے مختلف موضوعات پر مضامین اور رسالے اور کتابیں لکھیں +

اس حیثیت سے انہوں نے جو کچھ لکھا وہ سوائے الکلام اور موازنۂ انیس ودبیر اور منظومات کے سبھی ایک نقطۂ نظر سے تاریخی سرمایہ تھا وہ اول وبیشتر ایک مورخ ہی ہیں لیکن باعتبارِ موضوع نظر ڈالی جائے تو جو کچھ لکھا وہ بہت سے شعبوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے "گذشتہ تعلیم" زیادہ تر اسلامی مدارس اور قدیم تعلیم پر مشتمل ہے۔ اسی طرح اسلامی شفاخانے، اسلامی کتب خانے، ہیکلکس اور مسلمان، ہندوستان میں اسلامی حکومت، عبدالرحیم خان خاناں، ہمایوں نامہ، تزک جہانگیری، علامہ ابن تیمیہ کے مقالات تاریخی شذرات ہیں۔ حقوق الذمیین، جزیہ، تراجم، مسلمانوں کی علمی بے تعصبی، موبدانِ مجوس اور سلطنتِ تیموریہ، برج بھاشا اور مسلمان، کتب خانہ اسکندریہ میں مسلمانوں کے تعلقات دوسری قوموں سے دکھائے ہیں کہ وہ کیسے فراخ دل اور عالی نظر تھے۔ "اورنگ زیب عالمگیر" میں اس بادشاہ پر جو اعتراضات کی بھرمار ہے اُس کو روکنے کی کوشش کی ہے۔ "خطبہ" (مرقومہ ۱۸۹۵ء) میں ظاہر کیا ہے کہ مسلمان علما کے فرائض زمانۂ موجودہ کے لحاظ سے کیا ہیں اور اُن کو کیسے قوم کی حالت کو سنوارنا چاہیئے۔ "ابن رشد"، "معتزلہ اور اعتزال"، "منطقِ یونانی کی غلطیاں"، "علومِ جدیدہ"، فلسفیانہ ومتکلمانہ مضامین ہیں۔ "مبدء الاسلام" ایک مختصر سی "سیرت النبی" ہے جو شبلی نے عربی میں لکھی اور جس کا بعد میں فارسی اور اردو میں ترجمہ کیا گیا۔

یہ اُن کے بعض مختصر مضامین یا مقالات ہیں جو ایک کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں۔ "المامون"، "سیرۃ النعمان"، "الفاروق"، "سوانح مولانا روم"، "سیرۃ النبی"، "سوانح عمریاں ہیں اور تاریخ وسیرت کی کتابیں ہیں۔ لیکن اِن میں سیرۃ النعمان کو دوسری طرف فقہ سے تعلق ہے الغزالی کو علمِ کلام سے اور سوانحِ مولانا روم کو شعروادب سے "علم الکلام" تاریخی بھی ہے اور متکلمانہ بھی۔ الکلام اسلام کا جدید فلسفہ ہے۔ موازنۂ انیس ودبیر اور شعر العجم شعروادب سے متعلق ہیں اور تنقیدِ عالیہ کے قابلِ قدر نمونے ہیں۔ "سفرنامۂ روم ومصروشام" اور "مکاتیبِ شبلی" اور "خطوطِ شبلی" میں وہ ہمیں ایک معمولی انسان کی طرح چلتے پھرتے اور بولتے چالتے دکھائی سنائی دیتے ہیں۔

غرض شبلی صرف ایک مذہبی عالم ومصلح ہی نہ تھے بلکہ وہ ایک مورخ وسوانح نگار بھی ایک اسلامی فقیہ ومتکلم بھی ایک علمی وادبی نقّاد بھی ایک فارسی اردو کے فصیح شاعر بھی اور ایک بے تکلف آزاد رو انسان بھی تھے۔ اُن کی ہمہ گیری قابلِ غور ہے وہ محض تاریخ ومذہب کے سمندر کے پیراک ہی نہ تھے بلکہ شعروادب کی فضا کے ہواباز بھی تھے! لیکن جہاں ہمیں اس ہمہ گیری پر ایک نظر ڈالنی پڑتی ہے جہاں ہم مجبور ہوتے ہیں کہ شبلی کے ہر شعبۂ تصنیف پر ایک نظر ڈالیں وہاں ہمیں یہ بھی نہ بھول جانا چاہیئے کہ ہمیں اُن کی کتابوں اور مختلف تصانیف کو ایک سلسلے میں منسلک کرکے بھی دیکھنا چاہیئے کہ اُن کا مجموعی مدعا کیا تھا؟ جس طرح ایک کتاب کے مختلف ابواب اور فصلیں ہوتی ہیں اور اُن میں

ہے ہر ایک میں ایک کم و بیش جداگانہ موضوع پر بحث ہوتی ہے لیکن وہ سب مل کر ایک ہی کتاب کا جزو ہوتی ہیں اسی طرح ایک مصنّف کی مختلف کتابیں اُس کی شخصیت کے مختلف ابواب ہوتے ہیں جن کو الگ الگ اور یکے بعد دیگرے پڑھنے کے بعد ہم کو اُن پر ایک مجموعی نظر ڈالنی چاہئے کہ وہ ایک خاص مجموعہ کے اجزا ہیں اور وہ مجموعہ عبارت ہے اُس مصنّف یا اُس کی شخصیت سے + اگر ہم شبلی کی کتابوں کو مجموعی طور پر دیکھیں یا یوں کہئے کہ اگر ہم ان کو ایک مجموعے میں یا ایک کتاب کی صورت میں جمع کر کے اُس کو نامزد کرنا چاہیں تو ہم اس کا نام غالباً یہ رکھیں "مسلمان اور اُن کا علم وادب"۔ شبلی کی تصنیفات میں ہم اصلی اسلام کی ایک تصویر دیکھتے ہیں اُس کے تمدن میں اُس کے فلسفے میں اُس کے شعر وادب میں!

تصنیفات کی خصوصیات۔ شبلی کی تصنیفات کی خصوصیات کیا ہیں؟

مولوی محمد یحییٰ تنہا ایک جرمن مستشرق کی شبلی کے متعلق رائے نقل کر کے کہ اہل مغرب کے محققانہ اور عالمانہ معیار کے لحاظ سے اگر کوئی ہندوستانی تصانیف تحقیق وتدقیق کا پایہ رکھتی ہیں تو وہ علامہ شبلی کی تصانیف ہیں گو یہ ایک گونہ اسلامی رنگ لئے ہوتی ہیں" اور یہ قرار دے کر کہ مولوی چراغ علی سرسید اور مولانا حالی کی تصنیفات ان تمام خوبیوں سے بھری ہوئی ہیں، "شبلی کی تصنیفات وتالیفات پر یہ رائے قائم کرتے ہیں کہ[۱۳]

> بلاشبہ مولانا شبلی کی تصانیف بلحاظ عالمانہ استدلال وانداز کسی مستند یوروپی تصنیف سے کم نہیں۔ آپ کی کتابوں کی سب سے بڑی خصوصیت مضبوط رائے اور منطقی استدلال ہے۔ اُن میں ایک قسم کی جدت بھی ہے اور طرز ادا میں دل آویزی اور عام فہمی کا خیال ملحوظ رکھا گیا ہے۔ عالمانہ عبور، غور وخوض کی قوت، تجسس، درایت، علمی جانچ پرتال کی عادت، اپنی طبیعت سے کسی نتیجہ پر پہنچنا، پیچیدہ مسئلہ کو تیرہ وتاریک جھاڑیوں اور خارستان سے نکال کر سلجھانا اور پھر تقسیم وتحلیل کرنا، بعد ازاں اُسے اپنے طور سے ترتیب دینا کہ وہ فی اپنی اصلی حالت میں نظر آنے لگے یہ وہ باتیں ہیں جو مولانا شبلی کو درجۂ امتیاز بخشتی ہیں۔ اسی کے ساتھ مولانائے مرحوم میں ایک عجیب خوبی یہ ہے کہ قدیم وجدید میں ایسا پیوند لگاتے ہیں کہ مطلق اجنبیت باقی نہیں رہتی۔ معاملہ فہمی اور دور اندیشی بھی آپ کے خصائص میں سے ہے +
>
> آپ کی تصانیف کے مطالعہ سے دنیائے اسلام کی وسعت وعظمت اور خوبیوں اور ترقیوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ غیر اقوام پر ان کے پڑھنے سے اسلام کی حقیقی عظمت اور خوبیاں منکشف ہوجاتی ہیں۔ یہ کتابیں

[۱۳] سیر المصنفین جلد دوم ص ۲۲۵

سہل پسندی عام فہمی اور دلآویزی میں اپنی آپ نظیر ہیں +

آپ کا مذاقِ علمی مختلف پہلو رکھتا ہے - ایک طرف تو آپ سخت فلسفیانہ اور محققانہ پہلو لئے ہوئے ہیں دوسری طرف آپ بے حد نیچر پرست واقع ہوئے ہیں - آپ کی فارسی غزلیات سے جذباتِ لطیفہ درد و عشق اور حسن و جمال کا پتہ چلتا ہے +

لیکن جہاں ہم مولانائے مرحوم کی مقبولِ انام تصنیفات کے دلدادہ ہیں - وہاں اُن خیالات و آرا کا اظہار بھی ضروری ہے جو اربابِ نظر اُن کی کتابوں کے متعلق رکھتے ہیں +

چونکہ آپ کی کتابیں زیادہ تر سوانح عمریاں ہیں اور سوانح عمریاں بھی اکابرِ اسلام کی ہیں پس جن بزرگوں کے پاک ناموں کی ہمارے دلوں میں ضرورت سے زیادہ عزت و توقیر ہو اُن کی زندگی کے کارناموں کی نسبت ہمیں یہ کبھی خیال نہیں ہو سکتا کہ فی الواقع اُس زمانہ میں وہ انجام بھی دیئے گئے یا نہیں - مثلاً حضرتِ عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے حالاتِ زندگی الفاروق میں پڑھ کر یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ موجودہ زمانہ کی شائستگی اور اُس زمانہ کے تمدن میں کچھ زیادہ فرق نہ تھا - حالانکہ تیرہ سو سال کے عرصہ میں زمانہ نے ہر شعبۂ زندگی میں بے حد ترقی کی ہے - اور جو محکمے اور دفاتر موجودہ طرزِ حکومت کے لازمی عناصر ہیں کم و بیش وہ سب دربارِ خلافت کے ارکان پائے جاتے ہیں - جن کو درایت کبھی تسلیم نہیں کر سکتی "

پھر لکھتے ہیں کہ "شعر العجم پر بھی رسالہ اردو میں حافظ محمود خاں صاحب شیرانی کے اعتراضات شائع ہوئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا شبلی مرحوم نے کتابِ مذکور لکھنے میں کافی تحقیق و تدقیق سے کام نہیں لیا " پروفیسر شیرانی خصوصاً پروفیسر اقبال کے اکثر اعتراضات کے جوابات فروری ۲۴ء کے معارف میں سید سلیمان ندوی نے دیئے لیکن یہ تسلیم کیا کہ "ہمارے معترض پروفیسروں کی نگاہ کے سامنے ادبیاتِ ایران کا وہ پورا ذخیرہ موجود ہے جو یورپین مستشرقین نے اپنی تحقیق و کاوش سے پیدا کیا ہے اور جس پر علمائے مشرق کو عموماً دسترس حاصل نہیں " ساتھ ہی یہ بھی جتا دیا کہ بقولِ مہدی مرحوم "شعر العجم واقعات کی کھتونی نہیں بلکہ حسن و عشق کا صحیفہ ہے " اور مولانا شرر کی رائے (مطبوعہ دلگداز جون ۲۳ء) بھی نقل کر دی کہ "شبلی مرحوم کی شعر العجم پر ایک نہایت محققانہ ریویو نکل رہا ہے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اعتراضات تمام صحیح ہیں مگر یہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ خدا نے ان قابل ریویو نگاروں کو جتنا علم و فضل دیا ہے اتنا ہی ضبط و تحمل بھی عطا کرتا اور یہ کہ دنیا کی تحقیق صرف ایک مصنف کے قلم سے نہیں ہوتی تکمیل ہمیشہ ایک دوسرے کا نقد کرنے سے ہوتی ہے "

علمی تحقیق - یہ شعر العجم کا حال ہے لیکن شبلی نے بالعموم جس موضوع پر قلم اٹھایا اس کے متعلق بہت سے ماخذوں کی

چھان بین کی - اور پھر بصراحت دیباچہ میں یا کتاب میں جا بجا اُن کے حوالے دیئے تاکہ ہر بیان کسی نہ کسی ثبوت پر مبنی نظر آئے ؛ مثلاً سیرۃ النعمان کے دیباچے میں یہ لکھ کر کہ " امام ابو حنیفہ کو اسلام میں جو رتبہ حاصل ہے اُس کا اندازہ اِس سے ہو سکتا ہے کہ جس کثرت سے اُن کی سوانح عمریاں لکھی گئیں کسی کی نہیں لکھی گئیں " اور پھر ۲۵ ایسی سوانح عمریوں کا بہ تفصیل نام کتاب ، نامِ مصنف و کیفیت ذکر کر کے لکھتے ہیں کہ افسوس ہے کہ یہ کتابیں ہمارے ملک میں ناپید ہیں ؛ انہوں نے اِن میں سے تین کتابوں کا مطالعہ کیا اور لکھا کہ " عقودُ الجمان جو نہایت جامع اور مفصل کتاب ہے میری تالیف کا عام ماخذ ہے " ؛ پھر تصریح کی کہ " امام ابو حنیفہ کے حالات میں تصنیف تو مجھ کو ایک ہی مل سکی لیکن رجال و تاریخ کی مستند کتابیں جن میں امام کا ذکر ہے اکثر میری نظر سے گذریں " یہاں نو کتابوں کا خاص طور پر ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ " میری کتاب کا پہلا حصہ جس میں امام ابو حنیفہ کے عام حالات ہیں انہیں تصنیفات سے ماخوذ ہے لیکن دوسرا حصہ جس میں امام صاحب کی طرز اجتہاد و اصولِ استنباط سے بحث ہے ، اُس کے لئے یہ تمام دفتر بے کار تھا کیونکہ قدیم زمانہ میں سوانح عمریوں کا یہ ڈھنگ ہی نہ تھا کہ حالاتِ زندگی کے ساتھ اس شخص کی تصنیفات یا مسائل سے بھی بحث کرتے " ؛ پھر مثالیں دے کر اس بات کو واضح کیا ہے ؛ پھر بتا کر کہ امام صاحب کی زندگی کے مختلف یعنی تاریخی اور محدثانہ اور مجتہدانہ حصے ہیں صاف صاف بنا دیا ہے کہ " اس کتاب میں میں نے اُن مختلف حیثیتوں کا لحاظ رکھا ہے جو حالات تاریخ سے متعلق ہیں اُن میں شہادتیں کافی سمجھی ہیں جو عام مورخوں کے نزدیک مسلّم ہیں جو واقعہ محدثانہ پہلو رکھتا ہے اس میں زیادہ تر تدقیق کی ہے اور تمام تر اُن اصول سے کام لیا ہے جو محدثین نے اخبار و روایت کے لئے قرار دیئے ہیں عام ناظرین کو شاید ان بحثوں میں مزا نہ آئے مگر ایسے ضروری حصے کو میں کیونکر چھوڑ سکتا تھا عام تاریخی واقعات میں گو روایۃ حدیث کی طرح بال کی کھال نہیں نکالی ہے - تاہم کوئی ایسا واقعہ نہیں لکھا جس کی سند موجود نہ ہو - ساتھ ہی اِس کا التزام کیا ہے کہ ایسی کتاب کا حوالہ نہ دیا جائے جو خود میری نظر سے نہ گذری ہو - کیونکہ نقل در نقل ہو کر اکثر روایتیں اپنی حالت پر قائم نہیں رہتیں - اِن احتیاطوں کے ساتھ بھی ممکن بلکہ ضروری ہے کہ مجھ سے مسامحات اور غلطیاں ہوئی ہوں - لیکن میں اس سے زیادہ اور کیا کر سکتا تھا - وَقَالَ اللّٰہُ تَعَالیٰ لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا "[۱۴۳]

اسی طرح " الغزالی " کے دیباچے میں یہ لکھ کر کہ امام غزالی کی سوانح عمری میں کوئی مستقل کتاب تو غالباً لکھی نہیں گئی لیکن رجال اور تراجم کی کتابوں میں عموماً ان کے حالات کسی قدر تفصیل کے ساتھ مذکور ہیں (یہاں دو کتابوں کا خاص ذکر کیا ہے) پھر لکھا ہے کہ امام صاحب اس رتبے کے شخص تھے کہ ایک مدت تک اُن کی تصانیف کا یورپ میں چرچا رہا بعض کتابیں خاص امام صاحب کی تصنیفات کے متعلق لکھی گئیں ان میں سے دو تصنیفیں میرے پاس موجود ہیں -

---

[۱۴۳] سیرۃ النعمان ص ۱۳ -

(یہاں اِن کتابوں کا ذکر ہے) پہلی کتاب جرمن زبان میں تھی اس لئے مَیں اُس سے فائدہ نہیں اٹھاسکا۔ دوسری کتاب سے (یہ فرانسیسی میں ہے) میں نے فائدہ اٹھایا ہے اور جابجا اس کے حوالے دئیے ہیں" (چنانچہ دیکھو الغزالی امام صاحب کی تصنیفات اور یورپ۔ فٹ نوٹ صفحہ ۵۴)

شبلی نے اپنی اکثر کتابوں میں یہ التزام رکھا ہے کہ جابجا صفحات کے نیچے فٹ نوٹ دے کر ماخذوں کے حوالے دئیے ہیں اور متعدد مقامات پر بعض جگہ اتنی کہ سہل انگار کتاب خواں گھبرا جائے ان ماخذوں سے مفصل بحث کی ہے + لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایک محقق یا نکتہ بین کے لئے شبلی کی تصنیفات کے یہی حصے بے انتہا دلچسپ اور سبق آموز ہیں + مثلاً ماخذوں کی چھان بین کے سلسلے میں جو ۲۲ صفحے الفاروق میں اور ۵۰ صفحے سیرۃ النبی کے شروع میں محققین کے سامنے پیش کئے گئے ہیں وہ علاوہ سودمند ہونے کے دلچسپ استدلالات اور دلکش بیانات سے لبریز ہیں + الفاروق میں پہلے قدما کی تصنیفات کا مفصل ذکر کیا ہے۔ طبقاتِ ابنِ سعد اور انساب الاشراف کا ذکر کر کے بتایا ہے کہ ان کے قلمی نسخے اُن کی نظر سے گزرے ہیں + پھر متاخرین (مثلاً ابن الاثیر۔ ابوالفدا سیوطی وغیرہ) کا ذکر کر کے لکھا ہے کہ "ان لوگوں نے تاریخ کے ساتھ من حیث الفن کوئی احسان نہیں کیا قدما کی جو خصوصیات تھیں کھو دیں اور خود کوئی نئی بات پیدا نہیں کی" پھر ابنِ خلدون اور اُس کے شاگرد علامۂ مقریزی کو اس عام نکتہ چینی سے مستثنیٰ قرار دیا ہے + اور بتادیا ہے کہ "بہرحال الفاروق کی تالیف کے لئے جو سرمایہ کام آسکتا تھا وہ یہی قدما کی تصنیفات تھیں" + اس کے بعد تاریخ اور فنِ تاریخ پر ایک زبردست مقالہ سپردِ قلم کیا ہے۔ اس کے ضمن میں تاریخ کی دو تعریفیں نقل کر کے لکھا ہے[عله] کہ

> "ان تعریفات کی بنا پر تاریخ کے لئے دو باتیں لازمی ہیں + ایک یہ کہ جس عہد کا حال لکھا جائے اس زمانے کے ہر قسم کے واقعات قلمبند کئے جائیں یعنی تمدن، معاشرت، اخلاق، عادات، مذہب، ہر چیز کے متعلق معلومات کا سرمایہ مہیا کیا جائے۔ دوسرے یہ کہ تمام واقعات میں سبب اور مسبب کا سلسلہ تلاش کیا جائے + قدیم تاریخوں میں یہ دونو چیزیں مفقود ہیں۔ رعایا کے اخلاق و عادات اور تمدن و معاشرت کا سرے سے ذکر ہی نہیں آتا۔ فرماں روائے وقت کے حالات ہوتے ہیں لیکن ان میں بھی فتوحات اور خانہ جنگیوں کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ یہ نقص اسلامی تاریخوں تک محدود نہیں بلکہ کل ایشیائی تاریخوں کا یہی انداز تھا اور ایسا ہونا مقتضائے اسباب تھا"

واقعات کی صحت کے معیار کے متعلق لکھتے ہیں کہ واقعات کے جانچنے کے صرف دو طریقے ہیں روایت و درایت + پھر ان کی تعریف کر کے لکھا ہے کہ اس امر پر مسلمان بے شبہ فخر کر سکتے ہیں کہ روایت کے فن کے ساتھ انہوں نے جس

[عله] الفاروق جلد اول ص ۱۱

قدر اعتنا کیا کسی قوم نے نہیں کیا تھا، انہوں نے ہر قسم کی روایتوں میں مسلسل سند کی جستجو کی اور راویوں کے حالات اس تفحص اور تلاش سے بہم پہنچائے کہ اُس کو ایک مستقل فن بنا دیا جو فنِ رجال کے نام سے مشہور ہے۔ یہ توجہ اور اہتمام اگرچہ اصل میں احادیثِ نبوی کے لئے شروع ہوا تھا لیکن فنِ تاریخ بھی اس سے محروم نہ رہا۔ طبری فتوح البلدان طبقاتِ ابنِ سعد وغیرہ میں تمام واقعات بسندِ متصل مذکور ہیں۔ یورپ نے فنِ تاریخ کو کمال کے درجے پر پہنچا دیا ہے لیکن اِس خاص امر میں وہ مسلمان مورخوں سے بہت پیچھے ہیں"۔ اس سلسلے میں سیرۃ النبی میں لکھتے ہیں کہ "اس سے زیادہ کیا عجیب بات ہوسکتی ہے کہ آنحضرت کے افعال اور اقوال کی تحقیق کی غرض سے آپ کے دیکھنے والوں اور ملنے والوں میں سے تقریباً تیرہ ہزار شخصوں کے نام اور حالات قلمبند کئے گئے اور اُس زمانے میں کئے گئے جب تصنیف و تالیف کا آغاز تھا۔ کیا دنیا میں کسی شخص کے رفقا میں سے اتنے لوگوں کے نام اور حالات درج تحریر ہوسکتے ہیں"۔ قدما نے یہ ذخیرہ کس طرح مہیا کیا۔ لکھنے کے فن نے کیونکر رواج پایا اس کے متعلق بعض دلچسپ واقعات درج کئے گئے ہیں۔ فنِ روایت کے سلسلے میں جہاں اسماء الرجال (بیوگرافی) کا ذکر ہے وہاں لکھا ہے کہ ان تحقیقات کے ذریعہ سے اسماء الرجال (بیوگرافی) کا وہ عظیم الشان فن تیار ہوگیا جس کی بدولت آج کم ازکم لاکھ شخصوں کے حالات معلوم ہوسکتے ہیں اور اگر ڈاکٹر اسپرنگر کے حسنِ ظن کا اعتبار کیا جائے تو یہ تعداد پانچ لاکھ تک پہنچ جاتی ہے"۔ ملاحظہ ہو کہ شبلی نے محض مشہور جرمن عربی دان کا قول نقل نہیں کردیا بلکہ اُسے بیان کرکے گویا اُس رائے پر صاد کرنے سے صاف طور پر احتراز کیا ہے جو اُن کے نزدیک پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچ سکتی۔ درایت کے اصول کے تحت میں روایتوں کے ناقابلِ اعتبار ہونے کی جو مثالیں نقل کی ہیں وہ نہایت دلچسپ ہیں۔ مثلاً یہ حدیث کہ تین چیزیں نظر کو ترقی دیتی ہیں سبزہ زار آبِ رواں اور خوبصورت چہرے کا دیکھنا یا کہ فلاں سنہ اور فلاں تاریخ میں یہ واقعہ پیش آئے گا یا یہ کہ مسلمان شیریں ہوتا ہے اور شیرینی کو پسند کرتا ہے یا کہ دنیا کی عمر سات ہزار برس کی ہے وغیرہ وغیرہ۔ فنِ سیرۃ کے تبصرہ میں سیرۃ ابن اسحاق واقدی ابن سعد اور طبری کا ذکر کرکے لکھتے ہیں "اس بنا پر مجموعی حیثیت سے سیرۃ کا ذخیرہ کتبِ حدیث کا ہم پلہ نہیں البتہ اِن میں سے تحقیق و تنقید کے معیار پر جو اتر جائے وہ حجت اور استناد کے قابل ہے"۔ اس معیار کے اندازہ میں جن اصولوں کو قائم کیا ہے اُن میں سے ایک یہ ہیں "یہ لحاظ رکھنا ضرور ہے کہ واقعہ کی نوعیت کے بدلنے سے شہادت اور روایت کی حیثیت کہاں تک بدل جاتی ہے"۔ "سب سے اہم اور سب سے زیادہ قابلِ بحث یہ بات ہے کہ راوی جو واقعہ بیان کرتا ہے اُس میں کس قدر حصہ اصل واقعہ ہے اور کس قدر راوی کا قیاس ہے"۔ آگے چل کر لکھتے ہیں "اکابر صحابہ میں ایسے لوگ بھی تھے جو روایت کو باوجود راوی کے ثقہ ہونے کے اِس بنا پر تسلیم نہیں کرتے تھے

کہ وہ دلائلِ عقلی یا نقلی کے خلاف ہے۔"

اخیر میں یورپین تصنیفات کے نقائص کی وجوہ بیان کر کے اپنے "اصولِ تصنیف و ترتیب" کے تحت میں لکھتے ہیں [۱۵]

ہم نے اس کتاب میں جو اصول اختیار کئے ہیں اب اُن کے بتلانے کا وقت آگیا ہے۔

(۱) سب سے پہلے یہ کہ سیرت کے واقعات کے متعلق جو کچھ قرآنِ مجید میں مذکور ہے اُس کو سب پر مقدم رکھا ہے۔ یہ قطعاً ثابت ہے کہ بہت سے واقعات کے متعلق خود قرآنِ مجید میں ایسی تصریحات یا اشارے موجود ہیں جن سے اختلافی مباحث کا فیصلہ ہو جاتا ہے۔ لیکن لوگوں نے آیاتِ قرآنی پر اچھی طرح نظر نہیں ڈالی اس لئے وہ مباحث غیر منفصل رہ گئے (۲) قرآنِ مجید کے بعد حدیث کا درجہ ہے۔ احادیثِ صحیحہ کے سامنے سیرت کی روایتیں نظر انداز کر دی ہیں۔ جو واقعات بخاری و مسلم وغیرہ میں مذکور ہیں، اُن کے مقابلہ میں سیرت یا تاریخ کی روایت کی کوئی ضرورت نہیں، اربابِ سیر کو ایک بڑی غلطی یہ ہوئی کہ وہ واقعات کو کتبِ حدیث میں اُن موقعوں پر ڈھونڈتے ہیں جہاں عنوان اور مضمون کے لحاظ سے اُن کو درج ہونا چاہئے۔ اور جب اُن کو اِن موقعوں پر کوئی روایت نہیں ملتی تو وہ کم درجہ کی روایتوں کو لے لیتے ہیں لیکن کتبِ حدیث میں ہر قسم کے نہایت تفصیلی واقعات ضمنی موقعوں پر روایت میں آجاتے ہیں۔ اس لئے اگر عام استقراء اور تفحص سے کام لیا جائے تو تمام اہم واقعات میں صحاحِ ستہ کی روایتیں مل جاتی ہیں۔ ہماری اس کتاب کی بڑی خصوصیت یہی ہے کہ اکثر تفصیلی واقعات ہم نے حدیث ہی کی کتابوں سے ڈھونڈ کر مہیا کئے جو اہلِ سیر کی نظر سے بالکل اوجھل رہ گئے تھے (۳) روزمرہ اور عام واقعات میں ابن سعد، ابن ہشام اور طبری کی عام روائتیں کافی خیال کی ہیں لیکن جو واقعات کچھ بھی اہمیت رکھتے ہیں اُن کے متعلق تنقید اور تحقیق سے کام لیا ہے اور تا امکان کد و کاوش کی ہے اس خاص ضرورت کے لئے ہم نے پہلا کام یہ کیا ہے کہ ابن ہشام، ابن سعد اور طبری کے تمام رواۃ کے نام الگ انتخاب کر لئے جن کی تعداد سینکڑوں سے متجاوز ہے۔ پھر اسماء الرجال کی کتابوں سے اُن کی جرح و تعدیل کا نقشہ تیار کیا تاکہ جس سلسلۂ روایت کی تحقیق مقصود ہو بہ آسانی ہو جائے۔ (۴) جن فروگزاشتوں کی تفصیل اوپر گزر چکی ہے جہاں تک ممکن تھا ان کی اصلاح اور تلافی کی ہے۔

---

[۱۵] سیرۃ النبی جلد اول صفحہ ۷۲۔

شبلی کو علمی تحقیق کا اس قدر شوق تھا کہ روم و مصر و شام کا سفر اختیار کرنے کی بڑی وجہ اسلامی مذہبی اور خصوصاً تاریخی کتب کی تلاش تھی۔ سفرنامہ میں جہاں قسطنطنیہ کے کتب خانوں کا ذکر ہے وہاں اُن کی پانچ خصوصیتیں گنوائی ہیں جن میں ایک یہ ہے کہ "فنِ تاریخ و ادب میں بعض ایسی تصنیفات دیکھیں جن میں وہ جدت ہے جس کو میں مدت سے تلاش کرتا تھا اور یورپ کی تصنیفاتِ حال کے سوا اس قسم کی طرزِ تصنیف کا کہیں پتہ نہ لگتا تھا" اور ایک یہ کہ "مشہور حکما اور ائمۂ فن کی کتابیں جس کثرت سے یہاں موجود ہیں اَور کہیں نہیں مل سکتیں۔ امام غزالی بوعلی سینا، فخر رازی، فارابی کی وہ کمیاب تصنیفات جن کے نام صرف ابنِ خلکان وغیرہ کے ذریعہ سے معلوم ہیں اکثر یہاں موجود ہیں" + اس تحقیق کے ساتھ عقل و درایت کے اصولوں پر برابر عمل ہے چنانچہ سوانحِ مولانا روم میں مولانا سے شمس تبریزی کی ملاقات کے ذکر میں جو حکایتیں نقل کی ہیں مثلاً یہ کہ جب شمس تبریزی نے مولانا کی کتابوں کی طرف اشارہ کر کے پوچھا کہ یہ کیا ہے اور انہوں نے کہا کہ یہ وہ چیز ہے جس کو تم نہیں جانتے اور یہ کہنا تھا کہ دفعتہً کتابوں میں آگ لگ گئی وغیرہ وغیرہ ان حکایتوں کے متعلق لکھتے ہیں کہ اگرچہ ان میں سے بعض نہایت مستند کتابوں میں ہیں لیکن ایک بھی صحیح نہیں نہ صرف اس وجہ سے کہ خارج از قیاس ہیں بلکہ اس لئے کہ جیسا کہ آگے آتا ہے صحیح روایت کے خلاف ہیں + اسی طرح ہیجو خاں کی فوج کے آگے مولانا کے مصلا بچھا کر ڈٹ جانے اور باوجود تیروں وغیرہ کی بوچھاڑ کے زخمی نہ ہونے کو محض خوش اعتقادی کے حاشیے کہتے ہیں +

مضبوطیٔ رائے ۔اُن کی مضبوطیٔ رائے اور استدلال کا اندازہ غزوۂ بدر پر اُن کی محققانہ نظر سے ہوتا ہے جہاں سوال یہ درپیش ہے کہ غزوۂ بدر کا مقصد کاروانِ تجارت کو لوٹنا تھا یا قریش کے حملے کا دفاع۔ لکھتے ہیں کہ اِس بات کا مجھ کو خوف نہیں کہ اس فیصلہ میں عام مورخین اور ارباب سیر میرے حریف مقابل ہیں۔ نہایت جلد نظر آجائے گا کہ حق اکیلا تمام دنیا پر فتح پا سکتا ہے۔ پھر تمام واقعہ کو بیان کر کے یوں استدلال کرتے ہیں کہ اس سے پہلے آنحضرت نے قریش کے قافلوں پر حملہ کرنے کے لئے جس قدر سرایا بھیجے اُن میں کبھی کسی انصاری کو نہیں بھیجا۔ اس بنا پر اگر اس دفعہ بھی مدینہ سے نکلنے کے وقت صرف قافلۂ تجارت پر حملہ کرنا مقصود ہوتا تو انصار ساتھ نہ ہوتے + علاوہ بریں چونکہ مدینے سے مکّے تک کے قبائل قریش کے زیر اثر تھے اور مدینے سے شام تک کے حدود تک قریش کا اثر نہ تھا اس بنا پر اگر قافلہ تجارت پر حملہ کرنا مقصود ہوتا تو یہ بالکل خلافِ قیاس ہے کہ کاروانِ تجارت شام سے آ رہا ہے اور مسلمان بجائے اس کے کہ شام کی طرف بڑھیں پانچ منزل مکّے کی طرف بڑھ جاتے ہیں + پھر واقعات بالترتیب درج کر کے لڑائی کا اصلی سبب یہ بتایا ہے کہ ایک سریہ میں قریش کے ایک حلیف کا قتل وقوع میں آیا تھا جس سے

یہ سارا سلسلۂ جنگ چھڑ گیا۔ الفاروق میں آنحضرت کی وفات کے بعد سقیفہ بنی ساعدہ کے واقعات کے سلسلے میں جہاں حضرت ابو بکر و عمر کے چلن کو ملکی مفاد کے اعتبار سے سراہا ہے وہاں حضرت عمر کی تندی اور تیز مزاجی کا ذکر بھی کیا ہے۔ اسی کتاب کے حصۂ دوم میں فتوحات پر ایک اجمالی نگاہ ڈالتے ہوئے جہاں یورپین مورخین کی رائے کے مطابق اسلامی فتوحات کے بیان کردہ اسباب کو مسترد کیا ہے وہاں بعد میں فتوحات کے اصلی سبب کو کس قدر اصابت رائے سے بیان کیا ہے کہ ہمارے نزدیک اس سوال کا اصلی جواب صرف اس قدر ہے کہ مسلمانوں میں اُس وقت بانیٔ اسلام کی بدولت جو جوش عزم استقلال ہمت بلند حوصلگی دلیری پیدا ہوگئی تھی اور جس کو حضرت عمر نے اور زیادہ قوی اور تیز کر دیا تھا روم و فارس کی سلطنتیں عین عروج کے زمانے میں بھی اُس کی ٹکر نہیں اٹھا سکتی تھیں۔ پھر تین اور اسباب کا بھی ذکر کیا ہے۔

صدق گوئی۔ شبلی کو اعترافِ صداقت سے کبھی عمداً گریز نہیں۔ غزوات پر دوبارہ نظر ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ "اسباب ایسے جمع ہیں کہ اس قسم کی غلطیوں پر نہ صرف دوستوں کو بلکہ دشمنوں کو بھی معذور رکھ سکتے ہیں۔" امام غزالی کی شہرۂ آفاق تصنیف احیا العلوم کا ابن مسکویہ کی کتاب تہذیب الاخلاق سے موازنہ کرتے ہوئے اُن کی عبارتیں (جو لفظاً و معناً مطابق ہیں) بالمقابل نقل کر کے لکھتے ہیں کہ "ناظرین کو اختیار ہے کہ اس کو توارد قرار دیں یا نقل یا اقتباس۔" الغزالی کے اخیر میں امام غزالی کی تصنیفات پر جو بعض نہایت سخت اعتراضات ہیں اُن کو بتمامہا نقل کیا ہے پھر لکھا ہے کہ اخیر میں اس بات کا اعتراف بھی کرنا ضرور ہے کہ امام صاحب کی بعض تصنیفات میں واقعی بعض باتیں مواخذہ کے قابل ہیں۔ مثلاً احیاء العلوم میں احادیث کے نقل کرنے میں نہایت بے احتیاطی کی ہے۔ بزرگانِ سلف کے متعلق جو واقعات لکھے ہیں اکثر دُور از کار اور بعید از عقل ہیں۔" مصنف کا آخری فیصلہ یہ ہے کہ "بہرحال امام صاحب امام تھے پیغمبر نہ تھے۔" مامون کے ملکی کارناموں اور علمی تذکروں کو فخریہ بیان کرنے کے بعد سیرت نگار نے اُس کی عشرتوں اور عیاشیوں کا بھی صاف صاف ذکر کر دیا ہے کہ اِن کا اُسے چسکا پڑ گیا تھا۔ سوانحِ مولانا روم میں یہ لکھ کر کہ تمام اہلِ تذکرہ متفق ہیں کہ جن لوگوں نے غزل کو غزل بنایا وہ شیخ سعدی عراقی اور مولانا روم ہیں اعتراف کیا ہے کہ اس امر سے انکار نہیں ہو سکتا کہ غزل کو ترقی دینے والوں کی فہرست سے مولانا کا نام خارج نہیں کیا جا سکتا لیکن انصاف یہ ہے کہ غزل گوئی کی حیثیت سے مولانا کا سعدی اور عراقی کے ساتھ مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔" ساتویں صدی ہجری کے فحش و بدتہذیبی کا ذکر کر کے لکھا ہے کہ شیخ سعدی اس زمانے کے اخلاقی ریفارمر ہیں لیکن گلستان کے بابِ پنجم میں خود ایسی حکایتیں لکھی ہیں جو آج کسی مہذب آدمی کی زبان سے ادا نہیں ہو سکتیں۔ مولانا روم کی مثنوی "ہست قرآں در زبانِ پہلوی"

(۱) انسان کی تمام ترقیوں کی پہلی بنیاد یہ ہے کہ وہ خیال کرے کہ وہ اصلی ترین مخلوقات ہے اور تمام کائنات میں جو کچھ ہے وہ اِسی لئے ہے کہ انسان اِس سے تمتع اٹھائے +

(۲) انسان کی تمام ترقیوں کی بنیاد یہ ہے کہ اُس کو یہ یقین ہو کہ اس کے خیر و شر ترقی اور تنزل عروج اور زوال کا مدار تمام تر اُس کی سعی اور کوشش پر ہے اور دنیا اور دین کی تمام کامیابیاں محض اُس کی کوششوں پر موقوف ہیں +

(۳) تمدن کی ترقی کا سب سے بڑا اصول مساوات کا اصول ہے یعنی یہ کہ تمام انسانوں کے حقوق

قی کا بہت بڑا ذریعہ اور ترقیِ تمدن کی بہت بڑی علامت مذہبی نفرت اور مذہبی جبر

ن کے بڑے اسباب میں سے ایک یہ ہے کہ عورتوں اور مردوں کے حقوق برابر قائم کئے جائیں +

ؤم کی ترقی کا ایک بڑا اصول یہ ہے کہ اُس کے ہر فرد کو من حیث القوم سلف آنریعنی اپنی

کا خیال دلایا جائے +

قی کا مقدم ترین اصول علم ہے +

، ترقی کا ایک بڑا اصول یہ ہے کہ نظامِ حکومت جمہوریت کی بنا پر قائم کیا جائے +

(۹) ترقی کا بڑا اصول یہ ہے کہ تقسیم عمل کے اصول پر کام کیا جائے یعنی ہر فرقہ ایک خاص کام میں مشغول ہو تاکہ اس کام کو بوجہ خصوصیت کے نہایت اعلیٰ درجہ تک ترقی دے سکے۔

(۱۰) ہر زمانہ میں ایک گروہ ایسا ہوتا آیا ہے جس کی یہ رائے ہے کہ انسانوں کے افراد میں جو اختلاف مراتب ہے یہ مٹا دیا جائے +

(۱۱) ترقی کا بڑا اصول یہ ہے کہ علمی ترقی کی کوئی انتہا نہ قرار دی جائے یعنی انسان ترقی کی کسی حد تک پہنچ کر قانع نہ ہو اور یہ خیال رکھے کہ ابھی ترقی کے اور منازل طے کرنے باقی ہیں +

ہر اصول کو بیان کرکے قرآنِ مجید کی آیتوں سے صاف صاف ثابت کر دیا ہے کہ اسلام عین اِن اصولوں کے مطابق ہے بلکہ ان میں سے اکثر کا بانی مبانی اسلام ہی ہے + علامہ ابن حزم کی مشہور کتاب الملل والنحل پر بحث کرکے اخیر میں کہتے ہیں کہ اس کتاب میں بعض خیالات بالکل جدید ہیں مثلاً ابن حزم کا دعوے ہے کہ عورتیں پیغمبر ہو سکتی ہیں عام

لیکن کنیزک اور خاتون کا قصہ جعفر زٹلی کے نامۂ اعمال میں داخل کرنے کی چیز ہے"۔ قسطنطنیہ پر یورپی اثر کا ذکر کر کے لکھتے ہیں "حقیقت یہ ہے کہ صفائی اور خوش سلیقگی آج کل یورپ کا خمیر بن گیا ہے" (سفرنامہ) + ابن رشد کے حالات میں لکھا ہے کہ "یورپ کی یہ فیاض دلی رشک کے قابل ہے کہ ایک طرف تو مذہبی اختلافات کی بنا پر مسلمانوں کے خون کا پیاسا تھا لیکن دوسری طرف اُس نے بے تکلف مسلمانوں کے خوانِ کرم سے زلّہ ربائی شروع کر دی" + موازنۂ انیس و دبیر میں یہ کہہ کر کہ "اکثر صنائع و بدائع شاعری اور انشا پردازی کا دیباچۂ زوال ہیں" لکھتے ہیں کہ میرے ایک معزز دوست نے خود میر انیس سے پوچھا کہ آپ لفظی رعایتوں اور صنائع و بدائع کو پسند کرتے ہیں۔ انھوں نے جواب دیا کہ نہیں لیکن آخر لکھنؤ میں رہنا ہے تاہم میر انیس نے یہ کیا کہ جو صنعتیں محض لغو تھیں وہ نہایت کم برتیں" + اس بات کو ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ دبیر نے انیس کے مرثیوں کا سرقہ کیا لیکن جب ثابت نہیں ہو سکتا تو ضروری معلومات ہاتھ نہ آسکنے پر صاف کہہ دیا ہے کہ افسوس ہے کہ باوجود بہت سی جد و جہد کے اس بارہ میں مجھ کو کچھ کامیابی نہیں ہوئی"+

آزادگی ۔ شبلی کی آزادگی اور آزادمنشی باوجود اُن کے زہد و تقویٰ کے جا بجا اُن کی تصنیفات میں مترشح ہے+ "الکلام" میں لکھتے ہیں "بے شبہ اگر مذہب اسی چیز (یعنی علم اور حقیقت کے خلاف ہونے) کا نام ہے تو وہ سائنس کے مقابلہ میں کسی طرح نہیں ٹھہر سکتا لیکن اسلام نے پہلے ہی دن کہہ دیا تھا کہ انتم اعلم بامور دنیاکم (یعنی تم لوگ دنیا کی باتیں خود خوب جانتے ہو)" + "انبیا کی تعلیم و ہدایت کا طریقہ بتاتے ہوئے (ص ۱۰۵) شاہ ولی اللہ صاحب کے ضروری الذکر اصولوں میں پہلا یہ بیان کرتے ہیں کہ "اُن کی (یعنی انبیا کی) طرزِ تعلیم اور طریقۂ ہدایت میں عوام کا پہلو زیادہ ملحوظ ہوتا ہے البتہ ہر جگہ ضمن میں ایسے الفاظ موجود ہوتے ہیں جن سے اصل حقیقت کی طرف اشارہ ہوتا ہے اور جس کے مخاطب خواص ہوتے ہیں"+ پانچواں اصول یہ ہے کہ "شریعت کا ایک حصہ خاص خاص قوموں یا ملکوں کے مصالح اور فوائد پر مبنی ہوتا ہے + آخری اصول کے ضمن میں یہ منقول ہے کہ "اس بنا پر اس سے بہتر اور آسان کوئی اور طریقہ نہیں کہ شعار تعزیرات اور انتظامات میں خاص اس قسم کی عادات کا لحاظ کیا جائے جن میں یہ امام پیدا ہوا ہے۔ اس کے ساتھ آنے والی نسلوں پر اُن احکام کے متعلق چنداں سخت گیری بھی نہ کی جائے"+ اسلام کو تمدنی ترقی کا موید ثابت کرنے کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ[۵۱۶]

"یورپ کے تمدن کے مہمات اصول حسبِ ذیل عنوان میں محدود کئے جاسکتے ہیں اور دنیا میں جب کبھی کسی قوم نے تمدن میں ترقی کی ہوگی یا آئندہ کرے گی تو انہی اصول پر کی ہوگی اور کرے گی۔

---

[۵۱۶] الکلام جلد دوئم ص ۲۲۴

(۱) انسان کی تمام ترقیوں کی پہلی بنیاد یہ ہے کہ وہ خیال کرے کہ وہ اصلی ترین مخلوقات ہے اور تمام کائنات میں جو کچھ ہے وہ اِسی لئے ہے کہ انسان اِس سے تمتع اٹھائے +

(۲) انسان کی تمام ترقیوں کی بنیاد یہ ہے کہ اُس کو یہ یقین ہو کہ اس کے خیر و شر ترقی اور تنزل عروج اور زوال کا مدار تمام تر اُس کی سعی اور کوشش پر ہے اور دنیا اور دین کی تمام کامیابیاں محض اُس کی کوششوں پر موقوف ہیں +

(۳) تمدن کی ترقی کا سب سے بڑا اصول مساوات کا اصول ہے یعنی یہ کہ تمام انسانوں کے حقوق مساوی ہیں۔

(۴) تمدن کی ترقی کا بہت بڑا ذریعہ اور ترقیِ تمدن کی بہت بڑی علامت مذہبی نفرت اور مذہبی جبر کا دور کرنا ہے +

(۵) ترقیِ تمدن کے بڑے اسباب میں سے ایک یہ ہے کہ عورتوں اور مردوں کے حقوق برابر قائم کئے جائیں +

(۶) کسی قوم کی ترقی کا ایک بڑا اصول یہ ہے کہ اُس کے ہر فرد کو من حیث القوم سلف آثر یعنی اپنی آپ عزت کا خیال دلایا جائے +

(۷) ترقی کا مقدم ترین اصول علم ہے +

(۸) ترقی کا ایک بڑا اصول یہ ہے کہ نظامِ حکومت جمہوریت کی بنا پر قائم کیا جائے +

(۹) ترقی کا بڑا اصول یہ ہے کہ تقسیم عمل کے اصول پر کام کیا جائے یعنی ہر فرقہ ایک خاص کام میں مشغول ہو تاکہ اس کام کو بوجہ خصوصیت کے نہایت اعلیٰ درجہ تک ترقی دے سکے۔

(۱۰) ہر زمانہ میں ایک گروہ ایسا ہوتا آیا ہے جس کی یہ رائے ہے کہ انسانوں کے افراد میں جو اختلاف مراتب ہے یہ مٹا دیا جائے +

(۱۱) ترقی کا بڑا اصول یہ ہے کہ علمی ترقی کی کوئی انتہا نہ قرار دی جائے یعنی انسان ترقی کی کسی حد تک پہنچ کر قانع نہ ہو اور یہ خیال رکھے کہ ابھی ترقی کے اور منازل طے کرنے باقی ہیں +

ہر اصول کو بیان کر کے قرآنِ مجید کی آیتوں سے صاف صاف ثابت کر دیا ہے کہ اسلام عین اِن اصولوں کے مطابق ہے بلکہ ان میں سے اکثر کا بانی مبانی اسلام ہی ہے + علامہ ابن حزم کی مشہور کتاب الملل والنحل پر بحث کر کے اخیر میں کہتے ہیں کہ اس کتاب میں بعض خیالات بالکل جدید ہیں مثلاً ابن حزم کا دعوےٰ ہے کہ عورتیں پیغمبر ہو سکتی ہیں عام

خیال ہے کہ عورتوں کا درجہ مردوں سے کم ہے لیکن علامہ ابن حزم اس کے خلاف ہیں۔ پھر لکھا ہے علامۂ موصوف کا یہ خیال صحیح ہو یا نہ ہو لیکن اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہمارے زمانہ کے تعلیم یافتہ حضرات کے ہم خیال پہلے بھی موجود تھے۔ صاف ظاہر ہے کہ شبلی ابن حزم کے ہم خیال ہیں لیکن احتیاطاً خاموش ہیں!

شبلی کانگرس کے جانب دار اور ہندو مسلم اتحاد کے زبردست حامی تھے + جہانگیر اور تزک جہانگیری میں لکھتے ہیں "بے شبہ تیموریوں نے ہندوؤں کے ملک کو نہیں بلکہ دل کو فتح کرلیا تھا اور ہندوؤں کے اخلاص محبت نے فاتح کو مفتوح بنالیا تھا سے

به لوحِ مشہدِ پروانہ ایں رقم دیدم
کہ آتشے کہ مرا سوخت خویش را ہم سوخت"

قومی اصلاح ۔ شبلی اگرچہ بار بار بصراحت نہیں کہتے لیکن قوم کی اصلاح اور تربیتِ اخلاق ہر وقت اُن کے پیشِ نظر ہے + امام غزالی نے تربیتِ اطفال کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اُس کو غایت درجہ سبق آموز پند نامہ نیز اُس ہدایت نامہ کو جو امام ابو حنیفہ نے قاضی ابو یوسف کے نام[۱۷] لکھا زیادہ تر اس غرض سے بتفصیل درج کرتے ہیں کہ اس دور کے کج روش مسلمان اُن سے مستفید ہو سکیں اور دیکھیں کہ کیا کیا مہمات اصول تھے جو اُن کے بزرگوں نے قائم کئے تھے۔ لیکن جن پر اُن کا اک عرصے سے عمل نہ رہا + الغزالی میں لکھتے ہیں[۱۸] ۔ صدقات و وجوہِ خیر کی نسبت امام صاحب نے جو لکھا ہمارے زمانے کے بالکل حسبِ حال ہے۔ تمام ممالکِ اسلامیہ میں آج مسلمانوں کے تنزل کا سب سے بڑا سبب یہی ہے کہ لاکھوں کروڑوں روپیہ بے جا وجوہِ خیر پر صرف کر دیا جاتا ہے + شہر میں سینکڑوں مسجدوں کے موجود ہوتے اور نئی مسجدیں بنتی جاتی ہیں اور جو روپیہ اسلام کے نہایت ضروری کاموں میں خرچ ہونا چاہئے تھا وہ اس میں صرف کر دیا جاتا ہے پھر لکھا ہے[۱۹] " امام صاحب نے جو کچھ لکھا ہے ہمارے زمانے سے اُس کو مطابق کرو تو گمان ہوگا کہ اسی زمانے کو دیکھ کر لکھا ہے + تمام ہندوستان میں چھوٹے چھوٹے اختلافاتِ مذہبی پر نزاعیں قائم ہیں" + اخلاق کی اصلاح کے تحت میں لکھا ہے "اس بنا پر امام غزالی کے نزدیک تمام قوم کی بد اخلاقی کے ذمہ دار علماء تھے + الغزالی ۱۹۰۲ء کی تصنیف ہے ۔ ۱۸۹۵ء میں شبلی نے جو خطبہ ندوۃ العلما کے پہلے اجلاس میں دیا اُس میں یہی رونا ہے۔ شبلی نے اپنی تصنیفات میں اُنہیں شخصیتوں کی طرف رجوع کیا ہے جن کے خیالات اُن کے خیالات سے مطابقت رکھتے تھے۔ جب اُن کو اپنے زمانے کے علما میں ہم خیال نہ ملے تو انہوں نے گذشتہ نسلوں میں ایسے زعما و ائمہ کو ڈھونڈا جو اُن کے احساسات کی

---

[۱۷] سیرۃ النعمان ص ۵۸ [۱۸] الغزالی ص ۱۰ [۱۹] ص ۹۴ +

تائید کریں +

اسلامی تاثرات۔ شبلی سراپا اسلامی تاثرات میں ڈوبے ہوئے ہیں + مصر میں جاکر جامعِ ازہر کی بُری حالت کو دیکھتے ہیں تو بے اختیار کہہ اٹھتے ہیں کہ مجھ کو اپنے سفر میں جس قدر جامعِ ازہر کے حالات سے مسلمانوں کی بدبختی کا یقین ہُوا کسی چیز کا نہیں ہُوا۔ تربیت و معاشرت کا جو طریقہ ہے اُس سے حوصلہ مندی بلند نظری جوشِ ہمت غرض تمام شریفانہ اوصاف کا استیصال ہو جاتا ہے[۲۰] + لماموں کی جامعِ مسجد کے قریب ایک مکتب میں گئے[۲۱]۔ مُولوی صاحب کے اشارے سے ایک لڑکے نے قرآنِ مجید کی چند آیتیں پڑھیں۔ میرے دل پر عجیب اثر ہُوا۔ خیال آتا تھا کہ کہاں وہ حجاز کا ریگستان! کہاں بحیرۂ روم کے دور دراز جزیرے۔ اِس مقدس کلام (قرآن مجید) میں کیا تاثیر تھی کہ مشرق سے مغرب تک برقی قوت بن کر دوڑ گئی۔ اور آج تک باقی ہے۔ وہ معصوم لڑکا خوش لحن بھی تھا اور اصولِ قرات کے مطابق پڑھتا تھا۔ اتفاق سے آیتیں بھی مؤثر تھیں اِن باتوں نے مجھ کو بالکل مدہوش کر دیا اور دیر تک ایک عجیب حالت طاری رہی[۲۲]+

احیاءالعلوم کے ذکر میں لکھتے ہیں[۲۳]:۔

احیاءالعلوم میں یہ عام خصوصیت ہے کہ اس کے پڑھنے سے دل پر عجیب اثر ہوتا ہے۔ ہر فقرہ نشتر کی طرح دل میں چبھ جاتا ہے۔ ہر بات جادو کی طرح تاثیر کرتی ہے۔ ہر لفظ پر وجد کی کیفیت طاری ہوتی ہے۔ اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ یہ کتاب جس زمانے میں لکھی گئی خود امام صاحب تاثیر کے نشہ میں سرشار تھے۔ بغداد میں اُن کو تحقیقِ حق کا شوق پیدا ہوُا۔ تمام مذاہب کو چھانا۔ کسی سے تسلّی نہیں ہوئی۔ آخر تصوف کی طرف رخ کیا۔ لیکن وہ قال کی چیز نہ تھی بلکہ سراپا حال کا کام تھا۔ اور اُس کا پہلا زینہ اصلاحِ باطن اور تزکیۂ نفس تھا۔ امام صاحب کے مشاغل اس کیفیت کے بالکل سدِّ راہ تھے۔ قبولیتِ عام۔ ناموری۔ جاہ و منزلت مناظرات و مجادلات اور تزکیۂ نفس ع شَتّان بَیْنَهُمَا۔ ع ایں رہ کہ مے روی تو بمنزل نمے رود + آخر سب چھوڑ چھاڑ ایک کملی پہن بغداد سے نکلے اور دشت پیمائی شروع کی۔ سخت مجاہدات اور ریاضات کے بعد بزمِ راز تک رسائی پائی۔ یہاں پہنچ کر ممکن تھا کہ اپنی حالت میں مست ہو کر تمام عالم سے بے خبر بن جاتے۔ لیکن ع بیاد آر حریفانِ بادہ پیما را کے لحاظ سے افادۂ عام پر نظر پڑی۔ دیکھا تو آوے کا آوا بگڑا ہوُا ہے۔ امیر و غریب۔ عام و خاص۔ عالم و جاہل۔ رند و زاہد سب کے اخلاق تباہ ہو چکے ہیں۔ اور ہوتے جاتے

---

[۲۰] سفرنامہ ص ۹۳ [۲۱] ص ۱۷ [۲۲] ص ۱۰۲ [۲۳] الغزالی ص ۶۲

ہیں۔علما جو دلیلِ راہ بن سکتے تھے طلبِ جاہ میں مصروف ہیں یہ دیکھ کر ضبط نہ کر سکے اور اِسی حالت میں یہ کتاب لکھی۔دیباچہ میں خود لکھتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ مرض نے تمام عالم کو چھا لیا ہے اور سعادتِ اخروی کی راہیں بند ہو گئی ہیں۔علما جو دلیلِ راہ تھے زمانہ اُن سے خالی ہوتا جاتا ہے جو رہ گئے ہیں وہ نام کے عالم ہیں جن کو ذاتی اغراض نے اپنا گرویدہ بنا لیا ہے اور جنہوں نے تمام عالم کو یقین دلایا ہے کہ علم صرف تین چیزوں کا نام ہے مناظرہ (جو فخر اور نمود کا ذریعہ ہے) وعظ و پند (جس میں عوام کی دلفریبی کے لئے رنگین اور مسجع فقرے استعمال کئے جاتے ہیں) فتویٰ دینا جو مقدمات کے فیصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ باقی آخرت کا علم تو وہ تمام عالم سے ناپید ہو گیا ہے اور لوگ اُس کو بھول بھلا چکے" یہ دیکھ کر مجھ سے ضبط نہ ہو سکا اور مہرِ سکوت ٹوٹ گئی +

حضرتِ عمرؓ کی سیرت میں شبلی کے قلم سے بعض ایسی ایسی سادہ لیکن موثر عبارتیں نکلی ہیں کہ ظاہر ہے کہ جس رنگ میں قارئین کو رنگنا چاہتے ہیں وہ پہلے کس طرح بے تکلفی سے خود اُن کے دل پر چڑھ گیا ہوگا + لکھتے ہیں:[۵۲۳]

"اُن کے اخلاق و عادات کے بیان میں مورخوں نے تواضع اور سادگی کا مستقل عنوان قائم کیا ہے اور درحقیقت اُن کی عظمت و شان کے تاج پر سادگی کا طرہ نہایت خوشنما معلوم ہوتا ہے۔اُن کی زندگی کی تصویر کا ایک رخ یہ ہے کہ روم و شام پر فوجیں بھیج رہے ہیں۔قیصر و کسریٰ کے سفیروں سے معاملہ پیش ہے، خالد و امیر معاویہ سے بازپرس ہے، سعدِ وقاص، ابو موسیٰ اشعری، عمرو ابن العاص کے نام احکام لکھے جا رہے ہیں۔ دوسرا رخ یہ ہے کہ بدن پر بارہ پیوند کا کرتا ہے۔سر پر پھٹا سا عمامہ ہے پاؤں میں پھٹی جوتیاں ہیں۔پھر اس حالت میں یا تو کاندھے پر مشک لئے جا رہے ہیں کہ بیوہ عورتوں کے گھر پانی بھرنا ہے یا مسجد کے گوشے میں فرشِ خاک پر لیٹے ہیں اس لئے کہ کام کرتے کرتے تھک گئے ہیں اور نیند کی جھپکی سی آگئی ہے + بارہا مکہ سے مدینہ تک سفر کیا لیکن خیمہ یا شامیانہ کبھی ساتھ نہیں رہا۔جہاں ٹھیرے کسی درخت پر چادر ڈال دی اور اُسی کے سایہ میں پڑ رہے۔ابن سعد کی روایت ہے کہ اُن کا روزانہ خانگی خرچ دو درہم تھا جس کے کم و بیش ۱۰ روپے ہوتے ہیں۔ ایک دفعہ احنف بن قیس رؤسائے عرب کے ساتھ اُن کے ملنے کو گئے۔دیکھا تو دامن چڑھائے اِدھر اُدھر دوڑتے پھرتے ہیں۔احنف کو دیکھ کر کہا آؤ تم بھی میرا ساتھ دو۔بیت المال کا ایک اونٹ بھاگ گیا ہے۔تم جانتے ہو ایک اونٹ میں کتنے غریبوں کا حق شامل ہے۔ایک شخص نے کہا امیر المومنین! آپ کیوں تکلیف اٹھاتے

---

۵۲۳ الفاروق جلد دوم ص ۲۹۱۔

ہیں، کسی غلام کو حکم دیجئے وہ ڈھونڈ لائے گا - فرمایا - اَیُّ عَبْدٍ اَعْبَدُ مِنِّی "یعنی مجھ سے بڑھ کر کون غلام ہو سکتا ہے؟"

سادگی کے ایک اَور عنوان سے لکھا ہے[۲۴]:

"نہایت بے تکلفی اور سادگی سے رہتے تھے۔ کپڑوں میں اکثر پیوند ہوتا تھا۔ ایک دفعہ دیر تک گھر میں رہے۔ باہر آئے تو لوگ انتظار کر رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ پہننے کو کپڑے نہ تھے۔ اس لئے انہی کپڑوں کو دھو کر سوکھنے کو ڈال دیا تھا۔ خشک ہو گئے تو وہی پہن کر باہر نکلے"

ادبیات - تاریخ و سیرت و فلسفہ سے اب ہم خالص ادب کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ موازنۂ انیس و دبیر میں شبلی نے شاعری کا محض اجمالاً ذکر کیا ہے کہ شاعری کے دو جزو ہیں مادہ و صورت یعنی کیا کہنا چاہئے اور کیونکر کہنا چاہئے[۲۵]۔

"انسان کے دل میں کسی چیز کے دیکھنے، سننے یا کسی حالت یا واقعہ کے پیش آنے سے جوش و مسرت عشق و محبت۔ درد و رنج۔ فخر و ناز۔ حیرت و استعجاب۔ طیش و غضب وغیرہ وغیرہ کی جو حالت پیدا ہوتی ہے اُس کو جذبات سے تعبیر کرتے ہیں۔ اِن جذبات کا ادا کرنا شاعری کا اصلی ہیولیٰ ہے۔ ان کے سوا عالم قدرت کے مناظر مثلاً گرمی و سردی۔ صبح و شام۔ بہار و خزاں۔ باغ و بہار۔ دشت و صحرا۔ کوہ و بیابان کی تصویر کھینچنا یا عام واقعات اور حالات کا بیان کرنا بھی اِسی میں داخل ہے۔ لیکن یہ شرط ہے کہ جو کچھ کہا جائے اِس انداز سے کہا جائے کہ جو اثر شاعر کے دل میں ہے وہی سننے والوں پر بھی چھا جائے۔ یہ شاعری کا دوسرا جزو یعنی اُس کی صورت ہے اور انہی دونوں جزوں کے مجموعہ کا نام شاعری ہے۔ باقی خیال بندی۔ مضمون آفرینی۔ دقت پسندی۔ مبالغہ۔ صنائع و بدائع، شاعری کی حقیقت میں داخل نہیں۔ اگرچہ بعض جگہ یہ چیزیں نقش و نگار اور زیب و زینت کا کام دیتی ہیں"۔

شعر العجم جلد چہارم کے شروع میں شاعری پر مصنف کا ایک ایسا مبسوط اور جامع تبصرہ ہے کہ اردو زبان اُس کی دقتِ نظر سلاستِ زبان اور پیرایۂ بیان پر بجا طور پر فخر کر سکتی ہے۔ اگر کسی کو سمجھنا ہو کہ شاعری کیا ہے تو وہ اس تبصرہ کو اپنے جی میں جگہ دے لے۔ پہلے شاعری کی حقیقت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ شاعری چونکہ وجدانی اور ذوقی چیز ہے اس لئے اُس کی جامع و مانع تعریف چند الفاظ میں نہیں کی جا سکتی۔ اِس بنا پر مختلف طریقوں سے اُس کی حقیقت کا سمجھانا زیادہ

---

[۲۴] الفاروق جلد دوم ص ۲۹۸۔ [۲۵] موازنۂ انیس و دبیر ص ۴۔

مفید ہوگا کہ ان سب کے مجموعہ سے شاعری کا ایک صحیح نقشہ پیش نظر ہو جائے * پھر احساس اور ادراک کو تمیز کر کے بتایا ہے کہ احساس جب الفاظ کا جامہ پہن لیتا ہے تو شعر بن جاتا ہے۔ پھر لکھا ہے کہ منطقی پیرایہ میں شعر کی تعریف کرنا چاہیں تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ جو جذبات الفاظ کے ذریعہ سے ادا ہوں وہ شعر ہیں" * پھر شاعری کو دوسری چیزوں سے الگ کر کے دکھایا ہے کہ" جو چیزیں دل پر اثر کرتی ہیں بہت سی ہیں۔ مثلاً موسیقی، مصوری، صنعت گری وغیرہ لیکن شاعری تمام حواس پر اثر ڈال سکتی ہے"* سائنس اور شاعری میں یوں فرق بتایا ہے کہ"شعر کا نمایاں وصف جذبات انسانی کا برانگیختہ کرنا ہے"* "شاعری کا تخاطب جذبات سے ہے اور سائنس کا یقین سے۔ سائنس استدلال کرتا ہے اور شاعری محرکات کو استعمال کرتی ہے"* پھر موسیقی اور شعر تصویر اور شعر خطبہ اور شعر تاریخ اور شعر افسانہ اور شعر کے فرق کو واضح کیا ہے * پھر لکھتے ہیں "اصلی شاعر وہی ہے جس کو سامعین سے کچھ غرض نہ ہو"۔ "شاعری تنہا نشینی اور مطالعہ نفس کا نتیجہ ہے" شاعری کے عناصر وزن اور محاکات اور خیال بندی اور سادہ اور شیریں الفاظ اور صاف بندش اور جدید طرز ادا ہیں * اور حقیقت یہ ہے کہ شاعری دراصل دو چیزوں کا نام ہے محاکات اور تخئیل۔ ان میں سے ایک بات بھی پائی جائے تو شعر شعر کہلانے کا مستحق ہوگا"* پھر محاکات اور تصویر کا مقابلہ کیا ہے تخئیل کی تعریف یوں کی ہے کہ وہ دراصل قوت اختراع کا نام ہے"* فلسفہ اور سائنس میں قوت تخئیل کا استعمال اس غرض سے ہوتا ہے کہ ایک علمی مسئلہ کو حل کر دیا جائے لیکن شاعری میں تخئیل سے یہ کام لیا جاتا ہے کہ جذبات انسانی کو تحریک ہو*" ایک پھول کو دیکھ کر سائنس دان تحقیق کرنا چاہتا ہے کہ وہ نباتات کے کس خاندان سے ہے، اس کے رنگ میں کن رنگوں کی آمیزش ہے، اس کی غذا زمین کے کن اجزا سے ہے؟ اس میں نر و مادہ دونوں کے اجزا ہیں یا صرف ایک کے؟ لیکن شاعر کو ان چیزوں سے غرض نہیں پھول دیکھ کر بے اختیار اس کو یہ خیال پیدا ہوتا ہے ع اے گل بتو خرسندم تو بوئے کسے داری * پھر محاکات اور تخئیل پر تفصیلی بحث کی ہے جس میں جا بجا دلکش اور عام فہم مثالوں سے اُن کی حقیقت واضح کر کے پیش کر دی ہے * "محاکات کے کمال کے لئے عالم کائنات کی ہر قسم کی چیزوں کا مطالعہ کرنا ضروری ہے"* تخئیل کا خاکہ یوں کھینچا ہے کہ شاعر کی نظر میں عالم کائنات قوت تخئیل سے ایک اور عالم بن جاتا ہے"۔ "آفتاب، ماہتاب، ستارے، صبح، شام، شفق، باغ، پھول، پتے سب اس سے ہمزبانی کرتے ہیں سب اُس کے رازدار ہیں، سب سے اُس کے تعلقات ہیں، وہ شب وصل اور صبح وصل سے یوں خطاب کرتا ہے ؎

اے شب اگرت ہزار کار است مرو
وے صبح گرت ہزار شادی است مخند

"واقعاتِ عالم پر جب وہ عبرت کی نظر ڈالتا ہے تو ایک ذرہ ناصح بن کر اُس کو اخلاق اور عظمت کی تعلیم دیتا ہے۔ اس عالم میں وہ گورِ غریباں میں جا نکلتا ہے تو بوسیدہ ہڈیاں علانیہ اُس سے خطاب کرتی ہیں:-

کہ زنہار اگر مردے آہستہ تر

کہ چشم و بناگوش وروے است سر"

قوتِ تخئیل ایک چیز کو سو سو دفعہ دیکھتی ہے اور ہر دفعہ اِس کو اُس میں ایک نیا کرشمہ نظر آتا ہے"۔ پھر تخئیل کے بے جا استعمال کی مثالیں دی ہیں۔ اور مبالغہ کی بے اعتدالیاں دکھائی ہیں۔ لفظی تناسب اور ایہام کی بے بنیادی ظاہر کی ہے استعارات اور تشبیہات کے استعمال میں احتیاط لازم قرار دی ہے اور بتایا ہے کہ فارسی میں متاخرین کی سخت غلطی جس سے اُن کی شاعری بالکل برباد ہوگئی یہ ہے کہ وہ ان موقعوں پر محاکات کے بجائے تخئیل سے کام لیتے ہیں مثلاً

زمانہ ایست کہ بر قفل اگر نسیم وزید

بسانِ غنچہ اش از انبساط خنداں کرد

پھر تشبیہ و استعارہ کا صحیح مصرف دکھایا اور اس بات کی ترغیب دلائی کہ شاعر نادر اور جدید تشبیہیں اور استعارے ڈھونڈ کر پیدا کرے۔ جدت و لطفِ ادا کے بعد حسنِ الفاظ کی طرف توجہ دلائی ہے کہ "زیادہ تر اہلِ فن کا یہی مذہب ہے کہ لفظ کو مضمون پر ترجیح ہے اور حقیقت یہ ہے کہ شاعری یا انشا پردازی کا مدار زیادہ تر الفاظ پر ہے"۔ "یہ بالکل ممکن ہے کہ ایک عمدہ سے عمدہ خیال عمدہ سے عمدہ مضمون عمدہ سے عمدہ نظم اِس وجہ سے برباد ہو جائے کہ اُس میں صرف ایک لفظ اپنے درجے سے گر گیا"۔ الفاظ کے انواع اور اُن کے مختلف اثر خوب ظاہر کئے ہیں کہ "الفاظ متعدد قسم کے ہوتے ہیں بعض نازک، لطیف، شستہ، صاف، رواں اور شیریں اور بعض پُرشوکت، متین، بلند پہلی قسم کے الفاظ عشق و محبت کے مضامین کے ادا کرنے کے لئے موزوں ہیں"۔ پھر کہا ہے کہ "اس سے زیادہ مقدم الفاظ کا باہمی تعلق اور تناسب ہے"۔ "الفاظ کے توافق، تناسب، موزونی اور ہم آوازی سے سلاست صفائی اور روانی پیدا ہوتی ہے"۔ پھر مترادف الفاظ کا باریک اور نازک معنوی فرق دکھایا۔ پھر سادگی، جملوں کے اجزا کی ترکیب اور واقعیت سے ایک لطیف بحث کی ہے۔ اخیر میں پھر شاعری اور جذبات کا تعلق واضح کیا ہے اور شاعری کے استعمال کا صحیح رستہ دکھایا ہے کہ "شعر ایک قوت ہے جس سے بڑے بڑے کام لئے جا سکتے ہیں بشرطیکہ اس کا استعمال صحیح طور سے کیا جائے"۔ "شاعری کے جس قدر اقسام ہیں یعنی فلسفیانہ، اخلاقی، عشقیہ، تخئیلی سب سے مفید کام لئے جا سکتے ہیں۔ فلسفیانہ شاعری دقیق خیالات کو آسانی کے ساتھ ذہن نشین کر سکتی ہے، اخلاقی شاعری اخلاق کو سنبھالتی ہے، عشقیہ شاعری سے زندہ دلی

اور تازگی روح پیدا ہوتی ہے تخئیل سے طبیعت کو اہتزاز و انبساط ہوتا ہے لیکن افسوس ہے کہ اکثر شعرائے ایران نے شاعری کا صحیح استعمال نہیں کیا" دیکھو کیونکر شبلی نے اصطلاحی کنجلکوں سے بچ کر یا اُن کو سلجھا کر شاعری کے معنی اور اُس کا مقصد ذہن نشین کر دیا ہے۔ تنقید و تبصرہ عموماً اک خشک بیابان کا منظر پیش کرتے ہیں۔ شبلی نے اس کے بجائے روزمرہ کے واقعات اور موزوں اقتباسات سے ایک دلکش چمنستان کا سماں آنکھوں کے سامنے کھینچ دیا ہے جس سے محض لطف اٹھانے والا لطف اٹھا سکتا ہے اور چمن بندی کرنے والا اپنے فن کی مناسب اصلاح کر سکتا ہے۔ باب دوم میں فارسی شاعری کی پیدائش، ارتقا، ترقی و تنزل، عربی شاعری کا اس پر اثر، نظام حکومت کا اثر، امرد پرستی کا شرمناک اثر، مختلف قومی خصوصیتوں اور مختلف آب و ہوا اور مناظر قدرت کا مختلف ملکوں میں مختلف اثر ان سب پر ایک تاریخی ادبی نظر ڈالی ہے مثلاً لکھتے ہیں "غزنین و سمرقند وغیرہ کے شعرا سخت گو اور سادہ گو ہیں بخلاف اس کے شیراز وغیرہ کے شعرا کا کلام لطافت اور نزاکت سے گویا عروس رعنا ہے۔ ہندوستان میں آ کر ایرانی فحش گو بھی مہذب بن جاتے ہیں۔ ایران کے فطری خوبصورت اور رنگین مناظر کی وجہ سے رنگین سخنی، رنگین نوائی، رنگیں ادائی کے محاورات پیدا ہوتے" باب سوم میں عربی فارسی شاعری کا فرق دکھایا ہے پھر فارسی کے مختلف انواع پر تفصیلی تبصرہ ہے۔ مثنوی، قصیدہ، عشقیہ شاعری، غزل، صوفیانہ شاعری، اخلاقی شاعری، فلسفیانہ شاعری، کو یکے بعد دیگرے لیا ہے اور نہ صرف ان کا ارتقا دکھایا ہے بلکہ شاعر کا شاعر سے تمثیلاً موازنہ کیا ہے اور اس طرح ضمناً جا بجا شاعری کے اصولوں سے بحث کرتے ہوئے لطیف و بلیغ اشعار سے اپنی عالمانہ تصنیف کو دلچسپ و دلکش بنا دیا ہے۔ تصوّف کا اثر یوں دکھاتے ہیں کہ اول قصیدہ گوئی جو سراپا خوشامد تھی موقوف ہو گئی، بادشاہِ وقت کا نام لینا لازم نہ رہا۔ زبان مہذب اور شائستہ ہو گئی اور وہ الفاظ جو رندی اور عیاشی کے لئے خاص تھے حقائق اور اسرار کے ترجمان بن گئے۔ فلسفہ شاعری میں تصوّف کی راہ سے آیا۔ تصوّف کا اصلی مقام عشق و محبت ہے۔ اس عالم میں دشمن اور دوست کی تمیز اُٹھ جاتی ہے ہر چیز میں اُسی کا جلوہ نظر آتا ہے ہر چیز کی طرف دل کھچتا ہے۔ اِس کا اخلاق پر عمدہ اثر پڑا۔ عام محبت اور ہمدردی کے خیالات پھیل گئے اور یہ تعلیم ہونے لگی کہ

در حیرتم کہ دشمنی کفر و دیں چرا است　　از یک چراغ کعبہ و بت خانہ روشن است

یگانگت ملاحظہ ہو

زمینِ عشق بہ کونین صلح کل کردم　　تو خصم باش و زما دوستی تماشا کن

تصوّف نے بہت سے نئے الفاظ اصطلاحات تلمیحات زبان میں داخل کئے۔ عزتِ نفس کا خیال لوگو

کے دل میں پیدا کر دیا یہاں تک کہ لکھا ؎

سرمداگرش وفاست خود می آید ۔۔۔ در آمدنش بجاست خود می آید

بیہودہ چرا در پئے اومی گردی ۔۔۔ سرمد اگر او خداست خود می آید

غرض شبلی نے صرف اصولوں سے خشک اصطلاحانہ بحث نہیں کی بلکہ صحیح محاکات کے اصول پر گویا اک جیتی جاگتی دنیا پیش کردی ہے جس سے طبیعت میں اک تازگی آجاتی ہے - یہ ہے مصنف کا کمال کہ وہ جس بات کو ایسے انداز سے بیان کرے کہ اُس کی کیفیت آنکھوں میں پھر جائے اور دل میں سما جائے اور یہی ہے نقاد کا فرض کہ مصنف پر تبصرہ کرے تو خود مصنف کو بولنے دے اور قارئین یا سامع کو براہ راست مصنف سے دوچار ہونے دے کیونکہ جیساکہ ہم اوپر کہہ چکے ہیں کسی شے یا کسی شخص کو بخوبی جاننے کے لئے لازم ہے کہ اُس سے براہ راست اور بے تکلف تعلق پیدا کیا جائے +

شعر العجم میں ایک اور خوبی ہے کہ صرف ایک ہی مقام پر شاعری اور شعر کے حسن و قبح سے بحث نہیں کی - بلکہ جا بجا ہر شاعر کے ذکر میں مختلف اصنافِ شاعری کے نکتے بیان کر دیئے ہیں - اس سے یہ نقص تو ضرور پیدا ہو گیا ہے کہ جا بجا تکرار ہو گیا ہے لیکن اس نقص کی تلافی اس امر سے بخوبی ہو جاتی ہے کہ عام پڑھنے والے کو مختلف شخصیتوں اور مختلف تمثیلوں کے ذریعے سے شاعری کے اصول بخوبی ذہن نشین ہو جاتے ہیں + ہر فارسی شاعر کے کلام پر مختلف پہلوؤں سے تبصرہ کیا ہے اور پھر فارسی شاعری کے ان مختلف پہلوؤں پر علیحدہ تبصرہ بھی کیا ہے یعنی اُنہیں چیزوں پر پہلے جزئی نقطہ نظر سے اور پھر کلی نقطۂ نظر سے نگاہ ڈالی ہے - تبصرے کا یہ طریقہ نہایت موزوں و مناسب ہے +

اس کے ساتھ ہی مختلف شعرا کا کلام بالمقابل رکھا ہے جس سے شعر کے مختلف درجوں اور خوبیوں کا بخوبی موازنہ کیا جا سکتا ہے + حافظ کے مقابل میں سلمان کی بندش کی سُستی دکھاتے ہیں ؎

سلمان	حافظ
شوقم افزوں شد و آرام کم و صبر نماند	عاشقاں بندۂ ارباب امانت باشند
در فراقِ تو وے عہد ہماں ست کہ بود	لاجرم چشم گہر بار ہماں است کہ بود

یہ کہہ کر کہ در فراقِ تو کا موقع پہلے مصرع کے ابتدا میں کا ہے +

در ازل عکسِ مے لعلِ تو در جام افتاد	عکسِ روئے تو چو در آئینۂ جام افتاد
عاشقِ سوختہ دل در طمعِ خام افتاد	عارف از پرتوِ مے در طمعِ خام افتاد

خالِ مشکین تو در عارضِ گندم گوں دید
کے دم آمد شپئے دانہ و در دام افتاد

در خمِ زلفِ تو آویخت دل از چاہِ زنخ
آہ کز چاہ بروں آمد و در دام افتاد

اسی طرح انیس اور دبیر کے اشعار کا موازنہ کیا ہے۔

دبیر

گھوڑے پہ تھا شقی کہ پہاڑی پہ دیو تھا

انیس

گھوڑے پہ تھا شقی کہ ہوا پر پہاڑ تھا

دل صاف ہو کس طرح کہ انصاف نہیں ہے
انصاف ہو کس طرح کہ دل صاف نہیں ہے

عالم ہے مکدر کوئی دل صاف نہیں ہے
اس عہد میں سب کچھ ہے پر انصاف نہیں ہے

بندھتی تھی اور کھلتی تھی مٹھی حباب کی

کھلتی تھیں اور جھپکتی تھیں آنکھیں حباب کی

شبلی کی شاعری ۔ شبلی ہمیں "موازنہ" اور "شعر العجم" میں ایک زبردست نقاد بن کر نظر آتے ہیں لیکن اس سے مدتوں پہلے وہ ایک شاعر تھے ۔ چنانچہ اپنے اوائل عمر میں جب کہ ابھی اُن سے کوئی بڑا کام سرانجام نہ ہوا تھا جب وہ ابھی فقط ایک پکے مسلمان تھے وہ اکثر مسلمان نوجوانوں کی طرح شعر و سخن کے مشتاق تھے اور اپنے وقت کا کچھ حصہ ان غیر عملیات میں صرف کرتے تھے + پھر جب اُن کو معاش کی فکر ہوئی اور جب علی گڑھ میں وہ ایک زبردست قومی تحریک سے دوچار ہوئے تو اگرچہ شروع شروع میں "صبح امید" کی سی زبردست نظم اُن کے دماغ و قلم سے نکلی لیکن تحقیقی مشاغل میں مصروف ہو جانے کے ساتھ کچھ عرصے کے لئے اُن کی شاعری پر مہرِ خاموشی ثبت ہو گئی + لیکن شاعری دبائے دبنے والی چیز نہیں اور پھر ایک مسلمان کی شاعری! شاعری جذبات کی ترجمانی ہے اور مسلمان کیا ہوتا ہے جذبات کی ایک پوٹ، یہ دوسری بات ہے کہ یہ پوٹ پاکیزہ و نفیس ہے کہ نہیں + غرض شبلی ایک شاعر ضرور تھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ شاعر سے بڑھ کر ایک نقاد تھے ۔ اِس حیثیت سے اُن کا مقابلہ انگریزی کے مشہور نقاد شاعر میتھیو آرنلڈ سے کیا جا سکتا ہے جس کی نقادیت کو اُس کی شاعری پر بدرجہا سبقت تھی + شبلی کے ہم عصر بتاتے ہیں کہ اُن کو فی الحقیقت فارسی کے ہزاروں اشعار نوک زبان تھے اور راقم نے سنا ہے کہ ایک موقع پر کیسے سید سجاد حیدر یلدرم نے بحالتِ طالب علمی در علانیہ کے ایک چھید میں سے "شبلیِ غمزدہ" کو شعر لکھنے کی دُھن میں چھت کی طرف ٹکٹکی لگائے دیکھا + سو شبلی شاعر تو ضرور تھے لیکن ایک نقاد شاعر تھے ایک مورخ شاعر تھے ایک محقق شاعر تھے ایک

سیاسی شاعر تھے اور اس لئے سوائے اُس وقت کے جب وہ بمبئی چلے جاتے تھے اور جب وہ ہنگامۂ خوبانِ زرتشتی“ سے جو ”بہم آمیختہ از زلف و عارضِ ظلمت وضورا“ ”کنارِ آب چوپاٹی و گلگشتِ اپالو“ پر جلوہ گر ہوتے وہ فطری طور پر متاثر ہو جایا کرتے اتنا کہ کم از کم فارسی تغزل کے لئے ایک خاصا سامان مہیا ہو جاتا باقی اوقات میں وہ تنقید و تحقیق و سنجیدگی و وقار کو ہاتھ سے نہ چھوڑ سکنے کے باعث ایک بے اختیار انسان یعنی صحیح معنوں میں ایک زبردست شاعر نہ تھے + اور قوم کی خوش قسمتی تھی کہ شبلی کی شاعریت اُن کی علمیت کے نیچے دب کر رہ گئی اور فقط ایک وقتی مشغلہ بنی رہی ورنہ ”سنگ بر شیشۂ تقویٰ زدہ ام ہاں زدہ ام“ کی دلکش صدائیں جا بجا اُنہیں اور اُن کے ذریعے سے بہت سے حسّاس مسلمان نوجوانوں کو علمی کاموں کے لئے کسی حد تک بیکار بنا دیتیں + اور شبلی کی عدیم المثال تحقیقات جذبات کے کہر میں کم ہو جاتیں! تاریخی تحقیق کی روشنی کے آگے اُن کی شاعری کی چاندنی پھیکی پڑ گئی + کم از کم اُن کی اردو نظموں کو دیکھو کہ کس قدر بیانیہ ہیں - واقعات ہیں دلچسپ ضرور سچّی کہانیاں ہیں دل آویز بھی اور زبان صاف ستھری اور پیرایۂ بیان سدھرا ہوا اور سلجھا ہوا کلام میں روانی اور سلاست اور صفائی یہ سب کچھ لیکن تخئیل کو ڈھونڈو تو شاید کہیں کہیں چھپی بیٹھی ہو اور موسیقیت بھی شاید کبھی کبھی کنکھیوں سے دیکھتی ہو - ایک مورخ واقعات کو نظم کر رہا ہے ایک مسلمان سلف کے قصّے خوش الحانی سے سنا رہا ہے اور چونکہ مسلمان ہی سننے والے ہیں لہذا ان کا اثر بھی ہونا ضرور ہے اور ان کے مفید ہونے سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا - اور اس لئے اسے شاعری کے زمرے سے خارج کرنا بھی ناانصافی ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ اسے اعلیٰ معیار کی شاعری نہیں کہہ سکتے + بلاشبہ ”صبحِ امید“ کی مثنوی کے بعض حصّے نہایت موثر ہیں - اور بعض جگہ طنزیہ کلام سے بھی شبلی کی قدرتِ کلام ظاہر ہوتی ہے ؎

ہماری کلفتیں سب دور ہو جاتی ہیں یہ سُن کر
کہ دنیا آج تک اسلام کی ممنونِ احساں ہے

علاوہ بریں غزل کی شکل میں واقعات کو نظم کرنا اور تسلسل و محاکات کو یُوں قائم رکھنا کہ ذرا تکلف معلوم نہ ہو یہ شبلی کے اردو کلام کی سب سے بڑی خصوصیت ہے ”اہلِ بیتِ رسول صلعم کی زندگی“ ”خلافتِ فاروقی کا ایک واقعہ“ ”عدلِ فاروقی کا ایک نمونہ“ تسلسل اور روانی کے بہترین نمونے ہیں + ”ہنگامۂ طرابلس و بلقان“ سے متاثر ہو کر اہلِ یورپ کو یوں خطاب کرتے ہیں ؎

کوئی پُوچھے کہ اے تہذیبِ انسانی کے استادو! ۔۔۔ یہ ظلم آرائیاں تاکے یہ حشر انگیزیاں کب تک

یہ جوش انگیزیٔ طوفانِ بیداد و بلا تا کے | یہ لطف اندوزیٔ ہنگامۂ آہ و فغاں کب تک
یہ مانا تم کو تلواروں کی تیزی آزمانی ہے | ہماری گردنوں پر ہوگا اس کا امتحاں کب تک
یہ مانا قصۂ غم سے تمہارا جی بہلتا ہے | سنائیں تم کو اپنے دردِ دل کی داستاں کب تک
یہ مانا تم کو شکوہ ہے فلک سے خشک سالی کا | ہم اپنے خون سے سینچیں تمہاری کھیتیاں کب تک
سمجھ کر یہ کہ دھندلے سے نشانِ رفتگاں ہیں ہم | مٹاؤگے ہمارا اس طرح نام و نشاں کب تک

شبلی کی سیاسی آزادخیالی بھی فقط اُن کی نظموں ہی میں سے ظاہر ہوتی ہے ؎

معاملاتِ حکومت میں دیجئے کچھ دخل | یہ کیا کہ قصۂ پارینۂ وفا کہئے
برادرانِ وطن کہہ رہے ہیں کیا کیا کچھ | کبھی تو آپ بھی افسانۂ جفا کہئے

آپ اِس بھول بھلیاں سے نہ نکلیں گے کبھی | دل سے جائے گا نہ تعلیم غلامی کا اثر

لاکھ آزادیٔ افکار کو روکا لیکن | یہ وہ افسوں ہے کہ ہر شخص پہ چل جاتا ہے
غیر کمبخت تو گستاخ تھے مدت سے مگر | اب تو کچھ آپ کے منہ سے بھی نکل جاتا ہے

شبلی کی شاعری کا معراج اُن کی فارسی نظموں میں نظر آتا ہے ؎

دوش ایں مژدہ بگوشِ گل و ریحاں آمد | کہ بہار آمد و بسیار بساماں آمد
ابر گوہر ہمہ افشاند چو گریاں بگذشت | گل ہمہ زر بپراگند چو خنداں آمد
آب را سلسلہ برپائے ببستند ز موج | بس کہ دیوانہ وش از طرفِ بیاباں آمد
لالہ چوں مغ بچگاں چہرہ برافروخت بباغ | سنبل آشفتہ تر از طرۂ خوباں آمد

کشمیر کی تعریف میں لکھتے ہیں ؎

در بنِ آب دمد سبزہ و نیلوفر و گل | قوتِ نامیہ بنگر ز کجا تا بکجاست
گرچہ دانم کہ سخن خود بدرازی بکشید | چہ تواں کرد سخن ہم ز سر نشو و نماست

جدید تعلیم والوں کو یوں تہدید کرتے ہیں ؎

اے کہ بر مائدۂ یورپ مہماں باشی | حیف باشد اگر از جملۂ ایشاں باشی

حیف اگر از اثرِ فلسفۂ مغربیاں — منکرِ فلسفۂ سنت و قرآں باشی
قیصراں راہمہ یک یک بشماری ز آغاز — بے خبر از عمر و حیدر و عثماں باشی
از خداوندِ جہاں یاد نیاری گاہے — روز و شب خود بہ پرستاریٔ سلطاں باشی
ور بپرسی کہ دریں کار چہ تدبیر بود — دین و دنیا بہم آمیز کہ اکسیر بود

بمبئی کی تعریف میں بہت سی غزلیں ہیں۔ یہ مشہور ہے:-

نثارِ بمبئی کن ہر متاعِ کہنہ و نو را — طرازِ مسندِ جمشید و فرِّ تاجِ خسرو را

تغزل کا رنگ ملاحظہ ہو:-

من کہ در سینہ دلے دارم و شیدا چہ کنم — میل بالالہ رخاں گر نہ کنم تا چہ کنم
من نہ آنم کہ بہ ہر شیوہ دل از دست دہم — لیک باآں نگہِ حوصلہ فرسا چہ کنم

عمرے ست عشق ورزم و کارم تمام نیست — ایں بادہ پختہ تر نہ شد گرچہ خام نیست
چشمم ہر آنچہ دید نہ ہر دیدہ بنگرد — نظارۂ جمالِ تو عام ست و عام نیست

وقتِ سحر کہ عارضِ او بے نقاب بود — در بزمش اول آں کہ رسید آفتاب بود
بزمِ شراب و شاہدِ رنگین و بانگِ نے — ایں حرفے از فسانۂ عہدِ شباب بود

یہ ہے شبلی کی عاشقی اور شبلی کی شاعری لیکن اس سے بعض نکتہ چینوں کی طرح یہ نتیجہ نکالنا کہ شبلی کی زندگی کا ایک نہایت تاریک پہلو بھی تھا سخت ناانصافی اور پرلے درجے کی تنگ نظری ہے۔ ہاں متانت جن لوگوں کا مذہب ہے جو اسلام کو لطافت و فطریت کا دشمن سمجھتے ہیں جن کے نزدیک کسی خوبصورت چہرے کا دیکھ لینا اور پھر اُس کو خوبصورت سمجھ لینا یا خدانخواستہ کہہ دینا ایک گناہِ کبیرہ ہے جس کا کفارہ صرف دوزخ کی آگ میں جلنے سے ممکن ہے انہیں حق پہنچتا ہے کہ وہ شبلی کو جو نہیں معلوم کیوں اپنی ایک کتاب میں تھئیٹر دیکھنا بھی معیوب سمجھتے ہیں ایک چھپا وا رفتہ مزاج عاشق سمجھ لیں ورنہ شبلی نے تو صاف بتا دیا ہے کہ:-

شبلیا نابلدِ کوچۂ عشقیم ولے — دوستاں تہمتِ ایں شیوہ بما نیز کنند

اس سے یہاں مراد یہ نہیں کہ شبلی ضرور عشق سے نابلد تھے لیکن اُن کو اصلی عشق اسلام اور تاریخِ اسلام اور ادب

ورادب اسلام اور اس لئے تحقیق اور تدقیق اور تنقید سے تھا نہ کہ خوبانِ زرتشتی سے یا کسی اور بے نقاب یا نقاب دار کے زلف و گیسو سے۔

محاکات - محاکات اور خوبیٔ بیان کی مثالیں جابجا شبلی کے ہاں پائی جاتی ہیں۔ واقعہ نگاری کا کمال ذیل کی مثال سے واضح ہوگا۔ حضرت عمرؓ کی خلافت کے زمانہ میں قادسیہ کی مشہور جنگ و فتح سنہ ۱۴ھ بمطابق ۶۳۵ء سے قبل جو نامہ و پیام طرفین میں جاری رہے اُن میں سفارتِ ربعی کا یوں بیان کرتے ہیں[۵۴]

"رستم چونکہ لڑنے سے جی چُراتا تھا ایک دفعہ اور صلح کی کوشش کی۔ سعد کے پاس پیغام بھیجا کہ تمہارا کوئی معتمد آدمی آئے تو صلح کے متعلق گفتگو کی جائے۔ سعد نے ربعی بن عامر کو اس خدمت پر مامور کیا۔ وہ عجیب و غریب ہیئت سے چلے۔ عرق گیر کی زرہ بنائی، اور اِسی کا ایک ٹکڑا سر سے لپیٹ لیا۔ کمر میں رسی کا پٹکا باندھا اور تلوار کے میان پر چیتھڑے لپیٹ لئے۔ اِس ہیئت کذائی سے گھوڑے پر سوار ہو کر نکلے۔ ادھر ایرانیوں نے بڑے سرو سامان سے دربار سجایا۔ دیبا کا فرش۔ زریں گاؤتکیے۔ حریر کے پردے۔ صدر میں مرصع تخت۔ ربعی تخت کے قریب آ کر گھوڑے سے اترے اور باگ ڈور کو تکیے سے اٹکا دیا۔ درباری بے پروائی کی ادا سے اگرچہ کچھ نہ بولے تاہم دستور کے موافق ہتھیار رکھوا لینا چاہا۔ انہوں نے کہا میں بلایا ہوا آیا ہوں۔ تم کو اِس طرح میرا آنا منظور نہیں تو مَیں الٹا پھر جاتا ہوں۔ درباریوں نے رستم سے عرض کی۔ اُس نے اجازت دی۔ یہ نہایت بے پروائی کی ادا سے آہستہ آہستہ تخت کی طرف بڑھے۔ لیکن برچھی جس سے عصا کا کام لیا تھا اُس کی انی کو اس طرح فرش میں چبھوتے جاتے تھے کہ پُرتکلف فرش اور قالین جو بچھے ہوئے تھے جابجا سے کٹ پھٹ کر بے کار ہو گئے۔ تخت کے قریب پہنچ کر زمین پر نیزہ مارا جو فرش کو آر پار کر کے زمین میں گڑ گیا۔ رستم نے پوچھا کہ اِس ملک میں کیوں آئے ہو؟ اُنہوں نے کہا "اس لئے کہ مخلوق کے بجائے خالق کی عبادت کی جائے"۔ رستم نے کہا "مَیں ارکانِ سلطنت سے مشورہ کر کے جواب دوں گا"۔ درباری بار بار ربعی کے پاس آ کر اُن کے ہتھیار دیکھتے تھے اور کہتے تھے کہ اسی سامان پر ایران کی فتح کا ارادہ ہے؟ لیکن جب ربعی نے تلوار میان سے نکالی تو آنکھوں میں بجلی سی کوندگئی اور جب اُس کی کاٹ کی آزمائش کے لئے ڈھالیں پیش کی گئیں تو ربعی نے اُن کے ٹکڑے اڑا دیئے۔

یرموک سنہ ۱۵ھ بمطابق ۶۳۶ء کی فیصلہ کن جنگ کے دوران میں عکرمہ کی شجاعت کو یوں بیان کرتے ہیں[۵۵]

عکرمہ نے جو ابوجہل کے فرزند تھے اور اسلام لانے سے پہلے اکثر کفار کے ساتھ رہ کر لڑے تھے

گھوڑا آگے بڑھایا اور کہا عیسائیو! میں کسی زمانہ میں (کفر کی حالت میں) خود رسول اللہ سے لڑ چکا ہوں کیا آج تمہارے مقابلے میں میرا پاؤں پیچھے پڑ سکتا ہے ؟ یہ کہہ کر فوج کی طرف دیکھا اور کہا مرنے پر کون بیعت کرتا ہے ؟ چار سو شخصوں نے جن میں ضرار بن ازور بھی تھے مرنے پر بیعت کی اور اس ثابت قدمی سے لڑے کہ قریباً سب کے سب وہیں کٹ کر رہ گئے۔ عکرمہ کی لاش مقتولوں کے ڈھیر میں ملی، کچھ کچھ دم باقی تھا۔ خالد نے اپنے زانو پر اُن کا سر رکھا اور گلے میں پانی ٹپکا کر کہا "خدا کی قسم عمر کا گمان غلط تھا کہ ہم شہید ہو کر نہ مریں گے"

شبلی نے اپنی تاریخی کتابوں کو متعدد دلچسپ حکایتوں سے زینت دی ہے جن کے پڑھنے سے زمانۂ گذشتہ کا نقشہ آنکھوں کے آگے پھر جاتا ہے اور اسلامی تمدن کی جیتی جاگتی تصویر نظر آنے لگتی ہے الفاروق کے اخیر میں لکھتے ہیں [۲۸]

"اسلم (حضرتِ عمر کا غلام تھا) کا بیان ہے کہ ایک دفعہ حضرتِ عمر رات کو گشت کے لئے نکلے۔ مدینہ سے تین میل پر صرار ایک مقام ہے۔ وہاں پہنچے تو دیکھا کہ ایک عورت کچھ پکا رہی ہے اور تین بچے رو رہے ہیں۔ پاس جا کر حقیقتِ حال دریافت کی۔ اُس نے کہا کہ کئی وقتوں سے بچوں کو کھانا نہیں ملا ہے اُن کے بہلانے کے لئے خالی ہانڈی پانی ڈال کر چڑھا دی ہے۔ حضرتِ عمر اُسی وقت اُٹھے۔ مدینہ میں آکر بیت المال سے آٹا، گوشت، گھی، اور کھجوریں لیں اور اسلم سے کہا کہ میری پیٹھ پر رکھ دو۔ اسلم نے کہا میں لئے چلتا ہوں۔ فرمایا ہاں لیکن قیامت میں میرا بار تم نہیں اٹھاؤ گے۔ غرض سب چیزیں خود لاد کر لائے اور عورت کے آگے رکھ دیں۔ اُس نے آٹا گوندھا، ہانڈی چڑھائی۔ حضرتِ عمر خود چولہا پھونکتے جاتے تھے۔ کھانا تیار ہوا تو بچوں نے خوب سیر ہو کر کھایا اور اچھلنے کودنے لگے۔ حضرتِ عمر دیکھتے تھے اور خوش ہوتے تھے۔ عورت نے کہا خدا تم کو جزائے خیر دے، سچ یہ ہے کہ امیر المومنین ہونے کے قابل تم ہو نہ عمر"

زبان و طرزِ بیان۔ شبلی کی زبان و طرزِ بیان عالمانہ اور پُرشوکت ہے لیکن یہ تو عام انداز ہے یوں جہاں جس قسم کا مضمون ہو اُن کی انشا پردازی اُس کے دوش بدوش چلتی ہے۔ سرسید نے جو بلا شبہ اردو میں موجودہ طرزِ انشا پردازی کے موجدِ اعلیٰ تھے۔ شبلی کی اولین تصنیف "المامون" کے دیباچے میں اُن کی زبان کی بابت یہ لفظ لکھے ہیں [۲۹]

"یہ کتاب اردو میں لکھی گئی ہے اور ایسی صاف و شستہ اور برجستہ عبارت ہے کہ دلّی والوں کو بھی اس پر رشک آئے گا۔ اردو زبان نے بہت کچھ ترقی کی ہے مگر اس بات کا بہت کم لحاظ رکھا گیا ہے کہ ہر

---

[۲۸] الفاروق جلد ۲ ص ۲۔ [۲۹] المامون دیباچہ ص ۳۔

فن کے لئے زبان کا طرز بیان جداگانہ ہے۔ تاریخ کی کتابوں میں ناول (قصہ) اور ناول میں تاریخانہ طرز گو کیسی ہی فصاحت اور بلاغت سے برتا گیا ہو دونوں کو برباد کرتا ہے + لارڈ مکالی جو انگریزی زبان کا بے نظیر ادیب ہے اس کے تاریخانہ ایسے بااعتبار فصاحت و بلاغت کے اپنا نظیر نہیں رکھتے مگر انشائی اور شاعرانہ طرز ادا سے تاریخانہ اصلیت کو بہت کچھ نقصان پہنچانے والے ہیں + ہمارے لائق مصنف نے اس کا بہت کچھ خیال رکھا ہے اور باوجود تاریخانہ مضمون ہونے کے ایسی خوبی سے اُس کو ادا کیا ہے کہ عبارت بھی فصیح اور دلچسپ ہے، اور تاریخانہ اصلیت بدستور اپنی اصلی صورت پر موجود ہے۔ جو خوبصورت ہے خوبصورت ہے۔ جو بھونڈی ہے بھونڈی ہے۔ نہ خوبصورتی کو زیادہ خوبصورت بنایا ہے۔ نہ بھونڈے پنے کو زیادہ بھونڈا اور درحقیقت یہی کمال تاریخ نویسی کا ہے"

سیرۃ النبی میں آنحضرت کی ہجرت کا واقعہ یُوں بیان کرتے ہیں[۵۳]

"کفار نے جب آپ کے گھر کا محاصرہ کیا اور رات زیادہ گزر گئی تو قدرت نے اُن کو بے خبر کر دیا۔ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) اُن کو سوتا چھوڑ کر باہر آئے۔ کعبہ کو دیکھا اور فرمایا "مکہ! تُو مجھ کو تمام دنیا سے زیادہ عزیز ہے لیکن تیرے فرزند مجھ کو رہنے نہیں دیتے" حضرت ابوبکر سے پہلے قرارداد ہو چکی تھی دونوں صاحب پہلے جبلِ ثور کے غار میں جا کر پوشیدہ ہوئے یہ غار آج بھی موجود ہے اور بوسہ گاہِ خلائق ہے۔ حضرتِ ابوبکر کے بیٹے عبداللہ جو نوخیز جوان تھے شب کو غار میں ساتھ سوتے، صبح منہ اندھیرے شہر چلے جاتے اور پتہ لگاتے کہ قریش کیا مشورے کر رہے ہیں؟ جو کچھ خبر ملتی شام کو آ کر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) سے عرض کرتے حضرت ابوبکر کا غلام کچھ رات گئے بکریاں چرا کر لاتا۔ آپ اور حضرت ابوبکر ان کا دودھ پی لیتے۔ تین دن تک بس یہی غذا تھی لیکن ابن ہشام نے لکھا ہے کہ روزانہ شام کو اسماء گھر سے کھانا پکا کر غار میں پہنچا آتی تھیں۔ اسی طرح تین راتیں غار میں گزریں + صبح کو قریش کی آنکھیں کھلیں تو پلنگ پر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بجائے جناب امیر تھے۔ ظالموں نے آپ کو پکڑا اور حرم میں لے جا کر تھوڑی دیر محبوس رکھا اور چھوڑ دیا۔ پھر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تلاش میں نکلے، ڈھونڈتے ڈھونڈتے غار کے دہانہ تک آ گئے، آہٹ پا کر حضرت ابوبکر غمزدہ ہوئے اور آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) سے عرض کی کہ دشمن اس قدر قریب آ گئے کہ اگر اپنے قدم پر اُن کی نظر پڑ جائے تو ہم کو دیکھ لیں گے۔ آپ نے فرمایا لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا گھبراؤ نہیں

---

[۵۳] سیرۃ النبی جلد ا۔ ص ۱۹۸ ۔

خدا ہمارے ساتھ ہے۔"

فتح مکہ کے بعد خطبۂ فتح میں آنحضرت نے صرف اہل مکہ نہیں بلکہ تمام عالم کو خطاب کیا۔ شبلی لکھتے ہیں:[۵۳۱]

"خطبہ کے بعد آپ نے مجمع کی طرف دیکھا تو جبارانِ قریش سامنے تھے اِن میں وہ حوصلہ مند بھی تھے جو اسلام کے مٹانے میں سب کے پیشرو تھے۔ وہ بھی تھے جن کی زبانیں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) پر گالیوں کے بادل برسایا کرتی تھیں۔ وہ بھی تھے جن کے تیغ و سنان نے پیکرِ قدسی کے ساتھ گستاخیاں کی تھیں۔ وہ بھی تھے جنہوں نے آنحضرت صلعم کے راستے میں کانٹے بچھائے تھے۔ وہ بھی تھے جن کی نغمہ لبی خونِ نبوت کے سوا کسی چیز سے بجھ نہیں سکتی تھی۔ وہ بھی تھے جن کے حملوں کا سیلاب مدینہ کی دیواروں سے آ آ کر ٹکراتا تھا۔ وہ بھی تھے جو مسلمانوں کو جلتی ہوئی ریگ پر لٹا کر اُن کے سینوں پر آتشیں مہریں لگایا کرتے تھے۔ رحمتِ عالم نے اُن کی طرف دیکھا اور خوف انگیز لہجہ میں پوچھا "تم کو کچھ معلوم ہے؟ میں تم سے کیا معاملہ کرنے والا ہوں" یہ لوگ اگرچہ ظالم تھے، شقی تھے، بے رحم تھے لیکن مزاج شناس تھے پکار اُٹھے کہ اَخٌ کَرِیْمٌ وَابْنُ اَخٍ کَرِیْمٍ۔ تو شریف بھائی ہے اور شریف برادر زادہ ہے۔ ارشاد ہوا لَا تَثْرِیْبَ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ اِذْهَبُوْا فَاَنْتُمُ الطُّلَقَآءُ تم پر کچھ الزام نہیں، جاؤ تم سب آزاد ہو۔"

فاتح و پیغمبر کا امتیاز یُوں دکھایا ہے:[۵۳۲]

"جہاد کے معرکوں میں آپ کے ہاتھ میں گو تیغ و سپر اور جسمِ مبارک پر خود و مغفر ہوتا تھا لیکن اُس وقت بھی پیغمبر اور سپہ سالار کا فرق صاف نظر آتا۔ عین اُس وقت جب کہ معرکۂ کارزار گرم ہے، تیروں کا مینہ برس رہا ہے، تمام میدان لالہ زار بن گیا ہے، ہات اور پاؤں اِس طرح کٹ کٹ کر گر رہے ہیں جس طرح موسمِ خزاں میں پتے جھڑتے ہیں۔ دشمنوں کی فوجیں سیلاب کی طرح بڑھی آ رہی ہیں عین اُسی حالت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دستِ دعا آسمان کی طرف بلند ہے۔ جنگ آور باہم نبرد آزما ہیں اور سرِ مبارک سجدۂ نیاز میں ہے۔ معرکۂ بدر میں حضرت علی عین شدتِ جنگ میں تین بار خبر لینے آئے اور ہر دفعہ دیکھا کہ وہ مقدس پیشانی خاک پر ہے۔ فوجیں تیروں کا مینہ برسا رہی ہیں اور لڑائی کا فیصلہ نہیں ہوتا۔ فاتح بے سلاح زمین سے مٹھی بھر خاک اٹھا لیتا ہے اور دشمن کی طرف پھینکتا ہے

---

[۵۳۱] سیرۃ النبی جلد اول ص ۳۸ - [۵۳۲] ص ۴۵۰

دفعتہً فوجوں کا بادل پھٹ کر مطلع صاف ہو جاتا ہے + حنین میں دشمن نے دفعتہً اِس زور سے حملہ کیا کہ تمام فوج کے پاؤں اکھڑ گئے - ۱۲۰۰۰ ہزار آدمیوں میں سے ایک بھی پہلو میں نہیں - سامنے سے دس ہزار قدر انداز تیر برساتے آ رہے ہیں لیکن مرکزِ حق اپنی جگہ پر قائم ہے اور ایک پُرجلال آواز آ رہی ہے انا النبی لا کذب - میں پیغمبر ہوں اور جھوٹا پیغمبر نہیں ہوں + عین اُس وقت جب کہ صفیں باہم معرکہ آرا ہیں، ہر طرف تلواریں برس رہی ہیں، ہات پاؤں کٹ کٹ کر زمین پر بچھے جاتے ہیں، موت کی تصویریں ہر طرف نظر آ رہی ہیں، اتفاق سے نماز کا وقت آ جاتا ہے، دفعتہً نماز کی صفیں قائم ہو جاتی ہیں، سپہ سالار امامِ نماز ہے، فوجیں صفوفِ نماز ہیں، رجز کے بجائے اللہ اکبر کی صدائیں بلند ہیں - جوش و خروش، تہور و جانبازی، غیظ و غضب، اب عجز و نیاز، تضرع و زاری اور خضوع و خشوع بن جاتا ہے - صفیں دو دو رکعتیں ادا کر کے دشمن کے مقابلہ پر چلی جاتی ہیں - اُن کی بجائے لڑنے والے نمازیں شامل ہو جاتے ہیں - یہ دو رکعتیں ادا کر کے پھر اپنی پہلی خدمت پہ واپس چلے جاتے ہیں - اور مشغولینِ جنگ آ کر بقیہ نماز پوری کر لیتے ہیں لیکن یہ تبدیلیاں فوجوں میں ہوتی ہیں - امام (رسول) اول سے آخر تک عبادتِ الٰہی میں مصروف ہے + تعلیم و ارشاد، ہدایت و تلقین، تہذیب و تزکیہ کا کام ہر وقت جاری ہے - عین فتح کے وقت جب کہ مجاہدین فتح کے نشہ میں چُور ہیں، مالِ غنیمت فروخت ہو رہا ہے، ایک ایک کو ہزاروں کی رقمیں وصول ہو رہی ہیں ایک صحابی خوش خوش آتے ہیں اور جوشِ مسرت میں کہتے ہیں - "یا رسول اللہ! آج میں نے مالِ غنیمت سے جس قدر فائدہ اٹھایا کبھی نہیں اٹھایا تھا، پورے تین سو اوقیہ ہات آئے" (اوقیہ دس روپیہ کے برابر ہوتا ہے) آپ فرماتے ہیں کہ "میں اِس سے بھی زیادہ نفع بتاؤں؟ وہ بڑے شوق سے پوچھتے ہیں کیا؟ ارشاد ہوتا ہے - "نمازِ فرض کے بعد دو رکعتیں"+

مصنفینِ اردو اور شبلی - سرسید کے زمانے کے انشا پردازوں نے اردو کو اردو بنایا + سرسید پہلے لکھنے والے تھے جنہوں نے زبان کو لفظوں کی بے معنی بھرمار اور صنائع و بدائع کے مصنوعی بار اور اس قسم کی دیگر آلائشوں سے پاک کیا - اُن کی تحریریں احساس اور صداقت اپنی فطری عریانی میں نظر آ سکتے ہیں - وہ جو کچھ لکھتے ہیں دل میں جگہ پا لیتا ہے کیونکہ وہ براہِ راست دل سے نکلا ہے + حالی سرسید کے بڑے چیلے تھے حالی گویا نظم کے سرسید تھے، سادگی اصلیت متانت اُن کی تحریر کے جوہر ہیں + نذیر احمد اصلاح کے علم بردار مسلمانوں

کی جمعیت کو اپنی پُر رعب آواز سے پکارتے ہیں۔ دہلی کی بامحاورہ زبان کے چٹخارے اور روزمرہ سے وہ حاضرین کو اپنی طرف متوجہ کر لیتے ہیں۔ آزاد سب تحریکوں سے آزاد ہیں پرانی لکیر کے فقیر نہیں لیکن نہ نئی ڈگر کے مسافر ہیں اپنی راہ آپ بناتے ہیں اور اُسے اپنے ہی طبع زاد پھولوں پتّوں سے سجاتے ہیں۔ اِن سب کی انشا کے نمونے اپنی اپنی جگہ دلکش و دلپذیر ہیں اور ذوقِ سلیم پر بار ہے کہ ہم اس موقع پر اُن کے نقائص کی طرف متوجہ ہوں۔ اِن شیریں زبانوں کے دہن سے بعض ایسے ایسے جملے نکل گئے ہیں کہ کبھی بے ساختہ منہ سے داد نکل جاتی ہے اور کبھی زبان مزے لے لے کر اُنہیں دہرائے جاتی ہے۔ کون بدبخت مسلمان ہے جس نے اپنے نبی کے ظہورِ قدسی کا یہ خطبہ شبلی کی زبان سے نہیں سنا۔

"چمنستانِ دہر میں بارہا روح پرور بہاریں آچکی ہیں، چرخِ نادرہ کار نے کبھی کبھی بزمِ عالم اِس سرو سامان سے سجائی ہے کہ نگاہیں خیرہ ہو کر رہ گئی ہیں۔ لیکن آج کی تاریخ وہ تاریخ ہے جس کے انتظار میں پیرِ کہن سالِ دہر نے کروڑوں برس صرف کر دیئے۔ سیارگانِ فلک اِسی دن کے شوق میں ازل سے چشم براہ تھے۔ چرخِ کہن مدت ہائے دراز سے اِسی صبحِ جاں نواز کے لئے لیل و نہار کی کروٹیں بدل رہا تھا۔ کارکنانِ قضا و قدر کی بزم آرائیاں، عناصر کی جدّت طرازیاں، ماہ و خورشید کی فروغ انگیزیاں، ابر و باد کی تردستیاں عالمِ قدس کے انفاسِ پاک، توحیدِ ابراہیم، جمالِ یوسف، معجز طرازیٔ موسیٰ، جاں نوازیٔ مسیح، سب اسی لئے تھے کہ یہ متاع ہائے گراں آرزو شاہنشاہِ کونین کے دربار میں کام آئیں گے۔ آج کی صبح وہی صبحِ جاں نواز، وہی ساعتِ ہمایوں، وہی دورِ فرخ فال ہے۔ اربابِ سیر اپنے محدود پیرایہ بیانِ زبان میں لکھتے ہیں کہ "آج کی رات ایوانِ کسریٰ کے ۱۴ کنگرے گر گئے، آتشکدۂ فارس بجھ گیا، دریائے ساوہ خشک ہوگیا" لیکن سچ یہ ہے کہ ایوانِ کسریٰ نہیں بلکہ شانِ عجم، شوکتِ روم، اوجِ چین کے قصر ہائے فلک بوس گر پڑے۔ آتشِ فارس نہیں بلکہ جحیمِ شر، آتشکدۂ کفر، آذر کدۂ گمرہی سرد ہو کر رہ گئے، صنم خانوں میں خاک اڑنے لگی، بت کدے خاک میں مل گئے، شیرازۂ مجوسیت بکھر گیا، نصرانیت کے اوراقِ خزاں دیدہ ایک ایک کرکے جھڑ گئے۔ توحید کا غلغلہ اٹھا، چمنستانِ سعادت میں بہار آگئی، آفتابِ ہدایت کی شعاعیں ہر طرف پھیل گئیں، اخلاقِ انسانی کا آئینہ پرتوِ قدس سے چمک اُٹھا۔

یعنی یتیمِ عبد اللہ، جگر گوشۂ آمنہ، شاہِ حرم، حکمرانِ عرب، فرمانروائے عالم، شہنشاہِ کونین

شمۂ نہ مسندِ ہفت اختراں ختمِ رسل خاتمِ پیغمبراں

سیرۃ النبی ص ۱۲۳۔

احمدِ مرسل کہ خرد خاکِ اوست | ہر دو جہاں بستۂ فتراکِ اوست
امیؐ و گویا بزبانِ فصیح | از الفِ آدم و میمِ مسیح
رسمِ ترنج است کہ در روزگار | پیش دہد میوہ پس آرد بہار

عالمِ قدس سے عالمِ امکان میں تشریف فرمائے عزت وجلال ہوا اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَسَلِّمْ

حق یہ ہے کہ یہ پیرایۂ بیان مورخ ونقاد شبلی کا نہیں بلکہ شاعر و عاشقِ رسول شبلی کا ہے مصنف روایت و درایت کے اصولوں کو عبور کرچکا ہے بحث وتنازعہ کے مرحلے طے کرچکا ہے اور ایک ایسے مقام پر پہنچا ہے جس کے لئے وہ کبھی سے ساعئی و بے تاب تھا اور ایک ایسے وقت سے رُو بہ رُو ہے جس کا وہ مدتوں سے منتظر تھا اور ایک ایسے وجود سے دوچار ہونے کو ہے جس کے جلوے کے لئے اُس کی ساری زندگی گویا اک تیاری تھی. وہ بے اختیار ہو جاتا ہے وہ اس وقت دنیا میں یا اُس وجود کا احساس کرتا ہے یا اپنا۔ یہیں اُس کے خیالات تنہائی میں یہاں تک کہ اُس کا محبوب جب اُس کے سامنے آجاتا ہے تو وہ یہ ہدیہ پیش کرتا ہے جس کا سرنامہ ان لفظوں سے عبارت ہے:۔

"ایک گدائے بے نوا شہنشاہِ کونین کے دربار میں اخلاص وعقیدت کی نذر لے کر آیا ہے۔
زچشمِ آستنیں بردار و گوہر را تماشا کن"

حقیقت یہ ہے کہ ایک مسلمان خواہ اُس کا عقیدہ کچھ ہی کیوں نہ ہو اس کے بعد اس تصنیف پر نکتہ چینی کے لئے کیا قلم اٹھا سکتا ہے!

پیرایۂ بیان میں تغیرات ۔ دیکھو ۱۸۸۹ء سے ۱۹۱۴ء تک ۲۵ برس میں شبلی کی انشاپردازی اور اس کے پیرایۂ بیان میں کیا کیا تغیرات آئے ہیں + ذرا المامون کے ابتدائی وانتہائی صفحے کو سیرۃ النبی کے ابتدائی انتہائی صفحوں کے مقابل میں رکھ کر دیکھو تو فرق واضح ہو جائے گا + اُس وقت کا مورخ شبلی شاعر شبلی سے پہلو بچا کر تاریخ وسیرت پر قلم اٹھاتا ہے ۔ اِس وقت کا سیرت نگار شبلی حقیقت کو شعریت سے جدا نہیں کر سکتا، نہیں کرنا چاہتا + اُس وقت کا شبلی سیرۃ مامون کو یوں شروع کرتا ہے[۵۳]

"زمانہ کے انقلاب سے مسلمانوں کی قومی خاصیتیں گو بہت کچھ بدل گئیں اور بدلتی جاتی ہیں تاہم ابھی

---

[۵۳] المامون ص ۲ +

اپنی قومی تاریخ کے ساتھ جو دلچسپی اور شغف اُن کو پہلے تھا اب بھی ہے۔ جس طرح قومی روایتوں کو محفوظ رکھنے میں وہ ہمیشہ نام آور رہے ہیں آج بھی اپنی گذشتہ تاریخ کی طرف اُن کو وہ جوشِ التفات ہے کہ اُس سے زیادہ نہیں ہو سکتا۔

اِس وقت کا شبلی سیرۃ النبی کو گو "تالیف کی ضرورت" کے عنوان سے لیکن یوں شروع کرتا ہے[۳۵]۔

عالم کائنات کا سب سے بڑا مقدم فرض، اور سب سے زیادہ مقدس خدمت یہ ہے کہ نفوسِ انسانی کے اخلاق و تربیت کی اصلاح و تکمیل کی جائے یعنی پہلے ہر قسم کے فضائل اخلاق، زہد و تقویٰ، عصمت و عفاف، احسان و کرم، حلم و عفو، عزم و ثبات، ایثار و لطف، غیرت و استغنا کے اصول و فروع نہایت صحیح طریقہ سے قائم کئے جائیں اور پھر تمام عالم میں اُن کی عملی تعلیم رائج کی جائے"۔

خطوط۔ یہاں گنجائش نہیں کہ اُن کے خطوط پر تبصرہ کیا جائے لیکن چند اقتباسات دیئے جاتے ہیں کہ اُن کی شخصیت اور ادبیت پر کچھ روشنی پڑے اور ظاہر ہو کہ جہاں وہ مصنّف بن کر نہ نکلتے تھے وہاں کس خلوص و شستگی کے مالک تھے۔ ایک خط میں جو مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے نام ہے لکھتے ہیں[۳۶]

ع آنچہ استادِ ازل گفت ہماں مے گویم۔ آپ نے دیکھا اِدھر اوقافِ اسلامی کی تحریک شروع ہوئی اُدھر گورنمنٹ نے یادداشت شائع کی اور ایک کانفرنس اِسی مہینہ میں بٹھانے والی ہے۔ خیر میرا کام تو اس کے پیچھے جان لڑا دینا ہے۔ ع آگے نصیب ہے، جسے پروردگار دے۔ ہاں دار المصنفین پر کیوں آپ نے سکوت کیا۔ آپ سے بڑھ کر اس کی شرکت کا کس کو حق ہے۔ میں اس عمارت کو انشا اللہ پورا کر کے رہوں گا۔ اور شاید وہی میرا مدفن بھی ہو۔ ۲۴ سے پہلے علی گڑھ پہنچوں گا۔

شبلی ۱۶ - فروری سنہ ۱۹۱۴ء

سیّد سلیمان ندوی کو ایک خط میں لکھتے ہیں[۳۷]:-

عزیزی! تم نے اپنی حالت کے متعلق حجابانہ طریقہ میں اظہارِ خواہش کیا ہے۔ عزیزی! کیا اس کے کہنے کی حاجت ہے تم ہر وقت میری آنکھوں میں ہو اور میں موقع ڈھونڈتا رہتا ہوں لیکن اتنی جلدی کون کامیاب ہؤا ہے۔ میاں حمید اُس لیاقت پر جو زمانہ کے موافق بھی تھی کتنے دنوں کے بعد ٹھکانے لگے خود میرا کیا حال ہؤا، عمادی کس حالت میں ہیں"۔

---

۳۵ سیرۃ النبی ص ۱ ۳۶ مکاتیب شبلی جلد اول ص ۲۰۸ - ۳۷ مکاتیب شبلی جلد دوم ص ۶۸

بمبئی سے ایک خط میں اُن کو لکھتے ہیں :-

"یا تو سموم لکھنؤ میں جھلس رہا تھا یا یہاں بہشت کی ہوائیں آرہی ہیں تمام دن اور تمام رات اس قدر ہوا کے جھونکے آتے ہیں کہ بیان نہیں ہو سکتا ۔ شاید اب کی زیادہ رہوں ۔ ہاں اب الندوہ یوں چلتا نظر نہیں آتا پھر تم اپنے ہاتھ میں لو ۔ جو شرطیں پیش کروگے منظور کروں گا ۔ مجھ کو الندوہ سے کوئی غرض نہیں لیکن وہ درحقیقت ندوہ کا ایک اعلان ہے اس کو مٹانا نہیں چاہیئے ۔ . . . . . غزلیں ہو رہی ہیں لیکن چھپکی کہاں تک ؟ آخر عمر اور سن کا بھی کچھ تقاضا ہے ۔ شبلی ۲۹ مئی سنہ ۱۹۱۱ء بمبئی

زہرا فیضی صاحبہ کو ایک خط (مورخہ ۱۵ فروری سنہ ۱۹۰۹ء) میں لکھتے ہیں ۔ نزاکتِ خیال اور شوخیٔ بیان ملاحظہ ہو :-[۱۳۸]

"خاتونِ محترم! عنایت نامہ پہنچا ۔ آپ نے مختصر نویسی کی شکایت کی ہے لیکن انصاف فرمائیے اگر ایک کاغذ بالکل سادہ ہو اور ایک پر دو ہی حرف ہوں تو آپ کس کو مختصر کہیں گی ۔ میں نے تو سلام علیکم بھی لکھا لیکن آپ صاحبوں نے تو مطلق یاد ہی نہیں کیا ۔ شاید آپ کو معلوم ہوا ہو گا کہ میں بارِ خاطر ہونے سے بہت پرہیز کرتا ہوں ۔ جب میں وہاں تھا یا جب کبھی آپ لوگوں سے ملاقات ہوتی ہے تو اس کا ہر وقت کھٹکا رہتا ہے کہ میری ملاقات سے آپ گھبرا نہ گئی ہوں ۔ یہی حالت خطوط لکھنے کی ہے ۔ اور جب یہ دیکھتا ہوں کہ آپ صاحبوں کے خطوط کبھی ابتداً نہیں آتے بلکہ میرے جواب میں آتے ہیں تو سمجھ لیتا ہوں کہ کیوں بار بار زحمت دوں اور زبردستی آپ سے جواب حاصل کروں ۔ بہر حال مختصر نویسی کا یہ سبب ہے ورنہ میں تو دفتر لکھ کر بھی سیر نہ ہوں"

شبلی کے اسلوبِ بیان کا اثر ۔ آزاد کے مقابل میں شبلی کے اسلوبِ بیان میں یہ خصوصیت ہے کہ اس کا تتبع سہل ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ گذشتہ بیس پچیس سال میں شبلی کے اسلوبِ بیان نے اردو کے اسالیبِ بیان پر بے انتہا اثر ڈالا ہے اور جو لوگ اب سلامت روی کے ساتھ تاریخ و سیر پر قلم اٹھاتے ہیں اُن کی تحریریں جا بجا شبلیانہ طرزِ بیان کی جھلکیاں پائی جاتی ہیں ۔ اُن کا اسلوب شگفتہ ہونے کے ساتھ شوکت و متانتِ بیان کا پہلو لئے ہوتا ہے ۔ تاریخ و فلسفہ میں اُن کے خاص عربی مفرد و مرکب الفاظ اور ترکیبیں اب مدت سے اردو کے اخباروں رسالوں میں رائج ہو چکی ہیں ۔ وہ اُن زبردست مصنّفوں میں ہیں جنہوں نے اردو زبان کو اُس زمانے میں جب

---

[۱۳۸] خطوطِ شبلی ص ۱۰۰

پہلی بار اُسے سادہ و سہل بنانے کی کوششیں جاری تھیں بہت سے ایسے نئے الفاظ سے روشناس کرایا جن سے وسعتِ بیان میں آسانیاں پیدا ہوگئیں + تاریخ و سیرت کے پیچیدہ سے پیچیدہ مضامین اگر آج عام فہم طور پر اردو میں ادا کئے جا سکتے ہیں تو اس مشکل کو آسان کرنے والا پہلا شخص بلاشبہ شبلی ہی تھا +

ترتیبِ کتاب ۔ پیرایۂ بیان کی یہ سہل نگاری دراصل اُس نظم و ترتیب کا اک نتیجہ ہے جو لازم طور پر شبلی کی طبیعت کا ایک جزو ہوگی ۔ راقم شبلی کے ذاتی روزمرہ کے حالات و عادات سے مطلق واقف نہیں لیکن وہ اُن کے اقوال، اُن کے پیرایۂ بیان، ترتیب و تنظیمِ واقعات اور تحلیل و تقسیمِ موضوعات میں اُس صفائی اور سادگی اور نفاست پسندی کی ایک جھلک دیکھ سکتا ہے جو شبلی کی زندگی کا ایک لازمہ ہوگا + مثال کے طور پر الفاروق کو لو۔ یہ کتاب ۱۸۹۹ء میں نامی پریس کانپور میں شائع ہوئی اور اس لحاظ سے اس کی ظاہری صورت نہایت پسندیدہ ہے اور لکھائی چھپائی بھی حسبِ حال ہے ۔ شروع میں فہرستِ مضامین ہے جس سے تقسیم و ترتیبِ مضمون کے سمجھنے میں سہولت ہوتی ہے + پہلے تاریخ، عربی تاریخ، تاریخ، اصولِ فنِ تاریخ، تاریخی طرزِ تحریر اور اس خاص کتاب کی ترتیب و حوالہ جات پر ۲۲ صفحے کا ایک دیباچہ ہے ۔ اگلا عنوان ہے حضرتِ عمر کا نام و نسب ۔ سنِ رشد و تربیت ۔ پھر قبولِ اسلام جس سے اُن کی زندگی میں ایک انقلاب آیا ۔ پھر ہجرت جس سے اسلام کی تاریخ میں ایک انقلاب آیا پھر آنحضرت کے زمانے کے واقعات تا وفات ۔ پھر سقیفہ بنی ساعدہ کا جھگڑا اور حضرت ابوبکر کی خلافت ۔ اس کے بعد حضرتِ عمر کی خلافت اور فتوحات ۔ فتوحات کی الگ الگ فصلیں ہیں یعنی عراق = واقعۂ بویب ۔ قادسیہ کی جنگ فتوحاتِ شام ۔ فتح دمشق ۔ فحل ۔ حمص ۔ جنگِ یرموک ۔ حضرتِ عمر بیت المقدس میں ۔ حمص کی دوسری لڑائی ۔ خالد کی معزولی ۔ عمواس کی وبا فیساریہ و جزیرہ ۔ خوزستان ۔ عراقِ عجم ۔ ایران پر عام لشکر کشی ۔ آذربیجان ۔ طبرستان آرمینیہ ۔ فارس ۔ کرمان ۔ سیستان ۔ مکران ۔ خراسان ۔ مصر ۔ اسکندریہ کی فتوحات ۔ اخیر میں ۱۰ برس چھ مہینہ ۴ دن کی خلافت کے بعد حضرتِ عمر کی شہادت ۔ یہ کتاب کا پہلا حصہ ہے جس میں حضرتِ عمر کے مختصر ابتدائی حالات اور فتوحاتِ اسلام کا ذکر ہے + دوسرے حصے میں جو اس مہتم بالشان تصنیف کی روح و رواں ہے ۔ ملکی و مذہبی نظام پر ایک غائر نظر ڈالی ہے اور حضرتِ عمر کے ذاتی حالات و واقعات درج ہیں جن سے اُن کی شخصیت پر روشنی پڑتی ہے ۔ اس حصے کے عنوانات یہ ہیں ۔ فتوحات پر ایک اجمالی نگاہ ۔ نظامِ حکومت (جس میں ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ حضرتِ عمر کی حکومت صحیح جمہوری اصولوں پر مبنی تھی) ملک کی تقسیم، صوبجات اور اضلاع، عہدہ دارانِ ملکی ۔ صیغۂ محاصل ۔ صیغۂ عدالت ۔ افتا ۔ فوجداری اور پولیس ۔ بیت المال یا خزانہ ۔ پبلک ورکس

یا نظارتِ نافعہ - شہروں کا آباد کرنا - صیغۂ فوج - صیغۂ تعلیم - صیغۂ مذہبی متفرق انتظامات - ذمی رعایا کے حقوق
غلامی کا رواج کم کرنا - سیاست و تدبیر - عدل و انصاف - امامت اور اجتہاد + اس کے بعد ہیں ذاتی حالات اور اخلاق
و عادات (جن کے پڑھنے میں اک افسانے کا لطف آتا ہے) ازواج و اولاد - خاتمہ + واقعات کو الگ الگ
کر دیا ہے - جہاں ایک اہم واقعہ پیش آیا جس کے بعد یا جس کی وجہ سے آنے والے واقعات کا رنگ پلٹ گیا وہاں
سے ایک الگ فصل شروع کر دی ہے + ضمناً ملکی حالات کے ساتھ معتبر روایات کو نقل کیا ہے جس سے کتاب کہیں
خشک یا غیر دلچسپ نہیں ہونے پاتی - سفارتوں کے مکالمے، میدانِ جنگ کے معرکے اور حادثے تاریخ کو افسانے
کی طرح دلکش بنا دیتے ہیں - ساتھ ہی ساتھ بحث طلب امور پر تحقیق و تدقیق سے غور کیا ہے اور گتھیوں کو ساتھ ساتھ
سلجھا دیا ہے + دوسرے حصے میں جملہ نظاماتِ حکومت پر یکے بعد دیگرے نگاہ دوڑائی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ
گویا ہم کسی موجودہ دولتِ متمدن کا حال کسی علمی جریدہ میں پڑھ رہے ہیں - یہی اس حصے کا جزوی نقص بھی ہے
مانا کہ حضرتِ عمر کے زمانے میں وہ ترقیاں بروئے کار آئیں وہ ملکی و مذہبی ایجادات و اختراعات ہوئیں وہ ادارات
قائم ہوئے جن میں سے اکثر کا پہلے وجود نہ تھا اور جو اکثر جزوِ اسلام بن گئے بنے رہے لیکن اِن تمام حالات و بیانات
کو اِس طرح پیش کرنا چاہئے تھا کہ یہ شبہ نہ ہو کہ مورخ یہ ثابت کرنے کے در پے ہے کہ حضرتِ عمر کا زمانہ یورپ
کی انیسویں صدی کا زمانہ ہے + لیکن ایک اس فروگذاشت کے علاوہ اس حصۂ کتاب میں بظاہر کوئی کمی نہیں
مصنف نے دریافتِ حالات میں کمال تحقیق اور بیان میں کمال وضاحت سے کام لیا ہے + یقیناً "الفاروق"
اردو کی بہترین تصنیفات میں شمار ہونے کے قابل ہے اور وہ شبلی کی بہترین تصنیف ہے -

مصنفانہ طریق کار - شبلی کے مصنفانہ طریق کار کے متعلق "سیر المصنفین" میں لکھا ہے کہ[۲۹]

مولانا شبلی کی زندگی میں چند باتیں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں ایک یہ کہ باوجود نہایت ضخیم کتابیں تالیف کرنے سے اور
کثیر التصانیف ہونے کے وہ کسی دن بھی فلسکیپ کے دو یا تین صفحے سے زیادہ نہیں لکھتے تھے - زیادہ وقت
مطالعہ میں اور زیادہ سے زیادہ دو ڈھائی گھنٹے لکھنے میں صرف کرتے تھے - لکھنے دیر میں اور سوچ کر مگر اس
میں کاٹ پھانس بہت کم ہوتی تھی - ہمیشہ ایک دو سطر بیچ میں چھوڑ کر کھلا کھلا لکھتے تھے - خط نہایت
صاف اور با قاعدہ ہوتا تھا آخر عمر تک خوشنویسی کی شان اِس قدر تھی کہ شاید ہی کوئی اتنا بڑا مصنف
حروف کی خوبصورتی کی اس قدر پروا کرتا ہو - ایک خاص بات اُن کی طبیعت میں یہ تھی کہ بجز تعلیم اور علمی

---

[۲۹] سیر المصنفین جلد ۲ ص ۲۴۰

مذاکرہ و مباحث کے اَور کسی بات سے دلچسپی نہ تھی۔ غالبًا ۱۷ برس کی عمر سے ۵۷ برس کی عمر تک اُن کے پورے ۴۰ سال خالص علمی زندگی میں بسر ہوئے۔ یہ علمی زندگی بھی محض تقلیدی ورق گردانی نہ تھی اور نہ صرف بے کار معلومات کا دماغ میں جمع کرنا اِس کا مقصد تھا بلکہ وہ اس کے ذریعہ روشنی اور آزادی پھیلانا چاہتے تھے۔"

مقبولیّت۔ شبلی کی تصنیفات کو جو مقبولیت تعلیم و تمدن یافتہ طبقہ میں حاصل ہوئی وہ بہت کم اور مصنفین کی تصنیفات کو ہوئی۔ آزاد کی بعض تصنیفات اور حالی کی مسدّس کو چھوڑ کر غالبًا مسلمانوں کو کسی حال کے مصنف سے اس قدر رغبت نہیں ہوئی جتنی شبلی سے۔ شبلی نے تاریخ اور فلسفہ کو جدّت کے رنگ اور ادب کی زبان میں لکھا، جو کچھ کہا تحقیق کے بعد کہا اور اس کے کہنے میں متانت اور سنجیدگی کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ الفاروق نے خاص و عام کے دلوں پر قابو پالیا۔ الکلام نے بہت سے "یورپ زدہ" مسلمانوں کی مرہم پٹّی کی اور کامیابی کے ساتھ کی۔ الغزالی کے متعلق الکلام کی تمہید (رقمزدہ مہر کاظم علی) میں لکھا ہے کہ "یہ امر خاص طور پر ذکر کے قابل ہے کہ سالِ رواں (سنہ ۱۹۰۲ء؟) میں ہندوستان کی گورنمنٹ نے اپنی انتظامی رپورٹ کے صفحہ (۶۰) میں الغزالی کو جو اسی سررشتہ (علوم و فنون حیدر آباد دکن) کی تصنیف شدہ ہے تمام کتابوں پر ترجیح دی ہے اور نہایت مدحیہ الفاظ میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔"

موازنۂ انیس و دبیر اور شعر العجم اکثر نوجوان اردو شاعروں اور ادیبوں اور طالب علموں کے زیرِ مطالعہ رہتے ہیں اور اُن سے اور حالی کے مقدمۂ شعر و شاعری سے تنقید کے اصول واضح ہو کر ادب و شعر روز بروز جلا پا رہے ہیں۔ شبلی کی آخری تصنیف سیرۃ النبی کو جو قبولیتِ عامہ حاصل ہوئی وہ گزشتہ چند سالوں سے کسی تصنیف کو نہیں ہوئی۔ اکثر مسلمان گھروں میں اور اکثر مسلمان نوجوانوں کے پاس اس عزیز و محبوب تصنیف کی ایک جلد ضرور موجود ہے اور جس تعلیم یافتہ مسلمان نے اس کا مطالعہ نہیں کیا اکثر دیکھا گیا ہے کہ وہ اپنے تساہل کی وجہ سے بزمِ ادب میں شرمسار نظر آتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ شبلی کی تصنیفات کو اُن کی زندگی میں اور اُن کے بعد کس قدر مقبولیّت حاصل ہوئی اور کیسے اُن کا نام ہندی مسلمانوں کی مذہبی و علمی زندگی میں ہر دل عزیز اور ممتاز ہے۔

کمیاں۔ شبلی میں بلا شبہ بہ حیثیتِ مصنف متعدد خوبیاں اور وصف ہیں جن میں سے اکثر صریحًا یا اشارۃً بیان ہو چکے لیکن آخر اُن میں کمیاں بھی تو ہونگی۔ اُن کی خوبیوں کے بعد ہمارا فرض ہے کہ ہم اِن کمیوں پر

ایک سرسری نگاہ ڈالیں +

شبلی نے جہاں اسلامی تمدّن کی خوبیاں دکھائی ہیں وہاں ملکی تنظیم وتنسیق اور سیاسی ادارات کا اِس طریقے سے ذکر کیا ہے اور اُن کی تفصیلات ایسے پیرائے میں بیان کی ہیں کہ شبہ ہونے لگتا ہے کہ وہ بالکل آج کل کے مغربی نظامات سے مشابہ تھے + مثلاً حضرتِ عمر کی جمہوری حکومت کے انداز کو یا اس کے ضمن میں انگریزی الفاظ کونسل اور پبلک ورکس اور پولیس کو اس طرح استعمال کیا ہے گویا اُس وقت کے ادارے بالکل آج کل کے اداروں کی مانند تھے + دوسرے جہاں مسلمان حکمرانوں کو متعصب نکتہ چینوں سے بچانے کی کامیاب کوشش کی ہے وہاں بعض چیزوں کو خواہ مخواہ پسندیدگی کی نظر سے دیکھا ہے مثلاً ذمیوں کی وضع کو مسلمانوں کی وضع سے الگ رکھنے کا اصول جو حضرتِ عمر نے قائم کیا تھا اُس کو بنظرِ استحسان دیکھنے کی کوئی وجہ نہیں بالخصوص جب کہ ہمیں معلوم ہے کہ حضرتِ عمر نے عام طور پر ذمیوں کے حقوق کا ہر ایک طرح خیال رکھا یہاں تک کہ اپنی وصیت میں یہ خاص طور پر جتا یا کہ ذمیوں سے جو عہد کئے گئے اُن کا خیال رکھا جائے اور اُنہیں اُن کی طاقت سے بڑھ کر تکلیف نہ دی جائے + اِسی طرح اورنگ زیب کے بعض فتنہ گروں کے مندر ڈھا دینے پر صاد کرنا شبلی کے شایانِ شان نہیں ۔تیسرے بعض مقامات پر مبالغہ بیان سے کام لیا ہے مثلاً الغزالی میں جہاں بیان کیا ہے[۵۴] کہ امام صاحب نے فلسفۂ اخلاق پر کیا اضافہ کیا وہاں لکھا ہے کہ اخلاق میں انہوں نے نفسِ فن کو اس قدر وسعت دی کہ یونانیوں کا فلسفۂ اخلاق اُس کے مقابلے میں قطرہ و دریا کی نسبت رکھتا ہے + اسی طرح علم الکلام میں شاہ ولی اللہ کے متعلق لکھا ہے[۱۴۱] کہ اُن کی نکتہ سنجیوں کے آگے غزالی رازی ابن رشد کے کارنامے بھی ماند پڑ گئے + الفاروق میں لکھتے ہیں[۱۴۲] کہ حضرتِ عمر نے فوجی نظم ونسق کو اس قدر مرتب اور منتظم کر دیا کہ غالباً اس عہد تک کہیں اَور کبھی نہیں ہوا تھا + شعر العجم میں فیضی کے متعلق لکھا ہے[۱۴۳] کہ فیضی کی خصوصیات میں سب سے بڑھ کر جوشِ بیان ہے جس کا وہ موجد بھی ہے اور خاتم بھی" کتاب کے خاتمے پر فلسفیانہ شاعری کے تحت میں لکھتے ہیں[۱۴۴] "فارسی شاعری میں فلسفیانہ خیالات کا جس قدر ذخیرہ ہے کسی زبان میں نہیں" اس قسم کے بیانات میں اگر ذرا زیادہ محتاط الفاظ استعمال کئے جاتے تو بہتر ہوتا ورنہ ان میں کوئی ایسی فاش غلطی نہیں کہ ان کو قطعی لغو قرار دیا جائے + چوتھے ۔مذہبی اعتقاد کی بنا پر بعض جگہ واقعات کو اصولِ درایت کی نگاہ سے

---

[۵۴] الغزالی ص ۸۹ [۱۴۱] ص ۱۰۹ [۱۴۲] الفاروق ۔جلد دوم ۔ص ۹۷ [۱۴۳] شعر العجم ۔جلد سوم ۔ص ۲۷۔
[۱۴۴] شعر العجم جلد ۔۵ ۔ص ۲۰۵ ۔

نہیں دیکھا مثلاً امام غزالی کی وفات پر بروایتِ ابن جوزی لکھتے ہیں کہ "پیر کے دن امام صاحب صبح کے وقت بسترِ خواب سے اٹھے، وضو کرکے نماز پڑھی، پھر کفن منگوایا اور آنکھوں سے لگا کر کہا "آقا کا حکم سر آنکھوں پر" یہ کہہ کر پاؤں پھیلا دیئے۔ لوگوں نے دیکھا تو دم نہ تھا" اس قسم کی روایتوں پر شبلی عموماً یقین نہیں کرتے اور عموماً اُن کی ایسی تاویل کرتے ہیں کہ روایت کے خول کے اندر سے اصل واقعہ ظاہر ہو جاتا ہے لیکن کہیں کہیں ایسے تسامحات ہیں جن سے شبہ پڑتا ہے کہ قوتِ تنقید زورِ اعتقاد کے نیچے دب گئی + پانچویں۔ اس میں کچھ شبہ نہیں کہ اگرچہ شبلی نے بالعموم مسلمانوں کے مذہب اور معاشرت میں آزادگی اور حریت اور عقل پسندی کے اصولوں کو برتا، اک نیا علمِ کلام مرتب کیا جس سے عقل و حجت کے ذرائع سے انہوں نے یورپ کی دہریت اور الحاد کی ایک بڑی حد تک روک تھام کی یہاں تک کہ نیا طبقہ اُن سے خوش ہوگیا اور علما کی جماعت کے اکثر افراد اُن سے برگشتہ ہوتے گئے لیکن پھر بھی بعض باتوں میں انہوں نے حالات سے متاثر ہوکر پوری وسیع نظری سے کام نہیں لیا + مثلاً زہرہ فیضی صاحبہ کو ایک خط میں لکھتے ہیں کہ "ہم پرانے لوگ آزادی سے بے پردہ مجامعِ عام میں تقریر کرنا پسند نہیں کرتے لیکن آپ تو اس میدان میں آچکی ہیں اس لئے اب جو کچھ ہو کمال کے درجے پر ہو" یہاں تک کہ اُن کے ساتھ ولایت جانے پر بھی نیم آمادہ ہو جاتے ہیں یہ کہہ کر کہ "یورپ کی ہم سفری بھی چنداں بعید نہیں ممکن ہے ہمت پیدا ہو اور ساتھ چل سکوں" اس کے ساتھ ہی مقالاتِ شبلی میں گلبدن بیگم کے ذکر میں ناپردہ داروں پر چوٹ کر گئے ہیں[۵۷] اور سفرنامہ میں تھیٹر میں جانے کو معیوب کہا ہے[۵۸] لیکن خیر یہ مدت ہوئی اُس وقت کی رائے ہے + اصل یہ ہے کہ شبلی کم از کم اواخرِ عمر میں پردے کی سی پرانی رسوم کے دل میں ضرور مخالف ہونگے اور اسی طرح تھیٹر کو "وقار و شائستگی کے خلاف" نہ سمجھتے ہونگے لیکن اکثر ایسی باتوں میں اُن کو جرأت نہ ہوئی کہ وہ قدیم وضع کے علما و فضلا کے ہوتے علانیہ اپنی نئی رایوں کا اظہار کرتے اور ہدفِ ملامت بنتے + چنانچہ ایک خط میں عطیہ بیگم صاحبہ کو کم ہمتی کے الزام کے جواب میں لکھتے ہیں "تم کو کیا معلوم ہے کہ میں اگر عوام کی مرضی کا کسی حد تک لحاظ نہ رکھوں تو ایک نہایت مفید تحریک فوراً برباد ہو جائے" اس سے ظاہر ہے کہ شبلی ایک نیک دل مصلح و مدبر تھے جو زمانے کی مصلحتوں پر نظر رکھتے تھے لیکن ایک مجاہد یا مہاتما نہ تھے کہ وقتی بندشوں کو بے دھڑک توڑ سکتے اور جان و مال و عزت سب کو صداقت کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دیتے +

شبلی بحیثیتِ مصنف۔ اخیر میں ہمیں شبلی کی بہت سی خوبیوں اور تھوڑی سی کمیوں سے قطع نظر کرکے

---

[۵۷] مقالاتِ شبلی ص ۷۹، [۵۸] سفرنامہ ص ۱۱۱۔

یہ دیکھنا ہے کہ "شبلی بحیثیتِ مصنف" کیا کچھ تھا؟ اِس سوال کا جواب اُس وقت تک نہیں مل سکتا جب تک ہم اُس کی تصنیفات کو جو سات ہزار سے زائد صفحات پر مشتمل ہیں پس پشت ڈال کر یہ نہ سوچیں کہ "شبلی بحیثیتِ انسان" کیا کچھ تھا؟ شبلی اُس وقت ہندوستان میں پیدا ہؤا جب یہاں کے مسلمان قعرِ ذلّت میں گرا دیئے گئے تھے، جب حکومت و جہانبانی کے ساتھ اُن کی شجاعت وہمت اور ایثار و خودداری بھی رخصت ہو چکی تھیں۔ وہ ایک ایسی فضا میں پیدا ہؤا جس میں مغربیت کی مخالفت قدامت و تعصب کی بجلی بن کر مضمر تھی۔ لیکن حسنِ اتفاق سے زمانہ اُسے ایک ایسے اصلاح یافتہ اسلامی ماحول میں لے گیا جہاں مشرقیت و مغربیت کے صحیح امتزاج نے ظلمتِ زوال میں نورِ کمال کا عالم پیدا کر دیا تھا۔ اُس کی طبیعت کے جوہر اِس نئی روشنی میں چمکے، اُس کی جودتِ طبع کی کرنیں دور و نزدیک پڑنے لگیں اور آخر اِس تابش میں اُس نے اپنے لئے ایک نیا جادۂ علم و اعتقاد وضع کر لیا۔ وہ اس امر کا متمنی ہؤا کہ علماء کی تہذیب و تنظیم کر کے ہندوستان کے مسلمانوں کو پھر قرونِ اولیٰ کی شان دار زندگی کی طرف لے جائے لیکن مواد تیار نہ تھا کہ اُس سے یہ عالی شان قصر تعمیر ہو۔ مجبوراً شبلی کو اِس سودمند کام سے ہاتھ اُٹھانا پڑا۔ وہ اپنے وطن کو واپس چلا گیا لیکن اُس کی فطرت اُسے نچلا نہ بیٹھنے دیتی تھی۔ اُس نے تنظیم کی نئی راہیں تلاش کیں اور بالآخر کار ایک خود ساختہ راہ پر ایک علمی گروہ کو لئے ہوئے چل نکلا تھا کہ داعیٔ اجل نے پروانۂ رحلت لا پیش کیا!

اِس راہ کا پہلا چلنے والا نہ رہا لیکن راہ قائم ہے اور روز بروز خس و خاشاک سے پاک و صاف ہو رہی ہے اور اسلامی روش پر چلنے والوں کو ہر لحظہ خیر مقدم کہنے کے لئے تیار ہے۔

شبلی ایک بڑا مصنّف تھا لیکن اس کے ساتھ وہ ایک پکّا مسلمان بھی تھا۔ وہی اُس کے اوصاف ہیں جو ایک پکّے راست باز مسلمان کے ہو سکتے ہیں اور وہی اُس کی کمیاں ہیں جو ایک پکّے راست باز مسلمان میں عموماً پائی جائیں گی!

کون سا پیغام تھا جو شبلی لے کر آیا؟ اہلِ اسلام کا اسلام مکدّر ہو رہا تھا۔ نوجوان مسلمان مذہب سے منحرف ہو رہے تھے۔ یورپ آزاد خیالی اور عقل پسندی کا نعرہ بلند کر رہا تھا۔ شبلی نے اِس کے مقابل میں اسلامی حُرّیت و معقولیت کا آوازہ لگایا، بھٹکے ہوؤں کو واپس بلایا کہ جس عقل کے جوہر کو تم غیروں کے ہاں ڈھونڈنے جاتے ہو وہ یہیں تمہاری قومی خس و خاشاک میں چُھپا پڑا ہے آؤ اور اسے علم و تنقید کے ہاتھوں سے کھود نکالو!

شبلی دربارِ رسول کا عقیدت مند ہے وہ اسلام کا علم بردار ہے۔ وہ جو کچھ دیکھتا ہے اسلام کی آنکھوں سے جو کچھ کہتا ہے اسلام کی زبان سے اور جو کچھ سنتا ہے اسلام کے کانوں سے۔ اسلام اُس کی روح ہے اور اِسی سے اُس

کی دیکھنے اور بولنے اور سننے کی قوتیں برقرار ہیں - اس لئے اگر ایک غیر مسلم اعتراض کرے کہ شبلی چیزوں اور باتوں کو محض ایک مسلم بن کر دیکھ سکتا ہے تو اعتراض بجا ہے لیکن پھر اگر شبلی دُنیا و مافیہا کو ایک مسلم کی نظر سے نہ دیکھے تو حقیقت یہ ہے کہ وہ اِس کو مطلق دیکھ ہی نہیں سکتا - اُس کی بینائی کو سرمۂ اسلام لازم ہے - کیا اب ہم کہیں کہ وہ اس سے مدد نہ لے ؟ اِس کے معنی ہونگے کہ اُس جسم سے روح نکل جائے اُس جوہر سے چمک جاتی رہے اُس شخصیت سے اُس کی انفرادیت چھین لی جائے !

کارلائل نے خوب کہا ہے کہ ایمان بڑی چیز ہے ایمان زندگی بخش ہے ! وہ ایمان ہی تھا جس نے عرب کو اِدھر دہلی اور اُدھر غرناطہ تک پہنچا دیا !

شبلی کا ایمان اسلام ہے اس لئے شبلی کی زندگی اسلام سے ہے اور اُس کا جو پیغام ہے وہ فی الحقیقت اسلام کا پیغام ہے ! سچ یہ ہے کہ اسلام کا احیا اگر دنیا میں پھر ہو سکتا ہے ، اہلِ اسلام کے مردہ جسم کی یہ روح اگر پھر زندہ ہو سکتی ہے تو محض ایسے ہی پُر خلوص و پُر جوش نفوس کی ہمت و کارپردازی سے !

کیا ہم شبلی سے امید رکھ سکتے ہیں کہ وہ فاروقِ اعظم اور پیغمبرِ اسلام کی شخصیتوں کے متعلق نکتہ چینی کا قلم اُٹھائے ؟ یہ امید ایسی ہی ہے جیسی ایک یہ امید کہ ایک ننھا بچہ اپنی ہی ماں سے محبت نہ کرے لپٹ نہ جائے اُس کی نگاہوں میں اپنی خوشیوں کی جنت نہ ڈھونڈا کرے بلکہ غیروں سے اُس کی برائی سنے یا کسی کے سامنے بلکہ اپنے آگے اپنے دل میں بھی اُس کو اک ذرا سا برا بھلا ہی کہہ سکے ۔

اردو کے دوسرے بڑے مصنفین سے شبلی کا مقابلہ نہ صرف غلط ہوگا بلکہ لا حاصل - شبلی میں اپنی خوبیاں تھیں اُن میں اپنی - ہر شخص اور ہر شے کو اپنی جگہ دیکھو کہ

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است

ہاں خالص تصنیفی حیثیت سے الگ ہو کر محض انسانی و تمدنی حیثیت سے دیکھیں تو ظاہر ہے کہ اردو مصنفین میں شبلی ہی تنہا وہ مصنّف ہے جس نے اک دار المصنفین اپنی یادگار چھوڑا !

بشیر احمد

راز و نیاز

تم کہاں ہو میرے جیون دھن (سرمایۂ زندگی)؟ کیا نہ ملو گے؟ سچ سچ نہ ملو گے؟ اس زندگی میں تمہیں ڈھونڈتے ڈھونڈتے امید کی جوانی تھک کر چراغِ سحری کی طرح ہو چلی ہے۔

دیکھو زیادہ نہیں صرف ایک مرتبہ۔ صرف ایک بار تم مجھے اتنا بتا دو کہ تم میرے ہو۔ مجھے چاہتے ہو پھر میں فرہاد کی طرح، مجنوں کی طرح تمہیں ڈھونڈوں گا۔ جنگل جنگل پتے پتے میں ڈھونڈوں گا اور تمہیں تلاش کر لوں گا۔

آہ! تم بولتے کیوں نہیں۔ دیکھو تمہارے ہاتھ کا کھلونا یہ چندرماں ہنس ہنس کر کیسی پریم رس کی بارش کر رہا ہے۔

—— لیکن تم چپ ہو۔

لوگ تم کو منصف اور رحمدل کہتے ہیں۔ یہ جھوٹ ہے بالکل جھوٹ ہے۔ تم کیا ہو یہ میرے دل سے پوچھو۔ تم بے رحم ہو، سنگ دل ہو —— ہاں پتھر ہو —— بالکل پتھر۔

میں دیکھتا ہوں تم مجھ سے ناراض سے رہتے ہو۔ اور ناراض ہی نہیں بلکہ میرے خیال میں تم مجھ سے دشمنی بھی رکھتے ہو۔

میں جتنا تمہارے نزدیک پہنچنے کی کوشش کرتا ہوں تم اُتنا ہی مجھ سے دور ہو جاتے ہو۔ میں تمہارے درشن کا پیاسا ہوں اور تم مجھ سے چھپتے پھرتے ہو۔ میں تمہیں سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں اور تم میرے لئے معمّا بن جاتے ہو۔

کیا کہا؟ میں بُرا ہوں! واقعی میں بُرا ہوں بہت بُرا ہوں۔ اچھا تو میرے اچھے ساجن! تم مجھ کو بھی اچھا کیوں نہیں بنا دیتے۔ تم نے مجھے بُرا بننے ہی کیوں دیا۔

اگر تم مجھ سے بولو، مجھے اپنا درشن دو، مجھے اپنے چرنوں کے پاس بیٹھنے دو، تو کیا میں کبھی اچھا نہ بن جاؤں گا!

میں دیکھتا ہوں اے میرے سرولیشور! تم روزِ ازل سے مجھے اچھا بنانے کی فکر میں ہو۔

ہائے تم نے کتنی خوشامدیں کیں۔ کتنا ڈرایا اور دھمکایا لیکن تمہارا یہ غلام تمہارے قابو میں نہ آیا۔

تمہاری خوشی کے سامنے مجھے جنت کی نعمت اور دنیا کی دولت کی کچھ پروا نہیں۔

جنّت اور نجات! آہ یہ تو تھکے ہوئے بچوں کو بہلانے کے کھلونے ہیں۔

میں تو تمہیں چھیڑ چھیڑ کر تمہاری توجہ ہمیشہ اپنے ہی اوپر مبذول رکھنا چاہتا ہوں میری دلی خواہش یہی ہے کہ میں تم میں کھپ جاؤں تم مجھ میں سما جاؤ۔

اور دیکھو پریتم! میرے اِن بے شمار گناہوں کو اپنی رحم دلی سے کہیں معاف نہ کرنے لگنا!

(ترجمہ از گجراتی) اعظم کریوی

رباعیاتِ فراق

(۱)

ذرّوں کی نظر ہے ماہِ تاباں کی طرف
پروانے کی آنکھ ہے چراغاں کی طرف
ہے محوِ جمالِ دوست ہر اک ہستی
میری بھی نظر ہے روئے جاناں کی طرف

(۲)

کتنوں کو موت سے جلا گئی محبت تیری
کتنوں کو موت سے سلا گئی محبت تیری
نشتر ہیں یہیں بھی آگ تیغ عبرت کے لئے
افسانہ بنا گئی ہے محبت تیری

(۳)

سونے والوں کو قریب آ کے جگاتی دنیا
افسانے تھے کون جب سناتی دنیا
دنیا کا بھرم سنبھالے ہے چھپ چھپ کے
جب آنکھ کھلی تو دیکھی جاتی دنیا

(۴)

دل کیا تھا کوئی شمعِ شبستانِ حیات
اندھیر ہوا بجھتے ہی کسی کے ہاتھ
دل ہی تھا کہ جس کے ساتھ دنیا کے لئے
بیٹھے ہوئے رو لیا کئے ہم رات کی رات

فراق

چوکیدار

غضب کی سردی تھی اور ہوا نے طوفان مچا رکھا تھا۔ کئی دنوں سے ایسا اندھیرا چھا رہا تھا کہ لوگ بھول گئے تھے کہ انہوں نے دن کی روشنی، دھوپ اور صاف شفاف آسمان آخری بار کب دیکھا تھا۔

ہوا بے طرح چل رہی تھی! اُس کی ہائے وہُو میں ایسی دہشت وہیبت ملی ہوئی تھی کہ معلوم ہوتا تھا گویا موت کے شہر سے آرہی ہے۔ وہ برف کے ساتھ کھیل رہی تھی اور اپنے ہلاکت آفرین سانس کے ساتھ ہر چیز کو چاٹ رہی تھی۔

سرد ہوا نے انسانوں ہی پر لرزہ طاری نہ کر رکھا تھا بلکہ گاؤں کے تمام جھونپڑے گھاس کے تودے اور لکڑی کے ڈھیر بھی کانپ رہے تھے اور تاریک سایوں میں دبکے جا رہے تھے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ وہ سردی سے ٹھٹھر رہے تھے یا خوف سے لرز رہے تھے؟ گاؤں کا گاؤں خوف کے پنجے میں اسیر تھا۔

یہ بادل، یہ بجلی، یہ آندھی اور یہ طوفان گاؤں والوں کے نزدیک عناصر کا کوئی بے معنی اور بیہودہ کھیل نہ تھا بلکہ ایک آسمانی تازیانہ تھا جو کسی خاص مقصد کو لے کر نازل ہوا تھا۔ اور انہیں اس کا یقین تھا۔ پھر کیوں وہ اس سے نہ کانپتے؟ خدا کا خیال بجلی کے خوف کو دور کر سکتا ہے، لیکن جب باہر برفانی ہوا چل رہی ہو تو قہوہ خانے کی گرم فضا ہی میں گھستے بنتی ہے۔

بار بار ہواؤں سے "ہُو۔ ہُو۔ ہُو" کی آوازیں نکلتیں، اور اِس مہیب آواز کے ہر اعادے پر ملک شاہاں کے قہوہ خانے میں دیواروں کے ساتھ ساتھ بیٹھے ہوئے لوگ اپنی گفتگو بند کر دیتے اور حقّے چھوڑ کر ایک دوسرے کے چہروں کی طرف خوفزدہ نظروں سے دیکھنے لگتے پھر ایک دوسرے سے اور قریب ہو جاتے۔

کوئی پکار اٹھتا "یا الٰہی! برف تو ہوئی اور سردی بھی اپنی جگہ پر درست ہے لیکن یہ تیز و تند ہوا ہمیں کیا پیغام دینا چاہتی ہے؟" مگر عناصر کے اِس المناک گیت کے معنی بیان کرنے کی کسی کو جرأت نہ ہوئی۔ گو ہر شخص جانتا تھا کہ یہ ایک ماتمی راگ ہے جسے ہوا نے دنیا کے غموم و ہموم، کمزوروں کی آہ و بکا، مصیبت زدوں کی ہائے وہُو، غریبوں کے آنسوؤں اور حاجتمندوں کی التجاؤں سے ترتیب دیا ہے۔

درد سے بھرا ہوا ایک سانس بھی فضا میں ضائع نہیں ہوتا۔ ایک دبی ہوئی بے آواز آہ سے لے کر دل کو چیر کے گزر جانے والی چیخ تک فریاد کی ہر لے کو ہوا اکٹھا کر کے اپنے سینے میں رکھ لیتی ہے کہ اِس سے دنیا کے رنج و محن کی ایک لازوال شہادت تیار کرے۔ وہ اِن آہوں اور زاریوں کو پہاڑوں کی بلند چوٹیوں پر لے جاتی ہے اور تاریک غاروں کی عمیق گہرائیوں میں ٹھونس دیتی ہے تاکہ کسی وقت یک لخت کھول کر انہیں پھر زمین پر نازل کرے اور لوگ خوف و مصیبت کی چیخوں کو اور نہ ٹلنے والی تقدیر کی سرگوشیوں اور دھمکیوں کو سنیں۔

یہ تھا اُن دیہاتیوں کا خیال جو اِس وقت قہوہ خانے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ اِس ماتمی راگ کو سن رہے تھے جس کے الفاظ مرے ہوؤں کی آہیں، شیطانوں کی چیخیں اور گیدڑوں کے نعرے تھے۔ کیا طوفان اور جھکڑ میں یہ سب آوازیں اپنے اپنے مسکنوں سے نکل نہیں آتیں اور اپنے غیر زمینی شور و غل سے فطرت کو اور زیادہ ہیبت ناک نہیں بنا دیتیں؟ ان کو سُن کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، زبان خشک ہو جاتی ہے، گلا گھٹنے لگتا ہے۔

"ہُو۔ ہُو۔ ہُو!" طوفان اور تندی سے چلنے لگا۔ قہوہ خانے کی چھت کڑ کڑانے لگی جیسے اس پر کوئی بھاری قدموں سے چل رہا ہو۔

ایک شخص نے یوں ہی بات کرنے کے لئے کہا "اوہ! باہر تو جہنم ہے! میرا دشمن کہیں پہاڑوں پر ٹھٹھر رہا ہو!"

دوسرے نے کہا "پہاڑوں کو چھوڑو، ذرا جرأت ہے تو تاکستان تک جا کر دکھاؤ۔"

کسی نے کہا "آسمان اور زمین کشتی لڑ رہے ہیں۔"

پھر خاموشی چھا گئی۔ یہ غور و فکر کا موقع تھا۔

باہر کا دروازہ کھلا۔ تمام نگاہیں اُس طرف اُٹھ گئیں۔ دھندلی سی روشنی میں ایک آدمی کی شکل نظر آئی جس کا لمبا کوٹ برف سے ڈھکا ہوا تھا۔ وہ گھنٹوں باہر طوفان میں رہا تھا۔

نووارد نے برف کو جھاڑتے ہوئے سلام کیا۔

ایک شخص نے سلام کا جواب دے کر کہا "رحی! آؤ آؤ، اندر آجاؤ۔ او ہو تم تو سردی سے جم گئے ہو گے!" اور دوسرے نے نہایت ہمدردی سے کہا "اسے بیٹھنے کے لئے جگہ دو۔"

نووارد نے آگے بڑھتے ہوئے کہا "ہاں، واللہ، میں تو جم گیا! مجھ سے تو اب باہر ٹھیرا نہیں گیا۔ آسمان ٹوٹ ٹوٹ پڑتا ہے۔ انسان اُس کے نیچے دبا جا رہا ہے۔ کتنا طوفان ہے! کیسا جھکڑ ہے! مجھے گرم ہونے کے لئے قہوہ خانے میں آنا ہی پڑا۔ میں ابھی پھر باہر چلا جاؤں گا۔"

انگیٹھی کے اوپر ایک چھوٹے سے مٹی کے دیئے میں جو زیتون کے تیل سے بھرا ہوا تھا ایک باریک سی بتی جل رہی تھی اور اس کا بے نور سا شعلہ ہوا میں لہرا رہا تھا اور ٹمٹما رہا تھا۔ یہ بھی طوفان کے خوف سے دبکا جاتا تھا لیکن پھر بھی اس سے ایک دھیمی دھیمی روشنی نکل کر اُن چہروں کو نمایاں کر رہی تھی جو بوجھل استراخان ٹوپیوں کے نیچے سے جھانک رہے تھے، اور چند باریک اور زرد کرنیں نو وارد کے چہرے پر پڑ رہی تھیں۔ یہ چہرہ ایک کسان کا چہرہ تھا جس پر محنت اور مشقت نے اپنے گہرے نقوش ثبت کر رکھے تھے۔ عمر کے لحاظ سے وہ جوان تھا لیکن تجربے کے لحاظ سے وہ بوڑھا نظر آتا تھا۔ اُس کی گھنی مونچھوں کے نیچے اُس کے مضبوطی سے ملے ہوئے ہونٹ ظاہر کرتے تھے کہ وہ ایک زبردست ارادے کا مالک ہے۔ اُس کی آنکھیں چھوٹی چھوٹی لیکن بے قرار اور شرر ریز تھیں۔ وہ گاؤں میں رات کو پہرہ دیا کرتا تھا۔

اُس کا نام کسی کو بھی معلوم نہ تھا۔ سب اُسے حی کہتے تھے جو ارمنی کے لئے ایک دوسرا لفظ ہے۔ گو کہنے والے بھی ارمنی تھے لیکن وہ چونکہ ایک دوسرے گاؤں سے آیا تھا اس لئے اُسے حی کہہ لینا آسان تھا۔ یہی حی تھا جو اب ایک کونے میں دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھا ہوا تھا۔ گاؤں میں اُس کے بہت سے ساتھی آئے تھے لیکن اب وہ تمام اُس سے جدا ہو چکے تھے اور وہ ایک بچھڑی ہوئی کونج کی طرح باقی رہ گیا تھا۔ اُسے بھیک مانگنے سے نفرت تھی اسی لئے وہ گاؤں کا چوکیدار بن گیا تھا۔

قہوہ خانے میں کیسا امن تھا! باہر طوفان تھمنے میں نہ آتا تھا۔ ہوا ایک زخمی درندے کی طرح شور مچا رہی تھی۔ رئیس کیوان نے کہا "بس ایسی ہی رات تھی جب وہ بیچارا موت کے منہ میں جا پڑا!" اُس کا اشارہ اسی گاؤں کے ایک شخص کی طرف تھا جو تھوڑے ہی دن ہوئے طوفان کے چنگل میں پھنس کر اپنی جان کھو بیٹھا تھا۔

ایک اَور شخص بولا "کتنی دفعہ ہم نے اُس سے کہا باہر نہ جاؤ، اِس برف و باد میں آوارہ نہ پھرو، اپنے بیوی بچوں کا خیال کرو!"

ملک نے کہا "کیسی جاہلوں کی سی باتیں کرتے ہو! یہ تو اُس کی پیشانی پر لکھا تھا کہ وہ باہر نکلے اور مر جائے۔ تقدیر سے اُسے کون بچا سکتا تھا؟"

ایک نے کہا "ملک تم نے سچ کہا" دوسرا بولا "تقدیر کے لکھے کو کون مٹا سکتا ہے؟"

تقدیر، قادرِ مطلق تقدیر! ایسی مہیب رات میں اور اِس زمیں دوز قہوہ خانے کے اندر جب کہ باہر طوفان کے تھپیڑے دل میں غم انگیز کہانیوں کی یاد تازہ کر رہے ہوں گفتگو کے لئے اِس اندھی طاقت کے سوا کون سا موضوع

ہر شخص نے تقدیر کے متعلق کچھ نہ کچھ کہا اور سب اس بات پر متفق ہو گئے کہ تمام انسانی اسباب اور کوششیں تقدیر کے سامنے عاجز ہیں۔

کمرے کے ایک کونے سے آواز آئی "میں تقدیر کا ذرا بھی قائل نہیں ہوں"۔

تمام نگاہیں اُس طرف اُٹھ گئیں۔

ملک نے ہجویہ انداز میں کہا "یہ اژدہا کہاں سے بولا؟"

اسی آواز نے ذرا اور مضبوط لہجے میں جواب دیا "میں ہوں، ملک، تمہارا خادم۔ میں تقدیر کا قائل نہیں ہوں"۔ لوگ نہ جانتے تھے کہ اُس پر ہنسیں یا ناراض ہوں۔ یہ جو تقدیر کی زبردست طاقت کا قائل نہ تھا رات کو گاؤں میں پہرہ دینے والا مفلوک الحال چوکیدار تھا۔

چوکیدار کے اِس زعم نے سب کے دلوں کو سخت تکلیف پہنچائی۔ امیر اور طاقتور ملک تقدیر کا قائل تھا اور اُس سے ڈرتا تھا۔ رئیس کیوالن جس کے ڈنڈے کے سامنے سب سوکھے پتّے کی طرح کانپتے تھے، وہ بھی تقدیر سے سخت خائف تھا۔ امام اپنے ہر وعظ میں تقدیر کی طاقت کا ذکر کیا کرتا تھا۔ غرض کہ سب پر تقدیر نے اپنی ہیبت بٹھا رکھی تھی، لیکن یہ بے برگ و نوا انسان نہ اس کا قائل تھا اور نہ اس سے ڈرتا تھا۔

اُس نے دیکھا کہ وہ سب اُس کی طرف حقارت آمیز نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ اُس نے پھر ایک دفعہ ذرا اور قوی آواز سے کہا "میں تقدیر کا قائل نہیں ہوں۔ اور میں ثابت کر سکتا ہوں کہ میں درست کہہ رہا ہوں لیکن افسوس ہے کہ مجھے اب گاؤں کے گرد ایک چکّر لگانا ہے"۔ وہ اٹھ کر جانے لگا۔

کئی پرشوق آوازیں یک دم بلند ہوئیں "ٹھیرو، ٹھیرو، جی ٹھیرو! رئیس اِس سے کہو کہ ٹھیر جائے گاؤں کو آج رات کوئی خطرہ نہیں"۔

رئیس کے کہنے پر جی پھر بیٹھ گیا۔ سب لوگ منتظر نظروں سے اُس کی طرف دیکھنے لگے کہ یہ شخص جو تقدیر کا اِس سختی سے انکار کرتا ہے اپنی کہانی کب شروع کرے گا۔

اُس نے اپنی سرگزشت شروع کی "اُس سال ہماری ٹولی میں دس آدمی تھے ــــ دس دلیر اور جری آدمی۔ ہم کئی کئی مہینے ایک ریگستان سے دوسرے ریگستان، ایک وادی سے دوسری وادی اور ایک پہاڑ سے دوسرے پہاڑ میں پھرا کرتے تھے۔ جہاں سانپ پانی پیتے تھے وہیں ہم بھی پیتے تھے، جن پتھروں کے نیچے سانپ چھپے ہوتے تھے اُن کے اُوپر ہم سوتے تھے۔ اس کے سوا چارہ ہی کیا تھا؟ ہم نے اپنے وقار کو پسِ پشت ڈال دیا تھا۔ ہم نے

اپنے صبر کی کوئی انتہا نہ رکھی تھی لیکن ہمارے دشمنوں کے ظلم کی بھی کوئی انتہا نہ تھی —— اُن کے سنگدلانہ ظلم کی بنا پر ہمارے پاس کھانے کو روٹی تک نہ تھی اور جو تھی تو کھانے کے قابل نہ تھی۔ وہ زہر کی طرح ترش ہوگئی تھی۔ اس لئے ہم نے اپنے گھر بار، بیوی بچوں کو چھوڑ دیا تھا اور اپنی بندوقیں کندھوں پر رکھ کر ہم اپنی عزت کے دامن سے دھبے چھڑانے کے لئے نکل پڑے تھے۔

"ہم نے یہ اچھا کیا تھا۔ اب ہم آزاد تھے۔ آہ! جب کسی کو ہماری طرح مصیبتیں پیش آئیں، جب اُس کی بہن، اُس کی بیوی، اُس کی ماں کی توہین کی جائے، جب اُس کے بیٹے کو مار دیا جائے اور اُس کے باپ کو گالیاں دی جائیں تو اُس کے پاس کچھ باقی نہیں رہتا —— بندوق کے سوائے کچھ نہیں۔

"ترک اور کرد ہمیں فتاوی (واجب القتل) کہتے تھے، لیکن ارمنی ہمیں منتقم شیاطین کے نام سے پکارتے تھے۔ ہمارا خوف ہمارے آگے آگے چلتا تھا اور اپنے پیچھے ہم موت کو چھوڑتے جاتے تھے۔ پہاڑوں کی چوٹیوں پر عقابوں کے گھونسلوں کے پاس ہمارا مسکن ہوتا تھا۔ آہ، ہم نے کہاں کہاں کا سفر کیا! کتنے ترک اور کرد ہم نے مار ڈالے! اور اُن کے ناپاک منصوبوں کو خاک میں ملا دیا! انہوں نے ہر جگہ ہمیں تلاش کیا مگر ہماری ہستیاں غیر مرئی ہستیاں تھیں۔ ہم ہر کہیں موجود تھے اور پھر کہیں بھی نہ تھے۔ کسی فتاوی کا سراغ نکالنا آسان کام نہیں اور اُس سے دوچار ہونا تو خطرۂ عظیم کے مرادف ہے۔ یہ ہمارا حال تھا اور ہم اپنی تقدیر کا فیصلہ سننے کے منتظر تھے۔ تقدیر پر ہمارا پورا ایمان تھا۔

"ہم کوہستان پر رہا کرتے تھے جب ایک دن ہمارے پاس کھانے پینے کو کچھ نہ رہا۔ خوراک مہیا کرنے کے لئے قرعہ میرے نام نکلا۔ میں اس علاقے کے دیہات سے واقف تھا۔ دن دہاڑے بغیر کسی ہتھیار کے میں نے اپنی کمین گاہ سے نکل کر پہاڑ سے نیچے اُترنا شروع کر دیا۔ میں نے خیال کیا اول تو میں دشمن کی نظر بچا کر نکل جاؤں گا اور کسی کا سامنا ہو بھی گیا تو میرا خالی ہاتھ ہونا ہی میری نجات کے لئے کافی ہوگا۔ لیکن اگر میں مارا گیا تو اس کا یہ مطلب ہوگا کہ میری قسمت میں ایسا ہی لکھا تھا۔ چنانچہ میں گیا۔

"کچھ عرصے تک مجھے کوئی نظر نہ آیا۔ مجھے وادی تک پہنچنے کے لئے ایک پہاڑ کو عبور کرنا تھا۔ جب میں اس پہاڑ کی چوٹی پر پہنچا تو وہاں میں نے ایک کرد سپاہی کو دیکھا جو پُورے طور پر مسلّح تھا۔

"میں نے بے پروائی سے کہا "سلام کرو! (آقا)"

ہرکردنے جواب میں کہا "سلام فلاں (پرستار زادے)" لیکن وہ گزر نہ گیا۔ وہ کھڑا ہوگیا اور میری طرف دیکھنے لگا۔

"مگر میں نہ ٹھیرا۔ میں اُسی طرح چلتا رہا۔ میں نے دیکھا کہ وہ وہیں کھڑا میری طرف دیکھ رہا ہے۔ میں نے

اپنی رفتار ذرا بھی تیز نہ کی تاکہ اُس کے دل میں میری طرف سے کسی قسم کا شک پیدا نہ ہو۔

"اتنے میں اُس نے آواز دی، "او فلا ٹھہر جاؤ"۔ میں ٹھہر گیا اور پیچھے دیکھنے لگا۔ میں نے اپنے آپ سے کہا "میری تقدیر آ پہنچی"۔ مجھے پہلے ہی امید تھی کہ میری تقدیر مجھے ایک ایسے ہی کُرد کی صُورت میں آ ملے گی۔ اُس کی بندوق اُس کے کندھے پر تھی، اُس کی تلوار اُس کے پہلو میں لٹک رہی تھی اور اُس کا ہاتھی دانت کے دستے والا خنجر اُس کے کمر بند میں آویزاں تھا۔ اُس کے چہرے سے شیطنت برس رہی تھی اور اُس کی آنکھیں ایک بھُوکے بھیڑیے کی طرح معلوم ہوتی تھیں۔ وہ میرے پاس آ گیا۔

"کُرد نے کہا، "آج کل اِن علاقوں میں کسی فلا کو آنے کی جراءت نہیں۔ تم مجھے شریف آدمی معلوم نہیں ہوتے۔ تم کون ہو اور کہاں جا رہے ہو؟"

"میں نے کہا، "اے کرد، ہم پر بڑا بُرا وقت آ پڑا ہے۔ مگر ہم تمہارے ہمسائے ہیں۔ میں خوط سے آیا ہوں۔ ہمارے علاقے میں قحط پڑ گیا ہے، جیسا کہ تمہیں معلوم ہے۔ میں طرشان میں اپنے بچوں کے لئے روٹی کی تلاش میں جا رہا ہوں۔ مجھے اپنے راستے پر جانے دو"۔

"نہیں فلا تم مجھے دھوکا نہیں دے سکتے۔ تم مجھے شریف آدمی معلوم نہیں ہوتے"۔

"کُرد، خدا کو مانو۔ تم دیکھتے ہو میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں۔ میرے پاس چاقو تک نہیں۔ دو خالی ہاتھوں کے ساتھ میں کیا کر سکتا ہوں؟ مجھے گزر جانے دو"۔

"میرے آگے آگے چلو میں تمہیں گورنر کے پاس لے جاؤں گا"۔

"گورنر کے پاس! گورنر کے پاس جانا مجھے بھلا معلوم نہ ہُوا۔

"کُرد، مجھے گورنر کے پاس نہ لے جاؤ۔ وہ مجھے کچھ کہے گا تو نہیں لیکن مجھے دیر ہو جائے گی۔ میرے چھوٹے چھوٹے بچوں پر رحم کرو۔ وہ بھوک سے مر جائیں گے۔ کُرد، خدا کے لئے مجھے جانے دو"۔

"مگر کُرد کو ذرا رحم نہ آیا۔ میں نے اپنے آپ سے کہا یہ میری تقدیر ہے، اور سر جھکا کر اُس کے آگے آگے چل پڑا۔ میں کیا کر سکتا تھا؟ میں اُس کے قبضے میں تھا۔ بندوق اُس کے کندھے پر تھی، تلوار اُس کے پہلو میں اور خنجر اُس کے کمر بند میں۔ ہم چلتے رہے۔

"ہمارے آس پاس ہر چیز پر حُسن چھایا ہُوا تھا۔ آفتاب روشن تھا۔ آسمان صاف تھا۔ پہاڑیاں سرسبز تھیں۔ پھُول مہک رہے تھے۔ پرندے چہچہا رہے تھے۔ ہر طرف زندگی اور مسرت کا دور دورہ تھا۔ دُور

آسمان پر ایک کلنگ آزاد اور بے کھٹکے اُڑ رہا تھا۔ میں اُس کے دیکھنے میں ایسا محو ہوا کہ کچھ دیر کے لئے اپنے متعلق مجھے کسی قسم کا خوف نہ رہا۔ کیا اُس کی آزادی پر مجھے رشک آرہا تھا یا کوئی اَور بات تھی جس نے میری توجہ کو یوں اپنی طرف منعطف کر رکھا تھا؟ مجھے معلوم نہیں کیوں میں اُس میں کھو گیا تھا۔ جب کلنگ عین ہمارے سر کے اوپر پہنچ گیا تو یکایک اُس نے نیچے کی طرف رخ کیا اور ایک قریب کے ٹیلے پر اتر گیا۔ مَیں نے قیافے سے معلوم کر لیا کہ وہاں سانپ ہے جسے کلنگ نے اوپر سے دیکھا ہے۔ اُس کے پروں کی آواز سُن کر سانپ نے اپنا منہ اپنے لچھوں میں چھپا لیا۔ اس کے بعد خوب لڑائی شروع ہوئی۔ ہم دونوں دیکھنے کے لئے کھڑے ہوگئے۔

"گرُد نے کہا، 'دیکھتے ہو؟ سانپ ایک فلاّ ہے اور اسی طرح اُس کا غارت کر دینا لازم ہے'۔

"مَیں نے کچھ جواب نہ دیا۔ مَیں دیکھ رہا تھا۔ کلنگ ایک طرف ہٹ گیا۔ اُس نے اپنی چونچ سانپ کے جسم میں گھونپ دی اور پھر ایک طرف ہٹ گیا۔ سانپ نے بھاگنے کی کوشش کی، لیکن قبل اس کے کہ وہ اپنے پیچوں کو کھولتا اُس کے مہیب دشمن نے اُس پر حملہ کیا۔ سانپ پھر اکٹھا ہو گیا اور اُس نے اپنا سر چھپا لیا۔ میرا خیال غلط تھا کہ اب اُس کے بچنے کی کوئی امید نہیں رہی۔ میری کچھ ڈھارس بندھی۔ رفتہ رفتہ کلنگ زیادہ دلیر ہوتا گیا وہ اب زیادہ سرعت اور زیادہ شدت سے حملے کرنے لگا۔ آخر جب اُس نے سمجھا کہ سانپ کی سب طاقت زائل ہو چکی ہے تو وہ اُس کے پاس آکر کھڑا ہو گیا تاکہ ایک آخری حملہ کر کے اُس کا کام تمام کر دے۔ سانپ نے اب تک اپنا سر باہر نہ نکالا تھا اور نہ مدافعت کی کوشش کی تھی۔ اب کلنگ اُس کے بالکل قریب تھا۔ یکایک ایک حیرت انگیز بات ظہور پذیر ہوئی۔ قریب المرگ سانپ نے آخری بار اپنی قوت کو مجتمع کیا، سر اٹھایا، جسم کو کھول دیا اور سیدھا کھڑا ہو گیا۔ پھر ایک ہی دفعہ اُس نے کلنگ کی لمبی گردن کو اپنے پیچوں میں جکڑ لیا۔ کلنگ نے بہت کوشش کی مگر وہ اپنے آپ کو اس موت انگیز ہم آغوشی سے جدا نہ کر سکا۔ اُس کے پر لٹک کر زمین پر آگئے۔ اُس کی چونچ مٹی سے آلودہ ہو گئی۔ وہ بہت پھٹپٹایا۔ اُس نے اُڑنے کی کوشش کی، لیکن اُس کی تمام کوششیں بے کار گئیں۔ سانپ کا بے اندیشانہ غصہ خطرناک تھا۔ اُس کے پیچ اَور سخت ہوتے گئے، اور آخر کار کلنگ بے جان ہو کر زمین پر آرہا۔ سانپ نے اپنی گرفت چھوڑ دی اور چلا گیا۔

"گرُد نے کچھ نہ کہا۔ اُس نے صرف میری طرف دیکھا اور ایک طویل لمحے کے لئے ہماری نگاہیں ایک دوسرے پر جمی رہیں۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے خیالات معلوم کرنا چاہتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ ہم دونوں کے دل

میں ایک دوسرے کے لئے خطرناک خیالات گزر رہے تھے۔ اور ہماری آنکھوں سے صاف اُن خیالات کا اظہار ہوتا تھا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ کلنگ پر سانپ کی غیر متوقع فتح نے کُرد کو ہوشیار کر دیا ہے اور وہ میرے قتل کا فیصلہ کر چکا ہے۔ لیکن میں بھی کچھ سوچ رہا تھا۔ سانپ اور کلنگ کی اِس لڑائی نے مجھ میں بھی تبدیلی پیدا کر دی تھی۔ میں نے یہ کبھی نہ سنا تھا کہ سانپ نے کلنگ کو زیر کیا ہو۔ کلنگ سانپ کا جانی دشمن ہے، اُس کی تقدیر کا مالک۔ مگر آج یہ کیسے ممکن ہوگیا کہ اُس کی تقدیر اُس پر غلبہ نہ پا سکی؟ کیا وہ خدا جس نے اِس بے بس سانپ کو کلنگ کا ناحق شکار نہ ہونے دیا میری تقدیر کا فیصلہ اِس کرد کے ہاتھوں دیکھنا گوارا کرے گا؟ نہیں، میں نے کہا، میں غلطی پر تھا۔ انسان کو نجات کی راہ ڈھونڈنی چاہیئے۔ میں نے سوچنا شروع کیا کہ کوئی راہ نکل آئے۔ مگر وہ راہ کون سی ہو سکتی ہے؟ میرے پاس تو ایک چاقو بھی نہیں تھا۔ اُسی وقت میری نظر اُس خنجر پر پڑی جو کُرد کے کمربند میں اٹکا ہوا تھا۔ آہ! کاش میرے پاس یہ خنجر ہوتا ——— صرف یہ خنجر!

"کُرد نے گرج کر کہا "چلے چلو! تم کھڑے کیوں ہو گئے"؟

"میں چلتا رہا۔ ہم ایک تنہا اور تاریک وادی میں داخل ہو رہے تھے کہ کُرد نے پریشان ہو کر اِدھر اُدھر دیکھنا شروع کیا۔ اُس نے بندوق اپنے کندھے سے نیچے اتاری لیکن پھر وہیں رکھ دی۔ میں نے خیال کیا کہ اب انجام نزدیک ہے۔ لیکن میں ابھی مرنا نہ چاہتا تھا۔ اگر ایک سانپ زندہ رہنے کا حق رکھتا ہے تو انسان کو یہ حق اُس سے بہت زیادہ ملنا چاہیئے! میری رفتار سست ہوگئی۔ مجھے خیال آیا کہ کرد کے آگے آگے چلنا یقیناً میرے لئے خطرے کا باعث ہے۔

"کُرد نے کہا "تیز چلو، تیز!" وہ مجھے اپنے سامنے رکھنے کی کوشش کر رہا تھا مگر میں اُس کے پہلو بہ پہلو چلنا چاہتا تھا۔ ہم نے ایک دوسرے کو سمجھ لیا اور ہمارے درمیان ایک خاموش جنگ جاری ہوگئی ——— ایک ہلاکت آفریں جنگ، جس کے پوشیدہ منصوبے دہشت انگیز طور پر خطرناک تھے۔

"یکایک میں کھڑا ہو گیا۔ میری کھڑاؤں کے تسمے ڈھیلے ہو گئے تھے۔ کُرد میرے پاس آپہنچا اور وہ بھی کھڑا ہو گیا۔ وہ میری داہنی طرف کھڑا تھا اور اُس کے خنجر کا سفید دستہ اُس کے کمربند میں آگے کو نکلا ہوا تھا۔

"مجھے سست دیکھ کر وہ غصے سے پکارا "جلدی کرو فلاّ! جلدی کرو!"

"میں بجلی کی طرح اٹھا اور قبل اس کے کہ وہ اپنے آپ کو بچانے کے لئے کوئی حرکت کرے میں نے اُس

کا خنجر نکال کر اُس کے سینے میں گھونپ دیا۔ اُس نے ایک دفعہ ہائے کیا اور زمین پر ڈھیر ہوگیا۔ میں بچ گیا تھا۔ دیکھو جس خنجر نے مجھے بچایا تھا وہ یہ ہے!"

چوکیدار نے ہاتھی دانت کے دستے والا ایک خنجر اپنے کمر بند سے نکالا اور سامعین کو دکھایا۔ سب نے جھک جھک کر اُس بھیانک ہتھیار کو دیکھنا شروع کیا جس نے ایک شخص کو تقدیر کے پیچ در پیچ دام سے آزاد کرایا تھا۔ حی، وہ معمولی سا آدمی اب حقیقت میں سب کی نظروں میں ایک اژدہا بن گیا تھا۔ اُس نے تقدیر پر غلبہ پالیا تھا۔ تقدیر اُس کے آگے ہیچ تھی۔ وہ حق بجانب تھا۔

حی نے پھر کہا "میں تقدیر کا قائل نہیں ہوں"۔ مگر اس دفعہ کسی نے اُس کی ہنسی نہیں اُڑائی۔ بلکہ سب نے اُس کی بات احترام آمیز خاموشی کے ساتھ سن لی۔

اُس نے خنجر اٹھا کر اپنے کمر بند میں رکھا اور باہر کی طرف چل دیا۔ کوئی اُسے روک نہ سکا۔

باہر اُسی طرح ہوا چل رہی تھی، مگر اب اُس میں تقدیر کی دل ہلا دینے والی وحشت موجود نہ تھی۔ ہوا کی کثیر التعداد آوازوں میں اب ایک آواز یہ بھی آرہی تھی "آزادی کے لئے لڑو"۔

(ترجمہ) منصور احمد

انسان کے لئے صرف ایک ہی صراط المستقیم ہے اور وہ یہ کہ ہستیٔ مطلق سے بغاوت پیدا کرے اور بھولے بھالے ایٹم (Atom) سے راہ و رسم پیدا کرے یعنی اگر وہ اس قدر بدقسمت ہو کہ اس کو کسی کی آنکھوں، کسی کے بالوں کے تصوّر سے فرصت ہو

فلک پیما

ذرا اُن گھومتی ہوئی نگاہوں کی زبان تو پڑھو۔ بس دل ہی جانتا ہے!

صرف ستارہ ہی ٹھیک چمکتا ہے سیارے کی کرن ہوتی ہے تو محض ہلکی ہلکی مدھم سی!

گلچیں

غزل

چہرہ مئے شباب سے گلنار ہو چلا
فتنہ جو سو رہا تھا سو بیدار ہو چلا

دل آرزو کے نام سے بیزار ہو چلا
دیوانہ اپنے کام میں ہشیار ہو چلا

مدّت کی مشق میں دلِ رنگیں کا خونِ شوق
سب رفتہ رفتہ رنگِ رخِ یار ہو چلا

کچھ اِس ادا سے عشق نے چھیڑا ربابِ غم
جس نے سنا وہ غم کا طلب گار ہو چلا

اِس عقلِ ہرزہ کار کو ٹھکرا کے آج میں
پھر دامِ رنگ و بو میں گرفتار ہو چلا

اتنی اٹھائی ہیں غمِ حرماں کی لذتیں
اب عرضِ مدّعا بھی مجھے عار ہو چلا

پھونکا وہ چشمِ شوخ نے افسونِ التفات
کمبخت دل بھی اُن کا طرفدار ہو چلا

ذوقیؔ یہ شانِ حُسنِ تلوّن نہیں تو کیا؛
انکار کر دیا کبھی اقرار ہو چلا

ذوقیؔ

لاعلمی

علم اور واقفیت ایک نعمت ہے اس کے بغیر انسانیت کی تکمیل نہیں ہوتی لیکن اگر غور کر کے دیکھو تو لاعلمی اور عدم واقفیت اس سے بھی بڑی نعمت ہے اور اس کے بغیر زندگی کی تکمیل نہیں ہوتی، جو کچھ ہم جانتے ہیں اور جن چیزوں سے ہمیں واقفیت ہے اس سے کہیں زیادہ اہمیت اُن چیزوں کو حاصل ہے جن کا ہمیں مطلق علم نہیں،

زندگی صدہا رازوں کا مخزن ہے، خود زندگی ایک راز ہے جتنا علم بڑھتا جاتا ہے واقفیت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اتنا ہی زندگی کا لطف کم ہوتا جاتا ہے، عدم واقفیت اور لاعلمی زندگی کا سہارا ہے جب ہمیں کسی چیز سے واقفیت ہو جاتی ہے تو اس چیز کے اندر پھر ہمارے لیئے کوئی دلچسپی باقی نہیں رہتی، اپنے بچپن کا زمانہ یاد کرو، تمہیں بارہا ایسا اتفاق ہوا ہوگا کہ رات کے وقت گھر واپس آتے ہوئے اندھیرے میں کچھ سفید سفید چیز متحرک نظر آرہی ہے، جب تک تمہیں یہ نہیں معلوم ہوا تھا کہ وہ کیا چیز ہے دل میں کیسے عجیب و غریب دھڑکے محسوس ہوئے ہونگے ممکن ہے کوئی بھوت ہو ممکن ہے کوئی آدمی چھپا کھڑا ہو لیکن جب تمہیں معلوم ہوگیا کہ درخت کی ایک نیچی شاخ پر کسی نے دھوتی سوکھنے کے لیئے لٹکا دی ہے جو ہوا سے ہل رہی ہے تو تمہاری ساری دلچسپی زائل ہوگئی،

تم ایک شعبدہ باز کا تماشا دیکھتے ہو وہ ٹوکری میں کبوتر بند کر دیتا ہے اور جب ٹوکری اٹھاتا ہے تو کبوتر غائب ہوتا ہے مٹھی میں تمہارے سامنے ایک روپیہ رکھتا ہے اور جب مٹھی کھولتا ہے روپیہ نہیں ہوتا، تمہیں ان حرکتوں میں صرف اس لیے لطف آتا ہے کہ تم نہیں جانتے کہ وہ یہ سب کیونکر کرتا ہے، اگر تمہیں ان شعبدوں کی ترکیب معلوم ہو جائے تو پھر کوئی دلچسپی باقی نہ رہے اور تم اس کے حیرت انگیز کارنامے دیکھنے کے لیئے روپیہ صرف نہ کرو،

زندگی کے ہر دور میں جن چیزوں سے ہم واقف نہیں ان کی اہمیت ان چیزوں سے کہیں زیادہ ہے جن سے ہم واقف ہیں کوئی نہیں جانتا کہ خدا جانے کل کیا واقع ہونے والا ہے، کاروبار میں تجارت میں کسی بڑے سے بڑے ماہر کو بھی معلوم نہیں کہ کل بازار کا کیا رنگ ہوگا، کون جانتا ہے کہ موسم کی کیفیت اگلے دن کیا ہوگی۔ کسے معلوم ہے کہ آب و ہوا کا کل کیا حال رہے گا ہم دوست بناتے ہیں لیکن نہیں جانتے کہ وہ کیسے ثابت ہونگے ہم اُن سے نباہ بھی سکیں گے یا نہیں ہم شادی کرتے ہیں لیکن نہیں کہہ سکتے کہ وہ خانہ آبادی کا سبب ہوگی یا خانہ بربادی کا زندگی کا اعتبار نہیں، موت کا راز کسی کو معلوم نہیں موت کے بعد کون جانتا ہے کیا ہوگا، بس ایک غیر محدود سلسلہ ان اشیا کا ہمیشہ ہمیں گھیرے ہوئے ہے جن سے ہم بالکل واقف نہیں، نامعلوم اشیا سے لوگ ڈرتے ہیں، کہتے ہیں کہ پردۂ غیب سے خدا جانے کیا ظہور میں آئے لیکن یہ نہیں سمجھتے کہ خداوند کریم

نہ ہوں، اگر ذرا غور کرو تو معلوم ہوگا کہ زندگی میں جس قدر بہتر اور راحت بخشنے والی چیزیں ہیں ان سب کی بنا عدم واقفیت پر ہے اور وہ سب پردۂ غیب سے ظہور میں آئی ہیں، صحیح معنوں میں عقلمند اور دانا وہی شخص ہے جو نامعلوم اشیا کی اہمیت سے آگاہ ہے نہ وہ جو اپنے علم اور واقفیت پر نازاں ہو، اس کا سبب یہ ہے کہ جب انسان کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ جتنا علم ہمیں ہے جو کچھ ہم جانتے ہیں وہ اس کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں جو ہم نہیں جانتے تو اس میں عجز و انکسار پیدا ہو جاتا ہے اور یہی علم اور عرفان کی طرف پہلا قدم ہے،

عدم واقفیت کا احساس عقل و دانائی کی ابتدا ہے بالکل ایسے ہی جیسے واقفیت پر غرور دماغی ترقی کے لئے آخری حد ہے، تم نے دیکھا ہوگا کہ جو لوگ سطحی ہوتے ہیں اور جن کا دماغی سرمایہ جہالت کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا وہی سب سے زیادہ اپنے علم و عقل پر غرور کرتے ہیں اور بہ بانگ دہل اس کا اعلان کرتے ہیں اور جنہیں خدا نے صحیح معنوں میں علم حاصل کرنے کی توفیق عطا فرمائی ہے اور جو اس دولت سے مالامال ہیں وہی سب سے پہلے اپنی تنگ سامانی اپنی تہی دستی اور اپنی محدود واقفیت کو تسلیم کرنے کے لئے آمادہ نظر آئیں گے،

شاید دنیا میں سب سے بڑا عقلمند سقراط تھا اور جانتے ہو اس کا تکیہ کلام کیا تھا "میں تو کچھ بھی نہیں جانتا"،

کبھی تم نے "کشش ثقل" کے مسئلہ پر عالمانہ غور سے جداگانہ غور کیا ہے، مادہ کے ہر ذرہ میں کوئی ایسی چیز ہے جو مادہ کے ہر دوسرے ذرہ کو اپنی طرف کھینچتی ہے، یہی چیز یہی قوت اجرام فلکی کو ایک نظام میں وابستہ کئے ہوئے ہے اور خدا کی زمین کے ہر جزو پر اپنا تسلط اور قبضہ جمائے ہوئے ہے، لیکن نیوٹن بھی جس نے ہمیں بتایا کہ سیب زمین پر اس لئے گرتا ہے کہ ہر مادی چیز دوسری مادی چیز کو اپنے حجم اپنے وزن اور فاصلے کی نسبت سے اپنی طرف کھینچتی ہے اس امر سے واقف نہیں ہے کہ یہ قوت اصل میں ہے کیا؛ بالکل اسی طرح جس طرح وہ بچہ اس قوت سے آگاہ نہیں جو کہتا ہے کہ سیب اس لئے زمین پر گرتا ہے کہ وہ بھاری ہے اور شاخ اس کا بار نہیں سنبھال سکتی،

آج کل گھر گھر بجلی سے کام لیا جاتا ہے، ہم اس سے گاڑیاں چلاتے ہیں، پنکھے چلاتے ہیں روشنی حاصل کرتے ہیں، ایک منزل سے دوسری منزل پر دوسری سے تیسری پر اور ایسی بیس بیس منزلوں تک پہنچ جاتے ہیں، ایک تار لگا کر صدہا کوس کے فاصلے پر گھر بیٹھے بات چیت کرتے ہیں، یہی نہیں بلکہ بے تار لگائے بھی گفتگو کرتے ہیں، ہزارہا کوس کے فاصلے پر بیٹھے ہوئے تقریریں سنتے ہیں، موسیقی سے لطف اندوز ہوتے ہیں، "غرض بجلی "حیات جاوید" کی روح رواں ہے لیکن کوئی نہیں جانتا کہ بجلی ہے کیا چیز،

زندگی ایک قوت ہے، ایک طاقت ہے اور ایسی چیز ہے جس سے زیادہ اور کوئی چیز ہم سے قریب نہیں لیکن کون جانتا ہے کہ زندگی ہے کیا چیز، وہ کہاں سے آتی ہے اور پھر کہاں کو چلی جاتی ہے، آج تک کوئی سائنس دان زندگی کو ظہور میں نہیں لا سکا، کسی نے ایک حقیر سے حقیر کیڑا بھی پیدا کر کے نہیں دکھایا، اور نہ کبھی دکھا سکے گا،

زندگی سربستہ رازوں والی قوت کا وہ سرچشمہ ہے جو عدم واقفیت اور لاعلمی کی نامعلوم وسعت سے ہم تک پہنچتا ہے، جب تک وہ ہمارے جسم میں ہے ہم بڑھتے رہتے ہیں جس وقت وہ ہمارے جسم کو چھوڑ دیتی ہے وہ سڑ جاتا ہے، ہم اُسے اپنے جسم سے ایک چاقو یا زہر کے ذریعہ خارج کر سکتے ہیں۔ فرض کیجئے ہم اُسے بڑھا گھٹا بھی سکتے ہیں، لیکن ہم زندگی کو پیدا نہیں کر سکتے"

پس یہ سب چیزیں جن پر دنیا کی مشین چل رہی ہے "کشش ثقل" بجلی، زندگی ہمارے لئے ایک معما ہیں ہم ان کی بابت کچھ نہیں جانتے لیکن اس کے باوجود یہی دنیا کی اہم ترین چیزیں ہیں انہیں پر نسل انسانی کا دارومدار ہے، جن چیزوں کا ہمیں پورا علم ہے وہ نہایت غیر اہم معمولی اور سطحی ہیں، مثلاً ہم جانتے ہیں کہ دو اور دو چار ہوتے ہیں اس کا جاننا مفید سہی لیکن بے اثر ہے اگر نہ جانیں تو بھی زندہ رہ سکتے ہیں، تم یہ جانتے ہو کہ اس مضمون میں کل کتنے الفاظ ہیں لیکن کس کو غرض پڑی ہے جو ان باتوں کی طرف توجہ کرے اور اگر توجہ کرے بھی تو کیا حاصل ہے؟

زندگی کی ساری دلچسپیاں سارے دل نشین دھڑکے لاعلمی اور عدم واقفیت سے حاصل ہوتے ہیں، آنے والی کل ایک نامعلوم اور غیر دریافت شدہ ملک ہے جو خدا جانے کتنی مہمات کی سرمایہ دار ہے اور ہم سب کولمبس کی طرح "آج" کے جہاز پر کھڑے ہیں اور مستقبل کے نامعلوم اور تاریک سمندر کے سفر پر کمربستہ ہیں،

جوانی میں کیف سے دلچسپی ہے بڑھاپے میں کوئی لطف نہیں کوئی دلچسپی نہیں صرف اس لئے کہ جوان کے سامنے مستقبل کی ایک نامعلوم وسعت ہے، اس لئے کہ بوڑھے آدمیوں کی معلومات زیادہ ہے وہ بہت سی چیزوں سے واقف ہیں یا کم سے کم وہ سمجھتے ہیں کہ واقف ہیں۔ اسی لئے وہ نامعلوم اشیا میں دلچسپی لینا چھوڑ دیتے ہیں، اور اسی لئے زندگی کا سارا لطف غارت ہو جاتا ہے۔

موت بھی نامعلوم وسعتوں کا ایک دروازہ ہے کوئی نہیں بتا سکتا کہ اس دروازہ کے اُس طرف کیا ہے، اگر ہمیں یہ معلوم ہو جائے کہ موت ہمارے متعلق ہمارے لئے تمام چیزوں کا خاتمہ ہے یا فرض کرو ہمارے لئے ڈنٹے کا بہشت یا گوتم کا نروان ہے تو موت کے سربستہ رازوں اور اس کی پوشیدہ قوتوں کا ہم پر کوئی اثر نہ رہے اور ہم اسے ایک معمولی چیز سمجھنے لگیں صرف اس لئے کہ ہم موت کے متعلق کچھ نہیں جانتے اس سے بالکل واقف نہیں ہیں صرف اس لئے کہ ہم موت کے دروازے سے نامعلوم وسعتوں کی سرزمین میں داخل ہوتے ہیں ہمارے لئے وہ ایک زبردست مہم ہے، کسی قدیم یونانی حکیم کا مقولہ ہے "کسے معلوم ہے کہ یہ زندگی اصل میں موت ہی ہو اور جسے ہم موت کہتے ہیں وہ زندگی ہو"

حامد اللہ افسر

نغمۂ ناہید

کسی وفا ناآشنا کے حضور میں

میری خاموش التجاؤں کی سماعت ہو نہ ہو ۔۔۔ تیرے اندازِ تغافل کی نہایت ہو نہ ہو
میرے حالِ زار پر چشمِ عنایت ہو نہ ہو ۔۔۔ اے وفا ناآشنا تجھ کو محبت ہو نہ ہو

عشق میرا سر بسر رنگینیٔ امید ہے
آنکھ محوِ جستجو ہے دل میں ذوقِ دید ہے

عشق تیرا ہے بہشتِ جاوداں میرے لئے ۔۔۔ یاد تیری ہے نشاطِ کامراں میرے لئے
رنج تیرا ہے سرورِ بیکراں میرے لئے ۔۔۔ تیرے جلوے حاصلِ کون و مکاں میرے لئے

باوجودِ نامرادی عشرتِ جاوید ہے
میرے ارمانوں کی دنیا میں ہمیشہ عید ہے

تجھ سے خواہشِ لطف و کرم کوئی نہیں ۔۔۔ یہ ترا جور و ستم جور و ستم کوئی نہیں
تیرے مجھے رنج و الم کوئی نہیں ۔۔۔ مجھ کو تیری بے وفائی کی قسم کوئی نہیں

جامِ غم واللہ مجھ کو ساغرِ خورشید ہے
نالۂ حسرت سرود و نغمۂ ناہید ہے

جلال الدین **اکبر**

زندگی سربستہ رازوں والی قوت کا وہ سرچشمہ ہے جو عدم واقفیت اور لاعلمی کی نامعلوم وسعت سے ہم تک پہنچتا ہے، جب تک وہ ہمارے جسم میں ہے ہم بڑھتے رہتے ہیں جس وقت وہ ہمارے جسم کو چھوڑ دیتی ہے وہ سڑ جاتا ہے، ہم اُسے اپنے جسم سے ایک چاقو یا زہر کے ذریعہ خارج کر سکتے ہیں۔ فرض کیجئے ہم اُسے بڑھا گھٹا بھی سکتے ہیں، لیکن ہم زندگی کو پیدا نہیں کر سکتے"

پس یہ سب چیزیں جن پر دنیا کی مشین چل رہی ہے "کشش ثقل"، بجلی، زندگی ہمارے لئے ایک معمّا ہیں ہم ان کی بابت کچھ نہیں جانتے لیکن اس کے باوجود یہی دنیا کی اہم ترین چیزیں ہیں انہیں پر نسل انسانی کا دارومدار ہے، جن چیزوں کا ہمیں پورا علم ہے وہ نہایت غیر اہم معمولی اور سطحی ہیں، مثلاً ہم جانتے ہیں کہ دو اور دو چار ہوتے ہیں اس کا جاننا مفید سہی لیکن بے اثر ہے اگر نہ جانیں تو بھی زندہ رہ سکتے ہیں، تم یہ جانتے ہو کہ اس مضمون میں کل کتنے الفاظ ہیں لیکن کس کو غرض پڑی ہے جو ان باتوں کی طرف توجہ کرے اور اگر توجہ کرے بھی تو کیا حاصل ہے؟

زندگی کی ساری دلچسپیاں سارے دل نشین دھڑکے لاعلمی اور عدم واقفیت سے حاصل ہوتے ہیں، آنے والی کل ایک نامعلوم اور غیر دریافت شدہ ملک ہے جو خدا جانے کتنی مہمات کی سرمایہ دار ہے اور ہم سب کولمبس کی طرح "آج" کے جہاز پر کھڑے ہیں اور مستقبل کے نامعلوم اور تاریک سمندر کے سفر پر کمربستہ ہیں،

جوانی میں کیف ہے دلچسپی ہے بڑھاپے میں کوئی لطف نہیں کوئی دلچسپی نہیں صرف اس لئے کہ جوان کے سامنے مستقبل کی ایک نامعلوم وسعت ہے، اس لئے کہ بوڑھے آدمیوں کی معلومات زیادہ ہے وہ بہت سی چیزوں سے واقف ہیں یا کم سے کم وہ سمجھتے ہیں کہ واقف ہیں۔ اسی لئے وہ نامعلوم اشیا میں دلچسپی لینا چھوڑ دیتے ہیں، اور اسی لئے زندگی کا سارا لطف غارت ہو جاتا ہے،

موت بھی نامعلوم وسعتوں کا ایک دروازہ ہے کوئی نہیں بتا سکتا کہ اس دروازہ کے اُس طرف کیا ہے، اگر ہمیں یہ معلوم ہو جائے کہ موت ہمارے متعلق ہمارے لئے تمام چیزوں کا خاتمہ ہے یا فرض کرو ہمارے لئے ڈنٹے کا بہشت یا گوتم کا نروان ہے تو موت کے سربستہ رازوں اور اس کی پوشیدہ قوتوں کا ہم پر کوئی اثر نہ رہے اور ہم اسے ایک معمولی چیز سمجھنے لگیں صرف اس لئے کہ ہم موت کے متعلق کچھ نہیں جانتے اس سے بالکل واقف نہیں ہیں صرف اس لئے کہ ہم موت کے دروازے سے نامعلوم وسعتوں کی سرزمین میں داخل ہوتے ہیں ہمارے لئے وہ ایک زبردست مہم ہے، کسی قدیم یونانی حکیم کا مقولہ ہے "کسے معلوم ہے کہ یہ زندگی اصل میں موت ہی ہو اور جسے ہم موت کہتے ہیں وہ زندگی ہو"

حامد اللہ افسر

نغمۂ ناہید

کسی وفا نا آشنا کے حضور میں

میری خاموش التجاؤں کی سماعت ہو نہ ہو — تیرے اندازِ تغافل کی نہایت ہو نہ ہو
میرے حالِ زار پر چشمِ عنایت ہو نہ ہو — اے وفا نا آشنا تجھ کو محبّت ہو نہ ہو

عشق میرا سر بسر رنگینیٔ امید ہے
آنکھ محوِ جستجو ہے دل میں ذوقِ دید ہے

عشق تیرا ہے بہشتِ جاوداں میرے لئے — یاد تیری ہے نشاطِ کامراں میرے لئے
رنج تیرا ہے سرورِ بیکراں میرے لئے — تیرے جلوے حاصلِ کون و مکاں میرے لئے

باوجودِ نامرادی عشرتِ جاوید ہے
میرے ارمانوں کی دنیا میں ہمیشہ عید ہے

مجھ کو تجھ سے خواہشِ لطف و کرم کوئی نہیں — یہ ترا جور و ستم جور و ستم کوئی نہیں
شوق میں تیرے مجھے رنج و الم کوئی نہیں — مجھ کو تیری بے وفائی کی قسم کوئی نہیں

جامِ غم واللہ مجھ کو ساغرِ خورشید ہے
نالۂ حسرت سرودِ نغمۂ ناہید ہے

جلال الدین **اکبر**

محفلِ ادب

نغمۂ چین

چینیوں کی عشقیہ شاعری اُن کی متاعِ ذہنی کا نہایت اہم جزو ہے چینی لوگ اپنے پچھلے شاعروں کے عشقیہ کلام سے عام طور پر واقف ہوتے ہیں۔ آج بھی لی، تائی، پو کے اشعار جو ہزار سال سے اوپر ہوئے لکھے گئے تھے ہر طبقے کے لوگوں میں پڑھے اور گائے جاتے ہیں۔ آپ چین میں بدمست عشاق کی زبان سے بھی انہیں سُن سکتے ہیں اور شام کو اپنے کھیت پر کسان بھی اب تک انہیں گاتا ہے۔

چین کے سب بڑے بڑے شاعر عشقیہ شاعری کرتے تھے۔ ڈراما یا بیانیہ نظمیں چینیوں کی نظر میں دوسرے درجے کی چیز ہیں۔

چینی شاعری کے سب سے قدیم نمونے کوئی ۳ ہزار سال پرانے ہیں اور اس طرح چینی شاعری ہندوستانی اور عربی شاعری کے ساتھ ساتھ دنیا کی سب سے قدیم شاعری کہی جا سکتی ہے۔ قوم میں اس کا عام رواج اب تک اس لئے ہے کہ اِس طویل زمانے میں چین میں تقریباً کوئی تغیر نہیں ہوا۔

چینی شاعری کے عروج کا زمانہ وہ ہے جسے اُس وقت کے حکمران خاندان کے نام پر عہدِ تھانگ کہتے ہیں یعنی ولادتِ مسیح کے بعد کی ساتویں سے نویں صدی تک کا زمانہ۔

اس عہد کے دو سب سے مشہور شاعر لی، تائی، پو اور تھو، فو ہیں۔ لی عرصہ تک شاہِ منگ ہوانگ تی کے دربار میں رہا۔ بادشاہ نے ہر طرح اس کا اعزاز و احترام کیا لیکن اس کی طبیعت بے چین تھی۔ نچلا بیٹھنا ممکن نہ تھا۔ دربار کو چھوڑ چل کھڑا ہوا اور سارے ملک میں پھر پھر کر لوگوں کو اپنے اشعار سے مسحور کرتا رہا۔ ۶۱ سال کی عمر میں اس نے انتقال کیا۔ چینیوں نے اس کی موت کا ایک افسانہ بنا لیا ہے جس سے تقریباً ہر چینی واقف ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ لی ایک دفعہ کشتی میں بیٹھا تھا۔ شراب کا دور چل رہا تھا۔ اور یہ اپنے شعر گا رہا تھا کہ یکایک ایک عجیب سی موسیقی سنائی دی جس کا تعلق اس دنیا سے نہ تھا۔ اس موسیقی کو سن کر پانی سے پریوں کی ایک فوج نکل آئی اور آسمان سے دو فرشتے

اُترے۔ ان دونوں نے آئی کو ساتھ چلنے کی دعوت دی اور یہ ایک پری کے کندھے پر بیٹھ کر دونوں فرشتوں کے پیچھے پیچھے چلا۔ اور افق تک پہنچ کر سنہری فضا میں غائب ہو گیا۔

تھو فو جو آئی کے بعد اس عہد کا سب سے مشہور شاعر ہے، آئی سے کوئی ۱۲ سال چھوٹا تھا۔ یہ دونوں بڑے دوست تھے۔ پہلے اس کا تعلق بھی دربار سے تھا لیکن پھر اسے جلاوطن کر دیا گیا۔ جلاوطنی میں اس نے درد اور شوق سے بھری ہوئی نظمیں لکھی ہیں۔ ۵۹ سال کی عمر میں انتقال کیا۔

پچھلے ہزار سال میں بھی چینی شاعروں نے خوب خوب چیزیں لکھی ہیں، لیکن آٹھویں صدی کی سی خوبی پھر پیدا نہیں ہوئی۔ پندرھویں اور سترھویں صدی میں بھی چین میں بڑا ادبی چرچا رہا۔ لیکن زیادہ تر کام نثر میں ہوا۔ آخری زمانے میں چینی شاعروں پر علمی رنگ زیادہ غالب ہو گیا لیکن اب بھی عشقیہ شاعری کے اچھے نمونے کچھ بہت کمیاب نہیں ہیں۔

تقدیرِ آدم

(کانگ - فو - سے) (۵۵۱ تا ۴۷۸ ق م)

خزاں کی خنکی کے بعد موسم گرما کی حدت آتی ہے۔
برف سے ڈھکے ہوئے میدانوں پر بہار کے پھول
سج سجاتے ہیں۔
سورج جب صبح کو سو کر اٹھتا ہے تو سرخرو۔
جب شام کو سونے جاتا ہے تو سرخرو۔
چھوٹے چھوٹے چشمے سمندر سے جا ملتے ہیں۔
زمانہ ہر گھڑی اپنی تجدید میں مصروف ہے۔

ہر روز نئی دھوپ نکلتی ہے، ہر آن دریا کا پانی بدلتا
ہے۔
مگر آدمی! اسے بس ایک مرتبہ زندگی عطا ہوتی ہے۔
نہ یہ مڑ کر دیکھتا ہے نہ لوٹ کر آتا ہے۔
اس کی ہستی ایک حباب ہے۔ ٹوٹا اور ختم ہو گیا۔
اس کی زندگی کا حاصل؟ لاچار و بے بس مٹی کا ایک
چھوٹا سا ڈھیر جس پر گھاس اگتی ہے!

دیوتاؤں کا رقص

(لی - تائی - پو) (۷۰۲ء تا ۷۶۳ء)

دل میں درد کا ایک طوفان اُٹھا،
مَیں نے اپنی زمردین بانسری سے انسانوں کو
ایک گیت سنایا!
وہ ہنسے اور کسی نے میرے دکھ کو نہ سمجھا۔

درد کی شدّت سے میں نے اپنی زمردین بانسری کا
رُخ آسمان کی طرف کر دیا۔
اور اپنے گیت کا تحفہ دیوتاؤں کو پیش کر دیا۔
دیوتا مست ہو گئے اور روشنی سے دمکتے ہوئے

[illegible]

[illegible] ہوں -

آتش زدہ مکان

(تو-فو) (۷۱۲ء تا ۷۷۰ء)

میرا پیارا مکان جس میں میں پیدا ہوا تھا، شعلوں
کی نذر ہو چکا -
جہاں یہ مکان تھا، آج کچھ راکھ ہے کچھ کوئلے -
تھکن تھکا ماندہ، میں ایک سنہری کشتی میں بیٹھ گیا -
کہ شاید دنیا کی رنگینی دیکھ کر اپنا غم غلط کر سکوں -
رات کا وقت تھا، میں نے اپنی بانسری پر ایک
گیت گایا ایسا کہ چاند تک پہنچ جائے -
ایک شوق و تمنا سے لبریز گیت -
آہ میرا گیت سن کر چاند بھی غمگین ہو گیا
اور اس نے بھی اپنے بوڑھے چہرہ کو ایک بڑے سے
بادل سے ڈھانپ لیا -
ناچار، میں پہاڑوں کے پاس گیا -
ان کے پاس بھی میرے درد کا درماں نہ تھا -
میں نے اپنی ساری داستان ان سے کہی مگر بے کار
[illegible] میں سمجھا کہ میری خوشی، میرا چین،
میرے بچپن کی ساری یاد [illegible] کے اس [illegible] میں
مدفون ہے جہاں پہلے کبھی میرا مکان تھا!
میں نے موت کی دعا مانگی - میرا چہرہ زرد تھا -
سمندر کے کنارے بس اپنے کو موجوں کے سپرد
کرنے کے لئے تیار تھا کہ میرے پاس سے ایک ننھی
سی کشتی گذری!
پہلے تو میں سمجھا کہ یہ کشتی نہیں، پانی میں چاند کا عکس
لیکن نہیں، یہ ایک ننھی سی سفید کشتی ہی تھی -
جسے ایک عورت چلا رہی تھی!
اے تو، اے تو! کیا قسمت تھی کہ اس وقت میری
آنکھ نے تجھے دیکھا اس وقت اپنی زندگی کی سب
پُر درد و پُر یاس گھڑی میں -
اب میں جانتا ہوں، خوب جانتا ہوں، کہ میرے
درد کا درماں کہاں ملے گا -
اب میرا ایک مقصد ہے، تجھے پانا!
اے میری بجانے والی، مجھے پناہ دینے والی!
اب میں تیرے دل میں [illegible] بناؤں گا -

[illegible]

مطبوعاتِ جدیدہ

کتب

قرآن اور پردہ ۔ مصنفہ مرزا اعظیم بیگ صاحب بی اے، ایل ایل بی (علیگ) اس کتاب میں پردے کے مسئلہ کو اسلامی نقطۂ نظر سے حل کیا گیا ہے اور استدلال صرف قرآن مجید کی آیات سے کیا گیا ہے ہاں تفسیر کے طور پر احادیث بھی شامل کی ہیں اور اُن کی شرح کے لئے مستند اور مستند محدثین و مفسرین کی کتب کے حوالے دیئے ہیں۔ فاضل مصنف نے اس میں ثابت کیا ہے کہ پردہ ایامِ جہالت کی یادگار ہے اور اسلام پردے کا مخالف ہے پھر دکھایا ہے کہ رسول کریم علیہ نے اور صحابہ کرام نے پردے کی سخت مخالفت کی ہے اور مسلمانوں نے پردہ کفار سے لے لیا ہے۔ پھر ائمہ اور مفسرین کے وہ اقوال درج کئے ہیں جو پردے کی مخالفت میں ہیں۔ جو لوگ موجودہ رواجی پردے کی خرابیوں سے آگاہ ہونا چاہیں اُن کے لئے یہ بہترین کتاب ہے۔ ابتدا میں شاہ محمد سلیمان صاحب ایل ایل ڈی چیف جسٹس الہ آباد ہائی کورٹ کا ایک عالمانہ مقدمہ بھی شامل ہے۔ حجم ۱۳۴ صفحے۔ قیمت ایک روپیہ چار آنے۔ پتہ، اظہر حسین صاحب عثمانی، آنریری سکرٹری انجمنِ اصلاحِ پردہ کھانڈا پالسہ جودھ پور، ریاست مارواڑ (راجپوتانہ)

زاد السبیل ۔ محترمہ راحیل شروانیہ صاحبہ بنت حاجی محمد موسیٰ خاں صاحب رئیس دتاولی کا دلچسپ و سبق آموز سفرنامہ حجاز و شام و عراق ہے، جس میں جابجا نظمیں اور سفر کے متعلق دوسرے مفید تاریخی و معاشرتی مضامین درج ہیں حجم ۲۳۸ صفحے لکھائی چھپائی اور کاغذ اچھا۔ قیمت ایک روپیہ چار آنے۔ ان تینوں پتوں سے مل سکتی ہے (۱) مشرف منزل علی گڑھ (۲) دفتر "تہذیبِ نسواں"، لاہور (۳) دفتر رسالہ "نورجہاں"، لاہور۔

مقالات ۔ ۴۴ صفحے کے اس رسالے میں جناب احمد الدین احمد صاحب مارہروی ایم اے کے مندرجۂ ذیل پانچ محققانہ مضامین ہیں:۔ (۱) کیا اورنگ زیب سلطنت مغلیہ کے زوال کا باعث تھا؟ (۲) کیا فیروز تغلق غاصب تھا؟ (۳) نورجہاں اور جہانگیر کے تعلقات پر ایک نظر۔ (۴) علاؤ الدین اور پدمنی (۵) کیا محمد تغلق درحقیقت پاگل تھا؟ قیمت [illegible] چونکہ نذر کی گئی ہے طلبا سے نصف قیمت لی جاتی ہے۔ سفیر بک ایجنسی الہ آباد سے طلب فرمائیے۔

سادھو اور بیسوا ۔ مصنفہ پنڈت کشن پرشاد صاحب کول ممبر سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی لکھنؤ۔ ایک دلچسپ [illegible] ہے۔ [illegible] صفحے حجم [illegible]

قیمت بارہ آنے۔ انڈین پریس لمیٹڈ، الہ آباد سے طلب فرمایئے۔

غلط فہمی۔ جناب بصیر ایم اے کا ڈراما ہے۔ حجم ۸۰ صفحے۔ قیمت آٹھ آنے۔ پتہ شمس الاسلام بک ڈپو دہلی۔

کشکول سخن۔ اس میں بزم ادب شملہ کے مشاعرے کی غزلیں اور نظمیں ہیں۔ شروع میں ان پر تنقید اور تبصرہ بھی کیا گیا ہے۔ قیمت چھ آنے۔ سکرٹری بزم ادب شملہ سے منگایئے۔

انگلش ٹرانسلیشن اینڈ کمپوزیشن۔ از ایم۔ ایچ غازی صاحب۔ اس کتاب میں انگریزی سے اردو اور اردو سے انگریزی ترجمہ کرنے کے طریقے اور صحیح اور بامحاورہ انگریزی لکھنے کے قاعدے بتائے گئے ہیں۔ حجم ۱۷۶ صفحے قیمت چودہ آنے۔ ملنے کا پتہ۔ جی آر دیوی چند مہندور اینڈ سنز، بک سیلرز، پنجابی ڈنگہ، جموں

رسائل

"چاند" یہ ماہوار رسالہ منشی کنہیا لال صاحب ایم اے، ایل ایل بی کی ادارت میں دہلی سے نکلنا شروع ہوا ہے۔ چونکہ حجم ڈیڑھ سو صفحے کے قریب ہے اس لئے مضامین میں خوب تنوع ہوتا ہے۔ تصویریں بھی غالباً سب اردو رسالوں سے زیادہ ہوتی ہیں۔ اپریل کے پرچے میں ستر تصاویر ہیں۔ سالانہ چندہ آٹھ روپے مقرر ہے۔ مینجر رسالہ چاند، ۲۸ ایڈمنسٹن روڈ، چندر لوک، الہ آباد سے طلب فرمایئے۔

"ساقی" یہ علمی و ادبی رسالہ سید شاہد احمد صاحب بی اے آنرز کی ادارت میں دہلی سے نکلا ہے۔ اس کی بڑی خصوصیت دہلی کی ٹکسالی زبان ہے۔ ہمیں امید ہے کہ یہ ادب اردو کی نشر و اشاعت میں قابل قدر خدمات انجام دے گا۔ حجم ۷۰ صفحے اور قیمت تین روپے چھ آنے سالانہ مقرر ہے۔ پتہ مہتمم رسالہ "ساقی"، کھاری باولی دہلی۔

"اعجاز" یہ ماہوار رسالہ لسان الملک حضرت ریاض کی نگرانی میں شائع ہو رہا ہے۔ مضامین کے انتخاب سے حسن مذاق کا ثبوت ملتا ہے۔ حضرت ریاض کا کلام اس کے اوراق کی زینت ہے۔ حجم ۴۶ صفحے اور رسالہ قیمت چار روپے مقرر ہے۔ دفتر "اعجاز" بارہ بنکی سے طلب کیجئے۔

"ادب" سید اعظم حسین صاحب کی ادارت میں ہر ماہ لکھنؤ سے شائع ہوتا ہے۔ اس میں بہت اچھے ادبی تنقیدی مضامین درج ہوتے ہیں۔ زبان بھی خوب ہوتی ہے۔ حجم ۴۴ صفحے۔ سالانہ چندہ چار روپے۔ ملنے کا پتہ، دفتر "ادب"، چوراہا یحییٰ گنج لکھنؤ۔

"**عورتوں کا اخبار**" یہ ہفتہ وار اخبار خواجہ حسن نظامی صاحب نے ہندوستانی عورتوں کے لئے دہلی سے جاری کیا ہے۔ اس میں عموماً تاریخی اور تمدنی و معاشرتی مضامین شائع ہوتے ہیں۔ عورتوں میں آزادی خیال پیدا کرنے کے لئے یہ اخبار ضرور مفید ثابت ہوگا۔ سالانہ چندہ چار روپے۔ پتہ، دفتر "عورتوں کا اخبار"، دہلی۔

محفلِ ادب

نغمۂ چین

چینیوں کی عشقیہ شاعری اُن کی متاعِ ذہنی کا نہایت اہم جزو ہے چینی لوگ اپنے پچھلے شاعروں کے عشقیہ کلام سے عام طور پر واقف ہوتے ہیں۔ آج بھی لی تائی، پو کے اشعار جو ہزار سال سے اوپر ہوئے لکھے گئے تھے ہر طبقے کے لوگوں میں پڑھے اور گائے جاتے ہیں۔ آپ چین میں بدمست عشاق کی زبان سے بھی انہیں سُن سکتے ہیں اور شام کو اپنے کھیت پر کسان بھی اب تک انہیں گاتا ہے۔

چین کے سب بڑے بڑے شاعر عشقیہ شاعری کرتے تھے۔ ڈراما یا بیانیہ نظمیں چینیوں کی نظر میں دوسرے درجے کی چیز ہیں۔

چینی شاعری کے سب سے قدیم نمونے کوئی ۳ ہزار سال پرانے ہیں اور اس طرح چینی شاعری ہندوستانی اور عربی شاعری کے ساتھ ساتھ دنیا کی سب سے قدیم شاعری کہی جاسکتی ہے۔ قوم میں اس کا عام رواج اب تک اس لئے ہے کہ اِس طویل زمانے میں چین میں تقریبًا کوئی تغیر نہیں ہوا۔

چینی شاعری کے عروج کا زمانہ وہ ہے جسے اُس وقت کے حکمران خاندان کے نام پر عہد تھانگ کہتے ہیں یعنی ولادتِ مسیح کے بعد کی ساتویں سے نویں صدی تک کا زمانہ۔

اس عہد کے دو سب سے مشہور شاعر لی تائی پو اور تھو فو ہیں۔ لی عرصہ تک شاہ منگ ہوانگ تی کے دربار میں رہا۔ بادشاہ نے ہر طرح اس کا اعزاز و احترام کیا لیکن اس کی طبیعت بے چین تھی۔ نچلا بیٹھنا ممکن نہ تھا۔ دربار کو چھوڑ چل کھڑا ہوا اور سارے ملک میں پھر پھر کر لوگوں کو اپنے اشعار سے مسحور کرتا رہا۔ ۶۱ سال کی عمر میں اس نے انتقال کیا۔ چینیوں نے اس کی موت کا ایک افسانہ بنالیا ہے جس سے تقریبًا ہر چینی واقف ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ لی ایک دفعہ کشتی میں بیٹھا تھا۔ شراب کا دور چل رہا تھا۔ اور یہ اپنے شعر گا رہا تھا کہ یکایک ایک عجیب سی موسیقی سنائی دی جس کا تعلق اس دنیا سے نہ تھا۔ اس موسیقی کو سن کر پانی سے پریوں کی ایک فوج نکل آئی اور آسمان سے دو فرشتے

اُترے۔ اِن دونوں نے لی کو ساتھ چلنے کی دعوت دی اور یہ ایک پری کے کندھے پر بیٹھ کر دونوں فرشتوں کے پیچھے پیچھے چلا۔ اور افق تک پہنچ کر سنہری فضا میں غائب ہوگیا۔

تھوفو جو لی کے بعد اس عہد کا سب سے مشہور شاعر ہے، لی سے کوئی ۱۲ سال چھوٹا تھا۔ یہ دونوں بڑے دوست تھے۔ پہلے اس کا تعلق بھی دربار سے تھا لیکن پھر اسے جلاوطن کردیا گیا۔ جلاوطنی میں اس نے درد اور شوق سے بھری ہوئی نظمیں لکھی ہیں۔ ۵۹ سال کی عمر میں انتقال کیا۔

پچھلے ہزار سال میں بھی چینی شاعروں نے خوب خوب چیزیں لکھی ہیں، لیکن آٹھویں صدی کی سی خوبی پھر پیدا نہیں ہوئی۔ پندرھویں اور سترھویں صدی میں بھی چین میں بڑا ادبی چرچا رہا۔ لیکن زیادہ تر کام نثر میں ہوا۔ آخری زمانے میں چینی شاعروں پر علمی رنگ زیادہ غالب ہوگیا لیکن اب بھی عشقیہ شاعری کے اچھے نمونے کچھ بہت کمیاب نہیں ہیں۔

تقدیرِ آدم

(کانگ ۔ فو ۔ ستسے) (۵۵۱ تا ۴۷۸ ق م)

خزاں کی خنکی کے بعد موسم گرما کی حدت آتی ہے۔
برف سے ڈھکے ہوئے میدانوں پر بہار کے پھول سیج سجاتے ہیں۔
سورج جب صبح کو سو کر اٹھتا ہے تو سرخرو۔
جب شام کو سونے جاتا ہے تو سرخرو۔
چھوٹے چھوٹے چشمے سمندر سے جا ملتے ہیں۔
زمانہ ہر گھڑی اپنی تجدید میں مصروف ہے۔

ہر روز نئی دھوپ نکلتی ہے، ہر آن دریا کا پانی بدلتا ہے۔
مگر آدمی اسے بس ایک مرتبہ زندگی عطا ہوتی ہے۔
نہ یہ مڑ کر دیکھتا ہے نہ لوٹ کر آتا ہے۔
اس کی ہستی ایک حباب ہے ۔ ٹوٹا اور ختم ہوگیا۔
اس کی زندگی کا حاصل؟ لاچار و بے بس مٹی کا ایک چھوٹا سا ڈھیر جس پر گھاس اگتی ہے!

دیوتاؤں کا رقص

(لی ۔ تائی ۔ پو) (سنہ ۷۰۲ تا سنہ ۷۶۳)

دل میں درد کا ایک طوفان اُٹھا،
میں نے اپنی زمردین بانسری سے انسانوں کو
ایک گیت سنایا!
وہ ہنسے اور کسی نے میرے دکھ کو نہ سمجھا۔

درد کی شدت سے میں نے اپنی زمردین بانسری کا رخ آسمان کی طرف کردیا۔
اور اپنے گیت کا تحفہ دیوتاؤں کو پیش کردیا۔
دیوتا مست ہوگئے اور روشنی سے دمکتے ہوئے

بادلوں پر میرا گیت سن سن کر ناچنے لگے۔
اب کیا ہے، اب میں آدمیوں کا دل بہلانے کے
لئے بھی اپنا گیت سناتا ہوں۔

اور جب میں اپنی زمردین بانسری سے گاتا ہوں تو
یہ میرا گیت سمجھتے بھی ہیں۔

آتشزدہ مکان

(تو۔فو) (سنہ ۷۱۴ تا سنہ ۷۷۴)

میرا پیارا مکان جس میں مَیں پیدا ہؤا تھا شعلوں
کی نذر ہو چکا۔
جہاں یہ مکان تھا، آج کچھ راکھ ہے کچھ کوئلے۔
غمگین تھکا ماندہ، میں ایک سنہری کشتی میں بیٹھ گیا۔
کہ شاید دنیا کی رنگینی دیکھ کر اپنا غم غلط کرسکوں۔
رات کا وقت تھا میں نے اپنی بانسری پر ایک
گیت گایا ایسا کہ چاند تک پہنچ جائے۔
ایک شوق و تمنا سے لبریز گیت۔
آہ۔ میرا گیت سُن کر چاند بھی غمگین ہو گیا
اور اس نے بھی اپنے بوڑھے چہرہ کو ایک بڑے سے
بادل سے ڈھانپ لیا۔
ناچار، میں پہاڑوں کے پاس گیا۔
ان کے پاس بھی میرے درد کا درماں نہ تھا۔
میں نے اپنی ساری داستان ان سے کہی مگر بے کار
اب تو میں سمجھا کہ میری خوشی، میرا چین،
میرے بچپن کی ساری یاد، راکھ کے اس انبار میں

مدفون ہے جہاں پہلے کبھی میرا مکان تھا!
میں نے موت کی دعا مانگی۔ میرا چہرہ زرد تھا۔
سمندر کے کنارے بس اپنے کو موجوں کے سپرد
کرنے کے لئے تیار تھا کہ میرے پاس سے ایک ننھی
سی کشتی گذری!
پہلے تو میں سمجھا کہ یہ کشتی نہیں، پانی میں چاند کا عکس ہے،
لیکن نہیں، یہ ایک ننھی سی سفید کشتی ہی تھی۔
جسے ایک عورت چلا رہی تھی!
اے تو، اے تو، کیا قسمت تھی کہ اس وقت میری
آنکھ نے تجھے دیکھا اس وقت اپنی زندگی کی سب سے
پُر درد و پُر یاس گھڑی میں۔
اب میں جانتا ہوں، خوب جانتا ہوں، کہ میرے
درد کا درماں کہاں ملے گا۔
اب میرا ایک مقصد ہے: تجھے پانا!
اے میری بچانے والی، مجھے پناہ دینے والی!
اب میں تیرے دل میں اپنا مکان بناؤں گا۔

"جامعہ"

مطبوعاتِ جدیدہ

کتب

قرآن اور پردہ - مصنفہ مرزا عظیم بیگ صاحب بی اے، ایل ایل بی (علیگ) اس کتاب میں پردے کے مسئلہ کو اسلامی نقطۂ نظر سے حل کیا گیا ہے اور استدلال صرف قرآن مجید کی آیات سے کیا گیا ہے ہاں تفسیر کے طور پر احادیث بھی شامل کی ہیں اور اُن کی شرح کے لئے مسلّم اور مستند محدثین و مفسرین کی کتب کے حوالے دیئے ہیں۔ فاضل مصنف نے اس میں ثابت کیا ہے کہ پردہ ایامِ جہالت کی یادگار ہے اور اسلام پردے کا مخالف ہے۔ پھر دکھایا ہے کہ رسولِ کریم صلعم نے اور صحابہ کرام نے پردے کی سخت مخالفت کی ہے اور مسلمانوں نے پردہ کفار سے لے لیا ہے۔ پھر ائمہ اور مفسرین کے وہ اقوال درج کئے ہیں جو پردے کی مخالفت میں ہیں۔ جو لوگ موجودہ رواجی پردے کی خرابیوں سے آگاہ ہونا چاہیں اُن کے لئے یہ بہترین کتاب ہے۔ ابتدا میں شاہ محمد سلیمان صاحب ایل ایل ڈی چیف جسٹس الہ آباد ہائی کورٹ کا ایک عالمانہ مقدمہ بھی شامل ہے۔ حجم ۱۴۴ صفحے۔ قیمت ایک روپیہ چار آنے۔ پتہ، اظہر حسین صاحب عثمانی، آنریری سکرٹری انجمنِ اصلاحِ پردہ کھانڈا پالسہ جودھ پور، ریاست مارواڑ (راجپوتانہ)

زاد السبیل - محترمہ راحیل شروانیہ صاحبہ بنت حاجی محمد موسیٰ خاں صاحب رئیس دتاولی کا دلچسپ و سبق آموز سفرنامہ حجاز و شام و عراق ہے، جس میں جا بجا نظمیں اور سفر کے متعلق دوسرے مفید تاریخی و معاشرتی مضامین درج ہیں حجم ۳۳۸ صفحے۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ اچھا۔ قیمت ایک روپیہ چار آنے۔ ان تینوں پتوں سے مل سکتی ہے (۱) مشرف منزل علی گڑھ (۲) دفتر "تہذیبِ نسواں"، لاہور (۳) دفتر رسالہ "نورجہاں"، لاہور۔

مقالات - ۴۴ صفحے کے اس رسالے میں جناب احمد الدین احمد صاحب مارہروی ایم اے کے مندرجۂ ذیل پانچ محققانہ مضامین ہیں:- (۱) کیا اورنگزیب سلطنت مغلیہ کے زوال کا باعث تھا؟ (۲) کیا فیروز تغلق غاصب تھا؟ (۳) نورجہاں اور جہانگیر کے تعلقات پر ایک نظر۔ (۴) علاؤالدین اور پدمنی (۵) کیا محمد تغلق درحقیقت پاگل تھا؟ قیمت چھ آنے مقرر کی گئی ہے طلبا سے نصف قیمت لی جاتی ہے۔ سفیر بک ایجنسی الہ آباد سے طلب فرمایئے۔

سادھوا اور بیسوا - مصنفہ پنڈت کشن پرشاد صاحب کول ممبر سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی لکھنؤ۔ ایک دلچسپ ناول ہے جس میں دو حرماں نصیبوں کی سرگزشت بیان کی ہے۔ زبان صاف اور ستھری ہے۔ اندازِ بیان شگفتہ ہے۔ حجم ۲۰۳ صفحے

قیمت بارہ آنے ۔انڈین پریس لمیٹڈ، الہ آباد سے طلب فرمایئے۔

غلط فہمی۔ جناب بصیر ایم اے کا ڈراما ہے۔ حجم ۸۴ صفحے۔ قیمت آٹھ آنے۔ پتہ شمس الاسلام بک ڈپو دہلی۔

کشکول سخن۔ اس میں بزم ادب شملہ کے مشاعرے کی غزلیں اور نظمیں ہیں۔ شروع میں ان پر تنقید اور تبصرہ بھی کیا گیا ہے۔ قیمت چھ آنے۔ سکرٹری بزم ادب شملہ سے منگائیے۔

انگلش ٹرانسلیشن اینڈ کمپوزیشن۔ از ایم۔ ایچ غازی صاحب۔ اس کتاب میں انگریزی سے اردو اور اردو سے انگریزی ترجمہ کرنے کے طریقے اور صحیح اور بامحاورہ انگریزی لکھنے کے قاعدے بتائے گئے ہیں۔ حجم ۱۷۶ صفحے قیمت چودہ آنے۔ ملنے کا پتہ۔ جی آر دیوی چند مہندر اینڈ سنز، بک سیلرز، بچا ڈنگہ، جموں

رسائل

"**چاند**" یہ ماہوار رسالہ منشی کنہیا لال صاحب ایم اے، ایل ایل بی کی ادارت میں دہلی سے نکلنا شروع ہوا ہے۔ چونکہ حجم ڈیڑھ سو صفحے کے قریب ہے اس لئے مضامین میں خوب تنوع ہوتا ہے۔ تصویریں بھی غالباً سب اردو رسالوں سے زیادہ ہوتی ہیں۔ اپریل کے پرچے میں سترہ تصاویر ہیں۔ سالانہ چندہ آٹھ روپے مقرر ہے۔ مینیجر رسالہ چاند، ۲۹ ایڈمنسٹن روڈ، چندر لوک، الہ آباد سے طلب فرمایئے۔

"**ساقی**" یہ علمی و ادبی رسالہ سید شاہد احمد صاحب بی اے آنرز کی ادارت میں دہلی سے نکلا ہے۔ اس کی بڑی خصوصیت دہلی کی ٹکسالی زبان ہے۔ ہمیں امید ہے کہ یہ ادب اردو کی نشر و اشاعت میں قابل قدر خدمات انجام دیگا۔ حجم ۷۲ صفحے اور قیمت تین روپے چھ آنے سالانہ مقرر ہے۔ پتہ مہتمم رسالہ "ساقی"، کھاری باولی دہلی۔

"**اعجاز**" یہ ماہوار رسالہ لسان الملک حضرت ریاض کی نگرانی میں شائع ہو رہا ہے۔ مضامین کے انتخاب سے حسن مذاق کا ثبوت ملتا ہے۔ حضرت ریاض کا کلام اس کے اوراق کی زینت ہے۔ حجم ۴۶ صفحے اور سالانہ قیمت چار روپے مقرر ہے۔ دفتر "اعجاز" بارہ بنکی سے طلب کیجئے۔

"**ادب**" سید اعظم حسین صاحب کی ادارت میں ہر ماہ لکھنؤ سے شائع ہوتا ہے۔ اس میں بہت اچھے ادبی تنقیدی مضامین درج ہوتے ہیں۔ زبان بھی خوب ہوتی ہے۔ حجم ۴۸ صفحے۔ سالانہ چندہ چار روپے۔ ملنے کا پتہ، دفتر "ادب"، چوراہا چینی گنج لکھنؤ۔

"**عورتوں کا اخبار**" یہ ہفتہ وار اخبار خواجہ حسن نظامی صاحب نے ہندوستانی عورتوں کے لئے دہلی سے جاری کیا ہے۔ اس میں عموماً تاریخی اور تمدنی و معاشرتی مضامین شائع ہوتے ہیں۔ عورتوں میں آزادی خیال پیدا کرنے کے لئے یہ اخبار ضرور مفید ثابت ہوگا۔ سالانہ چندہ چار روپے۔ پتہ، دفتر "عورتوں کا اخبار"، دہلی۔

آج تقریباً پچاس برس کے بعد بھی وہی قد اور صورت اور اوصاف ہیں

جو پیدائش کے روز تھے

پ خیال نہ کریں کہ یہ بات کس طرح ممکن ہے کہ یوم پیدائش اور آج کی صورت میں کوئی فرق نہ ہوگا۔ آپ خود قبول کریں گے۔ جام نگر کاٹھیاواڑ
پیدا ہوکر تمام مذاہب اور فرقوں کے ساتھ یکساں سلوک کرنے کی وجہ سے تمام دنیا میں مشہور و معروف ہونے کے ساتھ ہر فرد بشر کی حفاظت کرنا اپنا فرض جانا
خواہ مسلمان ہو یا عیسائی ہندو برہمن ہو یا چمار حتیٰ کہ ہر انسان کے ساتھ یکساں برتاؤ کرنا اس کا خواص ہے۔ دونوں کو ہر نا اندر کرنے میں لاثانی لیکن
ن کو ذرا بھی اذیت نہ دینا اسکی عادت ہے **اسلئے** یہ بہی مقویات مزاج عالم آتنک نگرہ گولیاں جنکو جام نگر کاٹھیاواڑ کے وید شاستری منی شنکر
جی نے آج سے پچاس برس قبل ایجاد کر کے نہایت مفید ثابت کر دیا یہ گولیاں **اس طرح مقبول ہوئیں** کہ ہندوستان اور ممالک غیر سے انکی مانگ روز افزوں ترقی پر ہے
گولیاں قبض بدہضمی دل و دماغ معدہ کی کمزوری خون کی خرابی اور جملہ **امراض مخصوصہ** کے دور کرنے میں بہت شہرت حاصل کر چکی ہیں آپ ایک دفعہ استعمال کریں گے
بے بغیر نہ رہیں گے ایسی خوبیوں کے ہوتے ہوئے بھی قیمت اس لئے کم رکھی گئی ہے کہ ہر امیر غریب مستفید ہو سکیں ۳۲ گولیوں کی شیشی ایک روپیہ پانچ شیشی چار روپیہ۔

منی گولیاں (ہمدرد اطفال) بچوں کی ناساز طبیعت سے والدین کو سخت تکلیف ہوتی ہے اور کمزور ہو جاتا ہے اسلئے بیمار بچوں کو تندرست اور
ست کو طاقتور بنانے کیلئے بال منی گولیوں کا استعمال کرو یہ گولیاں بچوں کی جملہ شکایتوں دست کھانسی زیادہ آنا دانت کا ہونا شکم کا بڑھنا جسم کا زرد پڑ جانا
سوکھا پن وغیرہ دور ہو کر پوری صحت حاصل ہوتی ہے قیمت۔ ۳۰ گولی کے ڈبہ کی ایک روپیہ۔

ملنے کا پتہ **وید شاستری منی شنکر جی گوبند رام جی جام نگر (کاٹھیاواڑ)**

مردہ عزیزوں سے

ملاقات اور بات چیت گھر بیٹھے کر لو

نو ایجاد آلہ سپرٹس ورکنگ پلانچیٹ جس کے ذریعہ ہم خود اکیلے ہر ایک سوال کا جواب لے سکتے ہیں۔ ایک امریکن دماغ کی اختراع ہے آلہ کے استعمال
میں دوسرے آدمی کی ضرورت نہیں۔ جونسی روح آپ چاہیں آلہ میں حاضر ہو کر آپکے سوالوں کا درست جواب دے گی معمولی لکھا پڑھا ہر عمر
ہر مذہب کا آدمی کام لے سکتا ہے نہ کچھ پڑھنا پڑتا ہے اور نہ ہی چلہ کشی کی ضرورت ہے۔ عالم بالا کے حالات معلوم کرنا گم شدہ کا پتہ لگانا
ل کا سراغ نکالنا۔ دشمن سے بدلہ لینا مقدمات میں فتح پانا سخت سے سخت حاکم سے حسب دلخواہ کام نکلوانا اور دراز فاصلہ پر ایک سیکنڈ
میں خبر بھیجنا حسب دلخواہ نوکری یا روزگار حاصل کرنا۔ بند لفافوں کی عبارت پڑھنا مقفل صندوق یا مکان کے اندر کی اشیا معلوم کرنا وغیرہ
ل کام ہو سکتے ہیں اس نایاب چیز کا ہر گھر میں ہونا لازمی ہے اصلی قیمت پانچ روپیہ لیکن تھوڑے عرصہ کے لئے معہ محصول ڈاک صرف تین روپیہ
نے لئے جاویں گے ہدایات مفت ارسال ہونگی۔ اپنا پتہ صاف انگریزی یا اردو میں لکھیں۔

کیمیکلز سنڈیکیٹ (H) جالندھر شہر (پنجاب)

جدید فہرست کارخانہ مفت طلب فرمایئے

خلیفہ شیخ سلطان احمد کا عطر حنا، عطر سہاگ اور عطر [illegible] عورتوں میں نہایت مقبول ہے

یہ کارخانہ ۱۸۳۹ء سے نیک نامی کے ساتھ جاری ہے،

۱۔ "ہمایوں" بالعموم ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔

۲۔ علمی وادبی، تمدنی واخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ معیارِ ادب پر پورے اتریں درج کیے جاتے ہیں۔

۳۔ دل آزار تنقیدیں اور دل شکن مذہبی مضامین درج نہیں ہوتے۔

۴۔ ناپسندیدہ مضمون ایک آنہ کا ٹکٹ آنے پر واپس بھیجا جاسکتا ہے۔

۵۔ خلافِ تہذیب اشتہارات شائع نہیں کیے جاتے۔

۶۔ ہمایوں کی ضخامت کم از کم بہتّر صفحے ماہوار اور ساڑھے نو سو صفحے سالانہ ہوتی ہے۔

۷۔ رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع دفتر میں ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ کے بعد اور ۲۰ سے پہلے پہنچ جانی چاہیے۔
اس کے بعد شکایت لکھنے والوں کو رسالہ قیمتاً بھیجا جائے گا۔

۸۔ جواب طلب امور کے لئے ار کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ آنا چاہیے۔

۹۔ قیمت سالانہ پانچ روپے، ششماہی تین روپے (علاوہ محصول ڈاک) فی پرچہ ۸ر نمونہ ۶ر۔

۱۰۔ منی آرڈر کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ تحریر کیجیے۔

۱۱۔ خط وکتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر جو لفافہ پر پتہ کے اوپر درج ہوتا ہے ضرور لکھیے۔

مینیجر رسالہ ہمایوں

۲۳۔ لارنس روڈ لاہور

سید عبداللطیف مینیجر رسالہ ہمایوں نے مسلم پرنٹنگ پریس لاہور میں چھپوا کر شائع کیا

جسٹرڈ نمبر ایل ۱۳۶۳

اُٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا
(ہمایوں)

یادگارِ علامہ فضیلت مآب آنریبل جسٹس میاں محمد شاہ دین صاحب ہمایوں مرحوم

اُردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہُمایوں

ایڈیٹر: بشیر احمد، بی۔ اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا
جائنٹ ایڈیٹر: منصور احمد

2 — 10
3 — 2
0 — 12
1 — 4
1 — 4
1 — 0
4 — 4
2 — 0
1 — 8
1 — 5
1 — 0
2 — 0

17

جامعہ — فہرستِ مضامین — نمبر ۶

بابت ماہِ جون سنہ ۱۹۳۰ء

تصویر:- نہا تیر انداز

کالی گوری چڑیا

کالی گوری چڑیا
پیاری موری چڑیا
پھر کر گلشن گلشن بھایا تجھ کو "راجن"
چمپا پر جب چہکی چمپا تجھ سے مہکی
کالی گوری چڑیا
پیاری موری چڑیا

اُڑتی اُڑتی مُڑکر مُڑتی مُڑتی اُڑکر
پھولوں میں تو آئی پتّوں پر تو چھائی
ٹہنی ٹہنی کودی ٹہنی ٹہنی اُچھلی
ٹہنی ٹہنی کھیلی ٹہنی ٹہنی ناچی
کالی گوری چڑیا
پیاری موری چڑیا

آنا جانا تیرا "نانا بانا" تیرا
اِس جا اُس جا کس جا تُو نھی دیکھا جس جا
اونچے اُڑکر پھرنا نیچے مڑکر گرنا
ننھی مُنّی چنچل واہ ری تیری چھل بل
کالی گوری چڑیا
پیاری موری چڑیا

پیاری موری چڑیا کالی گوری چڑیا
جگ کا رہنا سہنا دو دن کا ہے گہنا
جینا کوئی دم ہے فرصت تجھ کو کم ہے
کرنا ہے جو کرلے دامن اپنا بھرلے
لے چل کلیاں چُن کر گانا گا سر دُھن کر
اپنی دُھن میں گالے
حق کو کھوکر پالے

ب ا

جہاں نما

اشتراکیت اور مذہب کی جنگ

"مذہب انسان کے لئے بمنزلہ افیون کے ہے" یہ وہ فقرہ ہے جو نہایت کثرت کے ساتھ سوویٹ روس کی سرکاری عمارات پر لکھا ہوا نظر آتا ہے۔ روس میں اس قول کو لینن سے منسوب کیا جاتا ہے۔ لیکن درحقیقت یہ قول کارل مارکس کا ہے۔ لینن نے اُس کی دوسری بہت سی تعلیمات کی طرح اسے بھی اپنے عقائد میں شامل کر لیا۔ اُس مضمون میں جہاں سے یہ فقرہ اخذ کیا گیا ہے مارکس یہ بھی کہتا ہے کہ "اُس تمدن و معاشرت کو مٹا ڈالو جس کی روحانی مہک مذہب ہے، مذہب خود مٹ جائے گا ...... مذہب وہ پھول ہے جو زنجیروں کو چھپائے ہوئے ہے۔ ان پھولوں کو مسل کر پھینک دو، زنجیریں ظاہر ہو جائیں گی"۔

ڈاکٹر جان ڈیوئی نے جو کولمبیا یونیورسٹی میں فلسفہ کے پروفیسر اور امریکہ کے ایک بہت بڑے مفکر ہیں اشتراکیت پر ایک مذہب کی حیثیت سے بحث کی ہے۔ انہوں نے کوئی ایک پہلو اختیار نہیں کیا بلکہ ایک فلسفی کی طرح ممکن الحصول شہادتوں سے نتیجہ نکالا ہے کہ اشتراکیت اور مسیحیت کیوں برسرِ جنگ ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:-

"اگر غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ مارکس کی ان سطور میں دو خیال ادا کئے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ موجودہ معاشی سیاسی نظام کی تخریب یقیناً مذہب کے زوال کا باعث ہو گی۔ اور دوسرا خیال یہ ہے کہ خود مذہب کی تخریب کا نتیجہ یہ ہو گا کہ موجودہ نظام کی زنجیریں نمایاں ہو جائیں گی، اور اس سے ایک نیا نظام معرضِ وجود میں آ جائے گا۔ روس اس دونوں قسم کی تخریب میں بڑی شدت سے مصروف ہے۔

"ایک طرف تو روسی اس عقیدہ سے پُرعمل پیرا ہیں کہ ایک اشتراکی تمدن کی تخلیق خود بخود مذہبی عقیدوں اور فرقوں کا شیرازہ بکھیر دے گی اور اُن قوتوں کو جو بالشویکی نقطۂ نظر سے فوق فطرتی اور غیر معاشرتی جادوں پر پڑ کر سیدھی راہ سے بھٹک گئی ہیں ایک صحیح معاشرتی اور انسانی راہ پر لا ڈالے گی۔ دوسری طرف لینن نے محسوس کیا اور بلاشبہ اپنے مقاصد کے پیشِ نظر صحیح محسوس کیا کہ موجودہ مذہب نئے نظام کا جس کی وہ طرح ڈال رہا تھا ایک رقیب ہے۔

"سابق معاشی حکومت اور سیاسی زاریت کا مذہب کے ساتھ ایسا قریب کا رشتہ تھا کہ لینن کی تجاویز کے پورا ہونے کے لئے اس کا وجود ایک بڑا خطرہ تھا۔ خیال کے اِن دونوں پہلوؤں کا خلاصہ یہ ہے کہ اشتراکیت

خود ایک مذہب بن گئی ہے جو کسی دوسرے رقیب مذہب کو برداشت نہیں کر سکتی اور اشتراکیوں کو کسی ادارتی مذہب کا اپنے پیروؤں کے معاشرتی معاملات میں حکومت جتانا ایسا ہی معلوم ہوتا ہے جیسے اُن کے مقابلے میں ایک اَور سیاسی نظام تیار کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

جب میں اشتراکیت کی مذہبیت کا ذکر کرتا ہوں تو میرا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کے پیروؤں میں اس کی نسبت وہی جذبہ اور جوش جاری و ساری ہے جو ایک مذہب کے ساتھ خاص ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اشتراکیت ذہنی طور پر بھی زندگی کے ہر شعبہ پر حاوی ہے۔ کوئی خیال کوئی عمل ایسا نہیں جس پر اس کا اثر نہ ہو جس طرح ایک مذہب کے مقررہ اور معینہ اصول و عقائد ہوتے ہیں اسی طرح اس کے بھی اصول و عقائد ہیں۔ جو شخص اسے خالص سیاسی طاقت کا ایک دباؤ سمجھتا ہے وہ کبھی اس کی حقیقت سے واقف نہیں ہو سکے گا۔ اس کے حقیقی معنی سمجھنے کے لئے ہمیں اس کو اُن مذاہب کی صف میں کھڑا کرنا پڑے گا جن کی حریفانہ کشمکش نے انہیں تاریخ میں نمایاں جگہ دی ہے۔

موجودہ روس کے حاکموں نے کبھی اپنی مذہب دشمنی کو جس کی بنیاد خدا کا انکار ہے نہیں چھپایا، نہ انہوں نے اُن ذرائع کو پوشیدہ رکھا ہے جنہیں وہ خدا اور تمام فوق انسانی طاقتوں کے عقیدے کو بیخ و بن سے اکھاڑنے میں استعمال کر رہے ہیں، مثلاً مدارس، مطابع، تصاویر وغیرہ۔

"یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ سائنس اور مذہب کی جنگ ضروری ہے اور مذہب کی فتح اُسی وقت ہو سکتی ہے جب جہالت، سادہ لوحی اور اسی قسم کی دوسری معاشرتی کمیاں قوم پر مسلّط ہوں ہر قسم کے تمثیلی ذرائع کام میں لائے جاتے ہیں۔ اپنے مخصوص سیاسی مقصد کے قطعِ نظر اس میں شک نہیں کہ روس کے حاکم روسی کسانوں کی پستی کے لئے یونانی کلیسا کو ذمہ وار گردانتے ہیں، اور روس میں کسانوں کا طبقہ ہی ایک ایسا طبقہ ہے جو وہاں کی آبادی کا سب سے بڑا حصہ ہے۔

"اشتراکیوں کو معلوم ہو گیا ہے یا وہ سمجھتے ہیں کہ انہیں معلوم ہو گیا ہے کہ مذہبی عقیدہ جب وہ اشتراکی گروہ کے کسی رکن میں پایا جائے تو ایک بڑی رکاوٹ ہوتا ہے، جو مذہبِ اشتراکیت کی تبلیغ میں اُن کی کوششوں کو پوری شدت سے عمل میں نہیں آنے دیتا۔ ایسے لوگوں کو بے دریغ گروہ میں سے نکال دیا جاتا ہے۔ ذاتی اور غیر ادارتی مذہب کی نسبت یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ روس کی تعمیر کے عظیم کام سے لوگوں کے خیال اور عمل کا رخ موڑ لیتا ہے۔

"لینن کی اپنی شخصیت اور تعلیمات بھی ایک خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ اُس کے نزدیک منطقی مادیت کا

فلسفہ، فلسفہ نہ تھا بلکہ سائنس ہی کی ایک دوسری شکل تھی۔ اُس کا خیال تھا کہ سائنس نے مذہب کے لئے کوئی گنجائش نہیں چھوڑی، اور دنیا کی دوبارہ تعمیر اُس کے نزدیک صرف انسانی قلب کو سائنس کے ذریعے سے فتح کرنے پر ہوسکتی تھی۔ مارکوجس نے لینن کی سوانح عمری لکھی ہے کہتا ہے کہ لینن کے لئے خیال یا چاہت کے معاملہ میں تحمل اور رواداری سے بڑھ کر نا قابلِ فہم کوئی چیز نہ تھی۔ وہ اسے رہنمایانہ قابلیت کا فقدان سمجھ کر کوئی اہمیت نہیں دیتا تھا۔ اُس کے نزدیک یہ قابلِ نفرت شکست کا آغاز تھی۔ لینن کے متبعین نے بھی یہی طبیعت ورثے میں پائی۔ جب وہ ایک نیا معاشرتی نظام قائم کرنے میں جان توڑ کوششیں کررہے تھے تو مذہب اور منطقی مادیت کا وہ مسلک جسے ایک علمی صداقت کا نام دیا جاتا تھا دو تسکین ناپذیر اور موافقت نہ کرنے والے دشمن تھے۔ ایک کے غالب آنے کے لئے دوسرے کی قطعی شکست ضروری تھی۔"

ڈاکٹر ڈیوئی کہتے ہیں کہ "ایک بات پر میں اپنی ذاتی رائے بیان کئے بغیر نہیں رہ سکتا وہ یہ کہ روس کی جانب سے سب خبریں اس پر مشتمل ہوتی ہیں کہ تمام اشتراکی اربابِ اختیار کی متفقہ رائے ہیں سوویٹ کے خلاف "مذہبی" احتجاج محض اشتراکی حکومت کو تہ و بالا کرنے کی ایک نئی کوشش ہے جو سرمایہ دار ملک اُس کے خلاف کررہے ہیں۔ جس کسی کو بھی روس کا کچھ علم ہے وہ پہلے ہی سے اس نتیجہ پر پہنچ سکتا تھا۔ اگرچہ بہت لوگوں نے خالص مذہبی بنا پر احتجاج کیا ہے لیکن یہ احتجاج بعد کو باقاعدہ جنگ کی صورت اختیار کرگیا سو جب تک سوویٹ روس میں کچھ مذہبی اثر باقی ہے مذہب کی مخالفت بڑھتی ہی جائے گی اور یہ عقیدہ پختہ ہوتا جائے گا کہ مذہب کے پردے میں ایک سیاسی اور معاشی مقصد کام کررہا ہے۔ یہ صورتِ حالات اُن احساسات کو بھی بیدار کرے گی جو ایسے وقت ہم میں بھی پیدا ہوجاتے ہیں جب ہمیں اپنے اندرونی معاملات میں کسی بیرونی مداخلت کے نشانات نظر آتے ہیں۔

"میرا خیال ہے کہ بیرونی احتجاج روس کے اس آزاد گروہ کو تقویت پہنچائے گا اور اس کی فوجیانہ سرگرمیوں میں اور شدت پیدا کرے گا۔ اِس سے اُن کے پاس اس امر کی ایک اور شہادت موجود ہوجائے گی کہ دوسری قومیں ہر اُس ذریعہ سے جو اُن کے ہاتھ میں ہے اشتراکی حکومت کو مٹانے کے لئے تیار ہورہی ہیں۔ روسی حکومت نے کلیسا کے خالص مذہبی اعمال اور اُس کے معاشرتی نظام اور مقاصد کے درمیان ایک واضح خط کھینچ دیا ہے۔ یہ امتیاز کل سوویٹ نظام کا ایک لازمی نتیجہ ہے اور سوویٹ حکومت پر اُس کی مخالفتِ مذہب کے لئے حملے کرنا اِس گمان کو بڑھائے گا کہ ذاتی مذہب اُن سیاسی، تعلیمی اور معاشی کارروائیوں کا ایک پردہ ہے جو اُس معاشرہ کو شکست دینے کے لئے کی جاتی ہیں جسے وہ تعمیر کرنے کی کوشش کررہے ہیں۔"

ترکی میں گراں بہا کتب کا ذخیرہ

امید کی جاتی ہے کہ قسطنطنیہ کی وہ گراں بہا قلمی کتب جو آج کل شہر کی بیس یا بیس سے بھی زائد مساجد میں منتشر ہیں۔ مسجدِ سلطان احمد میں ایک لائبریری کی صورت میں جمع کر دی جائیں گی۔ ہر سال تمام اطرافِ عالم سے شائقینِ علم فتوحاتِ ترکی کے اِن ثمرات سے استفادہ کرنے کے لئے آتے ہیں۔ ان کتب کا مطالعہ صرف مساجد کی چھوٹی سی لائبریری میں کیا جا سکتا ہے جس کا منتظم مسجد کا امام ہوتا ہے۔ ان علمی ذخائر کا کچھ حصہ سلطنتِ ترکیہ کے فیاض امرا نے اِن مساجد کو عطا کیا تھا، کچھ شاہی محلات سے لیا گیا اور کچھ ترکی کی فتح مند افواج نے بغداد، دمشق قاہرہ اور تبریز کی لائبریریوں سے مالِ غنیمت کے طور پر حاصل کیا تھا۔ ہر کتاب ایک شاہکار ہے جسے کسی پیشہ ور خطاط نے کسی امیر کے لئے یا خود مصنف کے لئے لکھا ہے۔ ہر کتاب کے معطی کا نام کتاب پر درج ہے اور اس طرح خود کتابیں اپنی تاریخ بتا رہی ہیں۔ ان کتب کے نقل کرنے والے بھی امرا تھے جن کی سرپرستی سلطان یا امیر کرتے تھے۔

قسطنطنیہ کے کتب خانوں میں کتابیں عاریتہً دینے کا رواج نہیں ہے، کیونکہ بیشتر کتب اس قدر قیمتی ہیں کہ ان کا عجائب خانے کی نادرات کی طرح مقفل رہنا ہی بہتر ہے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ منتظم کو بہلا پھسلا کر رات کی رات کے لئے کتاب عاریتہً لی گئی اور جب واپس کی گئی تو منتظم نے بظاہر کوئی تبدیلی نہ پا کر کتاب رکھ لی، لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ کتاب کے کئی اوراق اڑا لئے گئے ہیں اور ان کی بجائے نہایت چالاکی سے مصنوعی اوراق لگا دیئے گئے ہیں اور اس طرح صناعی کے کئی بیش قیمت نمونے ضائع ہو گئے۔ چنانچہ بوسٹن کے عجائب خانے میں ایک ورق موجود ہے جو آج سے پچیس سال قبل تیرھویں صدی کی ایک مصنعی کتاب میں سے چرایا گیا تھا۔

ان کتب کی مکمل فہرست صرف انگورہ میں موجود ہے جسے حکومت نے مرتب کرایا ہے کیونکہ اب تمام کتب خانے تعلیمی وزارت کی تحویل میں ہیں۔ یہ فہرست بھی کتب خانوں کی فہرست کے اصول پر نہیں ہے کیونکہ اس میں بلالحاظ ان کے نفسِ مضمون کے صرف کتابوں کے نام درج ہیں۔

ترکی کی تمام کتابیں بہت قدیم ہیں اور ان میں سے اکثر ایسی ہیں جن کی دوسری کاپی کہیں بھی موجود نہیں۔ ان میں جغرافیہ، نجوم، ہیئت، قانون، حکمت، مذہب اور مذہبی شاعری کی کتابیں ہیں۔ بعض ممتاز افراد کے خطوط کے مجموعے بھی ہیں۔

ان میں طبی کتب بھی ہیں جنہیں کافی اہمیت دی جا سکتی ہے۔ طبی کتب میں پودوں اور بوٹیوں کی تصویریں دی گئی ہیں۔ بعض میں جسمِ انسانی کے خاکے ہیں جن میں دورانِ خون دکھایا گیا ہے۔ اِن کتب کی تصنیف کے

CALCUTTA
ART PG WORKS
LAHORE

وقت میسوپوٹیمیا میں سائنس نے یورپ کی برنسبت کافی ترقی کرلی تھی ۔ یہ لوگ اُن دنوں نہایت کامیابی سے عملِ جراحی کرلیا کرتے تھے جب کہ شمالی ممالک میں ابھی اس کی ابتدا بھی نہ ہوئی تھی ۔

دماغی مریضوں کے علاج میں مسلمانوں نے ہی سبقت کی ۔ شمالی علاقے میں ایسے مریضوں کو مغضوبِ غضبِ الٰہی سمجھا جاتا تھا حالانکہ اسلامی ممالک میں ایسے مریضوں کے ہسپتال موجود تھے اور موسیقی کے ذریعہ سے اُن کا کامیاب علاج کیا جاتا تھا ۔

ابتدائی زمانے میں ترکی میں جغرافیہ دانوں کی بھی کمی نہ تھی ۔ دنیا کا سب سے پہلا نقشہ ایک عرب ادریسی نامی نے ۱۱۵۴ء میں تیار کیا تھا ۔ یہ نقشہ ایک چاندی کی چوکی پر ایک نارمن بادشاہ کے لئے بنایا گیا تھا جس نے عربوں سے سسلی کو فتح کیا تھا ۔ اس بادشاہ کے دربار میں کچھ عرب تھے جنہیں اُس نے اس کام کے لئے روپیہ اور سامان مہیا کیا تھا ۔ ادریسی نے اپنے کام کے متعلق ایک کتاب بھی لکھی جس میں زمین کو چپٹا اور سمندر کو اُس کے اطراف پر محیط بنایا ہے ۔ قسطنطنیہ کی کتب میں ادریسی کی اس کتاب کے چند نسخے موجود ہیں ۔

ایک اَور مشہور ترک جغرافیہ دان نے ساتویں صدی میں اپنی سیاحتِ یورپ کے متعلق ایک کتاب بارہ جلدوں میں لکھی ۔ چند سال ہوئے ہیمر نامی ایک جرمن نے اس کی پہلی جلد کا ترجمہ انگریزی میں کیا ہے ۔ یہ نہایت حیرت انگیز کتاب سمجھی جاتی ہے ۔

مختلف سلاطین کے تین نادرِ روزگار کتب خانے ٹاپ کپو کے محل میں جمع کئے گئے ہیں ۔ یلدیز محل کا کتب خانہ استنبول کی یونیورسٹی لائبریری کو دے دیا گیا ہے ۔ یہ ذخیرہ نہایت اہم ہے ۔ گذشتہ پانچ سال کے عرصہ میں درویشوں کی خانقاہوں میں سے قریباً دس کتب خانے مسجدِ سلیمانیہ میں منتقل کر دیئے گئے ہیں ۔ عجائب خانہ ایوگاگ کا کتب خانہ سب سے زیادہ حیرت انگیز ہے جہاں کے ابھرے ہوئے طلا کار کام کو دیکھ کر بڑے بڑے گھاگ حیرت زدہ رہ جاتے ہیں ۔

بعض حلقوں میں افواہ ہے کہ حکومت ان ذخائر کو انگورہ میں منتقل کرنے والی ہے لیکن بیرونی مستشرقین چاہتے ہیں کہ انہیں موجودہ جگہ پر ہی رہنے دیا جائے ۔ ان مسجدی کتب خانوں نے علومِ قدیمہ کے دلدادوں کو اس قدر مسحور کر رکھا ہے کہ اکثر نے مستقل طور پر استنبول میں اقامت اختیار کرلی ہے اور اپنی بقایا زندگی وہیں گذارنے کا تہیہ کرلیا ہے ۔

بقولِ اہلِ بابل

ہر بچے کی زندگی میں ایسا زمانہ آتا ہے جب کہ وہ نہ صرف دنیا بلکہ کل کائنات کے وجود پر نظر ڈال کر متحیر ہوتا ہے اور پریشان ہو کر سوال کرتا ہے کہ اس کائنات کا صانع کون ہے؟ آخر آسمان، زمین سورج، چاند اور ستاروں کا بنانے والا کون ہے؟ سمندر، پہاڑ، درخت، پھول وغیرہ عالمِ وجود میں کس طرح آئے؟

اُس کے بزرگ جواب دیتے ہیں کہ قادرِ مطلق اِن کا صانع ہے اور اُس کے ہی حکم سے کل کائنات عالمِ ہستی میں آئی۔ اس کے بعد جب بچہ دوسرا سوال کرتا ہے کہ کس طرح خالق ان کو عالمِ ہستی میں لایا تو اس کے جواب میں پیدائش عالم کی مختصر کیفیت بیان کی جاتی ہے اور ساتھ ہی سمجھا دیا جاتا ہے کہ اِس کے سمجھنے کے واسطے ایک زمانہ درکار ہے اور مختلف علوم پر کافی عبور ہونا لازمی ہے۔

الغرض اسی قسم کے سوال و جواب ہر خورد و بزرگ ہر زمانہ میں کرتے چلے آئے ہیں اور ہر قوم اور ہر فرقہ نے اپنی قابلیت اور مبلغ علم کے موافق اُن کے جواب دیئے ہیں جن کا نفسِ مطلب قریب قریب ایک ہی ہے۔

اس مسئلہ پر سب متفق ہیں کہ صانعِ عالم، موجدِ قانونِ قدرت اور نیستی سے ہستی میں لانے والی کوئی بڑی زبردست قوت ہے۔ فرق اس قدر ہے کہ جو مذاہب ترقی کر کے طبقۂ اعلیٰ پر پہنچے ہیں وہ اِس قوت کو خالق اور قادرِ مطلق وحدہٗ لاشریک کہتے ہیں اور جو مذاہب جہالت کی تاریکی سے باہر نہیں ہوئے اور جنہوں نے رسالت کی روشنی سے نفع نہیں اُٹھایا اُنہوں نے اس قوت کو مختلف خداؤں پر تقسیم اور دنیا اور کائنات کے وجود کو ان کی متفقہ قوتوں پر مبنی کیا ہے۔ اگر غور کیا جائے تو مختلف خداؤں کے کارناموں کے قصص اور افسانوں کا آغاز ان ہی عقائد کی بنا پر ہے اور ہر فرقہ و ملت نے اپنی فکر و مبلغ علم کے موافق پیدائشِ عالم کے واقعات بیان کئے ہیں۔

اہلِ بابل کا اعتقاد آفرینشِ عالم کے متعلق عجب دلچسپ گو لا یعنی ہے بہر حال اختصار کو مدِنظر رکھ کر ہدیۂ ناظرین ہے۔ یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ ملکِ بابل کے قدیم شہروں سے جو کتابے برآمد ہوتے ہیں اُن کی قدامت پر سب متفق

ہیں - یورپ اور امریکہ کے اساتذہ کی کوشش سے شہر نپر[1]، اگید[2]، سپر[3]، کوتھا[4] وغیرہ کے آثارِ قدیم سے علاوہ دیگر عجائبات کے نہایت قدیم زمانہ کے ہزارہا کتابے برآمد ہوئے ہیں - بعض قدیم تر کتابوں کی نقول ہیں اور بعض ان میں سے چار ہزار سال قبل مسیح کے سمجھے جاتے ہیں -

قدیم کتابے دستیاب ہونے سے پہلے بابل اور اہلِ بابل کے متعلق جو کچھ ہم کو علم تھا وہ برسس بابلی پوجاری مندر بعل کی بدولت تھا تین سو برس قبل مسیح اس شخص نے مشرح تاریخ ملکِ بابل من ابتدائے آفرینش تا فتح سکندر اعظم زبانِ یونانی میں تصنیف کر کے سکندر اعظم کی نذر کی تھی - افسوس ہے کہ تاریخ مذکور نابود ہو گئی - دیگر یونانی مصنفوں نے جن کے زمانہ تک اس تاریخ کا وجود تھا اپنی تصانیف میں اس کے حوالے دیئے ہیں -

الگزنڈر پالی ہسٹر نے بحوالہ برسس آفرینشِ عالم کا حال قلمبند کیا ہے جس کی نقل یوسی بیس نے اپنی کتاب کرونی کان کی پہلی جلد میں کی ہے - فی زماننا برسس کی تاریخ بابل کی چنداں پروا نہیں رہی کیونکہ ممالک بابل اور اسیریا کے آثارِ قدیم سے ہزارہا کتابے برآمد ہو کر لندن، پیرس، امریکہ اور قسطنطنیہ پہنچ گئے ہیں نیز اہلِ بابل اور اولادِ اشر (اسیرین) کی زبانوں پر کافی عبور ہو جانے سے قدیم حالاتِ بابل پر کافی روشنی پڑ گئی ہے -

ساتویں صدی قبل مسیح کے وسط میں شہر ننوہ میں آفرینشِ عالم کا منظوم قصہ محفوظ تھا - بارہ باب پر اُس کو منقسم کیا گیا تھا - ہر باب ایک خشت سے متعلق تھا گویا بارہ باب بارہ اینٹوں پر کندہ تھے - کامل نظم اِی نوما ایلش کے نام سے مشہور تھی - افسوس ہے کہ نظم مذکور کے بیت کے بیت اور مصرعے کے مصرعے، کتبوں کے شکست ہو جانے سے فنا ہو گئے تاہم دیگر کتابوں کی امداد سے قصہ کا سلسلہ ملتا ہے اور برسس بابلی کے اقوال کی تائید ہوتی ہے -

آفرینشِ عالم موافق اعتقادِ اولادِ سام

آفرینش کے متعلق اولادِ سام کا عقیدہ ذیل کے مضمون سے جو حقیقتاً مختلف کتبوں کا ترجمہ ہے ظاہر ہو گا - اُن کے اعتقاد کے موافق ایک زمانہ ایسا تھا جب کہ آسمان و زمین ہستی میں آئے نہ تھے اور سوائے اپسو (بحر) پیدا

---

[1] نپر کو اب نفر کہتے ہیں -

[2] اگید کو اب ابو حبّا کہتے ہیں -

[3] سپر اور اگید ایک ہی شہر کے دو حصے ہیں -

[4] کوتھا کو اب تل ابراہیم کہتے ہیں -

کرنے والا ہر شے کا) اور تیامت (سمندر موجزن جس سے ہر شے پیدا ہوئی) کسی چیز کا وجود نہ تھا۔ صرف انہی دونوں کی موجیں آپس میں مل مل کر ایک جان ہوتی تھیں۔ اُس وقت نہ زمین کا نشان نہ دلدل کا وجود اور نہ آسمان کا پتہ تھا حتیٰ کہ دیوتا بھی پیدا نہیں ہوئے تھے نہ لوحِ محفوظ مرتّب ہوئی تھی اور نہ مستقبل کا کچھ فیصلہ ہوا تھا۔ اِس ہیولیٰ یا ہیئتِ اولیٰ کے بعد جلیل القدر خداؤں کا وجود ہوا اور سب سے پہلے دو دیوتا عالمِ ہستی میں آئے جو لخمو اور لخامو کے ناموں سے منسوب ہوئے۔ پھر مدت مدید کے بعد انشار[1] اور کشار[2] کا وجود ہوا۔ ایک زمانۂ کثیر کے بعد ان کی تین اولادیں ہوئیں۔ انو[3]۔ انلیل[4]۔ ئیا[5]۔

ئیا اور اس کی زوجہ دام کنیا سے بعل مردوخ پیدا ہوا اور اُس کو صانعِ عالم و خلّاقِ جہاں مانا گیا۔ بعد ازاں نو دم مد کا وجود ہوا جو مالک و حاکمِ تحت الثریٰ سمجھا گیا۔

ہر خدا نے اپنی ذاتِ پاک یا نفسِ قدسی یا جوہر سے ایک دیوی وضع کر کے اپنی زوجیت[6] میں لی اور ان سے دیگر دیوتا مثلاً سن (قمر) شمس (آفتاب) رم من (ہوا) پیدا ہوئے[7]۔ اس روز افزوں نسل سے تیامت کی حکومت صرف محدود ہی نہیں ہوئی بلکہ اُس کے مدعا کے خلاف اُس کی اولاد نے عالم کو قبضہ میں لا کر باقاعدہ کرنا چاہا۔ اس سوءِ ادبی کو دیکھ کر اپسو سے نہ رہا گیا۔ اپنے خلف الرشید و مشیر مو سے کہا کہ اے میرے لختِ جگر میرے ہمراہ تیامت کے حضور میں حاضر ہو کر لخمو اور لخامو کی اولاد کے ارادوں سے جو خدائے افلاک بن بیٹھے ہیں مطلع کر۔ چنانچہ دونوں حاضر ہو کر سربسجود ہوئے اور اپسو نے عرض کیا کہ اے قادرِ علی الاطلاق، ملاءِ اعلیٰ کے ارادوں کی جب سے مجھے اطلاع ہوئی ہے شب کی نیند اور دن کا چین حرام ہو گیا ہے۔ میں نے تہیّہ کر لیا ہے کہ رخنہ اندازی کر کے ملاءِ اعلیٰ کے منسوبوں کو تباہ اور آفت و مصیبت نازل کر کے پریشان و سرگرداں کر دوں گا۔

---

[1] انشار (بمعنی ساکنِ عرش)۔

[2] کشار (بمعنی ساکنِ زمین)۔

[3] انو۔ خدائے افلاک۔

[4] انلیل کو ایلی لا اور انلیل بعل بھی کہتے تھے اور وہ تمام خوبیوں کا خدا سمجھا جاتا تھا۔

[5] ئیا کو آ بھی کہتے تھے اور وہ عقل و فہم کا خدا تصور ہوتا تھا نیز پانی کا خدا سمجھا جاتا تھا۔

[6] انو کی زوجہ انات۔ بعل کی لعلیت۔ ئیا کی دام کنیا۔

[7] یہ سب مرتبہ میں برابر تھے۔ ان کے بعد خود سیالے یا ملائکِ سیارگاں کا شمار تھا۔

تیامت اِس خبرِ بد کو سن کر غرائے اور تباہ کُن طوفان اٹھانے لگی اور غصہ میں کوسنا شروع کیا۔ بعد ازاں اپسو سے دریافت کیا کہ ایسی کون سی تدبیر عمل میں لائی جائے جو جلیل القدر خداؤں کو اُن کے ارادوں سے باز رکھے اور ہم بلا کسی مداخلت کے زندگی بسر کرتے رہیں۔ فتنہ انگیز ممّو بولا کہ گو ملاءِ اعلیٰ جلیل القدر اور اُن کے ارادے بلند ہیں تاہم آپ اُن کو زیر اور اُن کے عزم کو پست کر سکتی ہیں۔ ممّو کی رائے سُن کر اپسو شاد شاد ہوا لیکن خداؤں کے عزم کے خیال سے لرزاں تھا۔

ئیا خدا نے جو دانا و بینا ہے تیامت وغیرہ کے مشورہ سے واقف ہو کر منتر پڑھا جس کے اثر سے اپسو اور ممّو مسخر یا مقید ہو گئے۔ کنگو نے جو آخر الذکر کا ہم خیال تھا تیامت سے عرض کیا کہ اپسو اور ممّو کے مفتوح ہو جانے سے ہم سب نہایت بے چین ہیں۔ اے قہار اُن کا بدلہ لے۔ تیامت نے جواب دیا کہ اے میرے حامی تو بھروسے کے قابل ہے اعلانِ جنگ کر۔ اولو العزم خداؤں کے معزول کرنے کی فکر میں بڑے پیمانہ پر انتظام شروع ہوا غضب و قہر کا دریا جوش میں آیا۔ قوتِ اسفل نے ہجوم کیا اور تیامت نے (جس کو اس موقع پر ام خوبر یعنی مادر خوبر سے خطاب کیا ہے) عجائب الخلقت مخلوق پیدا کر کے خوفناک اسلحہ سے مسلح کیا۔ اور اس جرار لشکر کو کنگو کے زیرِ حکومت کر کے لوحِ محفوظ حوالے کی۔

انشار، تیامت اور اس کے تابعین کی سازش اور افلاک کے خداؤں کو تباہ کرنے کے ارادہ سے مطلع ہو کر نہایت چراغ پا ہوا۔ اپنے وزیر گاگا کو یاد کر کے فرمایا "اے میرے روح افزا وزیر میرے والدین کی خدمت میں حاضر ہو کر میری طرف سے عرض کر کہ خداوند کے صاحبزادہ انشار نے بندہ کو خداوند کی حضور میں بھیج کر گذارش کیا ہے کہ ماما تیامت ہم سے بلا وجہ ناراض ہو کر شب و روز غصہ میں پیچ و تاب کھاتی ہے۔ تمام دیوتا اُس کے معاون و مددگار ہو گئے ہیں حتیٰ کہ وہ بھی جن کو خداوند نے پیدا کیا تھا۔ وہ برہمی و آشفتگی کی وجہ سے شب و روز ہم کو گزند و مضرت پہنچانے کی تدبیروں میں منہمک اور دل کا بخار نکالنے کی فکر میں ہیں۔ نہایت جوش و خروش سے جنگ کی تیاری کی ہے اور لشکر جمع کر کے بر سرِ پرخاش ہیں۔ ماما خوبر (تیامت) نے عجیب الخلقت اور انواع و اقسام کی خوفناک مخلوق کو پیدا کر کے کاری اسلحہ سے مسلح کیا ہے مثلاً مار ہیئت عفاریت کو تیز دانتوں اور بڑے بڑے ناخنوں سے مسلح کر کے بجائے خون کے اُن کے جسم میں زہر بھرا ہے۔ عفریت جسم برق دم اژدھے جن کے پھونکاروں سے آگ کے شعلے نکلتے ہیں، غضب ناک کتے، کژدم نما اور ماہی صورت حیوان، سانڈ جیسے مانس (یعنی جسم ثور کا اور سر انسان کا) نیز ایسی مخلوق جس کا جسم گھوڑے کا اور رخونفی کبنتہ کی خشم ناک کتے

جن کے چار جسم آپس میں ملے ہوئے اور دُم ایک وہ بھی مچھلی جیسی بعض کا جسم انسان کا اور منہ عقاب اور شکرے کی مثال، بعض کے دو منہ اور چار پیر ہیں، بعض کی ٹانگیں اور سینگ بکرے کے اور چہرہ آدمی کا سا اور بعض کا نیچے کا دھڑ گھوڑے کا اور اوپر کا جسم انسان کی طرح - قصہ مختصر ایسے گیارہ عفریت پیکر راکشس پیدا کئے ہیں اور جاہ و جلال عطا فرما کر فلک پر چڑھایا ہے - ان کی صورت دیکھتے ہی ہر متنفس کا دل دہل جاتا ہے آندھی اور طوفان کو وجود میں لا کر حشر بپا کیا ہے - کسی میں تابِ مقاومت اور نافرمانی کی مجال نہیں ہے - کنگو کو اس ہیبت ناک اور جرار لشکر کی سپہ سالاری سے سرفراز فرما کر ہدایت کی ہے کہ کوچ کے وقت لشکر کے پیش پیش چل کر رہنمائی کرے - نواختنِ طبلِ جنگ کا حکم دے - سپاہ کا پرا باندھ کر اور صفیں آراستہ کرکے دشمن پر حملہ آور ہو نیز جنگ و پیکار میں شیرانِ اوژن و سپاہِ جنگجو کے شیرازہ کو منتشر ہونے دے - نہایت گراں بہا پوشاک پہنا کر کنگو کو دیوتاؤں کی مجلس میں مسند نشین کیا اور منتر پڑھ کر فرمایا کہ تجھ کو ہم نے ربوبیت کے اعلیٰ مرتبہ پر پہنچا کر تمام دیوتاؤں کو تیرے تابع فرمان کیا ہے - اے میرے پسندیدہ شوہر میری خواہش ہے کہ تیرا عروج، افتخار اور بول بالا ہمیشہ رہے لوحِ محفوظ حوالے کرکے فرمایا کہ تیری عدول حکمی کی کسی کو مجال نہیں ہوگی - زبان سے لفظ نکلتے ہی تعمیل ہوگی - تیری صرف لب کشائی سے آگ کا دیوتا ٹھنڈا ہو جائے گا - جس کو اپنی قدرت اور قوت پر زعم ہو وہ تجھ سے نبرد آزما ہو کر تماشا دیکھے - چنانچہ کنگو نے فلک پر پہنچ کر انو خدا کی قدرت حاصل کی اور تیامت نژاد دیوتاؤں کی قسمت کا فیصلہ کرنے لگا ہے - تیامت اور اُس کے تابعین کی غداری اور دغا بازی کا علم ہوتے ہی میں نے اپنے بہادر لڑکے انو کو اژدہے کے پاس (تیامت نے خود اژدہے کی صُورت اختیار کر لی تھی) بھیجا تھا تاکہ سمجھا بجھا کر اُس کا غصہ فرو کرے اور صلح و آشتی سے اگر کام نکل آئے تو فبہا ورنہ بنفسِ نفیس مقابلہ کرکے زیر کرے لیکن جونہی اژدہے پر انو کی نظر پڑی اور اُس نے پھنکاروں اور غرانے کی آواز سنی بدحواس ہو کر باقاعدہ واپسی کو مقابلہ پر ترجیح دی - اُس کے بعد نودمد کو تجویز کیا گیا مگر وہ بھی اس ہولناک صورت کو دیکھتے ہی سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا - آخر کار مردوخ نے تیامت کے زیر کرنے اور ہم سب خداؤں کو پناہ دینے پر کمرِ ہمت باندھی ہے - بشرطیکہ اس کی مندرجہ ذیل معروضات کو قبولیت کا شرف بخشا جائے!

(۱) سب جلیل القدر خدا مقام اپ شک کن ناکو (مقام کرسی) میں جمع ہوں،

(۲) جلیل القدر خداؤں کی مجلس میں اس کو صدر نشین کرکے اعزاز کا اعلان کیا جائے،

(۳) مستقل حکومت سے سرفراز فرمایا جائے،

(۴) مثل ہمارے وہ قسمتوں کا فیصلہ کرے،
(۵) اُس کے ہر فعل کو دوام حاصل ہو،
(۶) کن فیکون کی قدرت عطا ہو،
(۷) اُس کے احکام میں کوئی تغیر یا مداخلت نہ کی جائے۔

اے میرے وزیر گا گا جلد میرے والدین کی خدمت میں حاضر ہو کر میرا پیغام پہنچا اور دست بستہ عرض کر کہ قضا و قدر کی قدرت خداوندی کو حاصل ہے شفقتِ بزرگانہ سے جلد مردوخ کی معروضات کو منظور فرمایا جائے تاکہ وہ ہمارے دشمنوں کا مقابلہ شیر دل ہو کر کر سکے"

گاگا لخمو اور لخامو کی حضور میں پہنچ کر آداب بجالایا۔ آستاں بوس ہو کر دست بستہ کھڑا ہوا اور انشار کا پیغام نہایت مودبانہ پہنچایا۔ (تیامت کی غدّاری اور جنگ کی تیاری کا حال بیان کیا) دونوں نے بغور سنا ایگیگی (ملائک) اس واقعہ کو سن کر اشکبار کہتے تھے کہ آخر کس وجہ سے اس قدر خشونت پیدا ہوگئی۔ تیامت کی حرکت ہماری سمجھ سے باہر ہے۔ اس ولئے ویلا کے بعد تمام جلیل القدر خدا جو قسمتوں کا فیصلہ کرنے والے تھے جمع ہو کر روانہ ہوئے اور یہ جمِ غفیر انشار کے پاس پہنچا۔ اُس کی اقامت گاہ خداؤں سے بھر گئی۔ دعوت کی تیاری کی گئی۔ دستر خوان بچھا۔ خاصہ چنا گیا۔ خداؤں نے نان خطائی تناول کی اور خنک شہد کا شربت نوش فرمایا۔ شرابِ کنجد کا دور چلا۔ آنکھوں میں سرسوں پھولی۔ اپنے آپے کا ہوش نہ رہا۔ ہاتھ پاؤں نے جواب دیا لیکن ہمت بلند ہوگئی اور انتقام لینے والے مردوخ کی قسمت کا فیصلہ کیا۔ مردوخ کے واسطے قصرِ شاہی تیار کر کے اُسے مشیرِ خاص کی جگہ بٹھایا اور مخاطب ہو کر فرمایا کہ اے مردوخ تو تمام جلیل القدر خداؤں کا سردار ہے اور تیری قسمت لاثانی ہے۔ تیرا کلمہ وہی قوت رکھتا ہے جو انو کا۔ آج سے تیرا حکم رائگاں نہیں جائے گا۔ عزت و ذلت دینا تیری قدرت میں ہے تیرے منہ سے نکلی بات کو استحکامِ دوامی ہوگا۔ تیری حکم عدولی کی کسی کو مجال نہیں ہوگی۔ کوئی خدا تیری قلمرو میں مداخلت نہیں کرے گا۔ نذرانوں کی افراط جو خداؤں کی دلی تمنا ہے تیری پناہ گاہ (مندر) میں ہوگی خواہ کتنی ہی قلت دیگر خداؤں کے منادر میں ہو۔ اے مردوخ تو منتقمِ حقیقی ہے۔ ہم کُل کائنات کی حکومت تیری تفویض میں دیتے ہیں۔ تو عظمت و جلال سے دربار کر تیرا حکم بالاتر ہوگا۔ تیرے اسلحہ ہمیشہ کاری اور دشمن کو زیر کرنے والے ہونگے۔ اے شاہنشاہ اُس کو تو اپنی پناہ میں لے جو تیرا معتقد ہو اور اُس خدا کو جس نے غدر کیا ہے نیست و نابود کر دے۔ اے نگہبان ہماری دلی خواہش ہے

کہ تیرا مرتبہ سب خداؤں سے افضل اور بالاتر ہو۔ ہست و نیست کی طاقت اور کن فیکون کی قدرت تجھ کو عطا کی جاتی ہے اس کا تجربہ اس پوشاک پر کر جو تیرے سامنے ہے۔ تیرے حکم کے ساتھ غائب اور تیرے فرماتے ہی حاضر و موجود ہو جائے گی۔

خداؤں کے ارشاد کی تعمیل میں مرودخ نے نیست کہا وہ صفحۂ ہستی سے مٹ گئی۔ اور ہست کہتے ہی دوبارہ عالمِ وجود میں آگئی۔ اس معجزہ کو دیکھتے ہی سب خدا مسرت سے ایک زبان ہو کر بولے "مرودخ شاہنشاہ ہے"۔ سب آداب بجالائے اور تاج و تخت، خاتم و چترِ شاہی اس کی نذر کئے گئے۔ نیز ایک کاری ہتھیار جس سے وہ دشمنوں کو مغلوب کر سکے عنایت کر کے فرمایا "جاؤ تیامت کی حیات کا خاتمہ کرو اور اُس کے خون کو مخفی مقامات پر ہوا پہنچائے گی"۔ جب بزرگ خداؤں نے مرودخ کو مختلف قوتوں اور قدرتوں سے مسلح کر کے کامیابی و فیروزمندی کی شاہراہ پر کھڑا کیا تو اُس نے کمان اور نیزے کا اختراع کر کے نیزے کو بغل میں دبایا۔ گرز سیدھے ہاتھ میں لیا۔ تیر و کمان پہلو میں آویزاں کئے۔ آتشِ شعلہ زن اپنے جسم میں داخل کی اور اپنے جلو میں بجلی کو کوندنے کا حکم دیا۔ ایک جال بنایا نیز مشرقی مغربی، شمالی اور جنوبی ہواؤں کو وجود میں لایا تاکہ تیامت کے جسم کا کوئی حصّہ بچ کر نہ جائے۔ بادِ ادبار، آندھی، بے مثل بگولا، گردباد، نیز چوبائی اور بادِ ہفت تند و طوفان کو ہستی میں لا کر مشرقی، مغربی، شمالی و جنوبی ہواؤں کو اپنے بزرگ انو کی عطا کردہ کمند کے قریب استادہ کیا۔ اپنے مخترع جال کو چاروں سمت پھیلایا۔ بادِ ہفت اقسام کو اپنے پیچھے پیچھے آنے کا حکم دیا اور ابوبو (صاعقہ) سے مسلح ہو کر اپنی لاثانی خوفناک جنگی چوکڑی پر سوار ہوا جس میں بے نظیر بادرفتار چار گھوڑے جُتے ہوئے تھے۔ اُن کے دانت سمِّ قاتل سے بجھے ہوئے۔ وہ بھاگ دوڑ میں مشاق اور دشمن کو ٹاپوں سے روندنے میں ماہر تھے۔ القصہ ان تیاریوں کے بعد اور اسلحے سے مسلح ہو کر اپنے بزرگوں کے سایۂ عاطفت میں تیامت کے مقابلہ کے واسطے روانہ ہوا جونہی مرودخ کی نظر تیامت پر پڑی کچھ ہیبت طاری ہوئی مگر سنبھلا۔ کنگو پر نظر پڑی تو دیکھا کہ نہایت حقارت سے مرودخ کو گھور رہا ہے لیکن چار آنکھیں ہوتے ہی کنگو پر رعب غالب ہوا اُس کے ارادے پست ہو گئے اور انتظام میں خلل پڑا۔ اپنے ناخدا کی پریشانی دیکھ کر مددگار خداؤں کے قدم اکھڑ گئے مگر تیامت قدم جمائے اور سر بلند کئے مرودخ اور دیگر خداؤں سے جو مرودخ کی پناہ میں کھڑے تھے طعنہ زنی کرنے لگی۔ مرودخ نے اس کی غداری پر لعنت ملامت کی اور کہا کہ اپنی فوج کو آراستہ اور اپنے اسلحہ کو درست کر۔ بہتر یہ ہے کہ میرا اور تیرا مقابلہ ہو۔ تیامت اِن الفاظ کو سنتے ہی غصہ سے بے خود ہو گئی۔ چیخنے اور چنگھاڑنے لگی سارا

بدن تھرانے لگا۔ غیر معمولی حرکات سے بھوت کے اثر کا شبہ ہوتا تھا۔ بہرحال اپنے آپ کو سنبھال کر تیامت منتر پڑھنے اور جادو کرنے لگی۔ خداؤں نے اپنے اپنے اسلحہ طلب کئے۔ جنگ و پیکار پر آمادہ ہوئے۔ مرودخ او تیامت ایک دوسرے کے مقابلہ میں آگے بڑھے۔ جونہی تیامت زد میں آئی مرودخ نے اپنی کمند پھینکی۔ بادِ ادبار کو تیامت کے چہرہ پر چلنے کا حکم دیا۔ تیامت کے منہ پھاڑتے ہی بادِ ادبار نے اُس کے شکم میں داخل ہوکر اُس کی ہمت و جرأت کو سلب کر لیا اور بیچاری کا منہ پھٹا کا پھٹا رہ گیا۔ مرودخ نے موقع پاکر نیزے کا ایسا کاری وار کیا کہ انی پیٹ میں گھستی جگر کو چیرتی دل کے پار ہوگئی۔ ایک ہی وار میں تیامت کا کام تمام ہوا اور نعش پٹخ کر مرودخ اُس پر کھڑا ہوگیا۔[۵۱]

تیامت کے مرتے ہی اُس کی فوج کے پاؤں اکھڑ گئے۔ مددگار دیوتا جو اس کی کمک پر آئے تھے ہیبت سے لرزنے لگے۔ بیچارے نعش افگندہ جان کے خوف سے سرپاؤں پر رکھ کر بھاگے لیکن بعض محصور ہوکر گرفتار اور بعض اسیرِ کمندِ مرودخ ہوئے۔ اُن کے اسلحہ توڑے گئے اور قدرتیں سلب کی گئیں۔ گریہ و زاری سے محبوس دیوتاؤں نے ایک عالم کو سر پر اٹھا لیا تھا۔ گیارہ عجیب الخلقت راکشس اور فوجِ عفاریت جن کو تیامت نے مخصوص اس معرکہ کے لئے پیدا کیا تھا نیست و نابود کئے گئے۔ کنگو شوہرِ ثانی و سپہ سالارِ افواجِ تیامت کو آسمان پر اٹھا کر اوگ گا (عزرائیل) کے حوالہ کیا گیا۔ مرودخ نے لوحِ محفوظ اُس کے قبضہ سے نکال کر (جو حقیقتاً اُس کی ملکیت نہ تھی) اور اپنی مہر ثبت کرکے اپنے سینہ میں رکھ لی۔ تمام قدرتیں جو تیامت نے ضبط کرلی تھیں انشا کو واپس دی گئیں۔ اسی طرح ندم مد متمتع ہوا۔

جب شجاع مرودخ اپنے دشمنوں کو غارت اور تباہ کر چکا تو تیامت کی نعش کی طرف متوجہ ہوا اُس کے پاؤں کی طرف کھڑے ہوکر اپنے زبردست گرز سے اُس کی کھوپری پاش پاش کی۔[۵۲] اُس کے جسم کی شریانوں کو کاٹ کر

---

[۵۱] زبور کی عبارت سے اژدہے پر قدرے روشنی پڑتی ہے۔ ملاحظہ ہو زبور باب ۷۴، آیات ۱۳ و ۱۴۔ تو نے اپنی قدرت سے دریا کو چیرا۔ تو نے پانیوں میں اژدہوں کے سر کچلے۔ تو نے لویتان (Leviathan) کے سر کے ٹکڑے کئے۔ ملاحظہ ہو یسعیاہ باب ۵۱۔ آیت ۹۔ کیا تو وہی نہیں جس نے رہب کو کاٹا اور اژدہے کو قتل کیا۔ ملاحظہ ہو یسعیاہ باب ۲۷ آیت ۱۔ اس دن خداوند اپنی سخت اور بڑی ہی مضبوط تلوار سے لویتان اس تیز رو سانپ کو اور لویتان اس پیچ پیچ سانپ کو اور دریائی اژدہے کو قتل کرے گا۔

[۵۲] مُردے کی کھوپری پھوڑنے کی رسم ہندوستان کے ہنود میں اب بھی جاری ہے نعش کے جلنے کے بعد قریب سے قریب رشتہ دار مردہ کی کھوپری کو بانس یا لٹھ سے پھوڑتا ہے۔

بادِشمالی کو حکم دیا کہ خون کو مخفی مقامات میں پوشیدہ کرے۔ مردوخ کے بزرگوں نے اس کارستانی سے شاد ہو کر تحفے تحائف پیش کئے۔

مخدوم مردوخ نے قدرے آرام کیا لیکن نعش کو بغور دیکھتا رہا اور عجیب منصوبہ گانٹھ کر اٹھا اور نعش کو سنگھاڑا مچھلی کی طرح پہلو کی طرف سے چیرا۔ ایک حصّہ سے افلاک کا گھٹا ٹوپ بنایا[۱] اور چٹخنیوں سے مستحکم کرکے نگران مقرر کئے اور حکم دیا کہ پانی کو نیچے نہ اترنے دیں[۲]۔ خود مردوخ نے دورہ کرکے آسمانوں کا معائنہ کیا۔ ندم مد کی آرام گاہ تحت الثریٰ میں بنائی گئی۔ نیز محل اشارہ[۳] بنا کر انو، بعل اور ئیا میں تقسیم کر دیا جو جداگانہ آسمان زمین اور پانی کے حاکم تھے۔ اُس نے خداؤں کے قیام کے واسطے مختلف مقامات بنائے[۴]۔ دیوتا شمس کو روزانہ دورہ کرنے

۱ے اہلِ بابل کے اعتقاد کے موافق زمین پر آسمان اس طرح قائم ہے جس طرح محراب یا قوس پایوں پر اس قوس کو مردوخ نے جنوب کی طرف سے بالکل ٹھوس رکھا لیکن شمال کی طرف سے سرنگ لگا کر مشرق و مغرب کی طرف راستہ نکالا اور یہاں یعنی مشرق و مغرب میں ایک ایک دروازہ قائم کیا۔ آفتاب جس کو شمس دیوتا سے خطاب کیا ہے۔ مغربی دروازہ سے سرنگ میں داخل ہوتا ہے۔ شب کو محل کیرب شامی میں جو سرنگ کے وسط میں واقع ہے آرام کرتا ہے۔

۲ے قیامت کے وجود کو پانی تصوّر کیا گیا تھا۔ فلک الافلاک کے گھٹا ٹوپ بنانے سے مدعا ہے کہ پانی سب آسمانوں سے اوپر ہے۔ یہی اعتقاد یہود کا ہے۔

۳ے ڈاکٹر جنسن کا قول ہے کہ یہاں اشارہ سے مدعا زمین سے ہے لہٰذا اس قول کے موافق مردوخ نے قیامت کے جسم سے قبۂ فلک الافلاک اور کرۂ ارض بنایا اور پانی زیرِ زمین کو بھی قید کیا۔ لیکن دیگر اساتذہ کا قول ہے کہ اشارہ بھی ایک آسمان یا اُس کے ایک حصّہ کا نام ہے۔

۴ے افلاک کلیہ نو ہیں اور مع افلاکِ جزئیہ ۲۴ ہیں۔ فلکِ کلی قمر کا چار افلاک پر مشتمل ہے (۱) مائل (۲) حامل (۳) تدویر (۴) جوزہر جو کہ تینوں پر محیط ہے۔ فلکِ عطارد کے بھی چار افلاک ہیں (۱) ممثل (۲) مدیر (۳) حامل (۴) تدویر۔ فلکِ شمس کے دو افلاک ہیں (۱) ممثل (۲) خارج المرکز۔ تدویر نہیں ہے کیونکہ شمس نخن خارج المرکز میں خود بجائے تدویر مرکوز ہے اور افلاکِ جزئیہ علویات یعنی زحل، مشتری اور مریخ کے الفاظ بعینہٖ مثل افلاکِ زہرہ کے تین ہیں (۱) ممثل (۲) حامل (۳) تدویر یہ سب ملا کر ۲۲ افلاک ہوئے اور عرش و کرسی سمیت ۲۴ ہوئے۔ اِن نو افلاکِ کلیہ میں سے پہلے فلک پر قمر دوسرے پر عطارد، تیسرے پر زہرہ، چوتھے پر آفتاب، پانچویں پر مریخ، چھٹے پر مشتری، ساتویں پر زحل ہے۔ ان ساتوں سیاروں کو سبع سیارہ کہتے ہیں۔ آٹھویں آسمان پر سیارگانِ ثوابت ہیں اُس کو فلک البروج کہتے ہیں اور شارع

کا حکم دیا - کل کائنات کا وجود اور دار و مدار شمس کے روزانہ دورہ پر منحصر کیا - سال کا حساب معین کر کے دقیقوں پر تقسیم کر دیا اور بارہ ماہ کا سال تجویز کیا - ہر مہینے کے تین حصے کئے اور ہر حصے کو دس روز کی حکومت بخشی اور سال کے تمام دنوں کو اُس نے نبو[۵۱] یعنی مشتری کی زیرِ نگرانی کیا تاکہ اُن میں سے کوئی منتشر ہو کر لاپتہ نہ ہو جائے - اُس نے قمر کو روشن کر کے شب کی حکومت عطا کی - لیل و نہار میں تمیز کرنے کی غرض سے شب کا سیارہ بنایا - ہمیشہ ہر ماہ کے آغاز میں سر پر آکو رکھنے کا حکم دیا (تاج جو دو سینگوں سے آراستہ ہو یعنی ہلال) اور ہدایت کی کہ ہر ماہ کے شروع میں اپنے سینگوں کو شب افروز کرے تاکہ آسمان آنکھ سے اوجھل نہ ہو - ساتویں روز مجھے (مردوخ) اپنا تاج دکھا اور چودھویں شب سباٹو[۵۲] (بدر کی صورت) اے کر شمس کے مقابلہ میں کھڑا ہو[۵۳] (کتبہ شکستہ ہو جانے سے پڑھا نہیں جاتا لیکن جہاں جہاں عبارت پڑھی جاتی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مردوخ نے سن دیوتا (قمر) کو اور بھی ہدایات کی تھیں نیز اُس کے منازل[۵۴] اور ہر منزل پر شمس دیوتا سے اُس کے تعلقات کو بیان کیا ہے) اُس نے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۹۶) نے اُس کا نام کرسی رکھا ہے - نویں فلک پر کوئی ستارہ نہیں ہے - اُس کو فلکِ اعظم، فلکِ اطلس، فلک الافلاک، فلکِ محیط، فلکِ اعلیٰ، فلکِ اقصیٰ اور محدد الجہات کہتے ہیں - اور شارع نے اس کا نام عرش لکھا ہے - عرش کے اوپر نہ خلا ہے نہ ملا بلکہ لامکان ہے -

۵۱ حکما نے مشتری کو عہدۂ قاضیِ فلک، صاحبِ فتویٰ، وزیر، صدر امین اور مجتہد کا عطا کیا ہے - یہ سیارہ مالکِ فلکِ ششم و عاملِ روزِ پنجشنبہ ہے - سعدِ اکبر اور افسرِ جملہ سیارگاں سمجھا جاتا ہے - نہایت بطی السیر ہے - ایک سال میں ایک برج طے کرتا ہے - آڑی ترچھی چال کی وجہ سے اہلِ بابل سمجھتے تھے کہ دیگر سیاروں اور ستاروں کو جمع کرتا پھرتا ہے اور منتشر نہیں ہونے دیتا -

۵۲ سباٹو بمعنی تعطیل یا آرام - اسی لفظ سے یہود نے لفظ سبتہ (Sabath) بنایا ہے جس کے معنی روزِ آرام کے ہیں -

۵۳ اس فقرہ سے ثابت ہوتا ہے کہ اہلِ بابل کو علم تھا کہ قمر اپنی روشنی آفتاب سے حاصل کرتا ہے -

۵۴ واضح ہو کہ حکما نے فلکِ ثوابت یعنی منطقۃ البروج کے ۳۶۰ درجے مقرر کئے ہیں - ان درجات کے ۱۲ حصے کر کے ان کا نام برج رکھا ہے - اگر ایک سیارہ دوسرے سے ۱۸۰ درجہ پر ہو تو مقابلہ کہتے ہیں اور یہ نظر عین دشمنی کی ہے - ۱۲۰ درجہ پر تثلیث نظر دوستی کی ہے - ۹۰ درجہ پر تربیع نیم دشمنی کی ہے - ۶۰ درجہ پر تسدیس کہتے ہیں یہ نظر نیم دوستی کی ہے - اگر دو سیارے ایک برج میں ایک درجہ اور دقیقہ پر جمع ہوں تو قران کہتے ہیں اور اگر کوئی سیارہ آفتاب سے قران کرے تو اجتماعِ نیّرین اور اگر آفتاب و قمر ۱۸۰ درجہ کے فاصلہ پر ہوں تو بدر کہتے ہیں - انتباہِ ناظرین کے لئے نقشۂ منازلِ سبعہ سیارہ ذیل میں درج ہے

(بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ پر دیکھئے)

سیاروں کے واسطے راستہ صاف کیا اور ان میں سے چار سیاروں کو چار دیوتاؤں[1] کے متعلق کیا اور پانچواں سیارہ نبرو (مشتری) اپنی ذات سے منسوب کرکے سماوی امّت کا پیشوا اور محافظ مقرر کیا۔
دیوتاؤں کی ہستی اور شبیہ کو ظاہر کرنے کے لئے مردوخ نے قبۂ فلک پر ستاروں کو اس طرح آراستہ کیا

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۹۷)

منازلِ سبعہ سیارہ

نام کوکب	زحل	مشتری	مریخ	آفتاب	زہرہ	عطارد	قمر
نام منزل	ذراع	شرطین	ثریا	ہقعہ	بطین	زبانا	ہنقعہ
״	سماک	طرفہ	اکلیل	صرفہ	دبران	نعایم	نثرہ
״	بلدہ	مقدم	جبہہ	قلب	عواد	سعود	زہرہ
״	ذابح	شولہ	بلغ	مؤخر	اخبیہ	غفرہ	رشا

منازلِ قمر

حمل			ثور			جوزا			سرطان			اسد			سنبلہ		
شرطین	بطین	ثریا	ثریا	دبران	ہقعہ	ہقعہ	ہنعہ	ذراعہ	نثرہ	طرفہ	جبہ	جبہ	زبرہ	صرفہ	صرفہ	عوا	سماک
۱۳	۱۳	۴	۹	۱۳	۴	۹	۱۳	۱۳	۱۳	۱۳	۴	۹	۱۳	۴	۹	۱۳	۱۳
میزان			عقرب			قوس			جدی			دلو			حوت		
غفرہ	زبانا	اکلیل	اکلیل	قلب	شولہ	شولہ	نعایم	بلدہ	ذابح	بلغ	سعود	سعود	اخبیہ	مقدم	مقدم	موخر	رشا
۱۳	۱۳	۴	۹	۱۳	۴	۹	۱۳	۱۳	۱۳	۱۳	۴	۹	۱۳	۴	۹	۱۳	۱۳

[1] نرگ یعنی زحل (سنیچر) مقام فلکِ ہفتم
نرگال یعنی مریخ (منگل) ״ ״ پنجم
اشطر یعنی زہرہ (جمعہ) ״ ״ سوم
نبو ״ عطارد (بدھ) ״ ״ دوم
نبرو یا مردوخ ״ مشتری (برہسپت / پنجشنبہ) ״ ״ ششم

بقولِ صاحبِ مخزن الادویہ روحانیہ کو لسانِ شرع میں ملائکہ کہتے ہیں مثلاً
روحانیہ زحل کو عزرائیل
״ مشتری کو میکائیل
״ مریخ کو اسرافیل
״ شمس کو جبرائیل

کہ بروج کی صورت بن گئی اور اُن کو دیوتاؤں پر تقسیم کر دیا۵۔

---

۵ واضح ہو کہ اہلِ بابل نے جن کی پیروی ہر ملک کے منجم آج تک کر رہے ہیں فلکِ ثوابت کو باعتبار شکلِ ستارگان بارہ حصوں پر تقسیم کر کے بارہ بروج قرار دئیے ہیں۔ ہر برج کا ستارگان کے اجتماع سے جیسی شکل موضوع ہوئی ویسا نام رکھا گیا۔ مثلاً

(۱) برج نسان جس کی صورت مینڈھے کی ہے اور اہلِ عرب اس کو الحمل اور اہلِ ہند میکھ کہتے ہیں۔

(۲) ،، مل ملا	،، سانڈ (نر بیل) ،،	،، ثور	،، برکھ	،،
(۳) ،، سبزی انا	،، جوڑوان بچوں ،،	،، جوزا	،، متھن	،،
(۴) ،، علل یا نگر	،، کیکڑے ،،	،، سرطان	،، کرک	،،
(۵) ،، اب	،، شیر ،،	،، اسد	،، سنگھ	،،
(۶) ،، نسابہ	،، حسین عورت کی ہے جس کے ہاتھ میں گیہوں کی بال ہو ،،	،، سنبلہ	،، کنیاں	،،
(۷) ،، تصری	،، ترازو ،،	،، میزان	،، تولا	،،
(۸) ،، اشارہ	،، بچھو ،،	،، عقرب	،، برچھک	،،
(۹) ،، پابل سگ	،، گھوڑے جیسا آدمی ،،	،، قوس	،، دھن	،،
(۱۰) ،، سحر ماس	،، مچھلی حلوان نما بصورت مگرمچھ ،،	،، جدی	،، مکر	،،
(۱۱) ،، گولا	،، ایک آدمی جو کھڑا ہوا ایک ڈول سے اپنے پیر کے قریب پانی ڈالتا ہے اور وہ پانی مچھلی کے منہ تک پہنچتا ہے ،،	،، دلو	،، کنبھ	،،
(۱۲) ،، ادار	،، پانی کی نہر اور دو مچھلیاں ،،	،، حوت	،، مین	،،

معوج الطلوع اور کوتاہ مطالع چھ برج یہ ہیں :- جدی، دلو، حوت، حمل، ثور، جوزا،

مستقیم الطلوع اور دراز مطالع چھ برج یہ ہیں :- سرطان، اسد، سنبلہ، میزان، عقرب، قوس،

سمتِ بروج :- مشرق میں بروجِ حمل، اسد، قوس

مغرب میں ،، جوزا، میزان، دلو،

(بقیہ حاشیہ آئندہ صفحہ پر دیکھئے)

قیامت کے نصف جسم سے زمین بنائی۔ کرۂ ارض کو نیم مدوّر مثل الٹی ہوئی گُفا[لہ] کے بنایا۔ کناروں کی طرف

بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۹۹) شمال میں بروج سرطان، عقرب، حوت

جنوب " " ثور، سنبلہ، جدی،

حکماء فلاسفہ نے بارہ برجوں کو عناصر اربعہ پر تقسیم کیا ہے۔

آتش :- حمل، اسد، قوس

خاک :- ثور، سنبلہ، جدی،

باد :- جوزا، میزان، دلو

آب :- سرطان، عقرب، حوت۔

حکماء نے دورِ فلک یعنی منطقۃ البروج کو ۲۸ برابر حصوں پر منقسم کیا ہے

پہلی سات منزل بروج ربیعہ سے منسوب ہیں اور شمالی صاعد ہیں۔ درمیان مغرب و شمال کے ہیں

دوسری " " صیفیہ " " شمالی ہابط " " شمال و مشرق "

تیسری " " خریفہ " " جنوبی ہابط " " مغرب و جنوب "

چوتھی " " شتویہ " " جنوبی صاعد " " جنوب و مشرق "

بروج کے رنگ بھی قائم کئے ہیں مثلاً حمل برنگ سرخ، ثور برنگِ سفید، جوزا برنگِ سبز، سرطان برنگِ سرخ مختلط بہ سفیدی، اسد برنگِ زرد و سفید آمیختہ، سنبلہ برنگ گوناگوں یعنی چتکبرا، میزان برنگِ سیاہ، عقرب برنگِ سیاہ سرخی آمیختہ، قوس رنگِ ناختہ، جدی برنگِ سیاہ و سفید، دلو برنگِ نیولا، حوت سفید مائل بہ سرخی۔

نام کوکب	جنس	رنگ	مقام	حاکم روز	وقت قوت	عنصر	مزاج	خطوط کواکب
زحل	مذکر	سیاہ	فلک ہفتم	شنبہ	نہاری	خاکی	جاہل و چغلخور	⊢
مشتری	"	زرد	" ششم	پنجشنبہ	"	آتشی	بلغمی	□
مریخ	"	سرخ	" پنجم	سہ شنبہ	لیلی	"	خونی	+
شمس	"	طلائی	" چہارم	یک شنبہ	نہاری	"	صفراوی	⊙
زہرہ	مونث	سفید	" سوم	جمعہ	لیلی	بادی	بلغمی	×
عطارد	خنثیٰ	فیروزی	" دوم	چہار شنبہ	نہاری یا لیلی	"	صفراوی بلغمی	⊢⊣
قمر	مذکر یا مونث	سبز	" اول	دوشنبہ	لیلی	آبی	بلغمی بادی	6

[لہ] بزگال یعنی مریخ کو بروج حمل اور عقرب عطا کئے

اشطر " زہرہ " ثور اور میزان "

نبو " عطارد " جوزا اور سنبلہ "

نرگ " زحل " جدی اور دلو "

سن " قمر " سرطان "

شمس " آفتاب " اسد "

مروڈخ نے نبرو " مشتری " قوس و حوت لئے

[لہ] گُفا یعنی گول کشتی بغداد میں اب بھی اس قسم کی کشتیاں رائج ہیں۔ بڑے بڑے گول بید کے ٹوکروں کو (بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

سے زمین کو بتدریج بلند کرتا چلا گیا حتیٰ کہ وسط میں پہنچ کر مثل پہاڑ کی چوٹی کے بلند کر دیا۔ اور اُس کو برف سے ڈھک کر دریائے فرات وہیں سے جاری کیا۔ کفا نما کرہ ارض کے کنارے اونچے لیکن یکساں بلند مثل دیوار کے زمین کے گرداگرد بنائے تاکہ پانی زیر زمین اوپر نہ آسکے۔ کنارے اونچے ہو جانے سے درمیانی حصہ میں خلا پیدا ہو گیا۔ اُس خلا کو پُر از آب کرنے سے ایک تنگ سمندر بن گیا جس کو دیوتاؤں کی اجازت بغیر کوئی فردِ بشر پار نہیں کر سکتا تھا اور اس سمندر کو رازِ الٰہی سمجھا جاتا تھا۔

مرودخ نے اپنی کمان اور کمند آسمان پر محفوظ کیں۔ ہواؤں کو بھی مقیّد کر کے اپنی اپنی جگہ پر قائم کیا۔ (دیگر انتظاماتِ فلک وارض کو بھی بیان کیا گیا تھا لیکن کتبہ کے حروف مٹ جانے سے کچھ پڑھا نہیں جاتا)

جب مرودخ آسمانؔ وزمین کی ساخت اور ترتیبِ عالم سے فارغ ہُوا تو دیگر خداؤں کی امداد اور مجموعی کوشش سے وحوش و مواشی صحرائی اور حشرات الارض کو ہستی میں لایا۔ بعد ازاں مرودخ نے تاریکی کو روشنی سے، آسمان کو زمین سے جدا اور تمام عالم کو باقاعدہ کیا لیکن جاندار روشنی کی تاب نہ لا کر بے جان ہوگئے لہٰذا دوبارہ اس طرح پیدا کئے گئے کہ مرودخ نے اپنے والدِ دُنیا کو ہدایت کی کہ اُس کے سر کو تن سے جدا کرے اور اُس کے

بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۰۰۔ چرم سے منڈھ کر اور قیر آلود کر کے دریا میں ڈال دیتے ہیں۔ اس صورت اور ساخت کی کشتیاں کفا کہلاتی ہیں۔ اس نیم مدور کشتی کو زمین پر اُلٹا رکھ کر دیکھنے سے اہلِ بابل کا خیال زمین کی صورت کے متعلق سمجھ میں آجائے گا۔

۵ توریت کے باب ۱ سے اگر مقابلہ کیا جائے تو بہت کم فرق پایا جائے گا۔ توریت شاہد ہے کہ ابتدا میں خدا نے آسمان و زمین کو پیدا کیا۔ زمین ویران اور سنسان تھی اور خلا پر اندھیرا تھا۔ خدا کی روح پانیوں پر جنبش کرتی تھی۔

پہلا روز۔ خدا نے اجالا کیا اور اجالے کو اندھیرے سے جدا کیا۔ اجالے کو دن اور اندھیرے کو رات کہا۔

دوسرا روز۔ خدا نے پانیوں کو پانیوں سے جدا کیا اور فضا کو بنایا اور فضا کے نیچے کے پانیوں کو فضا کے اوپر کے پانیوں سے جدا کیا اور خدا نے فضا کو آسمان کہا۔

تیسرا روز۔ خدا نے کہا کہ آسمان کے نیچے پانی ایک جگہ جمع ہوں کہ خشکی نظر آئے اور ایسا ہی ہو گیا۔ خدا نے خشکی کو زمین کہا اور جمع شدہ پانی کو سمندر کہا اور خدا نے نباتات و جمادات اور مختلف میوہ دار درختوں کو اگایا۔

چوتھا روز۔ خدا نے کہا کہ آسمان کی فضا میں نیّر ہوں تاکہ دن اور رات میں فرق کریں اور زمانوں، دنوں اور سالوں کا شمار ہو سکے لہٰذا خدا نے دو بڑے نیّر بنائے ایک نیّرِ اعظم جو دن پر حکومت کرے اور نیّرِ اصغر جو رات پر حکومت کرے اور ستارے

خُون میں مٹی کو گوندھ کر اُس سے حیوان اور بشر بنائے جائیں تاکہ مقدس خون کی برکت سے جان دار ہوا اور روشنی کو برداشت کر سکیں چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور سب زندہ رہے۔[۵۲]

ابوالبشر کو عالمِ ہستی میں لانے کے بعد اُس کی رہنمائی کے لئے مرودخ نے مندرجہ ذیل ہدایات کیں :-

(۱) اپنے خدا کی طرف سے اپنے دل کو پاک رکھ کیونکہ یہی حمدِ پروردگار ہے۔

(۲) اے بندے تجھ کو لازم ہے کہ تو علی الصباح نماز پڑھے، دعا مانگے، گریہ وزاری کرے اور سجدہ اس طرح کرے کہ تیری پیشانی زمین پر لگ جائے۔

(۳) خوفِ خدا رحم پیدا کرتا ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۰۱) کو بھی بنایا اور خدا نے ان کو آسمان کی فضا میں رکھا کہ زمین کو روشنی بخشیں اور اجالے کو اندھیرے سے جدا کریں۔

پانچواں روز۔ خدا نے دریائی جانوروں اور ہر قسم کے پرندوں کو پیدا کیا۔

چھٹا روز۔ خدا نے وحوش و مواشیٔ صحرائی اور حشرات الارض کو بنایا۔ پھر خدا نے کہا کہ ہم انسان کو اپنی صورت اور اپنی مانند بنائیں کہ وہ سب پر حکومت کرے۔

ساتواں روز۔ آرام کیا اور اُس کا نام سبتھ Sabath رکھا۔

۵۲ چند کتبوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے دستیاب ہوئے ہیں منجملہ ان کے ایک میں پیدائشِ وحوش اور مواشیٔ صحرائی نیز حشرات الارض کا ذکر ہے۔ اس ریزۂ کتبہ سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ تنہا مرودخ کی نہیں بلکہ مختلف خداؤں کی مجموعی کوشش سے اُن کو پیدا کیا گیا تھا اور شاید مرودخ نے سب سے اہم حصہ اس کام میں لیا تھا۔ ریزۂ مذکور کی عبارت بھی اکثر جگہ سے مٹ گئی ہے لیکن ایک جگہ نن اگی آزگ درج ہے جو دیوتا ئیا کا خطاب ہے اور جس کے معنی دانا وبینا کے ہیں۔ بعض الفاظ سے قیاس ہوتا ہے کہ پیدائشِ بشر کا حال درج تھا۔

ایک اور کتبہ کے ٹکڑے میں درج ہے کہ خدا ئیا کے دل میں بشر کے پیدا کرنے کا خیال آیا۔ مرودخ نے علمِ غیب سے دل کا حال دریافت کر کے اپنے خون سے بشر کو پیدا کیا تاکہ زمین پر آباد ہو کر دیوتاؤں کی پرستش اور منادر کی تعمیر کرے اس کتبہ سے بروسس بابلی کے قول کی تائید ہوتی ہے کہ مرودخ نے اپنے خون سے ابوالبشر کو نیز مختلف حیوانات کو بنایا تھا۔

جارج دی سن سیلس اور یوسی بیس مورخوں کا بحوالہ بروسس بیان ہے کہ تمام دیوتاؤں کی مجموعی کوشش سے حیوانِ ناطق و مطلق و حشرات الارض پیدا کئے گئے لیکن تاریکی کو روشنی سے جدا کرتے ہی تمام جان دار فنا ہو گئے لہذا مرودخ نے اپنے خون میں مٹی کو گوندھ کر بشر اور دیگر حیوانات وغیرہ کو بنایا اور وہ سب روشنی میں زندہ رہے۔ اس قول کی کتبوں سے تائید ہوتی ہے

(۴) صدقہ زندگی کو بڑھاتا ہے۔

(۵) نماز گناہوں کو دھوتی ہے۔

(۶) وہ شخص جو خداؤں سے ڈرتا ہے کبھی غم میں مبتلا نہیں ہوتا۔

(۷) وہ شخص جو انوناکی (زمین کی ارواح یعنی ارواح جو زمین پر موجود ہیں) سے ڈرے گا بڑی عمر پائے گا۔

(۸) اپنے دوست اور ہمسایہ کی کبھی برائی نہ کر۔

(۹) غیب کا حال کبھی بیان نہ کر اور رحم سے کام لے۔

(۱۰) جب کبھی کسی چیز کے دینے کا وعدہ کرے تو ضرور دے اور کبھی ہاتھ نہ روکے۔

افسوس ہے کتبہ شکست ہوگیا اور باقی کی عبارت فنا ہوگئی۔

آخر میں مردوخ کے اکیاون نام درج ہیں۔ ان میں لفظ توتو مردوخ کی شان میں آیا ہے جس کے معنی خالق و آفریدگار کے ہیں۔ اسی سلسلہ میں بشر کی پیدائش کے وجوہ درج ہیں۔ کتبہ مذکور کی عبارت کا ترجمہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے:۔

سطر ۲۵ - توتو اگانزاگا یعنی خالق، فخر تاج، تاج کو عظمت عطا کیجیو۔

" ۲۶ - مالک مجرب منتر کا، مردہ کو زندہ کرنے والا۔

" ۲۷ - وہ ذات جس نے مفتوح دیوتاؤں پر رحم کیا۔

" ۲۸ - (وہ ذات) جس نے مخالف دیوتاؤں کے کندھوں پر جو ابھاری کیا۔

" ۲۹ - اور اُن کی شفاعت کے واسطے بشر کو پیدا کیا۔

" ۳۰ - وہ رحیم جس کی متابعت میں نجات ہے۔

اہلِ بابل کے اعتقاد کے موافق بشر کو دیوتاؤں کی پرستش اور پوجا کی غرض سے پیدا کیا گیا تھا نیز اس لئے کہ اُن کی بندگی و عبادت، نیکوکاری و راست بازی ذریعہ اُن دیوتاؤں کی شفاعت کا ہو جو افلاک کے خداؤں سے منحرف ہوکر عذاب میں گرفتار تھے۔ کتبہ مذکور شاہد ہے کہ تمام خداؤں نے اپنی مختلف قدرتیں مردوخ پر منتقل کردی تھیں اس سے قیاس ہوتا ہے کہ اہلِ بابل کا مذہب وحدانیت کا رنگ لئے ہوئے تھا۔

کتبہ مذکور کے آخر میں ہدایت درج ہے کہ عقلا ہمیشہ آفرینش کے واقعات پر غور کریں اور لازم ہے کہ پدر اپنے پسر کو تعلیم دے، اور بادشاہ کو چاہئے کہ اس واقعہ کو سنا کرے۔

محمد حامد (دہلوی)

آخری دُعا

شرمِ عصیاں سے جُھک گئی ہے گردن — اَللّٰھُمَّ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ ظُلْمًا

اب، بندہ ترے حضور میں آیا ہے — عاصی، دربارِ نُور میں آیا ہے

اِس مورِ ضعیف کی صدا بھی سُن لے — اِس بندے کی آخری دُعا بھی سُن لے

تو میری دعا کا مدّعا ہو جائے — بیمارِ وجود کو شفا ہو جائے

اِس طولِ اَمل کا رشتہ کٹ کر رہ جائے — پھیلی ہوئی زندگی سمٹ کر رہ جائے

پیری سے بدل جائے جوانی میری — وقفِ مُردن ہو زندگانی میری

یہ خشک نہال بارور ہو جائے — ہر جزوِ بدن تارِ نظر ہو جائے

دیکھوں جس سمت، ایک جلوہ نظر آئے — یہ آئینہ بال آکے، دو ہونے نہ پائے

نقشِ کون و فساد فاسد ہو جائے — محسوس حواسِ خمسہ واحد ہو جائے

ہو جائے ادائے عجز جوہر میرا — قدموں میں ترے پڑا رہے سر میرا

تلوے ترے مَلتی رہیں میری آنکھیں — ان پھُولوں سے پلتی رہیں میری آنکھیں

سو جاؤں، تو تیرا ہاتھ ہو سر کے تلے — جب آنکھ کھلے تیرے تبسّم میں کھُلے

دنیا کے عمل میں دین پیدا کر دے — شکّی دل میں یقین پیدا کر دے

سچّے دل سے کروں عبادت تیری — واپس کر دوں تجھے امانت تیری

یہ کہہ کے، بدن سے نکلے جانِ آگاہ — سَمعی، بَصَری، دَمی، عِظامی، لِلّٰہ

"مَیں ہُوں" کی صدا ہو منتہی "یا ہُو" پر

ہو خاتمہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوْ پر

امجد

پھُول والوں کی سیر

"اے ہے گرمی تو پہلے بھی ہوتی تھی مگر اب کے برس تو ایسی تڑاقے کی گرمی پڑی ہے کہ توبہ بھلی ـ
پسینے کے مارے شرابور، پنکھا کسی وقت تو ہاتھ سے چھوٹتا نہیں ـ دم ہلکان ہوا جاتا ہے ـ ان دنوں میں پھول والوں کی سیر ہوئی ـ لو بیوی اور تماشا دیکھو نہ ابر ہے نہ پپیاں پھیاں مینہ برس رہا ہے بلا سے پھول والوں کی سیر تو ہوگئی ـ اے سیر تو گئی بادشاہی وقت کے ساتھ اب تو نقل ہے" دوا مبارک مہتابی پر بیٹھی منوا تر پر زور لگا رہی تھیں ـ مَیں صبح سے اس فکر میں تھی کہ پھول والوں کی سیر کی اصلیت کیا ہے کسی سے معلوم کروں ـ اس وقت گرمی سے جو دم بولایا تو کوٹھے پر چڑھ گئی ـ دوا مبارک کی یہ زٹرشن کر خیال آیا کہ ان سے ہی دریافت کروں ـ دوا اگلے وقتوں کی آدمی اسی برس کے پیٹے میں ہیں ـ اب سے دو تین برس پہلے اُن کے پان کھانے اور پلپلانے کی نقل مَیں بھی اتارتی تھی ـ

دوا مبارک اس عمر میں اس بلا کی شوقین طبیعت ہیں کہ آندھی جائے مینہ جائے مگر اُن کی کنگھی چوٹی میں فرق نہیں آتا ـ کاجل اور وہ بھی خوب دھواں دھار دونوں وقت لگنا روزانہ سر گوندھنا اُن کا معمول ہے ـ پھر کیا مجال کہ اُن کے پان دان یا صراحی کو کوئی ہاتھ لگائے تو حشر تک اُس کا پیچھا نہ چھوڑیں ـ اگر کوئی پلنگ پر کبھی بیٹھ جاتا ہے تو گھنٹوں بڑبڑاتی ہیں ـ مجھ پر تو خاص عنایت ہے کہ مجھ کو ان کی ہر چیز میں دخل ہے ـ باتوں کی ایسی شوقین ہیں کہ صبح سے شام کردیں افسانہ ختم نہ ہو ـ مَیں نے دریافت کیا اچھی دوا پھول والوں کی سیر کا حال تو بتاؤ ... اس سوال کے پہلے دوا نے ایک لمبا ٹھنڈا سانس کھینچا اور پھر کھانس کر آواز صاف کی اور ...

"میری چاند جب بادشاہی وقت (وقت) تھا تو اس اجڑی دلّی شاہجہان آباد میں سب کچھ تھا جب بادشاہ سلامت موجود تھے قلعے آباد تھے خدا بخشے بڑے نواب صاحب تمہارے نانی اماں کے والد خدا اُن کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے ہم نے اُن کے وقت میں ایسے عیش کرلئے کہ اب اُن کے بچّوں کو نصیب نہیں" یہ کہتے کہتے دوا کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے ـ کانپتے ہاتھوں سے دوا نے آنسو دوپٹے کے آنچل سے پونچھے کھنکار کر گلا صاف کیا، اور یوں گویا ہوئیں، "ہاں تو بڑے نواب صاحب بھی بادشاہ سلامت کے ساتھ جاتے تھے ہائے کیسے کیسے گبرو جوان مغلیہ کے تھے ـ خدا بخشے تمہارے نانا تو چودہ پندرہ برس کے تھے تمہاری نانی اماں تو پیلی اوڑھنے پھرتی تھیں ہیں اُن

سے ایک دو برس بڑی ہوں۔ اُن کے ہی ساتھ کھیلتی تھی۔ تمہاری قطب کی کوٹھی ایسی سجی ہوئی تھی کہ منہ سے بولتی تھی۔ سیر میں بیگماتیں نہیں جاتی تھیں، کیونکہ امیر، رئیس، شہزادے سب ہوتے تھے، مگر تمہاری نانی امّاں کا پردہ نہ تھا وہ نواب صاحب کے ساتھ جاتی تھیں۔ میں اور اُن کی آور ماماؤں کی لڑکیاں ساتھ ہوتی تھیں۔ ہائے کیا وخت تھے۔ نہ نگوڑے یہ زمانے تھے کہ ہولوں میں دم جاتا ہے۔ نہ یہ باتیں تھیں، جس کو دیکھو آپے سے باہر مردوں نے ڈاڑھیاں منڈوالیں، عورتوں نے چُٹیاں کٹوالیں، کیسا سخت منہ لگتا ہے۔"

میں دوا کی اِس تقریرِ بے ہنگام سے اکتا گئی تو دوبارہ کہا سیر کا بیان کرو۔ دوا نے کہا "بیٹی اُس کی اصلیت یہ ہے اکبر شاہ ثانی کو یہاں کی آب وہوا پسند تھی، اس لئے یہاں آکر رہتے تھے جس زمانے میں مرزا جہانگیر اکبر شاہ کے چہیتے بیٹے نظر بند الہ آباد میں ہوئے تو اُن کی والدہ نواب ممتاز محل نے منت مانی تھی کہ مرزا جہانگیر چُھٹ کر آئیں گے تو خواجہ صاحب کے مزار پر پھولوں کا غلاف اور چھپر کھٹ چڑھاؤں گی بیٹی اگلے زمانے بھولے تھے، اُن کی دعا قبول ہوئی، مرزا جہانگیر چُھٹ آئے تو ممتاز محل نے بہت دھوم دھام سے پھولوں کا غلاف اور چھپر کھٹ چڑھایا۔ پھول والوں نے چھپر کھٹ میں ایک پنکھا بھی بناکر لٹکا دیا۔ بہت سا کھانا دانا نواب ممتاز محل نے فقیروں کو بانٹا۔ بادشاہ کی خوشی سے قلعہ کے لوگ اور شہر کی سب خلقت جمع ہوگئی۔ ایک بڑا بھاری میلہ ہوگیا۔ بادشاہ کو یہ میلہ پسند آیا۔ ہر برس بھادوں کے مہینے میں مقرر کردیا۔ بادشاہ ڈھائی سو روپیہ انعام پنکھے کی تیاری کے لئے جیبِ خاص سے مرحمت فرماتے تھے۔ ہر برس یہ میلہ ہوتا تھا۔ مہینوں پہلے بادشاہ کے ہاں پنکھے کی تیاری ہوتی تھی۔ رنگ برنگ کے جوڑے طرح طرح کے مصالے اُن پر ٹانکے جاتے ہیں۔ فراش، سپاہی سب کارخانوں کے لوگ خواجہ صاحب روانہ ہوئے۔ دیوانِ خاص بادشاہی محل جھاڑ جھوڑ فرش فروش پردے لگا آراستہ کیا۔ ایک دن پہلے محل کا تانتا روانہ ہوا۔ خاصگی رتھوں میں تورے داریں نقرئی میں سب کارخانے والیاں نوکریں چاکریں لونڈیاں باندیاں۔ دوسرے دن صبح کو بادشاہ سوار ہوئے بڑھی چڑھی بیگمات شہزادے خواجہ صاحب پہنچے۔ بادشاہی محل سے لے کر جھرنا امریوں، ناظر کے باغ شمسی تالاب تک لے کر پردہ ہی پردہ ہوگیا۔ سپاہی اور فوجوں کے پہرے لگ گئے۔ کیا مقدور کہ غیر مرد کا پشتہ بھی دکھائی دے۔ محل کی جنگلی ڈیوڑی سے بادشاہ ہوادار میں اور بادشاہ بیگم تام جھام میں اور سب ساتھ ساتھ جھولے پر آئے۔ بادشاہ اور ملکہ زمانی بارہ دری میں بیٹھے۔ اور سب سیر کر رہے ہیں۔ کڑاھیاں چڑھ گئیں۔ پکوان ہونے لگے امریوں میں جھولے پڑ گئے۔ سوئے والیاں آ بیٹھیں "جھولا کن ڈالو رے امریاں" کی سریلی تانیں لگنے لگیں۔ جھوم جھوم کے بادل آرہے ہیں۔ مینہ کی جھما جھمی مور کی جھنکار گانے کی للکار عجب بہار دکھا رہی ہے۔ منہ سے رنگ کٹ کٹ کر بہہ رہا ہے، کپڑوں سے لالہ نافرمان کھل رہا ہے، آم کا ٹپکا لگ

سب پھنک پھانک سواری کے ساتھ ہولیں نوکر جاکر گٹھڑی مٹھڑی سنبھال للّو پتّو کرتی دوڑیں۔ پندرہ دن اسی طرح چہل پہل میں گزر گئے تین دن سیر کے باقی رہے پھول والوں نے بادشاہ کو عرضی دی، ڈھائی سو روپے اُن کو پنکھے کی تیاری کے لئے مل گئے تاریخ ٹھیر گئی۔ شہر میں نفری بج گئی جھرنے کا زمانہ موقوف ہوا۔ شہر کی خلقت آنی شروع ہوئی۔ امیر امرا اپنے اپنے مکان میں آئے، کوٹھے والیوں نے کوٹھے سجائے۔ لو اب پنکھے کا دن آپہنچا۔ ساری مخلوق امنڈ آئی۔ تیسرا پہر ہوا ادھر شہزادوں کی سواری اُدھر پنکھے کی تیاری ہونے لگی۔ شہر کے رئیس امیر غریب رنگ برنگ کے کپڑے پہن کے سج بن کے اپنے کوٹھوں پر چھجوں پر ہو بیٹھے۔ پہلے آتشباز قلعی گرز ردوزوں کے ہاں کے پنکھے نفیری بجتی ہوئی امیروں کے مکانوں کے نیچے ٹھیرتے ٹھیراتے لیتے لواتے چلے گئے، پھول والوں کے پنکھے کس دھوم سے اُٹھے کہ نظر نہیں ٹھیرتی۔ آگے آگے پھولوں کی چھڑیاں، ہزارے چھوٹتے پیچھے شاہزادے ہاتھیوں پر سوار، آگے سپاہیوں کی قطار تاشہ مرفہ بجاتے پیچھے خواصی میں مختار بیٹھے مورچھل کرتے ہوئے نقیب چوبدار پکارتے صاحبِ عالم پناہ چلے آتے ہیں۔ ان کے پیچھے امیر امرا کے ہاتھی چلے آتے ہیں۔ مخلوق کے مارے کھوے سے کھوا چھلتا ہے۔ میٹھی میٹھی پھوار، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں نفیری کی بھینی بھینی آواز قہر توڑ رہی ہے۔ آدمیوں کی بھیڑ بھاڑ، کیا گلزار ہے، اسی دھوم دھام سے پنکھے شاہی محلوں کے نیچے آئے۔ شاہزادہ ہاتھی پر سے اُتر اپنے کمروں پر آبیٹھے۔ اور سب پیدل ہوئے حضور جلوؤں میں آبیٹھے۔ پنکھے درگاہ میں جاکر چڑھا دیئے گئے۔ حضور نے نفیری والوں کو انعام دلوایا۔ اب تمام رات قوالی رہی صبح سے بنے ہار، انگوٹھیاں، پنکھیاں، ربڑی، تندوری پراٹھے۔ یہاں کی سوغاتیں لے لو چلنا شروع کیا شام تک میلہ بھول گیا بادشاہ ساری برسات خواجہ صاحب میں ہی گذارتے تھے۔ اب نہ وہ بادشاہی رہی نہ سیر رہی۔ نگوڑے فرنگیوں کے آتے ہی سب ملیامیٹ ہوگیا۔ اب تو یہ سیر رہ گئی ہے کہ کئے برس بعد اکے بلّی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا تو یہ نزلقے کی گرتی گرتے پڑتے مصیبت بھگتتے خواجہ صاحب گئے نگوڑے دھوپ میں جلتے رہے اور الابلا کھانے سے مواننا واں ہیضہ بہنوں کو ہوگیا۔ جان سے ہاتھ دھوئے، اچھی سیر ہوئی۔ البو برا بھاگا گیا تھا وہ تو کہو دھر کی پوری تھی ورنہ خالہ بندی ہیں کیا رکھا تھا نگوڑا تندوری پراٹھا نام کا، کچّا گندوڑا کھا کے پیٹ منہ چلنے لگا نگوڑی میّا پیٹ پکڑے میرے پاس آئی میرے تو سُن کے چھکّے چھوٹ گئے۔ آخر کچھ سمجھ میں نہ آیا تو کہا نادِ علی گھول کر پلاؤ اُسی سے ذری دل تو ٹھیرا۔ اللہ بھلا کرے ہمسائی کا میں بولائی بولائی پھر رہی تھی انہوں نے کہا کہ توکّل شاہ درویش بہت اچھے ہیں، خدا نے شفا دی ہے اُن کے ہاتھ میں لکڑی ٹیکتی وہاں پہنچی۔ قربان جاؤں اُن کے کیسی نورانی صورت۔ جیسے فرشتہ، ایک تعویذ دیا جا پانی پلا بھلا ہوگا۔ سب وہ پلایا تو چین پڑا اُدھر اُس کے ایک دوست نے ڈاکٹر کو بُلا کر دکھایا اُس کی دوا پلائی مگر سچ کہوں مجھے ان نگوڑی دواؤں کا اعتبار نہیں سب میں تھو تھو شراب ملی ہوتی ہے۔ ان نگوڑے فرنگیوں کی بدولت نہ دین رہا نہ ایمان ——" دوا مبارک کا سلسلۂ تقریر ابھی جاری تھا اور میں بھی محویت سے اُن کی باتوں کو سُن رہی تھی کہ کرمن نے آکر کہا بیوی کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے تب خیال آیا اور میں دوا کو بولتا ہی چھوڑ نیچے آگئی۔

حمیدہ

مشاہدات وارادات

(۱)

ختم سمجھا تو نے غافل شمع کا دورِ حیات — وہ ہوئی مہرِ مبیں میں جذب ہو کر جلوہ گر
طالبِ غور و تامل ہیں اصولِ کائنات — سطح کے جلووں میں ہی الجھی ہوئی تیری نظر

ہستی ہر قطرہ دریا سے جدا ہوتی نہیں
شمع بجھ جاتی تو ہے لیکن فنا ہوتی نہیں

(۲)

سرودِ خیر سے کم دلنشیں نہیں ہمدم — نوائے بربطِ شر یا ترانۂ عصیاں
عجیب شے ہے یہ اضداد ہیں اصولِ حیات — فضائے عیش کے سینہ میں جوئے غم ہے رواں
ملی ہوئی ہیں حدیں اس قدر کہ کیا کہئے — یہ ایک ساز کے نغمے ہیں دو یقین و گماں

اسی طرح سے نظر آزما ہے ظلمتِ شب
شعاعِ مہرِ بصارت پہ جس طرح ہو گراں!!

(۳)

گرچہ ہے انسان یوں بننے بگڑنے کے لئے — راستہ پر جس طرح بکھرے ہوئے آثارِ پا
صبح دم یا شام کے رقصِ سنہری کے بعد — سطحِ گردوں جیسے بن جاتی ہے اک نیلی ردا
ایک ہو کر گونجتی ہے اس فضا میں ہم نشیں — نالۂ بیتاب یا شیریں تبسم کی صدا

آہ اس دنیا کا ہر جلوہ ہے کتنا ناتمام
پھر بھی کی جاتی ہے ہم سے خواہشِ نقشِ دوام

سید علی اختر

مصری کورٹ شپ

"میں نے جو پیرس سے لکھا تھا وہی اب بھی کہتا ہوں کہ میں ہرگز ہرگز اس بات کے لئے تیار نہیں کہ بغیر دیکھے بھالے شادی کرلوں۔ اگر آپ میری شادی کرنا چاہتی ہیں تو مجھ کو اپنی منسوبہ بیوی کو نہ صرف دیکھ لینے دیجیے بلکہ اُس سے دو چار منٹ باتیں کرلینے دیجئے۔"

یہ وہ الفاظ تھے جو نوری نے اپنی بہن سے پُرزور لہجہ میں کہے۔

"مگر یہ تو بتاؤ کہ آخر اس سے کیا فائدہ کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ اگر لڑکی کی صورت شکل اچھی نہ ہوئی تو تم انکار کردوگے؟ ہرگز ہرگز ایسا نہیں ہوسکتا! جب سب معاملات طے ہوچکے ہیں اور شادی کرنا ہی ہے تو پھر تم کو دیکھنے سے کیا فائدہ؟" بہن نے یہ تقریر ختم ہی کی تھی کہ ماں بھی آگئی اور اب نوری کو بجائے ایک کے دو سے بحث کرنا پڑی۔

"معلوم ہوتا ہے کہ تین سال فرانس میں رہ کر تم نے اپنی قومیت اور مذہب کو بھی خیرباد کہہ دیا" یہ الفاظ ماں نے اُسی سلسلۂ گفتگو میں کہے۔

"جی نہیں یہ ناممکن ہے میں پکا مسلمان ہوں اور مصری ہوں نہ میں نے مذہب کو چھوڑا ہے اور نہ قومیت کو۔ میں تو اپنے حق پر لڑتا ہوں کہ جس سے میری شادی ہونے والی ہے اُس کو میں دیکھ لوں ...."

"اور اگر لڑکی ناپسند ہو تو شادی نہ کروں" ماں نے گویا جملہ پورا کیا۔

نوری نے برجستہ جواب دیا "اور کیا؟"

ماں نے تیز ہوکر کہا "تم کو معلوم بھی ہے کہ تمہاری منسوبہ بیوی کس کی لڑکی ہے؟ وہ جامعہ ازہر کے نائب الشیخ کی لڑکی ہے اور شرافت امارت اور تمول میں وہ لوگ ہم سے کہیں زیادہ ہیں۔ ذرا اُن لوگوں کو دیکھو اور اپنے کو دیکھو۔ گورنمنٹ کے روپیہ پر یورپ جاکر تعلیم حاصل کرکے آئے اور انجنیر ہوگئے تو اب تم کسی کو شمار ہی میں نہیں لاتے"

"یہ سب کچھ آپ صحیح کہتی ہیں جو مجھ کو لفظ بلفظ تسلیم ہے مگر اس کے یہ تو معنی نہیں ہوسکتے کہ میں محض ان وجوہ کی بنا پر اپنا پیدائشی حق کھو بیٹھوں۔"

"مگر میں تو شادی پختہ کر چکی ہوں اور شادی کے تمام ابتدائی مراحل طے ہو چکے ہیں اور اب مَیں یہ نسبت نہیں توڑ سکتی" ماں نے نوری سے یہ الفاظ ایک مجبوری کا لہجہ لئے ہوئے کہے۔

"میں کب کہتا ہوں کہ آپ یہ نسبت توڑ دیں مجھ کو تو یہ رشتہ خود بسر و چشم منظور ہے"

یہ الفاظ سنتے ہی بہن چمک کر بولی "پھر آخر کیوں الٹی سیدھی باتیں کرتے ہو۔ یہی تم نے پیرس سے لکھا تھا ورنہ ہم لوگ کیوں یہ غلطی کرتے"

غرض اسی قسم کی بحث بہت دیر تک ہوتی رہی مگر نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ ماں نے بہت کوشش کی کہ نوری اپنی ضد سے باز آئے مگر بے سود اور اُدھر نوری نے بے حد کوشش کی کہ ماں اُس کی منسوبہ بیوی کے گھر کہلا بھیجے کہ لڑکا لڑکی سے ملنا چاہتا ہے مگر بے کار۔ ماں کو اپنی بات کا پاس تھا وہ اپنی ہمچشموں میں ذلیل ہونا گوارا نہ کر سکتی تھی۔ وہ پرانی رسموں کی قیود کو توڑنا نہیں چاہتی تھی اور یہ ناممکن تھا کہ ایسا ناشائستہ پیغام لڑکی والوں کے یہاں کہلا بھیجے جس کو وہ ان لوگوں کی کھلی توہین خیال کرتی تھی۔ نتیجہ ماں بیٹے کی ضد کا یہ ہُوا کہ ماں خفا ہو گئی گھنٹوں بیٹھ کر روئی۔ نوری نے بہت خوشامد کی مگر بے کار۔ نوری کو ماں کو رنجیدہ کرنے کا بہت افسوس تھا مگر مجبور تھا۔ کھانے کا وقت آیا اور ماں نے کھانا نہ کھایا نوری نے بھی نہ کھایا مگر مصالحت کی کوئی صورت نہ بن پڑی۔ بحث کا سلسلہ پھر چھڑ گیا اور نتیجہ اس کا یہ نکلا کہ ماں خوب روئی پیٹی مگر سنگ دل بیٹے نے اپنے اصول سے جنبش نہ کی۔ اب گھر گویا غمکدہ بنا ہُوا تھا۔ ماں نے کھانا نہ کھایا اور بیٹی اور بیٹے نے بھی کھانا نہ کھایا۔ یہی حالت دوسری شام تک رہی اور چوبیس گھنٹے سے زیادہ گذر گئے۔ نوری اپنے کمرے میں بیٹھا تھا ماں کی تکلیف کا خیال تھا۔ ماں کی ستیہ اگرہ آخر کو کامیاب ہو گئی اور نوری نے ماں کی شرائط منظور کر لیں تاکہ ماں کھانا کھا لے۔

(۲)

یہ بھی دراصل نوری کی چال تھی تاکہ ماں کھانا کھا لے چنانچہ ماں کو اُس نے راضی کر لیا۔ لیکن وہ اب اس سوچ میں تھا کہ کیا کرنا چاہئے۔ صبح کا وقت تھا اور اس واقعہ کو دو روز گذر چکے تھے۔ نوری اپنے کمرے میں بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا کہ اُس نے اخبار رکھ دیا اور اُٹھ کر الماری سے اخبار اور احادیث کی دو کتابیں اُٹھا لایا۔ ان کتابوں کا مطالعہ وہ پیشتر بھی کر چکا تھا اور اکثر کرتا رہتا تھا۔

وہ اسی سوچ میں تھا کہ اب کیا کرنا چاہئے کہ معاً اُس نے دل میں نئی بات ٹھان لی۔ نوکر کو حکم دیا کہ گاڑی لاؤ۔ کپڑے پہن کر تیار ہُوا اور کہا کہ نائب الشیخ کے یہاں چلو۔

گاڑی ایک عالی شان مکان پر رُکی۔ مکان کا ظاہری ٹھاٹھ کہہ رہا تھا کہ کسی امیر کبیر کا مکان ہے۔ ایک نوکر دوڑ کر گاڑی کے قریب آیا۔ نوری نے اپنا کارڈ دیا اور اطلاع کی گئی۔

نائب الشیخ اپنے منسوبہ داماد کی آمد کی خبر سُن کر باہر استقبال کے لئے آئے۔ نوری نے بڑھ کر مصافحہ کیا اور فرطِ احترام شیخ کے ہاتھوں کو بوسہ دیا۔ شیخ نے نوری کی پیشانی پر بوسہ دیا اور ہاتھ پکڑ کر کمرے میں لا بٹھایا۔

کمرہ مغربی سامانِ آرائش سے سجا ہوا تھا۔ جگہ جگہ خوبصورت کام ہو رہا تھا اور تمام فرنیچر اور دیگر سامان اعلیٰ قسم کا تھا۔ اس ہال کے ایک حصہ میں بہترین رومی غالیچوں کا فرش بھی تھا اور مشرقی فیشن کا بہترین سامان سجا ہوا تھا۔ نیچے نیچے زمین سے ملے ہوئے خوبصورت صوفے پڑے ہوئے تھے جن پر لوگ اطمینان سے پالتی مارے تکیہ لگائے بیٹھے تھے۔ نائب الشیخ نے نوری کا اپنے ملنے والوں سے تعارف کرایا اور ملنے والوں نے شیخ کو داماد کے انتخاب پر مبارکباد دی۔ تھوڑی دیر بعد قہوہ کا دور چلنے لگا اور شیخ نوری سے بسلسلۂ گفتگو فرانس کی باتیں پوچھتے رہے۔ قہوہ کا دور ختم ہوا اور تھوڑی دیر کے بعد شیخ کے دوست اُٹھ کر چلے گئے اور نوری اور شیخ رہ گئے۔ بڑی مشکل سے اور بڑی دیر کے سوچ کے بعد نوری نے شیخ سے نہایت مودبانہ طریقہ سے کہا:۔

"میں جناب کی خدمت میں ایک خاص مقصد سے آیا تھا"

"وہ کیا؟"

"اگر جناب اجازت دیں تو کچھ عرض کرنے کی جرأت کروں؟"

"بسرو چشم بسم اللہ۔ کہو کیا کہتے ہو"

نوری نے کچھ تامل کیا اور شاید وہ الفاظ ڈھونڈ رہا تھا کہ اپنا مدعا کن مناسب الفاظ میں ادا کرے کہ شیخ نے پھر کہا "تم ضرور اپنے دل کی بات کہو کوئی وجہ نہیں کہ تامل کرو"

نوری نے ہمت کر کے نیچی نظر کر کے دبی زبان سے کہا "میں جناب سے اپنا حق مانگتا ہوں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ میں اپنی منسوبہ سے پانچ منٹ کے لئے مل لوں؟"

نوری نے نظر اُٹھا کر جو دیکھا تو نائب الشیخ کو ہکا بکا پایا۔ وہ اس کے لئے بالکل تیار نہ تھے اور اُن کی خودداری کو کچھ اس سے ٹھیس سی لگی۔ شیخ نے اپنے کو عجیب کشمکش و پیچ میں پایا۔ وہ نوری کو بے حد پسند کرتے تھے مگر اُس کی اس بات سے وہ اس وقت حواس باختہ تھے۔ اپنے کو سنبھال کر شیخ نے کہا "میں اس حق کی اہمیت سمجھنے سے قاصر ہوں"

"کیا جناب کو اس بارے میں کسی قسم کا خاص اعتراض ہے؟"

"بے شک مجھ کو اعتراض ہے۔"

"مذہبی نقطۂ نظر سے یا دنیاوی نقطۂ نظر سے"

شیخ چونکہ پھر شیخ تھے وہ بولے "مذہبی نقطۂ نظر سے اور نیز دنیاوی نقطۂ نظر سے کیونکہ ہمارا دین اور دنیا الگ الگ نہیں۔"

نوری نے خوش ہو کر کہا مگر دین کو دنیا پر سبقت ہے۔ سب سے پہلے ہمارا مذہب ہے اور پھر دنیا۔"

"شیخ نے بھی خوش ہو کر کہا "بیشک، بیشک تم صحیح کہتے ہو۔"

"پھر جب خداوند تعالےٰ نے مسلمانوں کو مخاطب ہو کر قرآنِ پاک میں کہہ دیا کہ اُن عورتوں سے نکاح کرو جو تم کو بھلی معلوم ہوتی ہوں تو پھر کون سا اعتراض رہ گیا۔" یہ کہتے ہوئے نوری نے آیتِ نکاح پڑھ کر سنائی۔

شیخ صاحب اِس رنگ میں بحث کرنے کو خصوصاً نوری کے سے نئی تہذیب کے دلدادہ نوجوان سے قطعی تیار نہ تھے اور نہ ہی اُن کو امید تھی۔ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کہیں مگر جواب دینے کے لئے کہا کہ ہاں یہ مذہباً جائز تو ہو سکتا ہے مگر میں اس کو پسند نہیں کرتا، اور خصوصاً آج کل کے زمانہ میں۔"

نوری نے فوراً شیخ کی کمزوری کو محسوس کیا اور کہا "آپ کا کیا خیال ہے اگر آج کل ہم لوگ سنتِ رسول اللہ کی پیروی کریں؟ کیا یہ مستحسن نہیں ہے؟"

شیخ نے فوراً کہا "خدا ہم کو رسول اللہ کی پیروی کی توفیق دے۔"

نوری نے فوراً جیب میں سے ایک پرچہ نکال کر شیخ کے ہاتھ میں دے دیا۔ شیخ کی آنکھوں کے سامنے حسبِ ذیل عبارت تھی:۔

(۱) جابر سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم میں سے کوئی اپنے نکاح کا پیغام کسی عورت کی طرف بھیجنا چاہے تو ہو سکے تو اُس کو دیکھ لے جس سے نکاح کا ارادہ ہو پھر نکاح کرے۔"

(ابی داؤد)

(۲) مغیرہ بن شعبہ سے روایت ہے پیام کیا مَیں نے نکاح کا ایک عورت کے ساتھ زمانے میں رسول اللہ کے آپ نے فرمایا کہ تو نے دیکھ بھی لیا ہے اُس کو؟ مَیں نے کہا نہیں۔ فرمایا کہ دیکھ لے اُس کو، اس سے الفت زیادہ ہو گی تم دونوں میں۔ (النسائی)

(۳) ابوہریرہ سے روایت ہے پیغام بھیجا ایک آدمی نے مدینہ والوں کے یہاں - فرمایا اُس کو رسول اللہ نے تو نے اُس کو دیکھ بھی لیا ہے یا نہیں اُس نے کہا نہیں - آپ نے فرمایا اُس عورت کو دیکھ لے - یعنی بغیر دیکھے نکاح کرنا اچھا نہیں - (لنسائی)

شیخ نے اِن احادیث کو پڑھا - وہ ان احادیث کو کبھی پہلے بھی پڑھ چکے ہونگے مگر اُن کے لئے گویا اس وقت یہ بالکل نئی تھیں - وہ خاموش تھے اور کچھ بولنے میں ان کو تامل تھا کہ نوری نے اُن سے کہا کہ "کیا آپ مُجھ کو ان احادیث پر عمل نہ کرنے دیں گے ؟ کیا واقعی ہم اس زمانہ میں رسول اللہ کی نصیحتوں سے بے نیاز ہیں اور وہ ہمارے لئے بے کار ہیں ؟"

شیخ نے کہا " ہرگز نہیں ہرگز نہیں - گفتۂ رسول سر آنکھوں پر مگر میں یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ آخر تمہارا اس درخواست سے مطلب کیا ہے - اگر فرض کرو تمہاری منسوبہ بیوی تم کو ناپسند ہوئی تو کیا تم اس نسبت کو توڑ دوگے اور نکاح نہ کروگے ؟"

نوری نے جواب دیا " اس سے تو شاید آپ بھی اتفاق کریں گے کہ اُس صورت میں مجبوری ہوگی "

" تو اس شرط پر تو تمہاری شادی صرف یورپ ہی میں ہوسکتی ہے " شیخ نے کچھ ترشرو ہو کر کہا " مجھ کو یہ ہرگز گوارا نہیں ہے کہ میری لڑکی سے نسبت کرنے کے لئے لوگ گاہک بن کر آئیں اور ناپسند کر کے چلے جائیں - کیا تم نے میری عزت و آبرو کا اندازہ غلط لگایا ہے ؟ کیا تم نہیں خیال کرتے کہ نائب الشیخ کی توہین ہوگی - معاف کیجئے میں اس قسم کی گفتگو پسند نہیں کرتا جس میں میری عزت و آبرو کا سوال ہو "

نوری بھی پختہ ارادہ کر کے آیا تھا اور اُس نے بھی کچھ تیز ہو کر کہا " بیشک آپ مصر میں وہ عزت رکھتے ہیں جو دوسروں کو نہیں مگر مجھ کو اجازت دیجئے کہ عرض کروں کہ پھر بھی آپ کو وہ عزت نہیں حاصل ہے جو امیر المومنین عمر ابن الخطاب کو مدینہ میں حاصل تھی اور آج ساری دنیا میں حاصل ہے - کیا یہ واقعہ نہیں کہ حضرت عمر نے اپنی بیٹی ام المومنین حفصہ کو حضرتِ عثمان کے سامنے پیش کیا اور نکاح کی خواہش ظاہر کی اور جب حسبِ خواہش جواب نہ ملا تو پھر اُن کو حضرتِ ابوبکرؓ کے سامنے پیش کیا اور وہاں بھی ناکامی ہوئی - کیا اِس سے اُن کی عزت میں خدانخواستہ بٹہ لگ گیا ؟"

شیخ کا غصّہ ٹھنڈا ہوگیا اور وہ لاجواب ہو کر بولے کہ " وہ دونوں حضرات تو اُن کے دوست تھے "

" مگر میں بھی تو آپ کے عزیزترین دوست مرحوم کی نشانی ہوں "

شیخ نے نظر نیچی کر لی اور کچھ تامل کے بعد کہا " مجھ کو کوئی انکار نہیں ہے" یہ کہتے ہوئے شیخ گھر میں چلے گئے۔

(۳)

نوری کا دل بہت تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اُس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ریشمی سیاہ پردہ اٹھایا اور اندر داخل ہؤا۔ حالانکہ دن تھا مگر کمرے میں اندھیرا ہونے کی وجہ سے بجلی کا لیمپ روشن تھا۔ سامنے کرسی پر سیاہ گاؤن پہنے ایک سولہ یا سترہ سال کی نہایت ہی حسین لڑکی بیٹھی تھی۔ نوری کو دیکھ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ نوری نے سلام کیا کچھ جواب نہ ملا اُس نے دوبارہ سلام کیا تو لڑکی نے آہستہ سے جواب دیا۔ لڑکی کی نظریں نیچی تھیں صرف داخل ہوتے وقت اُس نے ایک لمحے کے لئے نظر اٹھا کر نوری کو ضرور دیکھا تھا۔ وہ ساکت کھڑی تھی اور اُس نے نوری سے بیٹھنے تک کو نہ کہا۔ نوری اجازت طلب کرتے ہوئے بیٹھ گیا مگر لڑکی نے کچھ جواب نہ دیا اور کھڑی ہی رہی۔ نوری پھر کھڑا ہو گیا اور کہا کہ بیٹھ جائیے۔ نوری نے اپنی کرسی قریب کر لی اور کہا " مجھ کو فخر ہے کہ میں اس وقت اپنی منسوبہ بیوی نازلی خانم کے سامنے بیٹھا ہوں اور اُن سے کچھ گفتگو کرنے کا مجھ کو موقع ملا ہے۔ کیا مجھ کو اجازت ہے؟"

نازلی نے دبی زبان سے کہا " فرمائیے"

" آپ میرے نام سے تو واقف ہی ہونگی کیا میں دریافت کر سکتا ہوں کہ آپ کو یہ مجوّزہ رشتہ پسند ہے؟"

اس کا نازلی نے کوئی جواب نہ دیا اُس کے چہرہ پر ایک خفیف سا رنگ آیا اور چلا گیا۔ وہ زمین کی طرف دیکھ رہی تھی اور اپنے بائیں ہاتھ کی انگلی داہنے ہاتھ سے کرید رہی تھی۔

" انداز سے نوری نے معلوم کر کے کہا " میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں" اسی سلسلہ میں نوری نے پوچھا

" کیا آپ میری اس ملاقات کو ناپسند کرتی ہیں؟"

" جی نہیں"

" تو پھر آپ نے اپنے والد صاحب سے اس بارے میں غیر آمادگی کا اظہار کیوں کیا تھا؟"

نازلی کے لبوں پر کچھ مسکراہٹ آئی لیکن شرم کی وجہ سے شاید کچھ نہ کہہ سکی۔ نوری نے فوراً کہا " آپ کو اس بات کا جواب ضرور دینا پڑے گا اور میں بے پوچھے نہ مانوں گا"

نازلی نے کچھ تامل سے کہا " میں نے یونہی کہہ دیا تھا"

نوری نے برجستہ کہا " تو اس سے یہ مطلب میں نکال سکتا ہوں کہ آپ مجھ سے ملنا چاہتی تھیں"۔ نوری نے یہ کہتے ہوئے نازلی کا ہاتھ اپنے ہاتھ [illegible] لے لیا اور پھر کہا " سچ سچ بتائیے کہ آپ مجھ سے ملنا چاہتی تھیں [illegible] آپ کی

دل کی بات معلوم کرنا چاہتا ہوں "۔

نازلی کی نظریں نیچی تھیں اُس کے سرخ اونی شال پر بجلی کی روشنی چمک رہی تھی جس کا عکس اُس کے چہرہ پر پڑ کر سیاہ گاؤں کے ساتھ ایک عجیب کیفیت پیدا کر رہا تھا۔ اُس نے ذرا تامل سے کہا "میں آپ کو دیکھنا چاہتی تھی ملنے کا تو مجھ کو خیال بھی نہ آسکتا تھا"۔

"کیا آپ مجھ کو بتا سکتی ہیں کہ آپ مجھ کو کیوں دیکھنا چاہتی تھیں"، یہ سوال کرنے میں نوری کو خود ہنسی آگئی نازلی نے بھی اب ہمت کر کے کہا "پہلے آپ بتائیے کہ آپ آخر کیوں مجھ سے ملنا چاہتے تھے جس لئے آپ مجھ سے ملنا چاہتے تھے اُسی لئے میں بھی چاہتی تھی کہ آپ کو دیکھ لوں "۔

نوری نے کہا کہ "میں تو آپ کو اس لئے دیکھنا چاہتا تھا کہ جو کچھ بھی میں نے اپنی بہن اور ماں سے آپ کے بارے میں سنا ہے اُس کی تصدیق کر لوں مگر یہ بتائیے کہ آپ کیوں مجھ کو دیکھنا چاہتی تھیں"!

نازلی نے اب نظریں اوپر کر لی تھیں اور وہ اب روبرو ہو کر باتیں سن رہی تھی۔ اُس کو ان سوالات پر کچھ ہنسی سی بھی آرہی تھی اور اُس نے جواب دیا کہ "میں تو یونہی دیکھنا چاہتی تھی"۔

"مگر میں آپ سے بغیر اس کی وجہ پوچھے نہ مانوں گا"۔

"نازلی نے کہا "مجھ کو معلوم ہی نہیں تو پھر بھلا آپ کو کیا بتاؤں"۔

نوری کو اس جواب سے اطمینان ہو گیا لیکن اُس نے اب دوسرا سوال پیش کر دیا۔

"میں جب پیرس میں بیمار پڑ گیا تھا تو آپ کو یاد ہو گا کہ آپ نے دو مرتبہ اپنے خطوط میں میری بہن کو یہ لکھا تھا کہ تمہارے بھائی اب کیسے ہیں۔ یہ آخر آپ نے کیوں لکھا تھا"؟

نازلی کو اس بات پر ہنسی آگئی اور وہ کہنے لگی "معاف کیجئے گا آپ کیسے سوالات کر رہے ہیں۔ کیا کسی کی خیریت دریافت کرنا گناہ ہے"؟

نوری نے کہا "اچھا آپ صرف یہ بتائیے کہ کیا آپ میری بیماری کا حال سُن کر کچھ متفکر ہوئی تھیں اور کیا آپ کو میرا کچھ خیال آتا تھا"۔

نازلی نے سمجھ لیا تھا کہ ایسے سوالوں سے نوری کا کیا مطلب ہے اور اُس کو بھی ان سوالات میں دلچسپی آرہی تھی اُس نے بجائے جواب دینے کے ہنستے ہوئے کہا "اچھا پہلے آپ بتائیے کہ اگر اُسی زمانہ میں میں بیمار پڑتی اور آپ کو اس کا علم ہوتا تو آپ میری خیریت دریافت کرتے یا کچھ متفکر ہوتے یا آپ کو میرا کچھ خیال آتا"؟

نوری نے کچھ لاجواب ہو کر کہا "میرا خیال ہے کہ ضرور مجھ کو بہت خیال آتا اور فکر بھی ہوتی اور میں خیریت بھی دریافت کراتا"

نازلی کامیابی کی خوشی کے لہجہ میں تیزی سے بولی "آخر کیوں، آخر کیوں۔ نہ میں نے کبھی آپ کو دیکھا تھا اور نہ ہی آپ نے مجھ کو دیکھا تھا"

نوری اس مسئلہ پر غور کر رہا تھا۔ نازلی کا ہاتھ بدستور اُس کے ہاتھوں میں تھا۔ اُس نے اس کے ہاتھ کو نرمی سے دباتے ہوئے عجیب پیرایہ میں کہا "میری جو باتیں خود سمجھ میں نہیں آتی تھیں اُن کو میں دریافت کرنا چاہتا تھا لیکن دراصل میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ آپ کی طرف سے جو خیالات میرے دل میں تھے کیا ویسے ہی میری طرف سے آپ کے دل میں بھی ہیں"

"پھر آپ نے کیا پایا؟"

"آپ کی اور اپنی حالت کو یکساں پایا۔ یہ ایک عجیب بات ہے۔ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ہم دونوں میں محبت کی بنیاد دراصل اُس وقت سے ہی استوار ہو گئی جب ہم دونوں کو اس کا علم ہوا کہ یہ رشتہ قائم ہو گا"

اس کا جواب نازلی نے کچھ نہ دیا صرف اس کے نرم ہاتھ کو ایک جنبش سی ہوئی جو نوری کے ہاتھ میں تھا اور یہی جواب تھا جو اُس کے جذبات کی صحیح ترجمانی کر رہا تھا۔

نوری نے متاثر ہو کر کہا "ایک سوال اَور کروں گا اور اُس کا جواب خدا کے واسطے ضرور دینا۔ وہ یہ کہ آپ نے جو اپنے ہاتھ سے ایک جنگل کے سین کی رنگ برنگی تصویر بنا کر میری بہن کو بھیجی تھی وہ کیوں بھیجی تھی؟"

"وہ میں نے اس لئے بھیجی تھی کہ انہوں نے مجھ کو تصویروں کا ایک البم بھیجا تھا۔ تبادلۂ تحفہ جات تو ایک پرانی رسم ہے"

نوری نے کچھ بیتاب ہو کر کہا "خدا کے واسطے ذرا اپنے دل کو ٹٹولئے اور اچھی طرح ٹٹولئے۔ ہر معاملہ میں میرا اور آپ کا حال ایک سا نکلتا ہے۔ بخدا مجھ کو تو ایسا معلوم ہوا کہ تصویر آپ نے میری بہن کے لئے نہیں بلکہ میرے لئے بھیجی تھی۔ تاکہ میں دیکھوں اور خوش ہوں۔ اُس وقت جس وقت تصویر آئی تو میرے دل میں یہی خیال تھا اور اب بھی یہی خیال ہے۔ سچ سچ کہئے گا کہ جس وقت آپ تصویر بھیج رہی تھیں کیا آپ کے دل میں کچھ میرا خیال آیا تھا"

نازلی کچھ حیران سی رہ گئی کیونکہ اس وقت نوری نے اُس کے دل کی گہرائی کا اس طرح پتہ لگا لیا کہ اُس

کو وہم وگمان بھی ہونا ناممکن تھا۔ وہ کچھ جواب نہ دے سکی اور حیرت میں تھی۔ ساتھ ہی حقیقی جذبات بھی اُس کو بولنے نہ دیتے تھے۔ نوری نے اصل کیفیت کو سمجھ لیا اور اصرار کے ساتھ کہا "اِس بات کا میں آپ سے ضرور جواب لوں گا۔ یہ میرا آخری سوال ہے اور میں اس وقت آپ کے جواب، صحیح جواب کا بیتابانہ انتظار کر رہا ہوں۔ بتائیے تو سہی کہ وہ تصویر آپ نے کس کے لئے بھیجی تھی؟"

"آپ کے لئے" یہ کہہ کر نازلی نے آنکھیں نیچی کر لیں۔

نوری کی آنکھیں چمکنے لگیں اُس کا دل اس جواب کو سُن کر دھڑکنے لگا۔ اُس نے زور سے نازلی کا ہاتھ گویا لاعلمی میں دبا یا اور خوش ہو کر اُس کے منہ سے نکلا "بخدا!"

"بخدا" نازلی کی بھی زبان سے نکلا۔

دونوں تھوڑی دیر تک خاموش رہے۔ نازلی نیچی نظریں کئے ہوئے بیٹھی تھی۔ نوری نے گھڑی دیکھی اور چاروں طرف دیکھ کر نازلی کا ہاتھ آہستہ سے چھوڑ دیا۔ اپنی جیب سے اُس نے ہیرے کی ایک انگوٹھی نکالی جس کی دمک سے بجلی کی روشنی میں آنکھیں خیرہ ہوتی تھیں۔ نازلی نے آنکھ کے گوشہ سے انگوٹھی کو دیکھا تو اُس نے مسکرا کر کہا "یہ آپ کے لئے ہے۔" ہاتھ پکڑ کر کہا "کیا آپ اجازت دیتی ہیں" اور یہ کہتے ہوئے نازلی کی انگلی میں انگوٹھی پہنا کر اُس کے ہاتھوں کو لبوں سے لگا کر آہستہ سے چھوڑ دیا۔ "خدا حافظ۔ خدا حافظ" کہہ کر وہ کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ایک طویل مصافحہ کیا۔ اور پھر خدا حافظ کہہ کر اجازت چاہی "خدا حافظ" نازلی نے آہستہ سے کہا۔ چلتے چلتے دروازہ سے مڑ کر اُس نے نازلی کی طرف دیکھا جو خود اُس کو جاتا ہُوا دیکھ رہی تھی۔

مرزا عظیم بیگ چغتائی

اگر تم کسی سے نہایت پاک نفسی اور دلجمعی سے محبت کرتے ہو تو عنقریب تم تمام بنی نوعِ انسان کو محبت کی نگاہ سے دیکھو گے۔ اس آسمان میں آسمان گرد آفتاب کی طرح دل بھی قطرۂ شبنم سے لے کر سمندر تک ایک آئینہ کے سوا کسی پر نظر نہیں کرتا۔ وہ آئینہ جسے یہ اپنی شعاعوں سے گرم کرتا اور زریں وسیمیں بناتا ہے ——— رچر

امین

غزل

جہان جلوے سے تیرے اگر نہیں معمور
تو ماہ و انجم و خورشید میں ہے کس کا نور

بنا دو تم مرے دل کو جلا کے وہ اکسیر
کہ جس سے سارے زمانے کا ہو سکے غم دور

یہ کم ہے کیا صلۂ عشق ناصحِ مشفق
خیالِ راحتِ ہر دو جہاں ہے دل سے دور

بنا دیا غمِ پنہاں کو برقِ ہستی سوز
نثار ہوں ترے فیضِ کرم کے طبعِ غیور

نہ ہے کرامتِ صبر و نہ ہے تحمّلِ عشق
وہ دل جو پہلے تھا پروانہ اب ہے شمعِ نور

ترے سبب سے ہمیں خلدِ عشق حاصل ہے
تجھی کو ہم کہیں ظالم یہ عقل کا ہے فتور

میں اور موت کا طالب ہوں اے غمِ دوراں
حیاتِ عشق میں فردوس کیا نہیں مستور

مثالِ مردہ چلیں امواج کے اشاروں پر
جو بحرِ زیست میں ہے تجھ کو عافیت منظور

صلائے عام ہے جور آزمائیں اہلِ جفا
کہ ہم سا کوئی نہیں بے زبان اور مجبور

فروغِ گلشنِ ہستی فقط تماشا ہے
گل و گہر سے سجانا انہیں نہیں منظور

جگر دیا تمہیں ناکامیوں نے کچھ نہ سبق
ذرا امید نے چھیڑا کہ ہو گئے مسرور

جگر بریلوی

میزبان نوازی

انصاف اس امر کا مقتضی ہے کہ تحریر کرنے سے پہلے میں اپنی غلطی کا اعتراف کروں کہ میرا ہی قصور تھا... محض میرا...... اپنا..... قصور! مجھ کو ہرگز یہاں نہیں آنا چاہئے تھا مجھ کو معلوم تھا۔ خوب معلوم تھا میں ہمیشہ سے جانتا ہوں کہ دوسرے لوگوں کے گھروں پر جانا اور وہاں رہنا سراسر دیوانگی ہے! تاہم مجھ سے دانستہ یہ غلطی سرزد ہوئی ـــــــ ایسی غلطی جس کا کفارہ تازیست ادا ہونا محال ہے۔ نہ معلوم مجھ پر کیا سودا سوار ہوا کہ یہاں چلا آیا۔ اب تو کوئی امید باقی نہیں۔ ۱۱ نومبر سے پہلے نجات ملنا مشکل ہے۔ مفر کا کوئی راستہ نہیں۔

یہ تحریریں ایسی عافیت کی جگہ بیٹھا لکھ رہا ہوں جہاں انسانی آنکھ مجھ کو نہیں دیکھ سکتی ہیں ہمت قلی خاں کے باغ میں حوض کے کنارے بیٹھا ہوں۔ وہ لوگ اس کو تیرنے کا تالاب کہتے ہیں۔ صبح ہی صبح برف جیسے ٹھنڈے پانی میں مینڈک کی طرح اچھلتے ہیں۔ خدا ان کو سمجھے! صبح چھ بجے کا وقت ہے۔ بمشکل سے ایک گھنٹہ باقی ہے جو میں سکون کی زندگی گذار سکوں ورنہ دوسرا ذریعۂ نجات میرے لئے موت کے سوا اور کوئی نہیں! کیونکہ ابھی ذرا دیر میں مس اسرائیل صاحبہ (آپ ایک یہودن ہیں اور فلسطین سے تشریف لائی ہیں) اپنے کمرے کی کھڑکی کھول کر چلائیں گی "آہا! کیسی زوردار صبح ہے! کیا سب لڑکے ابھی سورہے ہیں! (ان لڑکوں میں سے دو ایک کے داڑھیاں بھی ہیں جن کی سیاہی پر سفیدی کا حملہ ہوچکا ہے) مس صاحبہ کا جواب جوشیلے نوجوان مرزا صاحب شبنم آلود جھاڑیوں میں سے فاختہ کی آوازمیں دیں گے۔ کو ـــ ای!" اگر مسئلۂ تناسخ میں کوئی حقیقت ہے تو ضرور ایک دن وہ فاختہ کا جسم اختیار کرلیں گے۔ کچھ دیر بعد خان بہادر ہمت قلی خاں صاحب خود منہ میں ڈیڑھ گز لمبا سگار لگائے شانوں پر بڑے بڑے تولیے ڈالے باہر نکل آئیں گے اور چلائیں گے۔ "ارے بھئی! کوئی صاحب ہیں تیار غوطہ لگانے کے لئے؟" غور کیجئے عین طلوعِ آفتاب کے وقت نہار منہ غوطہ!!

خدا بچائے تمام مسلمانوں کو ہر ایسے عذاب سے! ہائے ہائے! مجھ کو تو اس خیال سے ہی لرزہ چڑھتا ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ ناشتے کے لئے سب اس طرح جمع ہونگے جیسے مذبح پر چیلیں منڈلاتی ہیں۔ کوئی کھڑا کھڑا گرم چائے کے گھونٹ مزے کے ساتھ حلق سے اتار رہا ہے۔ کوئی کرسی کے ڈنڈے پر بیٹھا ہے۔ کوئی صاحب کسی کے سامنے سے روٹی

ر بھاگے ۔ لطف یہ ہے کہ تمام اس قسم کے مہمان جن کے لئے "مس صاحبہ" کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے آرام سے کرسیوں پر ڈٹ جائیں گے ۔ بغیر اس بات کی پروا کئے ہوئے کہ باقی ماندہ معقول صورت اور معقول وضع اشخاص کو جگہ ملے گی یا نہ ملے گی! اُن کی بلا سے!

میں جانتا ہوں اس میں کسی دوسرے کا ذرا بھی قصور نہیں! اپنے ہی گناہ کی سزا بھگت رہا ہوں! خودکردہ را علاجے نیست! میری زندگی کا ہمیشہ یہ اصول رہا ہے کہ میں نہ کسی کے یہاں مہمان کی حیثیت سے جاتا ہوں نہ کسی کو اپنے یہاں بلاتا ہوں ۔ اگر مجھ کو کوئی اس قسم کی تحریر موصول ہوتی کہ "موٹر اسٹیشن پر ملے گی وغیرہ وغیرہ"، تو میں لکھ بھیجتا ہوں کہ کوئی وجہ نہیں کہ موٹر اسٹیشن پر ہو ۔ اُس کے کھڑا کرنے کے لئے بہت جگہ ہے ۔ بلکہ بہتر ہو اگر آپ اس کو اپنے مکان کی چھت پر رکھیں!" اگر کسی فیشن ایبل خاتون نے اپنے گلاب کی راکھ سے بنے ہوئے کاغذ پر لکھا "کہ آپ ۲ استمبر کے ساڑھے تین بجے سہ پہر سے ۱۴ کے چار تک کا وقت دے سکتے ہیں"، تو میں نے لکھ بھیجا "خاتون آپ ایک مہینہ لے لیجئے یا پورا سال لے لیجئے مگر مجھ کو یہاں ہی رہنے دیجئے"۔ اس قسم کے تمام اصول میں خاص طور پر فائدہ مند پاتا ہوں۔

لیکن اس دفعہ میں نے خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماری ۔ واقعہ یہ ہے کہ کم نصیبی سے کہئے یا شامتِ اعمال کے زور سے یا محض اتفاق سے ایک دن مجھ پر وہ دماغی کیفیت طاری ہوگئی جس کو لوگ جولانیٔ طبع سے موسوم کرتے ہیں، جب دماغی عناصر سے گرانی دور ہو جاتی ہے اور انتشار کے بدلے یکسوئی حاصل ہو جاتی ہے، جب انسان اپنے آپ کو اپنی حقیقی شخصیت سے مختلف پاتا ہے اور اپنے کو ملنسار، ظرافت پسند، خوش مزاج اور ہنسنے ہنسانے والا تصوّر کرنے لگتا ہے ۔ ایسی کیفیت وقتاً فوقتاً ہم میں سے اکثر پر طاری ہو جاتی ہے بعض لوگ ایسی کیفیت کے لئے ایک عامیانہ محاورہ "مخمور ہو جانا" استعمال کرتے ہیں! اس سے کیا بحث کہ وہ کیا کہتے ہیں یا کیا نہیں کہتے بہر حال ایک دن میری حالت ایسی ہی تھی کہ اتفاق سے لکھنؤ کے کلب میں اپنے ایک پرانے واقف خان بہادر ہمت قلی خاں سے ملاقات ہوئی ۔ خوب اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں ۔ میں نے طرح طرح کے پُرلطف قصّے اُن کو سنائے (میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ مجھ کو صرف چار قصّے یاد ہیں، اور پانچواں ایسا ہی ادھورا سا یاد ہے لیکن ایسی خاص کیفیت کے طاری ہو جانے کے بعد میں اِن ہی قصوں کو مختلف طرح سے سنا دیتا ہوں ۔ طرزِ بیان کا ایک خاص رنگ ہوتا ہے جو عموماً ایسی حالت میں ہو جاتا ہے ۔ شاید چلتے وقت میرے مصافحہ کرنے کی گرمجوشی دیکھ کر ان کو یہ خیال پیدا ہوا یا کیا سبب تھا انہوں نے بہت اصرار سے کہا "ارے بھئی تم ضرور بالضرور اکتوبر میرے پاس آ جیو

گذارو۔ میں نے چند اور لوگوں کو بھی بلایا ہے، مگر تمہاری موجودگی سے بہت زیادہ لطف رہے گا۔ تم جیسا زندہ دل آدمی تو ہم جیسے سوتے ہوئے لوگوں کو جگا سکتا ہے!" میں نے جہاں تک مجھ سے ہو سکا ایک قہقہے اور چیخ کو ایک ساتھ ادا کرتے ہوئے کہا "واللہ! اچھی تجویز ہے! ضرور رہئے! آؤں گا!"

لیکن ایک گھنٹہ بعد میں کفِ افسوس مل رہا تھا اور رہ رہ کر اپنے آپ کو ملامت کر رہا تھا کہ کیوں وعدہ کیا کیوں ازخود رفتہ ہوگیا! ...... سوتے ہوئے لوگوں کو جگا دوں! کیا کہا ؟ میں اور ایسے فرائض ؟ استغفر اللہ! ......!

میں نے سوچا ممکن ہے وہ بھول جائیں، لیکن نہیں صاحب! ستمبر کے آخری ہفتہ میں میرے پاس بیگم ہمت قلی خاں کی مجبور کر دینے والی چٹھی آ پہنچی کہ " ...... مہمانوں کی ایک چھوٹی سی پارٹی ہوگی۔ لیکن بغیر آپ کے کچھ لطف نہ رہے گا۔ ہم سب کو جگانے کے لئے آپ کی سخت ضرورت ہے!" میرے خدا! میں کس قسم کی الارم گھڑی ہوں جو میری اتنی سخت ضرورت ہے!

〰〰〰

جہاں زندگی کی اور مصیبتیں ہیں وہاں میرے لئے استقبال بھی ایک بڑی مصیبت ہے۔ اگر کوئی میرا استقبال کرتا ہے تو مجھ سے عداوت خریدتا ہے۔ انتقام کی آگ سینے میں بھڑکا دیتا ہے۔ میں ڈیڑھ دو دن کے اسٹیشن پر اترا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ہمت قلی خاں مع اپنی بیگم صاحبہ اور آٹھ دس مہمانوں کے موجود ہیں۔ میری روح فنا ہوگئی! ایک نے مجھے اپنے مضبوط ہاتھوں میں جکڑ لیا۔ پھر کسی نے پوری طاقت سے چار پانچ ہاتھ میری کمر پر رسید کئے۔ ایک صاحب اتنے تیز تھے کہ میری انگلیاں پکڑ کر اتنے زور سے جھٹکا دیا کہ قریب تھا کہ میرا ہاتھ شانہ سے علیحدہ ہو جائے کہیں اس عالمِ بدحواسی میں میرے منہ سے نکل گیا کہ " خان بہادر مع آفت کے تشریف لائے ہیں" بس بیگم ہمت قلی کھلکھلا کر ہنس پڑیں اور اُن کے ساتھ ہی سب لوگوں نے ایک ہیبت ناک قہقہہ لگایا۔ میرا دم اور خشک ہوگیا۔ یا مسبب الاسباب! اس میں کون سی ہنسی کی بات تھی ؟ بیگم ہمت قلی نے کہا " جب ہی تو میں کہتی تھی کہ آپ کی سخت ضرورت ہے! ہمت قلی صاحب بولے سب لوگ یہاں نہیں آئے ہیں کئی ایک گھر پر ہی رہ گئے " گھر پہنچا تو پھاٹک پر آٹھ دس مرد عورت لڑکی لڑکوں کا مجمع اور تھا۔ دور سے ہی کسی نے بندوق دکھائی کسی نے ٹینس کے بیٹ سے دھمکایا۔ ایک صاحب نے کتا ہی چھوڑ دیا۔ اور کتوں سے میرا دم فنا ہوتا ہے! ...... اسی کو بیگم ہمت قلی نے چھوٹی سی پارٹی لکھا تھا۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ میرا اپنا قصور تھا! نوشتۂ تقدیر کو کس نے مٹایا ہے! میرا خیال تھا کہ زیادہ سے زیادہ تین چار

آدمی اور میری ہی طرح کے دبلے پتلے، خاموش زندگی پسند کرنے والے، کم سخن، تنہائی پسند وہاں ہونگے، جن سے کبھی نہ بات کرنے کی نوبت آئے گی نہ اُن کے نام پُوچھنے کی مگر یہاں معاملہ بالکل برعکس نکلا!

لیکن بہت جلد مجھ کو احساس ہونے لگا کہ میرے میزبان کو میری طرف سے سخت مایُوسی اور ناامیدی ہوئی انہوں نے کہا تو نہیں لیکن تب بھی میں جانتا تھا! مجھ کو اندازہ ہُوا کہ میری حاصل کردہ تعلیم بالکل نامکمل اور ادھوری تھی۔ علم کے چند نہایت ضروری شعبوں سے مجھ کو بالکل بے بہرہ رکھا گیا تھا۔ مجھ کو ذرا بھی معلوم نہ تھا کہ اگر کوئی اپنا مکان اور اُس کے متعلق دوسری چیزیں دکھائے تو کن الفاظ کا استعمال مناسب اور موزوں ہوگا۔ میں نہ جانتا تھا کہ اگر کوئی اپنا مکان، زمین، درخت یا جھاڑیاں دکھائے تو کیا کہنا چاہئے۔ حالانکہ میں اسی قسم کی چیزیں تمام عمر دیکھتا رہا ہوں۔

ہمت قلی خاں نے کہا "دیکھئے یہ ہمارا نیا بڑا پھاٹک ہے ہم نے اسی سال لگایا ہے!

میں "ہوں!" بس میں نے اس سے زیادہ نہ کہا۔ کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ پھاٹک کو اِس سال نہ لگاتے اور اگر انہوں نے نہ بھی لگایا ہوتا تو مجھ کو ذرا بُرا نہ لگتا! اور اگر وہ ایک ہزار برس پیشتر اس کو لگا چکے ہوتے تب بھی میرا کیا بگڑتا تھا!

"اس کے لگانے وقت اچھا خاصا جھگڑا ہُوا تھا۔ بالآخر یہی طے پایا کہ چونے کا پلاسٹر ہونا چاہئے!"

میں "واقعی!" اس سے زیادہ میرے پاس کہنے کے لئے کچھ نہ تھا۔ کیونکہ مجھ کو یہ معلوم نہ تھا کہ کس کا جھگڑا کس سے ہُوا اور کون کس پر غالب آیا یا کس نے کس کو ہرایا۔ اُدھر خواہ چونے کا پلاسٹر ہو یا کنکھے کا پلاستر ہو میرے لئے سب یکساں ہے۔

"یہ گھاس کا خطہ ہم نے اُس سال تیار کیا تھا جب ہم پہلے پہل یہاں آئے تھے" میں چپ رہا۔

انہوں نے چبھتی ہوئی نظر سے میری طرف دیکھا۔ میں نے بھی ایک خلوص کی نظر سے اُن کو دیکھا۔ کوئی وجہ معلوم نہ ہوتی تھی کہ میں اُن کا یقین نہ کروں!

یہ کنارے پر جو مٹر کے پھول لگے ہیں یہ تجربہ کے طور پر لگائے ہیں۔ ان کا بیج بلخ سے منگایا تھا۔ میں نے گہری نظر سے پھولوں کی طرف دیکھا مگر زبان سے ایک لفظ نہ کہا۔ بیج اگر بلخ سے آیا تھا تو بہت اچھا ہُوا۔ میں کہتا ہوں کہ اگر سمرقند سے آتا تو کیا بُرا تھا۔ اور نہ آیا تو کیا نقصان ہُوا! تجربہ کے لئے لگائے۔ خوب کیا! اگر مٹر نہ لگاتے اور آلو بخارا لگاتے تو میرا کون حرج تھا! مجھ کو خیال ہُوا کہ ہمت قلی صاحب مجھ سے بالکل مایوس ہو گئے ہیں۔ مجھ کو

اُن کی حالت پر اپنے دل میں ترس آرہا تھا۔ مگر میں مجبور تھا۔ میرا ذرا قصور نہ تھا۔ کیونکہ میرے سرپرستوں نے مجھے صحیح، اصلی اور ضروری تعلیم نہ دی تھی۔ مجھ کو کسی استاد نے نہ سکھایا تھا کہ ایسے مواقع پر کیا کہنا چاہئے۔

مگر یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ایسے مواقع پر دوسرے لوگ کس خوبی سے گفتگو کر لیتے ہیں۔ میرے دوست نوجوان مرزا میری ہی طرح معمولی قابلیت رکھتے ہیں۔ اُن میں کوئی خاص خصوصیت نہیں۔ لوگوں کا خیال ہے کہ وہ بڑے باتونی ہیں اور خواہ مخواہ غل مچاتے ہیں۔ غرض کہ وہ مجھ سے ہر طرح کم ہیں لیکن مجھ کو ماننا پڑے گا کہ سفید فلالین کی پتلون اور نیلی فلالین کا کوٹ پہن کر اس خاص فن میں انہوں نے مجھ کو ہرا دیا ہے۔

ہمت قلی جب اُن کو مکان دکھانے لے چلے تو میں اُن کے ساتھ ہو لیا۔ ہمت قلی نے کہا یہ پھاٹک ہم نے اِس سال لگایا ہے۔" مرزا نے ایک معترضانہ انداز سے اُس کی طرف دیکھا۔ "آپ کو معلوم ہے یہ اگر میرا پھاٹک ہوتا تو میں کیا کرتا۔

وہ "نہیں"

مرزا "میں بہت چوڑا بناتا۔ اس میں تو نکلنے کی جگہ ہی نہیں۔ اور انہوں نے افسوس کے ساتھ سر ہلایا۔

"اس کی تعمیر کے وقت بڑا جھگڑا ہوا مگر آخر ہم نے چونے کے پلاسٹر کا فیصلہ کیا۔"

مرزا "اُفوہ! آپ نے کیسی غلطی کی۔" یہ کہہ کر انہوں نے ایک بڑا سا پتھر اٹھا کر زور زور سے پھاٹک کے ایک ستون پر مارنا شروع کیا جس سے پلاستر کے بڑے بڑے ٹکڑے ٹوٹ کر گرنے لگے۔ دو ایک اینٹیں بھی گریں "دیکھئے کتنا کمزور رہے۔" ہمت قلی نے کچھ نہ کہا۔ اُنہوں نے پھر اپنا گھاس کا خطہ دکھایا

مرزا "ارے صاحب! یہ تو بہت خراب لگا ہے۔ دیکھئے میں اس میں اپنی ایڑی سے گڑھے کھود سکتا ہوں!" یہ کہہ کر مرزا نے حیرت انگیز طاقت سے تین چار لاتیں اس زور سے چلائیں کہ آس پاس کی سب گھاس غائب ہو گئی! "دیکھا آپ نے!"

ہمت قلی "یہ کنارے پر جو لگے ہیں تجربہ کے طور پر لگائے گئے ہیں۔ بیج بلخ سے منگایا تھا"

مرزا "مگر صاحب یہ تو آپ نے بالکل غلط لگائے ہیں۔ ان کا رخ سورج کی طرف سے زمین کی طرف ہونا چاہئے تھا نہ کہ زمین کی طرف سے سورج کی طرف۔ ذرا ٹھہرئیے" یہ کہہ کر انہوں نے قریب پڑا ہوا ایک پھاوڑا اٹھا لیا اور دس بارہ پودے اکھاڑ ڈالے "آپ نے دیکھا میں ان کو کتنی آسانی سے اکھاڑ سکتا ہوں۔ بالکل غلط لگے ہیں۔"

اب تو میں مطلوب سبق سیکھ چکا تھا۔ مجھ کو معلوم ہو گیا تھا کہ کامیابی کا راز اسی میں ہے کہ پہلے تو دوسرے کی چیزوں کو اپنا سمجھ لینا چاہئے اور پھر اُن کو توڑ دینا چاہئے۔ چنانچہ جب ہمت قلی اپنے ملاقات کے کمرے کی تصویریں دکھانے اور اُن کی خوبیاں بیان کرنے لگے تو میں نے کہا "آپ کو معلوم ہے کہ اگر یہ تصویریں میری ہوتیں تو میں کیا کرتا؟"

وہ "نہیں"

میں "یکلخت ان سب کو توڑ ڈالتا اور پھاڑ ڈالتا"

یہ کہہ کر میں نے اردگرد لکڑی یا ہتھوڑی کی تلاش میں دیکھا مگر مایوسی ہوئی۔ لیکن میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ ہمت قلی ایک عجیب انداز سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ مگر میں اندازہ نہ کر سکا کہ یہ تجویز اُن کو پسند آئی یا نہیں۔

چائے کے وقت بیگم ہمت قلی اپنے لڑکوں کی باتوں اور تعلیم کا ذکر کرنے لگیں۔ بڑے لڑکے کے گیند پھینکنے کی تعریف کرتے ہوئے انہوں نے اپنا ایک ہاتھ اوپر اٹھایا اور دوسرے سے گرم چائے سے بھری ہوئی آدھی چائے دانی میرے کوٹ کے کالر کے اندر خالی کر دی! پھر انہوں نے بتایا کہ کس طرح چھوٹے لڑکے نے جماعت میں چوہے کی قسموں پر سب سے عمدہ مضمون لکھ کر انعام حاصل کیا۔

وہ "آپ چائے اور لیں گے؟"

میں "جی نہیں معاف کیجئے" اور میں اُس کرسی سے اٹھ کر دوسری پر جا بیٹھا۔

اگلے دن صبح کی چائے اور ناشتا غائب! ارے بھئی یہ کیا! معلوم ہوا بیگم ہمت قلی کا نیا چینی کتا طلوعِ آفتاب سے بہت قبل اور سپیدہ نمودار ہونے سے بھی پہلے انتقال کر گیا! ناشتے کے بجائے سب بیگم صاحبہ سے تعزیت کرنے گئے۔

ایک "واللہ کیا صدمہ ہوا ہے! لیکن مشیّتِ ایزدی میں کسی کا کیا چارہ!"

دوسرا "ہائے ہائے! بہت خوبیاں تھیں مرنے والے میں"

"بس اب تو یہ دعا ہے کہ پس ماندگان کو صبر آجائے"

"میری تجویز ہے کہ سب لوگ سیاہ ریشم کا ایک ایک خوبصورت پھول پہنیں"

بہر حال "بر سر فرزند آدم ہرچہ آید بگذرد" اب میں سمجھتا ہوں کہ جلد میری مصیبتوں کا خاتمہ ہونے والا ہے ۔ درحقیقت اس غیر مناسب وقت میرے یہاں آنے اور اس تنہائی کی جگہ بیٹھنے کا اصلی مقصد یہ ہے کہ میں بہت جلد اپنی تکلیف کا خاتمہ کردوں ۔ بس حد ہو چکی ! رات کھانے کے بعد ہمت قلی صاحب مجھ کو علیحدہ لے گئے اور کہنے لگے کہ ہم لوگ "سیر پرستان" کا ڈراما کرنے والے ہیں ۔ میں نے سب سے آپ کے اُن پُر لطف قصّوں کا حال کہا تھا جو آپ نے لکھنؤ میں سنائے تھے اس پر سب لڑکیوں نے (جن میں بیگم ہمت قلی بھی شامل تھیں) خوب تالیاں بجائیں ۔ سب کا اصرار ہے کہ آپ بھی ڈرامے میں حصّہ لیں ۔ آپ کے لئے تجویز پایا ہے کہ آپ سیاہ دیو کا پارٹ کریں ۔ تمام باتوں کو سوچتے ہوئے خیال ہے کہ اس پارٹ کو صرف آپ ہی نہایت خوبی سے کر سکتے ہیں" یہ کہہ کر وہ گرمجوشی کے ساتھ مصافحہ کر کے رخصت ہو گئے +

رات مجھ کو مطلق نیند نہ آئی ۔ میں تمام رات جاگتا رہا ۔ میں سوچ رہا تھا کہ تمام زندگی میں صرف ایک مرتبہ ایسا اتفاق پیش آیا تھا جب میں نے پبلک کے سامنے کسی قسم کی تقریر کی تھی جب میرے کلب کے وائس چیرمین صاحب سیر یورپ کے عزم سے ہم سب کو خیرباد کہہ رہے تھے اور میں نے اُن کو سائیکل کی ایک ایسی لالٹین جس میں مٹی کا تیل بآسانی جل سکتا ہے تحفہ میں دی تھی ۔ لیکن اس موقع پر بھی میں نے کئی رات جاگ جاگ کر یہ کہنے کی مشق کی تھی کہ "حضرات ! یہ لالٹین عام قسم کی لالٹینوں سے بہت مختلف ہے اس میں مٹی کا تیل نہایت آسانی کے ساتھ جلایا جا سکتا ہے اور اس کو محض ایک معمولی قسم کی دیا سلائی کے شعلہ سے مشتعل کر سکتے ہیں" اور اب یہاں یہ لوگ مجھ سے امید رکھتے ہیں کہ میں سیاہ دیو کا پارٹ کروں ! لیکن کیا پروا ہے ! اس کی نوبت ہرگز نہ آئے گی ! اب جینے کی کوئی خواہش باقی نہیں ! تھوڑی دیر بعد میرا مردہ جسم تیرنے کے تالاب میں تیر رہا ہوگا ! ہائیں ! یہ کیا بات ! میں اپنی نظر کاغذ سے اٹھاتا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ مکان کی طرف سے ہمت قلی خاں لپکتے ہوئے چلے آرہے ہیں ! خیریت تو ہے ؟ ہمت قلی کے بال بکھرے ہوئے ہیں اور وہ یوں ہی کمبل لپیٹے بھاگے چلے آرہے ہیں ۔ کیا کوئی قتل ہو گیا ؟ یا کسی مہمان نے زہر کھا لیا ؟ ضرور کوئی حادثہ پیش آیا ہے ۔ ممکن ہے ڈراما ملتوی ہو جائے ۔ . . . . . ! الشکر ہے !

ذیل کی چند سطور میں ڈیرہ اکسپریس کے ایک بہت عمدہ درجہ میں بیٹھا تحریر کر رہا ہوں جو مجھ کو نہایت تیزی کے ساتھ اور آرام سے لکھنؤ واپس لئے جا رہی ہے ۔ گاؤں ، جھونپڑیاں ، باغ کھیت تیزی کے ساتھ اُڑتے

اب تو میں مطلوب سبق سیکھ چکا تھا۔ مجھ کو معلوم ہو گیا تھا کہ کامیابی کا راز اسی میں ہے کہ پہلے تو دوسرے
یزوں کو اپنا سمجھ لینا چاہئے اور پھر اُن کو توڑ دینا چاہئے۔ چنانچہ جب ہمت قلی اپنے ملاقات کے کمرے
ویریں دکھانے اور اُن کی خوبیاں بیان کرنے لگے تو میں نے کہا "آپ کو معلوم ہے کہ اگر یہ تصویریں میری
تو میں کیا کرتا؟"

وہ "نہیں"

میں "یکلخت ان سب کو توڑ ڈالتا اور پھاڑ ڈالتا"

یہ کہہ کر میں نے اردگرد لکڑی یا ہتھوڑی کی تلاش میں دیکھا مگر مایوسی ہوئی۔ لیکن میری حیرت کی کوئی انتہا
جب میں نے دیکھا کہ ہمت قلی ایک عجیب انداز سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ مگر میں اندازہ نہ کر
کہ یہ تجویز اُن کو پسند آئی یا نہیں۔

چائے کے وقت بیگم ہمت قلی اپنے لڑکوں کی باتوں اور تعلیم کا ذکر کرنے لگیں۔ بڑے لڑکے کے گیند
لّے کی تعریف کرتے ہوئے انہوں نے اپنا ایک ہاتھ اوپر اٹھایا اور دوسرے سے گرم چائے سے بھری ہوتی
ی چائے دانی میرے کوٹ کے کالر کے اندر خالی کر دی! پھر انہوں نے بتایا کہ کس طرح چھوٹے لڑکے نے جماعت
یں چوہے کی قسموں پر سب سے عمدہ مضمون لکھ کر انعام حاصل کیا۔

وہ "آپ چائے اور لیں گے؟"

میں "جی نہیں۔ معاف کیجئے" اور میں اُس کرسی سے اٹھ کر دوسری پر جا بیٹھا۔

اگلے دن صبح کی چائے اور ناشتہ غائب! ارے بھئی یہ کیا! معلوم ہوا بیگم ہمت قلی کا نیا چینی کتا طلوعِ آفتاب
ے بہت قبل اور سپیدہ نمودار ہونے سے بھی پہلے انتقال کر گیا! ناشتے کے بجائے سب بیگم صاحبہ سے تعزیت
رنے گئے۔

ایک "واللہ کیا صدمہ ہوا ہے! لیکن مشیّتِ ایزدی میں کسی کا کیا چارہ!"

دوسرا "ہائے ہائے! بہت خوبیاں تھیں مرنے والے میں"

"بس اب تو یہ دعا ہے کہ پس ماندگان کو صبر آجائے"

"میری تجویز ہے کہ سب لوگ سیاہ ریشم کا ایک ایک خوبصورت پھول پہنیں"

بہرحال "ہر بر سرِ فرزندِ آدم ہرچہ آید بگذرد" اب میں سمجھتا ہوں کہ جلد میری مصیبتوں کا خاتمہ ہونے والا ہے۔ درحقیقت اس غیر مناسب وقت میرے یہاں آنے اور اس تنہائی کی جگہ بیٹھنے کا اصلی مقصد یہ ہے کہ میں بہت جلد اپنی تکلیف کا خاتمہ کر دوں۔ بس حد ہو چکی! رات کھانے کے بعد ہمت قلی صاحب مجھ کو علیحدہ لے گئے اور کہنے لگے کہ ہم لوگ "سیرِ پرستان" کا ڈراما کرنے والے ہیں۔ میں نے سب سے آپ کے اُن پُر لطف قصّوں کا حال کہا تھا جو آپ نے لکھنؤ میں سنائے تھے اس پر سب لڑکیوں نے (جن میں بیگم ہمت قلی بھی شامل تھیں) خوب تالیاں بجائیں۔ سب کا اصرار ہے کہ آپ بھی ڈرامے میں حصّہ لیں۔ آپ کے لئے تجویز پایا ہے کہ آپ سیاہ دیو کا پارٹ کریں۔ تمام باتوں کو سوچتے ہوئے خیال ہے کہ اس پارٹ کو صرف آپ ہی نہایت خوبی سے کر سکتے ہیں" یہ کہہ کر وہ گرمجوشی کے ساتھ مصافحہ کر کے رخصت ہو گئے +

رات مجھ کو مطلق نیند نہ آئی۔ میں تمام رات جاگتا رہا، میں سوچ رہا تھا کہ تمام زندگی میں صرف ایک مرتبہ ایسا اتفاق پیش آیا تھا جب میں نے پبلک کے سامنے کسی قسم کی تقریر کی تھی جب میرے کلب کے وائس چیئرمین صاحب سیرِ یورپ کے عزم سے ہم سب کو خیرباد کہہ رہے تھے اور میں نے اُن کو سائیکل کی ایک ایسی لالٹین جس میں مٹی کا تیل بآسانی جل سکتا ہے تحفہ میں دی تھی۔ لیکن اس موقع پر بھی میں نے کئی رات جاگ جاگ کر یہ کہنے کی مشق کی تھی کہ "حضرات! یہ لالٹین عام قسم کی لالٹینوں سے بہت مختلف ہے اس میں مٹی کا تیل نہایت آسانی کے ساتھ جلایا جا سکتا ہے اور اس کو محض ایک معمولی قسم کی دیا سلائی کے شعلے سے مشتعل کر سکتے ہیں" اور اب یہاں یہ لوگ مجھ سے امید رکھتے ہیں کہ میں سیاہ دیو کا پارٹ کروں! لیکن کیا پروا ہے! اس کی نوبت ہرگز نہ آئے گی! اب جینے کی کوئی خواہش باقی نہیں! تھوڑی دیر بعد میرا مردہ جسم تیرنے کے تالاب میں تیر رہا ہوگا! ہائیں! یہ کیا بات! میں اپنی نظر کاغذ سے ہٹاتا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ مکان کی طرف سے ہمت قلی خاں لپکتے ہوئے چلے آرہے ہیں! خیریت تو ہے؟ ہمت قلی کے بال بکھرے ہوئے ہیں اور وہ یونہی کمبل لپیٹے بھاگے چلے آرہے ہیں۔ کیا کوئی قتل ہوگیا؟ یا کسی مہمان نے ... [illegible] ضرور کوئی [illegible] آیا ہے۔ ممکن ہے ڈراما ملتوی ہو جائے ..... !! شکر ہے!

ذیل کی چند سطور میں ڈیرہ اکسپریس کے ایک بہت [illegible] درجہ میں بیٹھ کر تحریر کر رہا ہوں جو [illegible] کے ساتھ اور آرام سے لکھنؤ واپس لئے جا رہی ہے۔ گاڑی [illegible] نہایت تیزی کے ساتھ [illegible]

لے جارہے ہیں۔ اڑنے دو ایں بھی تو امن و عافیت کی طرف اُڑا چلا جا رہا ہوں! ہمت قلی نے اُس وقت کہا
ما کہ "بھئی لکھنؤ سے ٹیلیفون پر خبر آئی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" اور یہ کہہ کر انہوں نے بہت شفقت کے ساتھ
برے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ میرا دل چاہتا تھا اُن کو گلے لگا لوں!

میں "کیا؟" اور میں نے ششدر نظر آنے کی کوشش کی۔

وہ "بہت افسوسناک خبر ہے۔ دوست! لکھنؤ میں تمہارے دفتر میں آگ لگ گئی اور تمام ضروری
کاغذات جل گئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کل شام۔ شاکر ——— کیا تمہارے منشی کا یہی نام ہے نا؟ ——— موقع پر
موجود تھے۔ اُن کے سر چہرے اور ہاتھوں کے بال جل گئے! مجھ کو افسوس ہے کہ تم کو اسی وقت جانا پڑے گا۔"

میں "اسی وقت۔ فوراً!"

وہ "میں جانتا تھا اسی لئے میں موٹر کے لئے کہہ آیا ہوں۔ تم ساڑھے سات والی گاڑی سے جا سکو گے۔
اندر چلو۔"

میں "اچھی بات ہے۔" میں نے اپنا منہ دوسری طرف موڑ لیا تھا تاکہ وہ میرے چہرہ پر مسرت کے آثار
نہ دیکھ سکیں۔ دفتر میں آگ لگ گئی؟ خدا کا شکر ہے! شاکر کے بال جل گئے! کیا مضائقہ ہے! تمام زندگی میں
اتنی بڑی خوشی مجھے نہ حاصل ہوئی ہوگی۔ ایسی اندوہناک خبر سننے کے بعد میرا اس قدر ہمت آمیز اور بہادرانہ
برتاؤ دیکھ کر ہمت قلی تحسین اور آفرین کی نظروں سے مجھے دیکھ رہے تھے!

موٹر تیار ہے؟ مرحبا! خدا حافظ دوست! صد مرحبا! اچھی بات ہے ضرور ٹیلیفون کروں گا۔ خدایا
تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ اسٹیشن آ گیا۔ قلی صرف یہی دو چیزیں ہیں اور یہ لو دو روپے تمہارا انعام ہے! یہ قلی بھی
کیسے خوش مزاج انسان ہوتے ہیں! میں لکھنؤ جا رہا ہوں! خدا کا کتنا شکر ادا کروں! واہ شاکر خوب کیا! میری
ہدایت پر حرف بحرف عمل کیا۔ شاباش ہے۔ ٹھیک وقت پر ٹیلیفون کیا۔ میں نے یہاں آنے کے اگلے ہی
دن خط لکھ بھیجا تھا۔ مگر مجھے خوف تھا کہ کہیں بھول نہ گیا ہو۔ معلوم ہوتا ہے شاکر کا حافظہ غیر معمولی طور پر اچھا ہے!

ممکن ہے ہمت قلی کو کسی قسم کا شبہ ہو اس لئے میرا ارادہ ہے کہ لکھنؤ پہنچتے ہی اپنے دفتر میں آگ
لگا دوں گا اور شاکر کے سر اور چہرے کے بال بھی جلا دوں گا۔ کیا پروا ہے!!

سیّد شاہد حسین

ہندی جذبات

جب سے تم پردیس سدھارے نیند مجھے کب آتی ہے
سار ی رات آنکھوں میں تارے گن گن کر کٹ جاتی ہے

گھر کے بھری برسات میں جب متوالے بادل آتے ہیں
ایک اُمنگ اُٹھ اُٹھ کے جی میں آٹھ پہر تڑپاتی ہے

پیارا پیارا چاند سا مکھڑا آنکھوں میں پھرتا رہتا ہے
رات اکیلے میں جس سے باتیں کرتے کٹ جاتی ہے

ایک تمہارے کارن میں نے تج دیا تک سکھ سے رہنا
چین کسی کل جب نہ پڑے، پھر بات کوئی کب بھاتی ہے

سارا گھر سنسان پڑا ہے ایک تمہارے نہ آنے سے
رات اندھیری مجھ کو اکیلا پاکر پھاڑے کھاتی ہے

تم ہو جمی جم، چاندنی مجھ کو دھوپ دکھائی دیتی ہے
سیج بچھاتی ہوں پھولوں کی تو کانٹے بن جاتی ہے

سانس بھی لینا ہو گئی دوبھر منہ کو کلیجا آتا ہے
تم کیا جانو کوئی تمہارے پیچھے یوں گھبراتی ہے

کان لگائے رہتی ہوں دن رات تمہاری آہٹ پر
اور تمہیں کچھ دھیان نہیں کیا چاہ یہی کہلاتی ہے؟

اب تو اجیرن ہو گیا جینا میرے ہدف کب آؤ گے
سوچو تو کچھ چاہنے والی پر کیا بیتی جاتی ہے

ہدف
اجتہادی

سیاہ نقاب

اس واقعے کو جو میں آئندہ بیان کرنے والا ہوں آج پندرہ سال گزر چکے ہیں۔ میں اُن دنوں جوان تھا۔ ممکن ہے کہ دوسرے لوگوں کی زندگی سے اس دور کا تعلق دلچسپ معاشقانہ واقعات سے ہو لیکن میرے شباب کو اگر کوئی خصوصیت اور اہمیت ہے تو وہ صرف ایک رات میں ہے۔ سیاہ اور بھیانک رات میں جوانی آئی اور گزر گئی۔ جذبات پیدا ہوئے اور طبابت اور ڈاکٹری کے بوجھ تلے، بغیر میری زندگی میں کوئی رنگینی پیدا کئے پس کر مر گئے۔ اس وقت میں زندگی کے اُس حصّہ کو جس میں حیاتِ انسانی کی تمام دلفریبیاں مستور ہوتی ہیں کہیں پیچھے چھوڑ چکا ہوں۔ اور یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر "سیاہ نقاب" میری زندگی میں داخل نہ ہوتا تو میں اپنی جوانی ——اُس جوانی کو جس کے لئے دنیا ترستی ہے کبھی کا بھول چکا ہوتا، اور یاد کرنے کی بالکل کوشش نہ کرتا۔ ان سطور کے پڑھنے والے مجھے مردہ تصوّر کریں گے اور کہیں گے کہ میں جذباتِ لطیف سے عاری ہوں۔ میں بغیر کسی ردوکد کے اس بات کا اعتراف کرتا ہوں۔ میں مردہ ہوں بے حس ہوں۔ مجھے میرے افکار نے، ڈاکٹری نے آب و دانے کی تلاش نے اس قدر فرصت ہی نہیں دی کہ شباب کے لازمات یعنی عشق و محبت کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھ سکوں۔ چنانچہ اس واقعے کے پڑھنے والے ہرگز یہ خیال نہ کریں کہ میں کسی رابطہ عشق کا ذکر کرنے والا ہوں۔ یہ ایک داستان ہے المناک، جانگداز اور پُر درد۔

دسمبر سنہ ۱۹۱۵ء کی ایک گھٹ اندھیری رات کا ذکر ہے۔ بارش ہو رہی تھی اور پانی کے قطرے زور زور سے شیشوں کے ساتھ ٹکرا رہے تھے۔ تیز و تند ہوا دروازوں اور کھڑکیوں سے گویا دست و گریباں ہو رہی تھی۔ رات کے نو بج چکے تھے۔ میرے کمرے میں ایک چھوٹا سا لیمپ جل رہا تھا اور میں انگیٹھی کے قریب ایک صوفے پر لیٹا باد و باراں کے شور کو سُن رہا تھا۔ میری طبابت کا ابتدائی زمانہ تھا۔ ایم بی بی ایس کرنے کے بعد تھوڑے ہی عرصے سے میں نے پریکٹس شروع کر رکھی تھی۔ میرا مطب شہر کی ایک بارونق سڑک پر واقع تھا لیکن باوجود چند مہینے گزر جانے کے میرا کاروبار بالکل ٹھنڈا تھا۔ بڑے بڑے جاذبِ نظر اشتہارات بازاروں میں لگائے گئے، اخباروں میں اپنے نام کے ساتھ افلاطونِ دوراں اور مسیحِ زماں لکھ لکھ کر پبلک کی توجہ کو اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کی،

منادی اور لیکچروں کے ذریعہ سے اپنے نام کو فروغ دینا چاہا۔ مگر سب کوششیں اکارت گئیں۔ یہ تمام نمائشیں ایک مریض کو بھی میرے دروازے تک نہ لا سکیں۔ میں اُس وقت بہت حد تک مایوس ہو چکا تھا اور مستقبل کے متعلق فیصلہ کرنا چاہتا تھا کہ آیا کہیں ملازمت کر لی جائے یا چند ماہ اور اس کشمکش میں صرف کر دیئے جائیں۔ میری اس حالت کا اندازہ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جو خود اس امید و بیم کی حالت سے گزر چکے ہوں۔ والدین کی سالہا سال کی کمائی مجھ پر خرچ کر دی گئی تھی، اور پورے بیس سال کے بعد مجھے فارغ التحصیل دیکھ کر وہ میرے متعلق بلند ترین اندازے لگا رہے تھے۔ دسمبر کا ابتدائی ہفتہ تھا اور کرسمس میں میں وطن جا رہا تھا۔ مگر اپنی موجودہ حالت کو دیکھ کر خود ہی شرمندہ ہو رہا تھا۔ اپنی بیوی کے سامنے جو ابھی سے میری چشم براہ تھی اپنی ناکامی کا اعتراف کرنے کا خیال مجھے مارے ڈالتا تھا۔ میں یہی کچھ سوچ رہا تھا کہ مجھے نیند آ گئی۔

اسی حالت میں ابھی کچھ زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ کوئی میرے شانے کو دبا رہا ہے۔ میں نے آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ میرا ملازم چھوکرا مجھے جگا رہا تھا۔ میری حالت مجھے اس بات کی اجازت نہ دیتی تھی کہ ایک کمپاؤنڈر رکھ سکوں، اس لئے میں نے ایک اٹھارہ سال کے لڑکے کو جسے دن بھر سوائے پیپرمنٹ کی میٹھی گولیاں چوسنے کے کوئی کام نہ تھا ملازم رکھ لیا تھا۔

اُس نے آہستہ سے کانپتے ہوئے خوفزدہ آواز میں کہا "جناب ایک عورت آئی ہے"۔ میں حیران ہو کر اٹھ بیٹھا۔ اس طوفانی رات میں عورت کیا کسی مرد کی بھی توقع نہ ہو سکتی تھی۔

"کیسی عورت" میں نے سوال کیا "کہاں ہے؟"

"وہ" اور لڑکے نے اپنے دائیں ہاتھ کی انگلی سے برآمدے کے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے دروازے کے شیشوں میں سے دیکھا۔ ایک بلند قامت عورت جس کے جسم کا اوپر کا حصہ ایک چادر میں لپٹا ہوا تھا اور چہرہ ایک سیاہ نقاب نے چھپا رکھا تھا دروازے کے اِس قدر قریب کھڑی تھی کہ اُس کا چہرہ دروازے کو چھو رہا تھا۔ رات کے اس غیر موزوں وقت میں اس عجیب عورت کی آمد نے میرے دل میں ایک ہلکا سا اضطراب پیدا کر دیا تھا۔ میں آہستہ سے اٹھا اور دروازے کو ذرا سا کھولا۔ عورت کے جسم میں کوئی حرکت نہ ہوئی۔ وہ بدستور بت کی مانند کھڑی رہی۔ میں نے محسوس کیا کہ دو بڑی بڑی آنکھیں مجھے نقاب کے پیچھے سے گھور رہی ہیں۔ "آپ مجھ سے ملنا چاہتی ہیں" میں نے کہا۔

عورت نے سر کی خفیف سی جنبش سے اثبات میں جواب دیا۔ میں دروازے میں سے ہٹ گیا "تو آپ

اندر تشریف لے آئیں۔"

عورت ایک سائے کی طرح کمرے میں داخل ہوئی کمرے کے چاروں طرف نظر دوڑائی اور پھر میرے ملازم کو موجود پا کر ذرا ٹھٹکی۔ میں نے چھوکرے کو کہا "دروازے بند کردو۔ پردے گرادو اور تم دوسرے کمرے میں چلے جاؤ۔" میں نے ایک آرام کرسی انگیٹھی کے نزدیک کردی اور اپنے مہمان کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ عورت چپ چاپ بیٹھ گئی۔ انگیٹھی سے آگ کا ایک شعلہ ذرا بلند ہوا تو میں نے دیکھا کہ اس کا سیاہ لباس پانی میں شرابور ہو رہا ہے اور اس کا زیریں حصہ کیچڑ سے بھرا ہوا ہے "آپ بھیگ رہی ہیں" میں نے کہا۔ "جی ہاں" عورت نے پہلی دفعہ جواب دیا۔ اس کی آواز دبی ہوئی اور غمگین تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی دیرینہ مرض میں مبتلا ہے جو اس کی رگ رگ میں سرایت کر گیا ہے۔

"اور آپ بیمار ہیں" میں نے جلدی سے کہا۔

"جی ہاں میں بیمار ہوں، سخت بیمار ہوں۔ میرا جسم بے آزار اور محفوظ ہے، مگر میری روح ایک خطرناک اذیت میں مبتلا ہے۔ میں آپ کے پاس اپنے لئے نہیں بلکہ ایک اور شخص کے لئے آئی ہوں۔ اگر میں خود مریض ہوتی تو اس وقت اس تیرہ و تار وحشتناک رات میں جب کہ کائنات کی ہر جاندار شئے کونے کھدروں میں دبکی پڑی ہے۔ گھر سے باہر نہ نکلتی کاش کہ میں خود اس وقت بیماری کا شکار ہو جاتی۔ یقین جانئے کہ ایک حرف تک میری زبان پر نہ آتا اور میں نہایت خوشی اور سکون سے جان دے دیتی۔ ڈاکٹر صاحب! میں آپ کی امداد ایک دوسرے شخص کے لئے حاصل کرنے آئی ہوں۔ ممکن ہے کہ میرا تحمل دیوانگی پر محمول کیا جائے۔ واقعی میں دیوانی ہوں۔ ورنہ انتظار کی طویل نہ کٹنے والی راتوں میں نوحہ و گریہ کی نہ گزرنے والی گھڑیوں میں یہ خیال ہمیشہ میرے دماغ میں رہا اور اگرچہ میں جانتی ہوں کہ انسانی امداد اس معاملے میں کس قدر بے سود اور لا حاصل ہے لیکن اس کو اس کے بغیر سپردِ خاک کر دینے کا خیال میرا خون خشک کئے دیتا ہے۔"

عورت نے تقریر ختم کی تو اس کے تمام جسم میں ایک ایسا لرزہ دوڑ گیا جو تصنع سے کوسوں دور تھا۔

میں ابھی نوجوان تھا۔ انسانی مصائب افلاس اور فلاکت کے روزمرہ مشاہدوں نے مجھے ابھی تک بالکل بے حس نہ کر دیا تھا۔ میں جلدی سے اٹھا اور ٹوپی سر پر رکھ کر کہا "اگر مریض کی حالت اس قدر تشویشناک ہے تو ہم کو ایک لمحہ بھی ضائع نہ کرنا چاہئے۔ آپ نے اس سے پہلے کیوں نہ طبی امداد حاصل کی؟"

عورت بدستور بیٹھی رہی "اس لئے کہ اس سے پیشتر امداد حاصل کرنا بے سود تھا۔ آہ! اس سے کہ اب بھی

ایسا کرنا بےسود ہے،" اُس نے بےچینی سے ہاتھ ملتے ہوئے جواب دیا۔ کس قدر بےمعنی اور عجیب جواب تھا میں نے حیران ہوکر اُس کے چہرے کی طرف دیکھا، مگر وہاں سیاہ نقاب نے سب کچھ چھپا رکھا تھا۔

"آپ بیمار ہیں،" میں نے نرمی سے کہا، "اگرچہ آپ کو معلوم نہیں لیکن بخار جس کی شدّت نے آپ کو تکان محسوس نہیں کرنے دی آپ کو اندر ہی اندر جلا رہا ہے۔" اور ایک پانی کا گلاس دیتے ہوئے کہا "یہ پانی لیجئے اور تھوڑا عرصہ آرام کرنے کے بعد تسلّی اور اطمینان سے مرض کے متعلق بتائیے، جب مجھے سب کچھ معلوم ہو جائے گا تو میں ہر طرح آپ کی امداد کروں گا۔"

عورت نے بغیر نقاب اٹھائے گلاس لبوں تک اٹھایا اور پھر بن چھوئے رکھ دیا۔

"میں جانتی ہوں،" اُس نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا "کہ یہ سب کچھ بخار کا ہذیان معلوم ہوتا ہے۔ مجھے اس سے پہلے کہیں زیادہ سختی سے بتایا جا چکا ہے۔ میں عمر رسیدہ ہوں اور لوگ کہتے ہیں کہ جب انسان اپنی عمر کے اختتام کے قریب پر پہنچتا ہے تو اس کی زندگی کا یہ قلیل عرصہ، خواہ دوسروں کی نظروں میں وہ ناکارہ ہی کیوں نہ ہو گزشتہ سالوں سے جن کا تعلق زندگی کے بہترین واقعات سے ہوتا ہے کہیں زیادہ عزیز اور پیارا ہوتا ہے۔ چنانچہ مجھے یہ باقی ماندہ سال قدرتی طور پر عزیز ہونے چاہئیں۔ لیکن ڈاکٹر صاحب یقین جانئے کہ میں خوشی سے ان کو قربان کر دینے کے لئے تیار ہوں اگر ——— اگرچہ جو کچھ میں بیان کر رہی ہوں صرف ہذیان اور موہوم ہو۔ میں جانتی ہوں گو اس یقین کرنے سے خوف کھاتی ہوں کہ کل صبح وہ جس کا میں ذکر کر رہی ہوں انسانی مدد سے بالکل بے نیاز ہو چکا ہوگا لیکن اس وقت اگرچہ وہ موت کے منہ میں ہے۔ آپ اُس کو نہیں دیکھ سکتے۔ اُس کا علاج نہیں کر سکتے۔"

میری پریشانی انتہا تک پہنچ چکی تھی۔ مگر میں نے اس کو چھپاتے ہوئے کہا "میں آپ کے بیان پر نکتہ چینی کر کے یا اُن حالات کو جو آپ ارادتاً مجھ سے چھپا رہی ہیں کرید کرید کر پوچھنے سے آپ کو تکلیف نہیں دینا چاہتا لیکن آپ کی اس حکایتِ غم میں ایک ایسی بے ربطی ہے جسے میں سمجھنے سے قاصر ہوں۔ یہ شخص مر رہا ہے اور میں جو شاید اس وقت کچھ مدد کر سکوں اس کو نہیں دیکھ سکتا۔ باوجودیکہ آپ کو معلوم ہے کہ کل صبح کسی قسم کی امداد لاحاصل ہوگی۔ آپ مجھے اُس کو دیکھنے کی اجازت نہیں دیتیں۔ اگر مریض آپ کو واقعی اس قدر عزیز ہے تو آپ کو قبل اس کے مرض لاعلاج ہو جائے اُس کو بچانے کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہئے۔"

سیاہ پوش عورت بے اختیار ہوکر رونے لگی "آہ" اُس نے ایک ٹھنڈا سانس لیا "جس چیز پر مجھے خود یقین نہیں اُس کو دوسرے لوگ کیونکر باور کریں گے۔" اور پھر دفعتہً اٹھ کھڑی ہوئی "تو ڈاکٹر صاحب آپ اُس شخص کو

جس کی زندگی کے صرف چند گھنٹے باقی رہ گئے ہیں نہیں دیکھیں گے؟"

"میں نے یہ کب کہا ہے،" میں نے جواب دیا "میرا مطلب تو یہ تھا کہ اگر آپ اس طرح تاخیر کرتی رہیں اور مریض خدانخواستہ جاں بحق ہوگیا تو اُس کی موت کی بہت حد تک آپ ذمہ دار ہونگی"۔

"میں اُن ذمہ داریوں کا جو مجھ پر عائد ہیں ہر وقت جواب دینے کے لئے تیار ہوں"۔

میں نے کہا "چونکہ آپ کی ہدایت کے مطابق عمل کرنے سے مجھ پر کوئی اخلاقی یا قانونی گرفت نہیں آسکتی میں کل مریض کو دیکھوں گا بشرطیکہ آپ پتہ بتا جائیں۔ میں کل کس وقت مریض کو دیکھ سکتا ہوں؟"

"نو بجے" عورت نے جواب دیا۔

میں نے ایک دفعہ پھر کوشش کی "مجھے بار بار اس افسوسناک موضوع پر گفتگو کرنے سے معاف فرمایئے مگر کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ یہ مریض اس وقت آپ کی زیرِ نگرانی ہے؟"

"نہیں" جواب ملا۔

"تو اگر میں کچھ ہدایات عرض کروں تو اُن پر عمل کرنا آپ کے لئے ناممکن ہے"

"قطعاً" اور عورت بے اختیار ہو کر رونے لگ گئی۔

بدقسمت عورت نے اس وقت تک انتہائی کوشش سے اپنے جذبات کو ضبط کئے رکھا تھا مگر اب اُن میں طوفان آگیا تھا۔ وہ ابل رہے تھے اور عورت کے سکون اور ضبط کو بہائے لئے جارہے تھے۔ چنانچہ اس خیال سے کہ مزید دریافت فضول ہوگی اور عورت کے احساسات مجروح ہوجائیں گے۔ میں نے فردا کی ملاقات کا وعدہ کرکے پُراسرار عورت کو رخصت کیا جو شہر کے ایک بیرونی محلے کا پتہ دے کر سیاہ رات میں گم ہوگئی۔

عورت تو چلی گئی مگر میری نیند اور آرام بھی ساتھ لیتی گئی۔ میں پریشان تھا میرے حواس معطل تھے۔ عورت ایک معمّا تھی جس کو میں سمجھنے سے قاصر تھا۔ ایک مسئلہ تھا جس کا حل مجھ سے کوسوں دور تھا۔ میں نے اکثر ایسے واقعات سنے تھے جن میں ایک شخص کو اپنی موت کے صحیح وقت اور دن کا غیر معلوم طریق پر احساس ہوگیا تھا، مگر یہاں پر تو ایک دوسرے شخص کی موت کا ذکر تھا۔ یہ کہنا کہ عورت کسی واہمے اور تصوّر کا شکار ہو رہی تھی فضول تھا کیونکہ اُس کی گفتگو کے زبردست وثوق اور یقین کی موجودگی میں اس قسم کے شک کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ میرے دل میں ایک اور خیال پیدا ہوا کہ عورت قتل کے خوفناک جرم میں شریک ہے۔ عہد و پیمان اُس کو افشائے راز کی اجازت نہیں دیتے لیکن طبیعت کی کمزوری کے باعث وہ پشیمان ہے۔ اب وہ ارتکابِ جرم کو تو نہیں روک سکتی لیکن

اس بات کے در پے ہے کہ کسی صورت اُس شخص کو بچا لیا جائے۔ لیکن شہر کی گنجان آبادی میں ایسا ہونا بعید از عقل معلوم ہوتا تھا۔ میرے دماغ میں یکے بعد دیگرے کئی خیالات آئے مگر عقل نے سب کو رد کر دیا۔ اور آخر کار وہی ابتدائی اندازہ کہ عورت کا توازنِ دماغ بگڑ گیا ہے میرے دل میں مضبوط ہو گیا۔ اگرچہ میں اس میں کئی نقائص پاتا تھا مگر چونکہ اس الجھن میں سے نکلنے کا صرف یہی ایک راستہ باقی رہ گیا تھا اس لئے میں نے زبردستی یقین کر لیا کہ عورت دیوانی ہے۔ میں نے سونے کی ہزار کوشش کی لیکن سیاہ نقاب کا عکس ایک منٹ کے لئے بھی آنکھ بند کرنے سے روکتا تھا۔

اگلی صبح ابھی نو نہیں بجے تھے کہ میں اُس محلے میں جس کا پتہ مجھے رات کو بتایا گیا تھا پہنچ چکا تھا۔ محلہ غیر آباد تھا۔ بہت کم لوگ پھرتے نظر آتے تھے۔ مکانات کی ساخت اور مکینوں کے لباس سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ اس محلے میں افلاس اور غربت کی حکومت ہے۔ ایک مدت سرگرداں رہنے کے بعد اور جگہ جگہ سے اپنی منزلِ مقصود کا پتہ پوچھنے کے بعد میں ایک چھوٹے سے مکان کے سامنے پہنچا جس کی ظاہری حالت دیگر مکانات سے قدرے اچھی تھی۔ دروازے کے قریب گیا مگر زنجیر ہلانے کی جرأت نہ ہوئی۔ اس محلہ کی فضا میں سے مجھے گناہ کی بو آ رہی تھی۔ میں ہمت کر کے ایک دفعہ پھر بڑھا لیکن پھر ناکام رہا۔ تیسری مرتبہ گذشتہ رات کے واقعات اور مظلوم عورت کی قابلِ رحم حالت مجھے کھینچتی ہوئی دروازے تک لے گئی، اور میں نے زور سے زنجیر کو ہلایا۔ چند منٹ کے بعد میں نے محسوس کیا کہ دروازے کی دوسری طرف ذرا فاصلے پر دو شخص سرگوشیوں میں باتیں کر رہے ہیں۔ اس کے بعد بھاری بھرکم بوٹوں کی آواز آئی۔ زنجیر آہستہ سے اتاری گئی اور ایک دراز قامت پتلے دبلے شخص نے جس کے چہرے سے بے رونقی اور وحشت ٹپک رہی تھی دروازہ کھولا۔

"اندر تشریف لے آئیے" اُس نے کہا۔

عورت کی دردناک کیفیت اور اس شخص کی اندوہگین حالت میں اس قدر نمایاں تعلق پایا جاتا تھا کہ میں بغیر دریافت کئے کہ کس مکان میں جا رہا ہوں، اندر داخل ہو گیا۔

وہ شخص مجھے ایک کمرے کے دروازے تک لے گیا۔

"میں دیر سے تو نہیں پہنچا؟" میں نے پوچھا۔

"بالکل نہیں جناب" اُس نے دروازہ کھولتے ہوئے جواب دیا "اگر آپ اس کمرے میں تشریف رکھیں تو

آپ کو پانچ منٹ سے زیادہ انتظار نہ کرنا پڑے گا۔"

میں کمرے میں داخل ہوگیا اور وہ شخص چپ چاپ دروازہ بند کرکے چلا گیا میں ایک چھوٹے سے کمرے میں تھا۔ فرش پر ایک بوسیدہ چٹائی بچھی ہوئی تھی۔ ایک طرف ایک پلنگ رکھا تھا۔ دوسری طرف ایک شکستہ کرسی رکھی تھی۔ کونے میں دو ایک صندوق پڑے تھے۔ ہر چیز پر گرد پڑی ہوئی تھی جس سے معلوم ہوتا تھا کہ اس کمرے کو مدت سے صاف نہیں کیا گیا۔ چاروں طرف قبر کی سی خاموشی تھی۔ مکان بالکل سنسان معلوم ہوتا تھا۔ مکان کے اندر یا باہر کوئی آواز کوئی آہٹ سنائی نہ دیتی تھی۔ میں نے ایک کرسی صاف کی اور بیٹھ کر اپنی سب سے پہلی طبّی مہم کے نتیجہ کا انتظار کرنے لگ گیا۔ مجھ کو اس طرح بیٹھے زیادہ دیر نہ گذری تھی کہ سڑک پر ایک گاڑی چلنے کی آواز سنائی دی گاڑی مکان کے سامنے رک گئی۔ دروازہ کھلا۔ آہستہ آہستہ باتیں کرنے کی آواز آئی اور اس کے بعد پھر سناٹا ہوگیا چند منٹ کے بعد مجھے ایسا معلوم ہوا کہ دو یا تین آدمی کسی بھاری اور وزنی چیز کو اٹھائے سیڑھیاں چڑھ رہے ہیں تھوڑی دیر کے بعد سیڑھیاں اترنے کی آواز میرے کانوں میں آئی۔ دروازہ ایک دفعہ پھر کھل کر بند ہوگیا۔ اور فضا میں وہی اداسی اور پر دہشت سکون مستولی ہوگیا۔

پانچ منٹ اور گزر گئے اور عین اُس وقت جب میں نے دل میں یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ خود باہر جاکر اس معمے کو حل کروں۔ دروازہ آہستہ سے کھلا اور گزشتہ رات والی پُراسرار عورت اسی لباس میں اسی طرح چہرے کو نقاب میں چھپائے داخل ہوئی اور اُس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھ کو آگے بڑھنے کے لئے کہا۔ عورت کے غیر معمولی قد و قامت اور اُس کی مسلسل خاموشی نے ایک لمحے کے لئے میرے دل میں یہ خیال پیدا کردیا کہ اس لباس میں عورت نہیں بلکہ کوئی مرد چھپا ہے۔ لیکن سسکیوں کی آواز سے جو نقاب کے پیچھے سے آرہی تھی اور اس کی مجنونانہ حرکات نے فوراً اس خیال کو مٹا دیا۔

میں عورت کے پیچھے پیچھے چل دیا ہم سیڑھیوں سے اور ایک برآمدے میں سے ہوتے ہوئے ایک کمرے کے دروازے تک پہنچے جہاں عورت دروازہ کھول کر ذرا رک گئی تاکہ میں پہلے داخل ہوسکوں۔ کمرے کی کھڑکیاں بند تھیں۔ صرف ایک چھوٹا سا روشندان تھا جس میں سے اتنی ناکافی روشنی کمرے میں آرہی تھی کہ میں اُس چیز کو جو میرے سامنے کمرے کے وسط میں پڑی تھی اُس وقت تک نہ دیکھ سکا جب تک کہ عورت ایک چیخ کے ساتھ میرے پاس سے ہوتی ہوئی دیوانہ وار اُس کے قریب نہ جا گری۔ میں جلدی سے آگے بڑھا۔ ایک چارپائی پر سفید چادر میں جس پر گرم کمبل بھیلا ہوا تھا ایک شخص لپٹا پڑا تھا۔ بے حس اور بے حرکت چہرے پر سر کے اوپر سے اور ٹھوڑی

کے نیچے سے ایک پٹی بندھی ہوئی تھی - دایاں ہاتھ پہلو کے ساتھ پڑا تھا اور بایاں ہاتھ عورت کے ہاتھوں میں تھا -
میں نے آہستہ سے عورت کو ایک طرف ہٹایا اور اُس شخص کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا - ہاتھ سرد تھا اور نبض ساکن -

"اِنّا للہ" میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا " یہ شخص تو مر چکا ہے "

عورت تڑپ کر اٹھ کھڑی ہوئی " خدا کے لئے ڈاکٹر صاحب ایسا نہ کہئے مجھ میں اب نہیں کہ اس کو برداشت کرسکوں - بسا اوقات ایسے لوگ جن کی جانب سے دنیا نا امید ہو چکی تھی دوبارہ زندہ کر دیئے گئے اور ایسے لوگ جو آسانی سے صحتیاب ہو سکتے تھے صرف بے توجہی اور بے پروائی کی بدولت قبر کی آغوش میں پھینک دیئے گئے ڈاکٹر صاحب! اس کو بغیر علاج کے، بغیر کسی جدوجہد کے یوں کس مپرسی کی حالت میں نہ مرنے دیجئے - شاید اس وقت اس لمحے اسی لحظہ جسم میں سے جان نکل رہی ہو - للہ کوشش کیجئے - ڈاکٹر صاحب اس کو مرنے نہ دیجئے "

اور یہ کہتے ہوئے اُس نے لاش کے ہاتھ پاؤں اور سینے کو ملنا شروع کر دیا -

" یہ سب کچھ بے سود ہے " میں نے اپنا ہاتھ سینے پر سے اٹھاتے ہوئے کہا - مگر آنکھوں کی حالت دیکھ کر معاً میرے دل میں ایک خیال پیدا ہوا -

" ٹھہرو " میں نے کہا " کھڑکیاں کھول دو "

ان الفاظ نے عورت پر بجلی کا سا اثر کیا - اس طرح گویا اس کو تیر آ لگا ہے -

" کیوں " اُس نے دفعتہً چونک کر کہا

" میں کہتا ہوں کھڑکیاں کھول دو " میں نے پہلے سے ذرا زیادہ سخت آواز میں کہا -

عورت روتی ہوئی میرے پاؤں پر گر پڑی " میں نے ارادتاً کمرہ تاریک کیا تھا " اُس نے کہا " ڈاکٹر صاحب مجھ پر رحم کیجئے - اگر وہ واقعی مر چکا ہے اور اس کو زندہ کرنے کی کوشش فضول ہے تو خدا را اس شرمناک اور دلخراش منظر کو جسے اب تک میری آنکھیں دیکھ سکی ہیں دوسری آنکھوں کو دیکھنے کی اجازت نہ دیجئے "

" اس شخص کی موت طبعی بواعث سے واقع نہیں ہوئی " میں نے کہا " میں لاش کو ضرور دیکھوں گا " اور یہ کہہ کر ایک ہی جست کے ساتھ پیشتر اس کے کہ عورت کو معلوم ہوتا میں کھڑکی کے قریب پہنچ چکا تھا - میں نے کواڑ کھول دیئے اور پھر لاش کے قریب آ گیا - لاش کے چہرہ کا نیلگوں رنگ، آنکھیں، بھری ہوئی صاف بتا رہی تھیں کہ موت کا باعث تشدد ہے -

" اس پر تشدد کیا گیا ہے " میں نے عورت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اور عورت کے چہرے کی طرف جس

سے اب نقاب ہٹ چکا تھا دیکھتے ہوئے کہا۔

عورت نے پریشانی میں نقاب اتار دیا تھا اور اب حیرت سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر میری طرف دیکھ رہی تھی۔ خدوخال سے اُس کی عمر ۵۰ سال کے قریب معلوم ہوتی تھی۔ غم واندوہ نے اُس کے چہرہ پر ایک دردناک کیفیت پیدا کردی تھی۔ مسلسل رونے سے اُس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے تھے۔ اُس کی آنکھوں میں ایسی چمک تھی جو صرف دیوانگی ہی پیدا کرسکتی ہے۔

"اس پر تشدد کیا گیا ہے" میں نے پھر کہا۔

"جی ہاں"

"یہ شخص قتل کیا گیا ہے"

"خدا گواہ ہے" عورت نے جواب دیا "کس سفاکانہ اور خوفناک طریق پر قتل کیا گیا ہے"

میں نے اضطراری طور پر عورت کا بازو پکڑ لیا اور اُس کو دباتے ہوئے کہا "کس نے قتل کیا ہے"

"یہ دیکھو" عورت نے لاش کے گلے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

میں لاش پر جھک گیا۔ گلا متورم تھا اور اس کے گرد ایک نیلگوں حلقے کا نشان تھا۔

تمام واقعات ایک لمحے میں میرے دماغ میں پھر گئے اور حقیقت بجلی کی طرح میری آنکھوں کے آگے کوند گئی۔ "اس شخص کو آج صبح پھانسی دی گئی ہے" میں نے جلدی سے کہا۔

"جی ہاں" عورت نے خلا میں بے معنی طور پر دیکھتے ہوئے کہا۔ اُس کے بہتے ہوئے آنسو اب منجمد ہو گئے تھے۔ انتہائی غم نے اُس کے احساسات کو شل کردیا تھا۔

"یہ کون تھا" میں نے پوچھا۔

"میرا لختِ جگر۔ میرا بیٹا" یہ کہا اور عورت بے ہوش ہوکر میرے پاؤں میں گر گئی۔

یہ صحیح تھا۔ اِس قدر طویل عرصہ گزر جانے کے بعد واقعات کا اعادہ فضول اور محض درد انگیز ہوگا۔ یہ بدقسمت شخص اس بیوہ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ بدنصیب عورت نے اپنا تمام اندوختۂ حیات اُس کی پرورش پر صرف کردیا، مگر جب وہ جوان ہوا تو گناہ کی رنگینیاں اُس کو اپنی سرکش موجوں میں بہا لے گئیں۔ بدبخت ماں نے خوشامدوں سے التجاؤں سے اُس کو باز رکھنے کی کوشش کی۔ مگر نوجوان بغیر سنے بغیر دیکھے بغیر سوچے ذلت کے عمیق ترین گڑھوں میں گرتا گیا نیچے ـــــ نیچے ـــــ اور نیچے یہاں تک کہ قانون نے ایک سنگین جرم میں اُسے سزائے

موت کا حکم سنایا۔ ایک شریک مجرم بوجہ عدم ثبوت رہا ہوگیا اور یہ جانہار پھانسی کے تختے پر لٹکا دیا گیا۔

یہ سب کچھ ہُوا مگر ماں کی بے پایاں محبت نے اُس کو یہ یقین نہ کرنے دیا کہ اُس کا بیٹا بھی مر سکتا ہے۔ اِس خیال سے کہ شاید پھانسی پر لٹک جانے کے بعد بھی اُس میں زندگی کا کوئی شائبہ رہ جائے، یا شاید وہ کہنہ مشق ڈاکٹر جو اس بات کے ذمہ دار ہوتے ہیں کہ کوئی شخص پھانسی کے تختے سے زندہ نہ جائے دھوکا کھا جائیں وہ تاریک اور سرد رات میں بھیگتی ہوئی میرے دروازے تک آئی اور اس دلخراش حقیقت کو چھپاتے ہوئے مجھے قدرت کے اُس اٹل قانون "موت" کا مقابلہ کرنے کے لئے اپنے مردہ بیٹے کے بستر تک لے گئی۔

آہ! بدنصیب فریب خوردۂ محبت ماں!

خادم بٹالوی

محبّت

ہماری حیاتِ مستعار کا پاکیزہ ترین وہ لمحہ ہے جب ہم نے پہلے پہل محبت کو محسوس کیا، جب گوشِ دل سے اُس کے ریشمیں پردوں کی پھڑپھڑاہٹ سنی، جب ہم نے سنی بڑھتی ہوئی سانس اور صدا اُس ہولئے تیزی کی جو ہماری روح پر تسلّط کرنے کو تھی، اُس کو پاکیزہ بنانے کے لئے یا تباہ و برباد کرنے کے لئے ——— لانگ فیلو

محبت کے مسرور اثر کی قوت سے ہم طعن و تشنیع اور زجر و توبیخ کے دلخراش حملات سہار سکتے ہیں، خواہشات کی گرم جولانی کو روک سکتے ہیں، جامِ مصائب کے کڑوے گھونٹ کو شیریں بنا سکتے ہیں اور اُن راحت کے لطیف و حسین ترین پھولوں کو جو ہماری زندگی کی کٹھن اور کانٹوں بھری راہوں پر بکھرے پڑے ہیں چن سکتے ہیں ——— زرمین

محبت دل کو پراگندہ اور آلودہ خیالات سے خالی کرتے ہوئے پُرتقدیس و پُرتنویر بناتی ہے، الائے حیات کو تزئینِ شرف بخشتی ہے، زندگی کی ہر ہر حرکت کو عالی ہمتی اور شرافت و نجابت سے درخشاں کرتی ہے، ہر عورت اور مرد پر احترام جرات اور قوت کے پھول نثار کرتی ہے! وہ بہترین تحفہ جس سے بنی نوعِ انسان مشرف ہوا ہے۔ نیں دل اور جان نثاری سے محبت کرنے کے سوا اور کچھ بھی نہیں! محبت مقدس آگ ہے اسے بتوں کے سامنے روشن کرنا اس کی تحقیر کرنا ہے! ———

مس جیوسبری

ایمن

تجلّیات

عشق و جنوں پرست ہوں بادہ کشِ الست ہوں ۔۔۔ میکدۂ ازل کا ایک رندِ سیاہ مست ہوں
سجدے کے واسطے مرے گردنِ آسماں ہے خم ۔۔۔ تیری رہِ نیاز میں ایک گدائے پست ہوں
زاہدِ کم نظر نہ کچھ اس کے سوا سمجھ سکا ۔۔۔ کافرِ بت پرست ہوں جام و سبو بدست ہوں
تجھ کو خیالِ حور ہے مجھ کو خیالِ طور ہے ۔۔۔ ہاں! تُو خدا پرست ہے ہاں! میں صنم پرست ہوں

چشمِ نجوم میں آثرؔ کوئی نہیں ہے امتیاز
مَیں ہی اسیرِ حلقۂ دامِ بلند و پست ہوں

آثرؔ صہبائی

کشتِ لالہ و گل

یہ داغہائے جگر ہیں کہ کشتِ لالہ و گل ۔۔۔ کھلا ہے دامنِ دل پر بہشتِ لالہ و گل
ہر ایک غنچہ و گل چاک در گریباں ہے ۔۔۔ خرابِ دستِ جنوں ہے سرشتِ لالہ و گل
نہ محو خونِ شہیداں کی یاد ہو جائے ۔۔۔ لگا دو گورِ شہیداں پہ خشتِ لالہ و گل
مراد جو دے اسرار دانِ فطرتِ حسن ۔۔۔ میری نظر میں ہے زیبا و زشتِ لالہ و گل

فسانۂ دلِ خوں گشتہ جفا ہے ظفرؔ
سرِ صحیفۂ قدرت، نوشتِ لالہ و گل

سراج الدین ظفرؔ

کولمبس سے پہلے امریکہ میں عربیت

یہ حقیقت تاریخ کی بالکل واضح حقیقت ہے کہ داخلہ کولمبس سے پہلے امریکہ میں انسانوں کی باقاعدہ آبادی تھی حتیٰ کہ ان میں متعدد فرمانروا بھی تھے، جو اپنی اپنی حدود مملکت میں مستقل طور پر فرمانروائی کرتے تھے۔ اور اُن کا عمران و تمدن بھی زمانہ کے لحاظ سے بہترین تمدن تھا۔ لیکن یہ حقیقت کہ کولمبس سے پہلے عربی لوگ بھی امریکہ میں پہنچے تھے یا نہیں البتہ ایک ایسی حقیقت ہے، جس کی عقدہ کشائی میں بہتیرے ناخنِ فکر بے کار ہو چکے ہیں۔ "جامعہ ہارورڈ" کے مشہور عالم لیونر نے صرف اتنا ثابت کیا ہے کہ ہنودِ امریکہ (جو وہاں کے قدیمی باشندے ہیں) کی زبان میں بعض عربی کلمات پائے جاتے ہیں۔

علامۂ موصوف ۲۶ زبانوں کے ماہر ہیں، آپ نے کئی برسوں میں اُن مسیحی مبلغوں کی کتابوں سے جو اسپین کے مشہور قائد اعظم کورٹز فاتح مکسیک کے زمانہ میں وہاں مصروفِ تبلیغ تھے، ہنودِ امریکہ کی زبان سیکھی، اور اس کاوش کا منشا صرف یہ تھا کہ اُس زبان کے اُن کلمات و تعابیر کا پتہ لگایا جائے جو ازمنۂ غابرہ میں وہاں کے اصلی باشندوں کے ساتھ اجنبی اقوام کے مل جانے کی وجہ سے پیدا ہو گئے تھے۔ تحقیقات کے بعد موصوف کو معلوم ہوا کہ امریکہ کی زبان میں انگریزی اور سپینی، فرانسیسی اور پرتگالی زبان کے بہت سے الفاظ شامل ہیں۔ لیکن مزید تفحص کے بعد یہ حقیقت بھی عالم آشکارا ہوئی کہ ان تمام زبانوں کے علاوہ امریکہ کی اصلی زبان عربی کی بھی بہت کچھ ممنونِ احسان ہے۔ اور سب سے پہلے عربی زبان نے ہی لغتِ امریکہ کو الفاظ کا قرضہ دیا تھا۔ موصوف کا خیال ہے کہ اس زبان میں عربی کلمات سنہ ۱۲۹۰ء میں یعنی کولمبس کی آمد سے دو صدی پہلے داخل ہو چکے تھے اور جن لوگوں کی وساطت سے یہ کلمات وہاں تک پہنچے وہ دو صدی اور پہلے سے وہاں پہنچ چکے تھے۔

علمائے فن نے سجلاتِ قدیمہ کے متعلق جو جدید بحثیں کی ہیں، اُن سے ثابت ہوتا ہے کہ گذشتہ زمانوں میں تجار سفید تجارت کی غرض سے اوقیانوس اٹلنٹک میں بھی برابر جاتے تھے۔ لیکن ان کی یہ آمد و رفت غیروں سے بالکل پوشیدہ اور مخفی ہوتی تھی۔ اسی انداز پر فرانس کے مشہور مقام دیب وردان والے تاجر بھی اپنے اپنے جہاز افریقہ کے مغربی ساحل غانا پر کولمبس سے ۱۰۰ برس پہلے تک بھیجا کرتے تھے، جو وہاں سے مخفی طور پر سونا، ہاتھی دانت، خوشبوئیں، اور قیمتی پتھر وغیرہ لاتے تھے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہیں کے تاجر اپنے اپنے جہازوں کو جنوبی امریکہ میں بھی بھیجتے تھے۔

"دیب" کے متعلق علمائے آثار کی کوششوں سے محقق طور پر یہ معلوم ہوا ہے کہ یہ شہر ولادتِ کولمبس سے چند سال پہلے بھی اسی قسم کی مخفی تجارت کا مرکز تھا۔ اور دیب کی یہ چال سنہ ۱۴۹۲ء تک جاری رہی۔ لیکن اسی سن میں جب فرانس

اور انگلینڈ کے درمیان جنگ چھڑ گئی، تو انگریزوں نے "ڈیب" پر توپوں کے اتنے گولے برسائے کہ ساری ڈیب تاجروں کے تمام مکانات اُن کی ساری کائنات کے ساتھ بھسم ہو گئی۔

مذکراتِ کولمبس میں یہ واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ جب کولمبس انکشافِ امریکہ کی مہم سر کرنے کے لئے جا رہا تھا تو اثنائے راہ میں اسپین کے نامور بہادر نبزون سے ملاقات ہو گئی، جس کو کولمبس نے ایک نعمتِ غیر مترقبہ سمجھ کر اپنا رفیقِ سفر بلکہ رہنما بنا لیا۔ لیکن آگے چل کر دونوں تعینِ سمت میں مختلف ہو گئے۔ نبزون جنوب کی سمت چلنا چاہتا تھا اور کولمبس اس کے خلاف تھا۔ ناچار نبزون نے کولمبس کا ساتھ چھوڑ دیا اور خود تنِ تنہا جنوب کی طرف روانہ ہوا۔ تین ہفتے کے بعد جنوبی ساحل کو پا کر دفعتہً دونوں سیاحوں کی ملاقات ہو گئی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ نبزون کولمبس سے پہلے امریکہ جا چکا تھا، اور کولمبس بھی اس کو اچھی طرح جانتا تھا۔ چنانچہ اسی لئے اُس نے نبزون کو اپنے ہمراہ ایک مرشد اور رہنما کی حیثیت سے لیا بھی تھا۔

کولمبس اپنے تیسرے سفر سے پلٹنے کے بعد بیان کرتا ہے کہ میں نے امریکہ کے شہروں میں بہت سے زنگی دیکھے، اور جن منود (سکانِ امریکہ) سے میں پہلے سفر میں ملا تھا۔ انہوں نے مجھ کو "جوانین" کا ہدیہ بھی دیا تھا (جوانین" اس زمانہ میں تانبا ملے ہوئے سونے کو کہتے تھے جو افریقہ سے لایا جاتا تھا) اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ کولمبس نے امریکہ میں افریقی سونا اور زنگیوں کو دیکھا تھا۔ اس لئے ضروری ہے کہ وہاں پہلے کچھ لوگ ایسے گئے ہوں جن کے ساتھ زنگی زادے اور افریقہ کا خاص سونا بھی رہا ہو۔ کولمبس اپنے ساتھ ترجمانی کے لئے بہت سے ایسے افریقی زنگیوں کو لے گیا تھا جو امریکہ کی زبان سے خوب واقف تھے۔ اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ افریقہ کے زنگی کولمبس کے پہلے امریکہ کو جانتے تھے۔ مزید برآں بعض ماہرینِ فن کا یہ بھی خیال ہے کہ "ازدومایہ" کا قدیم تمدن خالص عربی تمدن تھا۔ اور خود ازدومایہ عربی مستعمرات تھے، "عربی تمدن نویں صدی عیسوی کے اندر افریقہ میں پورے طور سے پھیل چکا تھا۔ اور مغربی افریقہ سے ہوتا ہوا خلیج مکسیک کے کناروں پر "مشواکان" وغیرہ میں بھی اس کا گہرا اثر پڑ چکا تھا۔ اس لئے امریکہ کی قدیم زبان میں جو عربی آثار موجود ہیں، وہ ان تمام مقامات کو واضح طور سے بیان کرتے ہیں۔ ماہرینِ فن کے خیال میں امریکہ کے اندر عربی کلمات پہنچانے والے بربر کے باشندے یا عربی دان افریقی ہیں۔

ابن بطوطہ مشہور اسلامی سیاح ۱۳۲۴ء مطابق ۷۲۵ھ کے سفر میں لکھتا ہے کہ میں نے سارے افریقہ میں عام طور سے عربی زبان کو رائج دیکھا،" ابنِ بطوطہ کا یہ سفر کولمبس کے پہلے سفر سے ۱۵۰ برس قبل کا ہے۔ ان تمام واقعات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ امریکہ میں کولمبس کے بہت پہلے سے عربیت موجود تھی۔

بدر اصلاحی

مُسلم خاتون کی حالتِ زار

کیا چین ملا بزمِ جہاں میں ہمیں آ کے
بس ہم تو ہدف ہو گئے مردوں کی جفا کے

لب پر کبھی آیا ہی نہیں حرفِ تمنّا
بے عقل رہے واقعی حق اپنے گنوا کے

تو جان سے اپنی گئی اے پیکرِ الفت
قائل نہ ہوئے مرد مگر تیری وفا کے

سینے میں لگی کھانا پکانے میں لگی تو
فرصت جو بزرگوں کے ملی پاؤں دبا کے

گھر بھر کی مصیبت کبھی بیمار کی پرسش
کیا چین تو لائی ہے مقدّر میں لکھا کے

کس شوق سے کھاتی ہے تو پس خوردہ سبھی کا
بچ جائے مقدر سے جو گھر بھر کو کھلا کے

جاہل بھی ہے کم عقل بھی ہے مرد کے نزدیک
کب اس کو پسند آتے ہیں آئین حیا کے

اک جانِ حزیں پر تری دنیا کے مصائب
تو اس پہ بجا لاتی ہے سو شکر خدا کے

اک بیوہٗ کم عمر کی دیکھو گے جو حالت
دل تھام کے رہ جاؤ گے گردن کو جھکا کے!

مسّی ہے نہ سرمہ ہے نہ زیور ہے نہ کپڑا
یہ عمر تو قابل نہ تھی اس سخت سزا کے

یہ طرفہ تماشا ہے کہ فرزند بھی زن بھی
دنیا میں جئیں گر تو جئیں اشک بہا کے

پر صاحبِ خانہ کی حمیّت کو تو دیکھو
فرعون بنے بیٹھے ہیں بندے یہ خدا کے

اسلاف کی عظمت تو ہوئی ایک فسانہ
محجوب ہوئے یہ نہ شرافت کو گنوا کے!

اقوامِ جہاں میں یہ گرے سب کی نگہ سے
کیا مرتبہ پائیں گے یہ عورت کو ستا کے

عورت بھی وہ عورت کہ جو ہے پیکرِ عصمت
چلتی ہے ہوا سے بھی جو دامن کو بچا کے

اب خواب سے بیدار ہو اے مسلمہ للّٰہ
اور چاروں طرف دیکھ ذرا آنکھ اٹھا کے

کب تک ہدفِ تیرِ ملامت تو رہے گی
کر حضرتِ باری میں دعا ہاتھ اُٹھا کے

اے مردِ مسلماں ہے اگر دل میں ترے درد
سُن لے مرے نالے کہ یہ نالے ہیں بلا کے

میدانِ ترقی میں نکل اپنی جگہ سے
ہو تیغ بکف جوہرِ اسلام دکھا کے

فاطمہ بیگم

مہماں نوازی

"جے رام جی کی، جے رام جی کی، بھائی صاحب کیسے آنا ہوا؟ کہاں اترے ہو؟ کتنے دن قیام رہے گا؟"

"بھائی صاحب آڑھت کا حساب کرنا ہے، دیکھئے کتنے دن لگتے ہیں۔ آپ کے ہاں ٹکوں گا۔ اگر گنجائش ہو تو آدمی کو کہہ دیں کہ اسباب ٹانگے سے اتار لے۔"

کیا کیفیت میزبان پر گذری کون جان سکتا ہے۔ چہرہ سے تو نمایاں نہ تھی ظرف بڑا تھا دل کی اندرونی کیفیت ظاہر نہیں ہوتی تھی۔ خندہ پیشانی سے کہا۔ ارے بدھو (ملازم) لالہ جی کا اسباب اتار پاس والے کوٹھے میں رکھ اندر کہہ دینا کہ ایک پراہونا آیا ہے۔ کھانے کا انتظام کریں۔ ایک دو چیزیں اور پکا لیں۔ تو بازار سے انبہ خربوزے لے مگر یاد رکھنا، مہنگی دوکان سے نہ لانا۔ مارکیٹ نہ جانا خبردار۔ پیسے منیم جی سے لے لینا۔ آٹھ آنے سے زیادہ مال نہ ہو۔

مہمان نے اشنان دھیان کیا۔ دھیان کچھی کا تھا۔ سرستی کی اپاسنا اُن کا شیوہ نہیں تھا۔ تھالی میں کھانا آیا سبزی ترکاریاں سواد دار بنی ہوئی، اجوائن اور ادرک کی آمیزش تھی۔ دہی میٹھا اور نمکین، دال پتلی اور کڑھی دو قسم کی، پوری کچوری نمکین، چاول اچار مربہ غرض مکلّف و شیشو غذا پروسی گئی۔ مہمان نے ذوق سے کھایا۔ یاد کیا کہ جب میزبان ہمارے ہاں اترا تھا، یہی چیزیں ہمارے ہاں بھی اُس کو ملی تھیں۔ موسم کا میوہ البتہ زیادہ

مہمان کھانا کھا کر بازار تشریف لے لئے۔ حساب کتاب ہوتا رہا۔ اب سنئے کہ میزبان کے ہاں وہ آٹھ دن سے اس خیال سے زیادہ نہ ٹھہرے کہ جب وہ اتفاق سے پھر اُن کے ہاں آئے گا تو دو دن رہ کر ایک دن کے عوض میں حساب پورا کرے گا۔

ایک اور لالہ صاحب اُن کے واقف اسی شہر میں رہتے تھے۔ ایک دن اُن کے ہاں قیام کیا۔ کیونکہ وہ اُن کے شہر میں ایک دن اُن کے ہاں کھانا کھا گئے تھے۔ گویا انہوں نے اس طریق سے حساب بیباق کرا

مہماں نوازی کی یہی تاریخ ہے۔ دیہات میں تو کہاں، بڑے بڑے شہروں میں بھی انگریزوں کے آنے سے قبل ہوٹل نہ ہوتے تھے۔ شہروں میں سرائیں ہوتی تھیں۔ ان میں مسلمانوں کے لئے تو نان بائی ہوا کرتے تھے۔ ہندوؤں کو بازار سے پوری کھانی ہوتی تھی یا کہاروں کے تنور ہوتے تھے مگر وہاں کا کھانا اعلیٰ ذات

کے لوگ نہیں کھاتے تھے اس لئے مہماں نوازی شرفا کے واسطے ضروری ہوگئی تھی۔ البتہ کشمیر میں اب تک بھی رواج ہے کہ کشمیری پنڈت جس گاؤں میں چلا جائے نمسکار کر کے جس کشمیری پنڈت کے گھر ٹھہرنا چاہے خواہ واقف ہو یا نہ ہو اُس کو کھانا اور بسیرا مل جائے گا۔ مسلمانوں میں بسم اللہ کہئے اور دسترخوان پر بیٹھ جائیے محض مومن ہونا کافی ہے۔

بعض ہندو قوموں میں مہماں نوازی بھی حساب کے قاعدہ پر ہے۔ میزبان اور مہمان بعض اوقات اصل کے ساتھ سود وصول کرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ جہاں تک ممکن ہے لین دین کی بیباقی کے مانند دعوت کی بیباقی بھی ہوتی رہتی ہے۔

انگریز لوگ مہمان نوازی ۲۴ گھنٹے تک تو روا رکھتے ہیں۔ بشرطیکہ گھر میں کمرہ فالتو ہو۔ مفہوم ہے کہ ۲۴ گھنٹے کے بعد مہمان کو کسی اَور جگہ قیام اور طعام کا انتظام کرنا ہوگا۔ اب انگریزی زمانہ میں ہندوستان میں جگہ جگہ ہوٹل بن گئے ہیں۔ لفظ ہوٹل کی پوری ماہیت سے ابھی دیسی لوگ واقف نہیں۔ اکثر نام کے ہوٹل ہیں۔ جب جائیے تو قیام کا کوئی انتظام نہیں ہوتا۔ صرف آپ کو بنچ پر بٹھا کر رکابی یا تھالی میں کھانا مل جائے گا ہم کو حیدرآباد میں ایک دفعہ ایسا ہی اتفاق ہوا تھا۔ ہوٹل کے لفظ سے ہم گمراہ ہوگئے تھے۔ حال میں کہیں کہیں ہندو اور مسلم ہوٹل بھی کھلے ہیں۔ جن میں شب باشی کا انتظام ہوا ہے۔ مگر ہم اُن کے تجربہ کی بھی سفارش نہ کریں گے۔ امید رکھنی چاہئے کہ انگریزی ہوٹلوں کی کبھی نہ کبھی پوری تقلید ہوگی اور عوام کو شکایت نہیں رہے گی ضروریاتِ زمانہ خود سکھا دیں گے۔ روز بروز تجارتی کاروبار بڑھتے جاتے ہیں۔ ہوٹلوں کی ضرورت پیش آ رہی ہے۔ مہمان نوازی کی ضرورت کم ہو رہی ہے۔

شمیم

غزلیات

(۱)

اک جلوۂ حق نما کو دیکھا — تم کو دیکھا - خدا کو دیکھا
محشر کی بھی راہ دیکھ لیں گے — تجھ سے صبر آزما کو دیکھا
ہستیٔ عدم نما کے صدقے — چھپتے ہوئے برملا کو دیکھا
دام اُٹھے نہ کیمیائے دل کے — اس جنسِ گراں بہا کو دیکھا
ہم نے بھی خدا سے موت مانگی — ہم نے بھی تری جفا کو دیکھا
ہستی میں بھی شانِ نیستی ہے — موجودِ عدم نما کو دیکھا!
تیری وہی سرگرانیاں ہیں — ہم نے اپنی وفا کو دیکھا

"ہم نے بھی فراقؔ دل بچا کے
اُس ناوکِ بے خطا کو دیکھا

فراقؔ
گورکھپوری

(۲)

ہم آغوشی کو ابھرے ہیں زمیں سے — ترے نقشِ قدم میری جبیں سے
ٹپکتا ہے محبت کی بدولت — ہمارا خوں ہماری آستیں سے
تڑپ پڑھتی گئی قلبِ حزیں کی — شکن مٹتی گئی اُن کی جبیں سے
دیارِ عشق میں ہے ہُو کا عالم — بڑی رونق تھی اک صحرا نشیں سے
ذرا سا لفظ کہہ دیتے تو کیا تھا — یہ سُنتے جی نہ اٹھتے آفریں سے
وہیں سے کوچۂ قاتل کی حد ہے — فغاں ہوتی ہی پیدا جس زمیں سے
اب اُس لیلائے بے محمل کا ہو رو — بدل جا لیلیٔ محمل نشیں سے

جفائیں دیکھ لیں زیبا دکن کی
فلک کیا بڑھ سکے گا اس زمیں سے

نسیـ[illegible]
ردولو[illegible]

(۳)

جونہی سر بر تن سے جدا ہو گیا — حقِ بندگی بھی ا[illegible]
فلک کا ستم یہ نیا ہو گیا — میں پابندِ جور و جف[illegible]
دوائے دلِ دردمنداں فلک — کرے کیا جو اُن کا کہ[illegible]
پرستش ہے در اصل وجہِ کمال — پرستش سے بت بھی خ[illegible]

تبسّم میں پنہاں ہے رازِ بقا
ہنسی گل کو آئی فنا ہو گیا

صو[illegible]

(۴)

آپ کی پردہ داریاں نہ گئیں — میری امیدواریاں نہ گ[illegible]
اُس کے ادراک کی تمنا ہے — عقل کی ہرزہ کاریاں گ[illegible]
دلِ مجروح کو محبت میں [illegible] — چھوڑ کر دل فگاریاں گ[illegible]
چھین لوں گا میں چارہ گر کا قرار — جو مری بے قراریاں نہ گ[illegible]
شبِ غم ہو گئی وداع مگر — درد کی غمگساریاں نہ گ[illegible]
میرے ماتم میں صبحِ محشر تک — رات کی سوگواریاں نہ گ[illegible]

کوششیں کیں ہزار صحرائی
تھیں جو قسمت میں خواریاں نہ گئیں

[illegible]

محفلِ ادب

پشتو ادب

جیساکہ دانتے وغیرہ نے اطالیہ کی ادبیات کو جب کہ وہ ملک معرضِ زوال میں تھا چار چاند لگا دیئے تھے افغانوں کے شعروسخن نے مغلوں کے زمانے میں بڑی آب وتاب دکھائی۔ واضح رہے کہ جتنی قوت مغلوں کی جنوبی محاربات میں صرف ہوئی اُس سے زیادہ شمال میں کام آئی۔ صرف اکبر کے عہد میں زین خاں اور ٹوڈرمل کے سمیت میں ہزار سپاہ کو افغانوں نے تلف کیا۔ اورنگ زیب کے وقت افغان بارے ہاتے گویا آرام سے بیٹھے کہ شغل سے نوب ... راغب ہوں۔

ارسطو نے قفس میں پرندوں کی نغمہ سرائی کو غمگینی پر مبنی نہیں سمجھا جیسا عام خیال تھا اور اس دلیل پر اس کی تردید کی کہ اگر مرغ کے زخم لگا ہو تو چہچہانے سے قاصر ہوتا ہے۔ ابنِ عربی نے عذاب الیم کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ بندگانِ خاص کو مصیبت میں ایک عذوبت یعنی شیرینی حاصل ہوتی ہے جس میں درد ہوتا ہے اور وہ ایک لذت لئے ہوتا ہے۔ ہمارے ایک دہقان نے کہا کہ مزہ جب ہے کہ آدمی کھیت میں بیٹھا ہو نم نم مینہ برستا ہو اور نرم نرم تپ بھی چڑھی ہو۔ مجددِالفِ ثانی محی الدین عربی کی ذات کو مقبول اور اُن کے کلام کو مردود کہنے میں اگر کوئی اس دہقان کی بات کو فضول سمجھے تو تعجب نہیں

ع فکرِ ہر کس بقدرِ ہمتِ اوست۔

عاشق کو فراق میں رنج کے ساتھ البتہ ایک لطف بھی حاصل ہوتا ہے اور جدائی کا غم تو لازمۂ شاعری ہے جو وصل میں بھی اُس کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ ایک افغان کہتا ہے :-

دوصال پہ چینی مرمہ وچی شنڈی — دفراق لہ اندیشنے لہ تاب وتب

وصال کے چشمے پر خشک لب مر رہا ہوں — فراق کے اندیشے کی تب وتاب سے

ایک افغان فارسی میں کہتا ہے :-

ماتم وسوزِ جہاں بس کہ بہم آمیز ست — خندۂ قہقہہ ہم اشک ندامت ریز است

مرج البحرین ھذا عذب فرات وھذا ملح اجاج وبینھما برزخ دو بحر میٹھے اور تازہ اور کھاری اور کڑوے مل رہے ہیں اور اُن کے درمیان فاصلہ ہے۔ اس کی ایک تفسیر یہی دکھ اور سکھ ہے بلکہ الٓمٓ کے حروفِ مقطعہ بھی الم کی

تائید و تشدید میں شاید علیحدہ علیحدہ پڑھے جاتے ہوں۔ غرض یہ ہے کہ جیسے خنسا رنے غم وہم کے محرم میں مرثیے کہہ کر نابغہ کا مقابلہ کیا بعض قومیں بھی آزادی کھو کر اس کی تعزیت میں سرور سے گاتی ہیں۔

ہندوستان کے افغانوں نے بہت سے دیوان پشتو میں لکھے۔ عجائب اللغات یہیں تالیف ہوئی جو پشتو کی بڑی ضخیم کتاب ہے۔ سرحد میں تفسیرِ معالم کا ترجمہ ہوا یہاں تک کہ انجیل بھی پشتو میں منتقل ہوئی۔ مغلوں کی سلطنت میں رشید البیان وغیرہ فقہ کی کتابیں لکھی گئیں جو پشتون عورتیں تک پڑھتی ہیں اور بڑے بڑے افغانی شعرا تو تقریباً سب اسی عہد میں ہوئے۔ خوشحال خاں جو خٹک افغانوں کا سردار تھا ایک عمدہ گھوڑا اورنگ زیب کو نہ دینے کی وجہ سے قید میں ڈال دیا گیا، جہاں اس کو اذیت پہنچائی گئی مگر اُس نے گھوڑا دینا منظور نہ کیا آخر ایک تند خو اور کج طبع آدمی کو اس کا رفیقِ قید بنایا تو ناچار ہو کر بادشاہی خواہش کو پورا کیا۔ اس مصیبت میں اس نے ایک قصیدہ لکھا جس میں اپنے مختلف خیالات کا اظہار کرتا ہے۔

ماوچہ د مغل پہ نوکرئ کښ — رکیبونہ کړم د سرو د سپینو نال

ناحق زنجیرونہ را پہ پښو کړل — واہ واہ ھسے نوازش ھسے آمال

(میں نے کہا کہ مغل کی نوکری میں رکابیں سونے کی اور نعلیں چاندی کی بناؤں گا۔ ناحق زنجیریں میرے پاؤں میں ڈال دیں۔ واہ واہ ایسی نوازش اور ایسی امیدیں) پھر اپنی قوم کو مغلوں سے استغنا برتنے کی ہدایت کرتا ہے۔

پښتانہ لرہ شړئ اندیری بس دئی — نہ غواړو د مغلو مجری شال

(افغانوں کے لئے اُن کے اپنے دیسی کپڑے کافی ہیں مغلوں کی مجری شال ہم نہیں چاہتے) پھر اپنے رنج کے ختم ہونے کی دلیل پیدا کرتا ہے۔

پس لہ ژمی راذی پشکال

(جاڑوں کے بعد بہار آتی ہے) اپنے وطن میں پہنچ کر ہمیشہ افغانوں کو متحد کرنے کی کوشش کرنے، ضمناً مغلوں سے آزاد رہنے کی ترغیب دیتا رہا۔

ترمنصب پورے خوشحال خٹک نوکر و — چہ منصب ورعنی لاړ نشہ اُس بادشاہ دئی

(منصب تک خوشحال خٹک نوکر تھا۔ جب منصب اُس سے جاتا رہا تو اب بادشاہ ہے)

چہ تنخواہ مد مغل خوړ یو ملک وم — چہ تنخواہ اس نشتہ ملک یم

(جب مغل کی تنخواہ کھاتا تھا تو ایک ملک تھا، جب تنخواہ نہیں ہے تو اب ملک ہوں)

خوشحال خاں نے مختلف اقسام کی نظموں کے علاوہ نثر میں بھی فضیلت دکھائی ہے۔ تاریخ مرصع میں جو پشتو کی ایک عمدہ تصنیف ہے ایسے واقعات درج ہیں جو معاصر فارسی اور انگریزی کتابوں میں نہیں پائے جاتے۔ اس کی اولاد میں مدتوں شعرا ہوتے رہے جن میں سے ایک شیدا ہے جو اقارب کے عقارب ہونے کی ضرب المثل کو یوں بیان کرتا ہے۔

د دریاب له سرد جوشی دحباب زړه چوی   شیدا قطع د امید بویه له خپلو

(دریا کی سرد جوشی سے حباب کا دل پھٹا جاتا ہے۔ شیدا اپنوں سے قطعِ امید کر لینی چاہئے) اس کی ایک دو بیتیں لکھی جاتی ہیں جو مجھے یاد رہ گئیں کیونکہ سب مضمون حافظے ہی کی مدد سے تحریر کر رہا ہوں۔ ورنہ اس سے بہتر مثالیں موجود ہیں:۔

ستا په سپین تندے اے جانان د اشین خال دئ   یا د سحرو اذان نه ولاړ بلال دئ

(تیری سفید پیشانی پر اے جاناں یہ سبز خال ہے یا فجر کی اذان کے لئے بلال کھڑا ہے؟)

که چا په دنیا کښ جنت نه وی لیدلے   بلا تشبیه دا یو خوند ستا د وصال دئ

اگر دنیا میں کسی نے بہشت نہیں دیکھا بلا تشبیہ یہ تیرے وصال کا ایک مزہ ہے)

خوشحال خاں کو بجا طور پر پشتو کا شیکسپیئر، رحمٰن کو حافظ اور حمید کو سعدی کہتے ہیں اور تینوں فی الحقیقت بہت بلند رتبہ رکھتے ہیں۔ حمید نے گلستاں، بوستاں اور انوارِ سہیلی وغیرہ کا پشتو میں نظم کا نظم میں اور نثر کا نثر میں ترجمہ کیا اس کا دیوان بھی اخلاقی نصائح اور نفائس سے مملو ہے ایک جگہ کہتا ہے۔

ناز ولے زوے نه اخلی ادب   او د سورے نخل نه نیسی رطب

(نازنین بچہ ادب حاصل نہیں کرتا اور سائے کی کھجور میں پھل نہیں لگتا)

رحمٰن روحانی امور کے علاوہ اپنے زمانے کے وقائع کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے:۔

اورنگ زیب هم یو فقیر وو   یو ټوپی لے وو په سر

(اورنگ زیب بھی ایک فقیر تھا جس کے سر پر ٹوپی تھی) چه لاس لے وو رسیده خراب کړ دخورم ټول ټبر جب ہاتھ پہنچا تو خورم کا سارا گھرانہ برباد کر دیا) باوجود اس کے عالمگیر کی وفات کو غروب آفتاب سے تشبیہ دے کر اندیشہ ظاہر کرتا ہے کہ اس اندھیرے میں دیکھئے کیا حوادث پیش آتے ہیں۔ حافظ کے دیوان کی طرح افغان اس میں فال دیکھتے ہیں۔ جب کابل کے محبس میں پڑا تو ایک معزز آدمی کسی خاندانی لڑائی کے سبب قید میں

آیا۔ جب امیر حبیب اللہ مقتول نے اسے دربار میں بلایا تو جانے سے پہلے اُس نے مجھ سے دیوانِ رحمٰن سے فال دیکھنے کی فرمائش کی جو عجیب برمحل نکلی۔

فال بہ خہ گورے رحمٰن ــــــ دھر سڑے اعمال خپل فال شی

(رحمٰن فال کیا دیکھتے ہو ہر شخص کے اعمال اُس کی فال ہونگے) چنانچہ اس کے کردار کے مطابق فیصلہ ہوا۔

یہ تو مجمل حال ہے کابل اور پشاور کے درمیان کے شعرا کا۔ قندھار میں بھی لطیف الطبع شاعر اور ادیب گذرے ہیں۔ ایک عبد آخوند بڑا عالم تھا جس نے اصولِ فقہ پر کتاب لکھی اور مقاماتِ حریری کی شرح تالیف کی۔ اپنے پوتے پر معمّا کہا ہے:۔

کہ لاس پورے مخ بہ گلبدن کښی ــــــ لہ غیرت خال پریوزی پہ لمن کښی

(اگر گلبدن کے منہ پر ہاتھ پھیریں تو غیرت سے خال دامن میں گر پڑے) افغان بچوں کے منہ پر خال سرمے سے بناتے تھے جو سیاہی کا نقطہ معلوم ہوتا تھا۔ مخ منہ کو کہتے ہیں اگر اس کو ہاتھ یعنی ید لگایا جائے تو مخید ہو جاتا ہے اگر خال یعنی نقطہ دامن میں نیچے آپڑے تو مجید ہو جاتا ہے جو اس کا نام تھا)

امیر عبدالرحمٰن خاں کا سپہ سالار سدو خاں حوتک کہتا ہے:۔

دعاشقی پہ کور کښی لږ غوندے دسترس لرم ــــــ چہ جان پہ خپل جانان قربان کړم دھغہ وس لرم

(عاشقی کے گھر میں تھوڑی سی دسترس رکھتا ہوں کہ جان اپنے جاناں پر قربان کروں یہ میرے بس میں ہے)

تیغِ ابرو کو کس طرح نبا ہا ہے:۔

ستاد سترگی او بہ داسے نہ دی ــــــ چہ غیر لہ سر پہ سرلری حباب

(تیری آنکھوں کا پانی ایسا نہیں ہے کہ سر کے سوا اس کے سر پر یعنی سطح پر اور کوئی حباب ہو)

شرقِ قدیم کی بلندیٔ مضمون ملاحظہ ہو۔

ستا دمخ مگرم لمر نہ دیٔ ناجوړ ــــــ چہ مسیحی وعلاج تہ سفری ولاړ

(تیرے منہ کی وجہ سے کہیں سورج بیمار تو نہیں کہ مسیحا علاج کے لئے سفر پر گیا ہے)

چہ تاسئے لہ تاسرہ دیوسف حسن ــــــ ترازو پسے واسماں تہ مشتری ولاړ

(تا کہ تیرے ساتھ یوسف کے حسن کو تولے ــــــ ترازو کے پیچھے آسمان پر مشتری گیا ہے)

افغانوں کے ملّی اشعار جنہیں بدلی یا لنڈی کہتے ہیں یعنی چھوٹی ابیات اکثر جوانوں کو ہزاروں یاد ہوتے ہیں۔

اور ایسی آواز سے گاتے ہیں جو اونچے پہاڑوں سے ٹکرا کر دور تک گونجتی ہے۔

پہ تورتوپک وشتلے شہ سپے ــــ د نامردی احوال دمرازہ مسینہ

(سیاہ بندوق سے تیرا مارا جانا بہتر ہے اے محبوب تیری نامردی کی خبر مجھے نہ پہنچے)

جدت طرازی بھی اکثر پائی جاتی ہے۔

سترگی دڈکے تپانچے دی ــــ غریب سری پہ لاڑ تلم ودوشتمہ

(تیری آنکھیں بھرے پستول ہیں۔ مجھ غریب آدمی کو راہ جاتے مار دیا)

د کافرگل پہ شان کازہ سوے ــــ چہ راسمیزے روز بہ نیمہ تیروی نہ

(کافرگل کی شان پر ٹیڑھی ہوگئی ہو۔ جب سیدھی ہوگی تو آدھا دن گذرا ہوگا) شان مانند کو بھی کہتے ہیں اور آدھا دن گذرنا پشتو میں آدھی عمر بسر ہونے کے مساوی ہے۔ کافرگل سورج مکھی کو کہتے ہیں کیونکہ ایک بڑی چیز کو قلب موضوع سے کافرت تعبیر کرتے ہیں حتیٰ کہ ایک نیک شخص دعا کرتا ہے کہ خدا مجھے اتنا مال واختیار دے کہ ایک کافر مسجد بناؤں اور ایک کافر ملا کو وہاں رکھوں۔ اسی طرح محاورہ ہے زشت یا بدشہ سڑہ دئی۔ زشت یا بد اچھا آدمی ہے یعنی نہایت خوب آدمی ہے۔ یہ انگریزی کے آفل وغیرہ الفاظ سے مشابہ ہے)

تجنیس کے علاوہ اس فرد میں عالی دماغی قابل داد ہے

سر شما سر کوزی ندمنی د تاج ــــ بارے تاج دی خما و سر و نہ محتاج

میرا سر تاج کی سرنگونی کو نہیں مانتا ــــ بارے تاج میرے سرو کا محتاج ہے

تاج پہننے کے وقت جو سر جھکانا پڑتا ہے یا اُس کو پہن کر جو سر خم رکھنا پڑتا ہے میرا سر اسے قبول نہیں کرتا۔ میرے سرو قد کا خود تاج محتاج ہے۔

"اردو"

مجنوں کا نعرۂ مستانہ

محبّت کی فسوں کاری سے کلیاں مسکراتی ہیں ــــ فضائیں جگمگاتی ہیں ہوائیں گیت گاتی ہیں

محبّت دامنِ کہسار کو گلشن بناتی ہے ــــ محبت پتھروں سے دودھ کے دریا بہاتی ہے

یہ شعلہ موجزن ہے میرے دل میں آرزو بن کر ــــ رگوں میں دوڑتی پھرتی ہے یہ صہبا لہو بن کر

مری فریاد سے پھول اور غنچے تھرتھراتے ہیں
مری فریاد سے پتھر لرز کر ٹوٹ جاتے ہیں

مرے نغمے دلوں میں شمع بن کر جگمگاتے ہیں
حرم سے وہ غزالانِ حرم کو کھینچ لاتے ہیں

چلے آتے ہیں وحشی جانور آرام گاہوں سے
عیاں ہے ایک رنگِ بیخودی جن کی نگاہوں سے

پلنگ و شیر و آہو جمع ہیں باغِ محبت میں
محبت کا تصرف دیکھ لو اسرارِ فطرت میں

جہاں میں ہوں وہاں قانونِ فطرت ٹوٹ جاتا ہے
یہاں وحشی درندہ آہوؤں سے خوف کھاتا ہے

یہاں ذرّوں میں روحِ زندگی بیدار ہوتی ہے
یہاں ہر چیز کیفِ عشق سے سرشار ہوتی ہے

عابدؔ
"ادبی دنیا"

بیوہ کا گیت

شروع شروع زندگی میں ایک مزہ تھا۔
ایک امنگ تھی، ایک ڈھارس تھی۔
یہ کہ جوانی میں یونہی ہوتا ہے۔
ان دنوں کیا معلوم ہوتا۔
نہ معلوم تھا کہ زندگی کیا چیز ہے،
اور دفعتاً زندگی یہ ہوگئی۔
کہ سال آیا اور سال گیا۔
نہ اس میں مزا رہا، نہ تغیر نہ تحیر،
جیسے کوئی بیچ سے دو ٹکڑے کر دے۔
اس میں نہ اُس کی خطا تھی نہ میری،
ہم دونوں صابر تھے اور صبر بھی کرتے رہے،
لیکن موت کو صبر نہیں۔
میں نے اُس کو آتے دیکھا کیا ہی برا آنا تھا اُس کا آنا
اور میں اُس کو تکتی رہی اور وہ سمیٹتی گئی، سمیٹتی گئی

کچھ میری تھوڑی ہی تھی، میری!
پھر تھا کیا میرا؟ میری، میرا؟
کیا میرا سوگ تک مانگے کا نہ تھا۔
قسمت کا دیا قرض؟
تقدیر نصیب ہی نہیں لیتی
دل کا رنج اور جگر کے نالے تک لوٹ لیتی ہے۔
اور پھر اجڑے کھنڈل کو گدڑی کے داموں خرید لیتی ہے۔
ہاں! تقدیر آئی اور ایک نہیں کے بدلے سب کچھ لے گئی
میرے چہرے کی ہر ہر بات،
میری چال، ڈھال،
سب،
جیسے روز کے روز کا نیلام،
اور جب کچھ نہ رہا تب اپنے حالوں چھوڑ دیا .....
خالی ہاتھ کھڑی ہوں۔

"جامعہ"

نئی کتابیں

مصطفائی کمال مولفہ حاجی محمد موسیٰ خاں صاحب رئیس دتاولی ضلع علی گڈھ - اس میں محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت سے ۵ ہجری تک کے حالات میں سے ایسے واقعات کی خوشہ چینی کی گئی ہے جن کا تعلق انسان کی مذہبی اخلاقی اور انتظامی اصلاح سے ہے اور آپ کے ایسے بعض اقوال اور افعال پر روشنی ڈالی گئی ہے جس سے اسلامی خلافت کی جھلک نمودار ہو جاتی ہے اور معلوم ہو جاتا ہے کہ اسلام کے احکام کس درجہ مکمل اور مستحکم ہیں - حجم ۳۵۰ صفحات سے زائد، کتابت طباعت اور کاغذ عمدہ - قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے -

یادگارِ عشق - حضرت شاہ رکن الدین صاحب عشق دہلوی ابو العلائی عظیم آبادی کے حالاتِ زندگی خصوصیاتِ شاعری اور انتخابِ کلام کا ایک دلنواز مجموعہ ہے جسے مولوی سید حسن رضا صاحب ثاقب عظیم آبادی نے مرتب کیا ہے - عشق گزشتہ صدی کے ایک بلند پایہ نغز گو شاعر اور درویش تھے اور اُن کا کلام خواجہ میر درد کی طرح تصوف اور معرفت سے پُر ہے - حجم ۱۶۰ صفحات، قیمت ایک روپیہ چار آنے - پتہ، مولوی سید حسن رضا صاحب مدرسِ عربی، پٹنہ سٹی سکول، پٹنہ

تابشِ خیال - حضرتِ افسر صدیقی امروہوی کی اُن غزلیات کا مجموعہ ہے جو انہوں نے ۱۹۲۴ء سے ۱۹۲۹ء تک لکھیں - ابتدا میں مولوی اسرار احمد صاحب کریوی فاضلِ ادب و الہیات کا مفصل و مبسوط مقدمہ ہے - جناب افسر کے کلام کے متعلق ہمیں صاحبِ مقدمہ کی رائے سے اتفاق ہے کہ وہ دلکش سادہ تصنع اور آورد سے بری اور ایک حد تک قدیم ایشیائی شاعری کا نمونہ ہے" حجم ۱۲۷ صفحات - لکھائی، چھپائی اور کاغذ عمدہ - قیمت ایک روپیہ - جنابِ مصنف سے رام سوامی، کراچی کے پتہ سے منگائیے -

شہریت - مصنفہ شیخ عطاء اللہ صاحب پروفیسر مرے کالج، سیالکوٹ - یہ کتاب شہریوں کے حقوق اور اُن کی ذمہ داریوں کے متعلق لکھی گئی ہے، اور اس میں حکومت کے نظام اور اُس کے طریقِ کار کو نہایت آسان اور جامع انداز میں بیان کیا گیا ہے - ہندوستان کو اچھے شہری پیدا کرنے کے لئے ایسی کتابوں کی اشد ضرورت ہے اور ہمارا خیال ہے کہ شہریت سے واقفیت پیدا کرنے کے لئے اس سے بہتر کتاب اب تک اردو میں شائع نہیں ہوئی حجم ۲۱۶ صفحات قیمت درج نہیں - میسرز عطر چند کپور اینڈ سنز تاجرانِ کتب انارکلی لاہور سے طلب فرمائیے -

رئیل ایگزسٹنس - مصنفہ ایس ایم یونس صاحب جوہر عظیم آبادی - چالیس صفحے کی ایک چھوٹی سی کتاب ہے جس کے دو حصے ہیں پہلے حصے میں ایک صوفیانہ نظم کوئل اور اس کا انگریزی ترجمہ دیا ہے اور دوسرے حصے میں فاضل مصنف کے ۳۰ اقوال درج ہیں۔ قیمت ایک روپیہ مقرر کی ہے۔ ایم کے جعفری صاحب، لینگویج بیورو، نمبر ا جبلی روڈ، انٹالی کلکتہ سے طلب فرمائیے۔

النجمۃ السّائرہ - یہ عروض کی عربی کتاب محیط الدائرہ کا اردو ترجمہ ہے۔ اصل کتاب کی عربی عبارت بھی ساتھ دی گئی ہے۔ ترجمہ بہت اچھا ہے حجم ۱۸۴ صفحات قیمت ایک روپیہ - پتہ - انجمن موبد الاسلام، مدرسۃ الواعظین لکھنؤ۔

سلطانہ ڈائری - خواتین کے لئے حساب خانہ داری کی کتاب ہے جس میں ریل اور ڈاک کے معلومات، اوزان اور پیمانوں کے نقشے، اور خانہ داری کے متعلق مفید اور کار آمد باتیں بھی درج ہیں۔ قیمت مجلد ۲/۸ بے جلد دو روپے۔ ملنے کا پتہ سلطانہ بیگم صاحبہ مالکہ خاتون وے بی سٹورز، چاندنی چوک، نزد فتح پوری، دہلی۔

محمود اور فردوسی مصنفہ قاضی ظہور الحسن صاحب ناظم - اس میں شاہنامہ کے متعلق محمود اور فردوسی کے مشہور معاملے کی تردید کی گئی ہے - حجم ۴۰ صفحے، قیمت چار آنے - پتہ، مولوی فیض الدین صاحب وکیل محلہ عابد شاپ حیدر آباد (دکن)

اردو انقلابی قاعدہ، مرتبہ منشی اکبر علی صاحب بی اے، بی ٹی سابق ایجوکیشنل سکرٹری ریاست منگرول قیمت چھ پیسے پتہ، نمبر ۲۴ لیک سکوائر، نئی دہلی۔

اسلامی محمدی تقویم - بڑی تقطیع کے ۸۰ صفحات پر ۱۳۴۹ھ ہجری کی جنتری ہے جو بہت سے مفید معلومات سے پر ہے نہایت خوبصورت چھپی ہے - پتہ، علی بھائی و شرف علی صاحبان تاجران کتب بھنڈی بازار، بمبئی نمبر ۹

"خیالستان" یہ ماہوار رسالہ حضرت اختر شیرانی اور جناب لطیفی بی اے کی ادارت میں ماہ اپریل سے شائع ہونا شروع ہوا ہے۔ ہمارے سامنے اس کا دوسرا نمبر ہے جو ظاہری و معنوی محاسن سے مالامال ہے۔ لکھائی چھپائی عمدہ ہے، کاغذ انٹیک استعمال کیا گیا ہے تصویریں سات ہیں اور مضامین ۱۰۴ صفحات پر مشتمل ہیں "خیالستان" کی بزم میں ہندوستان کے بڑے بڑے ادبا جمع نظر آتے ہیں - پروفیسر محمد اقبال صاحب ایم اے، پی ایچ ڈی کا مضمون "تاریخ رزمیات ایران"، سید غلام بھیک صاحب نیرنگ کی نظم "نازنین مغرب"، سید سلطان حیدر صاحب جوش کا افسانہ "خوبصورت دھوکا" اور اختر صاحب کے تقریباً تمام مضامین نظم و نثر خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ہمیں مسرت ہے کہ لاہور سے ایک ایسے اچھے پرچے کا اجرا عمل میں آیا، اور ہم قابل مدیروں کو اس کامیابی پر مبارک باد دیتے ہیں۔ سالانہ چندہ پانچ روپے ہے۔ پتہ، دفتر "خیالستان" ۸ فلیمنگ روڈ، لاہور

خوشخبری صرف ایکماہ کیلئے

ناظرین کے اصرار پر امسال پھر کارخانہ جنرل سپلائی سٹور نے اپنی مطبوعات نصف قیمت پر فروخت کرنے کا اعلان شائع کیا ہے
براہ کرم اس فہرست کو خود پڑھنے کے بعد اپنے حلقہ احباب میں بھی پہنچادیں۔ علم سب سے بڑی دولت ہے اس کے
ذریعہ سے آپ دنیا پر حکومت کر سکتے ہیں۔ اس کو حاصل کرنے کی کوشش کیجئے۔ ہندوستان کی روزافزوں بیکاری صرف
حصول علم سے ہی دور ہو سکتی ہے۔ ادبیات کو چھوڑ کر صنعت وحرفت کی طرف اور زراعت کی طرف توجہ کیجئے۔

نصف قیمت کے علاوہ دیگر شاندار رعائتیں

دس روپے اصل اور **پانچ روپے** نصف قیمت کے خریدار کو **سعید و فلپانہ** ایک نہایت دلچسپ تاریخی ناول مفت دیا جائے گا۔

بیس روپے اصل اور **دس روپے** نصف قیمت کے خریدار کو **تین روپے** اصل قیمت کے کوئی ناول مندرجہ فہرست مفت دیئے جائینگے

چالیس روپے اصل اور **بیس روپے** نصف قیمت کے خریدار کو محصول ڈاک معاف کر دیا جائیگا۔ ایک روپیہ سے کم کا وی پی ارسال نہیں کیا جائے گا۔ کیونکہ اس صورت میں محصولڈاک زیادہ خرچ آجاتا ہے۔ اس فہرست میں تمام اصل قیمتیں درج ہیں۔

المشتہر مینیجر جنرل سپلائی سٹور لاہور

صرف یہ کتاب نصف قیمت پر نہیں دیجا سکتی

خزائن الادویہ ہندی۔ یونانی۔ ویدک اور انگریزی مفرد ادویات کا قاموس آٹھ جلدوں میں حجم ۴ ہزار بڑے صفحے
مفردادویات کی شناخت خواص صفات۔ بدل خوراک فوائد نسخے متعلق مفصل حالات
عربی انگریزی ہندی سنسکرت کی کتابوں سے بڑی دیدہ ریزی سے جمع کئے
گئے ہیں۔ اس کتاب کی پوری تعریف اس مختصر اشتہار میں نہیں ہو سکتی [illegible]

منشی عبدالغفور صاحب مدرو کے مشہور و معروف ناول

فعر دریا حیرت انگیز مناظر کا پے درپے آنا۔ مجرموں کا نہایت چالاکی سے کامیاب ہونا اور آخر پرکالہ آتش سراغرساں کا بھانڈا پھوڑنا۔ حجم ۔ صفحہ قیمت ...

حق بحق دار۔ ایک لڑکی کو کئی کروڑ پونڈ کا ورثہ ایک سراغرساں کی مدد سے کامیاب ہونا۔ قیمت تین روپے (ع)

سرگذشت رینالڈس کے مشہور ناول میری پرائس کا سلیس ترجمہ ایک خادمہ کی آپ بیتی کہانی چار حصوں میں جب تک ختم نہ کر لیا جائے دل چھوڑنے کو دل نہیں چاہتا حصہ اول ۱۲؍ دوم ۱۲؍ سوم ۱۲؍ چہارم ۱۲؍

تماشہ گاہ عالم ہندوستانی زندگی کا ایک نہایت دلچسپ مرقع قیمت ۱۲؍

داستان چہل وزیر۔ ترکی زبان کی الف لیلہ۔ ایک بادشاہ کو چالیس روز تک اس کی بیوی اپنے سوتیلے بیٹے کے خلاف ایک نئی کہانی سنا کر اس کو قتل کرا دینے کی خواہاں ہوتی ہے۔ دوسری صبح اس کا وزیر بادشاہ کو عورتوں کے مکر و فریب کا قصہ بیان کرکے بیٹے کا قصور معاف کرا دیتا ہے غرضیکہ اس کتاب میں الف لیلہ سے بھی دلچسپ اسی کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ جو ترکی سے ترجمہ کیا گیا ہے۔ قیمت ایک روپیہ بارہ آنہ (۱۲؍)

قدیم لنڈن کے اسرار رینالڈ کے مشہور ناول مسٹریز آف اولڈ لنڈن کا ترجمہ دو حصوں میں قیمت ہر دو حصہ ۸؍

غبارہ میں پانچ ہفتے انگلستان کے مشہور مصنف جولیس ورن کے مشہور ناول فائیو ویکس ان دی ایرو پلین کا ترجمہ۔ یہ ناول اس وقت لکھا گیا تھا جبکہ ہوائی جہاز ایجاد نہ ہوا تھا۔ اور جو خیالات اس وقت ہوائی جہازوں کے متعلق ظاہر کئے گئے تھے۔ وہ اس وقت ثابت ہو رہے ہیں۔ قیمت ایک روپیہ (عہ)

دلفگار ایک حسین لڑکی کی دردبھری کہانی شروع سے اخیر تک نہایت ہی سبق آموز اور عبرتناک نصائح سے پُر ہے۔ قیمت ۸؍

چلتا پرزہ خفیہ پولیس کے ایک ہوشیار سراغرساں کی حیرت انگیز کارروائیوں کی بدولت ایک لڑکی کی جان کا بچنا۔ قیمت عہ

موتیوں کا جزیرہ۔ مشہور فرانسیسی ناولسٹ سر الیگزینڈر کے ناول کونٹ آف دی مانٹی کرسٹو کا اردو ترجمہ قیمت مکمل عا

محبت کا فلسفہ اس ناول میں سید محمد امین آفندی ایک ترکی مصنف نے محبت کے فلسفہ پر روشنی ڈالی ہے۔ قیمت ۱۲؍

مفتاح التفتیش یا وار برٹن نامہ پنجاب کے مشہور خفیہ پولیس کے افسر وار برٹن کی زندگی کے تجربات۔ دغا اور فریب کی درخشندہ مثالیں جرائم پیشہ اقوام اور مجرموں کی سراغرسانی۔ قیمت دو روپے (عا)

بد انجام سن ستاون کے غدر کے مشہور تاریخی حالات پر لطف زبان میں عہ

پرستان بغداد کوہ قاف کی پری جمال خوبصورت نازنینوں کے قصے جنہیں پڑھکر رونا اور ہنسی آتی ہے۔ قیمت ۸؍

زن مرید پارک جو کہ پکا زن مرید تھا۔ ایک خود پسند بیگم کی غلامی میں پھنس گیا۔ ایک دن اس کی بیوی جوتوں سے اس کی مرمت کرتی ہے۔ قیمت چھ آنے (۶؍)

فریبی عورت ایک عورت اپنے ادنےٰ اغراض کے لئے ایک مالدار شخص کی لڑکی کو گم کر لیتی ہے اور اس کو اپنی پوتی ظاہر کرتی ہے آخر حق بحقدار پہنچتا ہے۔ عورت مذکور کو اپنے افعال کی عبرتناک سزا ملتی ہے عہ

حسن آرا بیگم زنانہ اخلاقی ناول۔ لڑکیوں کے لئے نہایت نصیحت آمیز ناول ہے جنابہ جہاں آرا صاحبہ کے پر زور قلم سے۔ عہ

قدرتی سیر بین نامی گرامی ناولسٹ مسٹر ڈیم کے مشہور ناول کا ترجمہ ۱۲؍

آلات کیمیا کا نیلگوں کمرہ سائنس کی روز افزوں ترقی سے یورپ کے شاطروں نے کیا کیا سیکھا۔ دنیا کی نیرنگیوں کا دلچسپ مرقع۔ قیمت ۱۲؍

آستانہ کی حور جنگ یورپ میں ترکوں کی بہادری انجمن اتحاد و ترقی ینگ ٹرکش پارٹی کے کارنامے۔ وطن فروش وزیر دامادِ فرید پاشا اور خلیفۃ المسلمین کی جلاوطنی۔ وزارت اور سلطنت کی بدنظمیاں۔ خود غرض ارباب حل و عقد کے ہاتھوں سے قسطنطنیہ کی بربادی مصطفےٰ کمال پاشا کی بہادری۔ انگورہ میں مجلس ملی کا انعقاد۔ یونانیوں کے مظالم اور پسپائی اس ناول کو پڑھکر حرارت اسلامی سے خون جوش میں آتا ہے۔ قیمت ...

سعید و فلیانہ۔ اسلامی شجاعت اور بہادری کا سچا تاریخی فسانہ غازیانِ اسلام کی فتح۔ ایک پادری کی لڑکی فلیانہ اسلام کے سچے اصول دیکھکر خود بخود مسلمان ہو جاتی ہے۔ قیمت فی جلد عا

بخیل کی دولت ایک کروڑ پتی بخیل کی دولت اس کی ہلاکت کا ہی سبب ہوئی۔ یہ بخیل تمام عمر اخراجات سے ڈر کر شادی نہیں کرتا۔ قیمت عہ

پرکالہ آتش سراغرسانی کا ایک حیرت انگیز قصہ۔ ایک مشہور سپینش ناول کا ترجمہ۔ قیمت عہ

تخم بدی سراغرسانی کا ایک دلکش واقعہ۔ قیمت ۲؍

چہار چمن شمرانہ کی عیاریوں کا نہایت دلچسپ قصہ۔ مصنفہ خان احمد حسین خان بی اے قیمت ۸؍

سلسلۂ مقبول ایک اخلاقی ڈرامہ عربی سے ترجمہ شدہ قیمت ۳؍

اسرار آکلینڈ نیکیوں کے خوشگوار نتائج۔ بدیوں اور شرارتوں کی سزائیں۔ قیمت ۱۲؍

سیر بکاؤلی قلعہ بکاؤلی کے پُراسرار چشم دید عجیب و غریب حالات قیمت آٹھ آنہ ۸/

مطلوب حسینان مصنفہ سجاد حسین صاحب بی اے۔ اپنی طرز کا اچھوتا ناول ترکی سے اردو میں ترجمہ۔ قیمت ۶/

دس پونڈ کا نوٹ ایک یورپین امیر زادہ اپنی معشوقہ کو دس پونڈ کا نوٹ دیکر ہمیشہ کے لئے اپنے کیرکٹر پر سیاہ دھبہ لگا لیتا ہے۔ انگریزی زندگی کے تاریک پہلو پر روشنی۔ قیمت ۱۲/

اکبر و زہرہ عشق و محبت کی سچی داستان۔ اکبر اپنی معشوقہ کے جنازہ کے ہمراہ جاتا ہے۔ اور دنیا کی تمام مصائب کو نہایت مردانگی سے برداشت کرتا ہے۔ قیمت ۱۲/

امریکہ کی نازنین دریائے نیاگرا کی سیر نیاگرا کی مشہور عالمگیر نمائش یا کے حالات۔ اور ایک حسینہ کا ڈاکوؤں کی عیاری سے گم ہو جانا۔ قیمت ۱۲/

شمع شبستان مصنفہ خان احمد حسین۔ لاہور کے ایک امیر زادہ کی زندگی اور ایک بڑھیا کی لڑکی سے عشق و محبت کا افسانہ۔ ۱۲/

حیات سعدی شیخ سعدی کے مفصل سوانح حیات۔ طالبعلمی۔ سیر و سیاحت شیراز میں واپسی تصنیف شاعری۔ طرز ادا۔ غزل گوئی۔ نقطہ سنجی وغیرہ پر کمال تبصرہ کیا ہے۔ مصنفہ مولانا شبلی قیمت ۸/

حیات حافظ خواجہ حافظ شیرازی کے نام و نسب بچپن۔ شاعری۔ فلسفہ اخلاق کلام کی بندش چستی و ظرافت پر نہایت عالمانہ تبصرہ ہے مصنفہ مولانا شبلی قیمت ۸/

حیات خسرو امیر خسرو رحمۃ اللہ کی مکمل سوانح حیات۔ امیر صاحب کی صوفیانہ زندگی پر تبصرہ قیمت ۸/

مولانا شبلی رحمۃ اللہ کا سفرنامہ روم و مصر و شام اس سفرنامہ میں ترکوں، عربوں کی تمدنی حالت اور ان کی معاشرت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ قیمت ۱۲/

مجموعۂ نظم شبلی و سوانح حیات مولانا کی وہ تمام اردو نظمیں اور مولانا مرحوم کی لائف مسٹر لکھنوی کے قلم سے ۸/

مقالات شبلی مولانا شبلی کے وہ علمی اور تاریخی مضامین جو آج تک کتابی صورت میں شائع نہیں ہوئے۔ قیمت ۱۲/

آغاز اسلام ترجمہ بدر الاسلام مسلمان بچوں اور لڑکیوں کیلئے مولانا شبلی مرحوم کے قلم سے۔ قیمت ۳/

خلافت اسلامیہ ڈاکٹر سر محمد اقبال ایم اے کا مشہور لیکچر جس میں انہوں نے بتایا تھا کہ جمہوریت اسلام اور سائنس انتخاب ایک ہی چیز ہیں۔ قیمت ۳/

سوانح مولانا جلال الدین رومیؒ مولانا شبلی نے مثنوی شریف اور مولانا روم کی دیگر تصانیف پر نہایت شاندار تبصرہ لکھا ہے۔ مولانا کی شاعری، اخلاق، ریاضت اور زہد و تقویٰ وغیرہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ قیمت ۱۲/

زنانہ حاضر جوابیاں صنف لطیف کی ذہانت اور طباعی کے نادر اور دلچسپ انتخاب قیمت ۸/

حسن آرا یعنی اچار چٹنی کی کہانی۔ اس رسالہ میں باتوں باتوں ہی کے اندر ہر قسم کی چٹنیاں۔ اچار بنانے کی ترکیبیں درج ہیں قیمت ۴/

زنانہ خط و کتابت ہندوستان میں انگریزی راج کے اندر زنانہ تعلیم نے خوب بیٹے کھائے ہیں۔ اس کتاب میں ہر قسم کے لکھنے کے نمونے درج ہیں۔ قیمت ۸/

چینی قزاق چین میں انگریزوں کی ریشہ دوانیاں۔ موتیوں کی ہوس میں ایک بیگناہ کا قتل قزاقوں کی انصاف پسندی۔ اصل واقعہ کا انکشاف قیمت ۱۰/

جیسی کرنی ویسی بھرنی ایک بیگناہ کے قتل کا قصہ۔ ۴/

بہشتی زیور مولوی اشرف علی صاحب تھانوی کی مشہور کتاب جس میں بچوں اور عورتوں کے لئے تمام ضروری دینی و دنیوی مسائل درج ہیں۔ کتاب دس حصوں میں ہے قیمت فی حصہ ۸/ مکمل سٹ کی قیمت ۵

متفرق ناول

ایڈیٹر کا حشر مولانا ظفر علی خان ایڈیٹر زمیندار نے اس ناول میں ایڈیٹر کی ہٹی پلید کی ہے۔ قیمت ۴/

خوبصورت ناگن ملک کی بگڑی ہوئی حالت کا سچا فوٹو جس میں بدتہذیبی اور صحبت بد کے نتائج دکھائے ہیں۔ قیمت ۱۲/

راحت جان اور علی جواد اس ناول میں بانکی طوائف کی مغرور نوچی چھمی جان اور چنبیلی جان کے سٹی مجسٹریٹ کی عدالت میں بیان ڈاکوؤں کی گرفتاری۔ پولیس کی کارگزاری۔ ٹھاکر صاحب کا طوائفوں کے ہاں چھپ کر آنا۔ اور پکڑا جانا۔ قیمت ۱۲/

پرانا کھنڈول حسن و عشق کی عجیب و غریب داستان۔ پرستان کا حیرت انگیز نقشہ قیمت ۱۲/

پریتم کی تلاش کمل کا پریتم پر عاشق ہونا۔ پریتم کی تلاش میں جوگن کے لباس میں نکلنا۔ آخری ملاقات۔ قیمت ۱۲/

شہر شباب عیاش مردوں کی عورتوں کے افسوسناک حالات عیاشی کے برے نتائج۔ طوائفوں کی تمام کاریگری اور گرم بازاری قیمت ۱۲/

چھلاوہ اس ناول میں مصنف نے اس زمانہ کی خیرات کی خرابیاں۔ ایک شریف عورت کا بدذاتوں کے پھندے میں پھنسنا اور وہاں سے اپنے آپ کو بال بال بچانا وغیرہ۔ قیمت عمر

حکیم گلباز اس کتاب میں نمک حلالی۔ بدکاری۔ خودغرضی ظلم اور مکاری کی خوفناک تصویریں دکھائی گئی ہیں۔ قیمت ۱ر

سلیمان عذرا بدتہذیبی اور انگریزیت کے خوفناک نتائج۔ انگریزی روشنی سے نوجوانوں کے کیرکٹر پر خراب اثر۔ قیمت ۸ر

انگریزی ناولوں کے مشہور ترجمے

مرد میدان حصہ اول و دوم۔ پولینڈ کے دارالسلطنت وارسا کے عجیب و غریب تاریخی حالات۔ روسیوں کے مظالم۔ قومی ہمدردی خودغرضی اور بیوفائی کا سچا فوٹو۔ قیمت حصہ اول عہ حصہ دوم عہ

سونے کا جزیرہ چارلس گاروس کے مشہور ناول ہیری ہیچ آف دلتھ کا ترجمہ جس میں ایک نوجوان کسی غیر آباد جزیرہ میں پہنچتا ہے۔ وہاں اتفاقاً ایک لڑکی سے آشنا ہو جانا۔ لڑکی کا غائب ہونا۔ نوجوان کا مجنون ہو جانا۔ ایک شخص کا وہاں پہنچنا اور اس کو سونا کھود کر انگلستان بھیجنے پر لگانا۔ قیمت ۱۲ر

روز الیمبرٹ ہر دو حصہ۔ یہ رینالڈس کا مشہور ناول ہے اس میں ایک پادری کی حسن فروش لڑکی کی سوانحعمری درج ہے۔ قیمت ۸ر

مارگیرٹ مسٹر رینالڈس اس ناول میں سکاٹ لینڈ کے بادشاہ کا مارگیرٹ کو چپ چاپ شادی کر لینے کا واقعہ دکھاتا ہے۔ قیمت ۱۴ر

حاجی بغلول منشی سجاد حسین صاحب ایڈیٹر اودھ پنچ کا شاہکار۔ ظرافت لطیف میں شرابور۔ ہر لفظ میں مذاق و شوخی۔ قیمت ۱۲ر

طرحدار لونڈی اس ناول میں ایک دولتمند گھر کی ایک خادمہ ناجائز تدابیر سے صاحب خانہ بننا چاہتی ہے۔ آخر کو پیشہ ور بازاری عورت بنکر اپنی حالت درست کرتی ہے۔ اس دولتمند مگر غافل گھر کے برباد ہونے پر یہ ایک مقدمہ میں پھنسکر جیل خانہ کو جاتی ہے۔ قیمت ۱۴ر

کایاپلٹ اس کتاب میں دکھایا گیا ہے کہ ہندوستان میں ہر قسم کی ترقی سے روحانی ترقیوں کی کیا حالت ہے؟ قیمت ۲ر

مولانا عبدالحلیم شرر کے ناول

فلورا فلورنڈا اسلمان فرمانروایان اندلس کے عہد کا سچا واقعہ۔ رومن کیتھلک پادریوں کے خانقاہوں اور کلیساؤں میں سیاہ کاریوں کے مناظر۔ قیمت ۸ر

حسن بن صباح اس میں اسماعیلی فرقہ کے موجد کے مفصل حالات۔ نظام الملک اور حسن بن صباح کی لڑائیاں درج ہیں۔ قیمت ۶ر

منصور موہنا فتح سندھ کے تاریخی واقعات سلطان محمود غزنوی کے مشہور جرنیل منصور کا ہندوستان کو پے در پے لوٹنے کے لئے آنا راجہ کی خوش رو لڑکی موہنا کی منصور سے ملاقات۔ آخر منصور کا مارا جانا۔ موہنا کا اضطراب۔ عمر

حسن انجلینا روسیوں اور ترکوں کی لڑائیاں۔ روسیوں کو شکست ملکہ انجلینا کے عاشق کی بہادری اور حسن و عشق کی داستان نہایت موثر الفاظ میں بیان کی ہے۔ قیمت عہ

حسن کا ڈاکو دربار حرام پور میں حسن کی لوٹ۔ کمزور رعایا پر مظالم۔ مغرور رئیس کی تباہ کن روش۔ قیمت ۸ر

دربار حرام پور۔ دربار حرام پور کے سنسنی خیز واقعات۔ قیمت ۶ر

دلکش کامل ہر سہ حصہ یہ ناول آج تک کبھی نصف قیمت پر فروخت نہیں ہوا۔ نہایت دلچسپ ہے۔ قیمت ۸ر

فردوس بریں حسین زمرد کی ہمکناری کیلئے شیخ علی وجودی کے کہنے سے امام نجم الدین نیشاپوری کا قتل اور اس کا فردوس بریں میں قیام۔ ملا اعلیٰ کا سفر اور جنت کی سیر۔ قیمت عہ

ملک العزیز ورجنا رچرڈ شیردل اور صلاح الدین کے کارنامے۔ اسلامی فتوحات وغیرہ۔ نہایت دلچسپ۔ قیمت - عمر

اردو زبان کے بہترین ناول

انارکلی شاہزادہ سلیم اور نادرہ عرف انارکلی بیگم کے عشق و محبت کا دردناک انجام۔ بنگالی سے ترجمہ قیمت ۴ر

چمپا چمپا کے عشق صادق اور مصائب کی دردناک داستان۔ انگریزی کے مشہور ناول لاسٹ لائٹ کا ترجمہ۔ قیمت - ۴ر

رام پیاری اہل ہنود کے رسم و رواج۔ سندر میں چھپا ہے عشق و محبت کی داستان قیمت ۱ر

پاربتی۔ ایک وفادار نوجوان حسینہ کی وفاداری و ثابت قدمی قیمت ۸ر

چندراوتی۔ جس میں عورتوں کی ضد اور خودداری کا فوٹو کھینچا گیا ہے۔ ۸ر

اختر و بلقیس۔ ایک بیوفا شوہر کی اپنی بیوی سے بے اعتنائی۔ ۴ر

اختری بیگم ایک امیرزادی کی غریبوں کے ساتھ بھلائی۔ دشمنوں کی اس پر تہمتیں لگانا۔ بالآخر نیکی کی فتح۔ قیمت عہ

ذبیح فاطمہ ایک شریف خاندان کی عورت کا عشق و محبت کے باعث تباہ ہونا۔ ۹ر

یوسف بزینہ طوائفوں کے داؤ پیچ اور مکر و فریب۔ نوخیز عیار دل ناتجربہ کار تماش بینوں کی تباہی۔ ۱ر

بیٹے کا قاتل ایک لالچی باپ کا روپیہ کے طمع میں اپنے معصوم لڑکے کو قتل کرنا تاکہ اس کے خون سے ایک سکھ سندر کی لڑکی کو بیوی بنائے۔ پولیس کا قاتل اور قتل کرنیوالوں کو گرفتار کرنا۔ قیمت ۴ر

...وز و محمودہ ہجر و فراق کے درد انگیز واقعات فیروزہ کی ڈاکوؤں کے ہاتھ گرفتاری کا سچا واقعہ قیمت عہ

...یدہ بانو اس میں نماز روزہ اور تمام اسلامی شعائر کے دینی اور دنیوی فوائد پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ قیمت ۸ر

...ب قاتل چند لوگوں کا جعلی نوٹ بنانا ان میں نا اتفاقی ہونا پولیس کو خبر۔ قاتل کے قاتل کی تعجب انگیز عیاریاں ۶ر

...کا قاتل قربانگاہ پر اس کا لٹایا جانا۔ دیوتا کا ٹھکرا دینا اس کا پھانسی سے بچنا اس کی ماں کا یکایک قتل۔ عا

تاریخی عربی ناولوں کے ترجمے

...و مامون ہارون رشید کے فرزند امین و مامون کا مجادلہ۔ خلافت بنی عباس کے جلیل القدر ارکان کی زندگی کا خاکہ۔ عربوں ...رانیوں میں پولٹیکل کشمکش۔ فراق۔ وصال وغیرہ قیمت ۱۲ر

...ل اور عبدالرحمن علامہ جرجی زیدان کا مشہور ناول جس میں امیر عبدالرحمن والی اندلس فرانس پر حملہ کرتا ہے۔ فرانسیسی ...وں کا مسلمانوں سے مقابلہ اور شکست قیمت ۱۲ر

...طولون علامہ جرجی زیدان کا مشہور ناول جس میں تیسری صدی کی مصری اسلامی حکومت کے سیاسی واقعات وغیرہ۔ ۱۲ر

...وس فرغانہ خلیفہ معتصم باللہ کے عہد حکومت کے پراسرار واقعات۔ ایرانیوں کی جدید حکومت کا قیام۔ ترکوں کا طرز معاشرت قیمت ۱۲ر

...وبہ قریش ایک نہایت مشہور تاریخی ناول جس میں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے عہد کی فتوحات کا ذکر ہے۔ قیمت عہ

...ہرا جنبی عمرو کو انگلستان سے لاکر نیم عریاں وحشی قوم میں چھوڑ دیا گیا۔ مغربی سوڈان کے آوارہ لوگ۔ عربوں سے جنگ۔ ترلیبا کا پراسرار ...انگریزی کیمپ پر حملہ وغیرہ قیمت ۱۲ر

...ن دیوتا ہندو قومیں جو اپنے آپ کو اہم قوم کہتی ہیں وہ ہندوستان کے اصلی باشندوں پر جو مظالم کرتی ہیں ان کی زندہ تصویر۔ ۸ر

...یل صفیہ ایک تجارتی ملک کے ڈاکوؤں سے لوٹے جانے کے حالات سمیل کا ڈاکوؤں کے خوف سے وطن کو خیرباد کہنا۔ جنگل میں اس کی بیوی صفیہ ...ہونا۔ سمیل کا واپس آکر ڈاکوؤں سے ملک کو صاف کرنا۔ ۸ر

...ت پرست۔ بوالہوسی کا البم۔ ایک خاندان کی تباہی۔ قیمت ۱۰ر

...سیہ عرف پاکدامن لڑکے اور لڑکیوں کی ایک جگہ تعلیم پانے کے نقائص۔ شریف اور قدسیہ کی ملاقات اختیاری ...کوٹھڑی میں۔ قیمت ۴ر

...بوالہوس نواب۔ ایک نواب کی بوالہوسی کا خاکہ۔ قیمت ۴ر

ولائتی بھوت دو شخص ایک عورت کے لئے باہر جاکر ڈوئل لڑتے ہیں۔ اور ایک اپنے رقیب کا کام تمام کر دیتا ہے۔ قیمت ۸ر

عصمت کا البم جہانگیر بادشاہ کے مینا بازار کی کیفیت۔ اکبر کی وزیر خان اعظم کی دختر عفت آرا کے ساتھ شادی کی نسبت بادشاہ کی رائے سے قرار پانا عفت آرا کا ڈاکوؤں کے ہاتھ آنا اور بچنا۔ قیمت ۱۲ر

فتنہ ایک پیارے بچے کے کارنامے اس کے بھولے پن کی جیتی جاگتی تصویر۔ بلا ارادہ شرارتوں کا مرقع۔ قیمت ۱۲ر

بڈھے میاں ریاض کا اپنے بوڑھے استاد کی ڈاڑھی کتر کر جلا ڈالنا وغیرہ۔ قیمت ۴ر

رن بیر کانتا۔ ایک عورت کے فرار ہو جانے کا قصہ۔ ۸ر

مالن کی بیٹی ایک مالن کی بیٹی تارا پر نیپال کے کنور کا عاشق ہونا۔ راجہ نے کنور کو پھانسی کا حکم دینا۔ راجہ اور کنور کی جنگ۔ کنور کا کامیاب ہو کر اس کے ساتھ شادی کرنا۔ قیمت ۸ر

کنیز فاطمہ ایک یتیم لڑکی۔ دنیاوی مصائب میں پرورش اور تعلیم کا پانا۔ حوادث زمانہ سے تھیٹر کی نوکری اور عشق۔ نواب محمود الحسن سے شادی مصنفہ قاضی عزیز الدین صاحب وزیر ریاست دتیا۔ قیمت عہ

شوخ دلہن یہ ناول رازداری کا زینہ۔ دیہاتی زندگی کا زندہ مرقع۔ شوخی و شرارت کے حاشیہ میں ناز و انداز کی تحریر۔ ۸ر

کمسن بی بی مسن شوہر ۵۰ برس کے رئیس کا ۹ برس کی لڑکی سے شادی کرنا۔ نوجوان عورت کا اس رئیس کے منشیوں سے ناجائز تعلق۔ قیمت ۴ر

جوان بی بی کمسن شوہر ایک ۲۰ سالہ نوجوان لڑکی کی ۱۲ سال کے لڑکے سے شادی۔ شادی سے فوراً بعد عورت کا ناجائز تعلقات پیدا کرنے کی تلاش۔ قیمت ۴ر

لاڈلی بیٹی ایک تعلیم یافتہ لڑکی کی فضیلت کی وجہ سے کامیابی اور جاہل کی بیٹی اور بے جا لاڈ کی خرابیاں اس ناول میں بیان کی گئی ہیں۔ ۴ر

وفادار بی بی۔ وفادار بی بی کا مرتبہ۔ قیمت ۴ر

نورجہاں شہنشاہ جہانگیر کی چاہیتی ملکہ کی دلچسپ سرگذشت۔ ۵ر

تاریخی ناول

انقلاب یورپ کا ہیرو آرسین لوپن ایک عجیب و غریب انسان ہے۔ جو وسط یورپ کا بادشاہ بنتا اور مغرب میں حیرت انگیز انقلاب پیدا کرنا چاہتا ہے۔ یہ پراسرار ناول نیند حرام کر دیتا ہے۔ قیمت ۵ر

بالشویک شہزادی روس کے حکمران طبقہ کی جفاکاریوں کا سچا نقشہ۔ حصول آزادی کے لئے رعایا کی جدوجہد۔ قیمت ۵ر

انقلاب فرانس اس ناول میں فرانس کے مشہور انقلاب یعنی فرنچ ریولیوشن کا حال درج ہے۔ سیاسی خونریزیوں کا منظر۔ حریت و مساوات کے حامی لیڈروں کی سرفروشی۔ قیمت ۱۲ر

معرکہ ٹیونس ٹیونس میں اسلامی حکومت کا خاتمہ۔ ایک مکرام وزیر کے نفرت انگیز کارناموں سے فرانس کی کامیابی۔ قیمت ۱۲ر

جنگ قفقاز علاقہ قفقاز میں بہادر لڑکوں کی جانبازی اور سرفروشی کی داستان۔ ترکوں کے روسیوں سے جان توڑ مقابلے ۶ر

جنگ طرابلس طرابلس الغرب میں حفظ ناموس الٰہی کیلئے وطن پرست عربوں اور ترکوں کا اطالوی افواج سے مقابلہ قیمت ۶ر

جنگ سمرنا بہادر ترکوں سے یونانیوں کی تباہی کا سچا واقعہ قیمت ۸ر

اورنگ زیب اور چنچل کماری ایک پاکباز غیور راجپوت لڑکی کا تاریخی قصہ اورنگ زیب کا جوش اسلام اور اودے پور کے رانا راج سنگھ کی حمیت کا مرقع۔ قیمت ۸ر

حسین رانی پرتھی راج اور شہاب الدین غوری کی معرکہ آرائیاں۔ قیمت ۴ر

نازنین بلخ انگریزی کے مشہور ناول دی پرنس آف بلخ کا ترجمہ حب الوطنی کا عجیب و غریب فسانہ۔ قیمت ۸ر

سراب نیش ایک یورپین تہذیب کے مجنوں کی داستان عشق۔ ناداری اور مفلسی کا ایک عشقیہ فسانہ قیمت ۱۰ر

ماہ نو یا معرکہ سمرنا۔ اناطولیہ۔ انگورہ اور سمرنا کے دلخراش مظالم میں حسن و محبت کی گھاتیں۔ قیمت ۸ر

کارگذار ایک ٹھگی اور ڈکیتی کی داستان۔ ایک ہوشیار جاسوس نے ان ٹھگوں کو کیفر کردار تک پہنچا دیا۔ قیمت ۸ر

برق غضب سراج الدولہ حاکم بنگالہ کی غفلت اور بنگالہ کی اسلامی حکومت کا خاتمہ قیمت ۱۲ر

زر پرست زر کی خاطر قتل۔ آخر ایک کتے کے ذریعہ سراغ لگنا۔ ۱۲ر

پراسرار گھوڑا۔ شرلک ہومز کا مشہور جاسوسی فسانہ ۶ر

عربی دلہن حسن و عشق کے پاکیزہ جذبات۔ قیمت ۸ر

مقدس دیوی مغل بادشاہ جہانگیر کی میواڑ پر فوج کشی۔ مہارانا امر سنگھ اور ہندو دیویوں کے کارنامے۔ قیمت ۱۰ر

سفید پوش غنڈا مسٹر ہرس کا ایک محل میں نقب لگاتے ہوئے پکڑا جانا اس کی حسینہ دوست کا جیلخانہ سے اڑانا ۸ر

ترکی حرم سرا ترکوں کی معاشرتی خرابیوں کو حسن و عشق کی کرشمہ سازیوں میں دکھایا گیا ہے۔ قیمت ۸ر

جانفروش چمپا اور رام پیاری کی مصیبتیں۔ قیمت ۱۲ر

سائیکل یا زحسینہ پادری کا اپنی ملازم حسینہ سے شادی کی درخواست کرنا پادری وحسینہ کا سیاہ کاری کرتے پکڑے جانا۔ ۴ر

محبوبہ حلب اسلام کے ابتدائی زمانہ میں مٹھی بھر جانباز کلمہ گو بہادروں نے حلب کو کس طرح فتح کیا۔ قیمت ۸ر

زندہ لاش اس میں امریکہ کے ایک نامور جاسوس کی دل ہلا دینے والی تحقیقات اور مجرموں کی حیرت انگیز چالاکیاں۔ قیمت ۱۰ر

محبوبہ شام بیروت کے ایک عالیشان قصر میں ایک نوجوان لڑکی کلمہ تیمم ہوجاتی ہے شام کے عیسائی گورنر کا لڑکا اس کو دیکھکر اس سے شادی کی تمنا میں دیوانہ ہوجاتا ہے۔ قیمت ۸ر

اسرار افریقہ کمبرلے کی کانوں کے حالات جادوگرنیوں کا شکار۔ افریقہ کے پراسرار جنگلوں سے جواہرات لیکر لندن جانا۔ ۱۲ر

محبوبہ بغداد جنگ عراق میں ترکی کارنامے۔ روسیوں سے جنگ حسن و عشق کے دلاویز قصے۔ قیمت ۱۰ر

محبوبہ قریش جرجی زیدان ایڈیٹر الہلال کا تاریخی ناول۔ قیمت ۱۲ر

بچھڑوں کا ملاپ ایک شیر خوار بچے کا دریا میں بہنا ایک شریف آدمی کے گھر پرورش پانا۔ آخر والدین کا ملاپ۔ ۴ر

خونی ملاح ایک بیگناہ خونی ملاح کی خونی داستان۔ سراغرسان کی طباعی۔ اور خوش دماغی کی بدولت راز کا انکشاف۔ شرلک ہومز کا دلچسپ فسانہ کا ترجمہ۔ قیمت ۴ر

خونی چور ایک عورت اپنی سازش کی تکمیل کیلئے ایک کرنیل کو اپنے دام گیسو میں گرفتار کرلیتی ہے۔ قیمت ۶ر

خونی ساحر لکھنؤ میں متین مرزا کا پراسرار قتل حیدری خانم کی دلشکن مصیبتیں قیمت ۱۲ر

خونی آقا ایک غریب نوجوان کی عبرت انگیز موت۔ محمد امین سب انسپکٹر جبلپور کی سراغرسانی کی قابلیت۔ قیمت ۶ر

خونی بھید ایک روسی نواب کی لڑکی عاشقان زر کے پھندے میں۔ ایک ہوٹل میں ایک ظالم نے اس کو قتل کردیا قیمت ۸ر

خونی بہن ایک انگریزی جاسوسی ناول کا ترجمہ اس میں ناپاک دنیا کی مکاریوں سے پردہ اٹھایا گیا ہے۔ قیمت ۱۰ر

خونی بھائی اس ناول میں حریص عزیزوں کی بیوفائی۔ ناشاد لڑکی کا شستہ عاشق کا قتل۔ قیمت ۱۰ر

خونی منظر ایک فرانسیسی عورت کو قتل کرکے قاتل ہومر پر غائب ہوگیا۔ قاتل کی گرفتاری۔ قیمت

خونی تصویر ایک مظلوم کا قتل قاتل کی گرفتاری۔ شرلک ہومز کا مشہور فسانہ۔ قیمت ۴ر

عشق و محبت یا الفت کا خزانہ

بلا عاشق ایک تاریخی ناول حسن و عشق کی جیتی جاگتی تصویر۔ قیمت ۴ر

افسانہ عاشق کوروپانڈو سے لیکر احمد شاہ درانی کے حملوں تک مکمل تاریخی ناول کے رنگ میں۔ قیمت ۱۲ر

شیدا عاشق میرزا جلال الدین شہزادہ دہلی اور جہان آرا بیگم کے عشق و محبت کی داستان۔ قیمت ۶ر

دلیر عاشق ایک بدمعاش ڈاکو کی گرفتاری۔ زہرہ کی جان کے لالے۔ عابد علی کی چالاکی۔ قیمت ۴ر

آوارہ عاشق ایک ہوا باز محب وطن کا ایک حسین دوشیزہ کو لانا۔ اسکی ریشہ دوانیاں کا علم انگریزوں کو ہونا۔ قیمت ۱۲ر

شیطان عاشق یا عاشق شیطان اس ناول میں چھوٹی نمائشوں میں ہیچ اور دنیاوی مسرتوں میں لہو و لعب۔ قیمت ۶ر

رومال کا عاشق عرف معشوقہ غدر۔ قمرالزمان کا قیصر باغ میں ایک رومال کو پانا اس پر زہرہ بیگم کا نام دیکھکر محبت کا پیدا ہونا۔ آخر قمر و زہرہ کا کئی مشکلوں کے بعد ملنا۔ قیمت ۸ر

درد عشق علیگڈھ کے دو طالبعلموں کی محبت کا فسانہ۔ کالج کے طلبار کی خوش گپیاں۔ قیمت ۴ر

قانون عشق شرلک ہومز کا ایک جاسوسی قصہ رقابت میں ایک شخص کا قتل ملزم کی گرفتاری وغیرہ ۶ر

نظیر عشق نواب یوسف علی کا محبت میں گرفتار ہونا۔ آخر ملاقات۔ ۴ر

ظالم عشاق عرف کھتری ابن جس میں جانس کو ایک حسن کی دیوی اپنا بندہ بنا لیتی ہے۔ قیمت ۶ر

معشوقہ فرانس شمس کا فرانس کے خفیہ نواب سے تعلق۔ یہ ناول فرانس کی حرامکاریوں کا آئینہ ہے۔ قیمت ۱۲ر

دنیا کے چند مشہور جاسوسی ناول

لندنی جاسوس مصر کی بغاوت کا انکشاف۔ سراغرساں کی کامیابی۔ حرار مصریوں کی بربادی۔ قیمت ۸ر

بنگالی جاسوس ایک نازنین کا قتل۔ سراغرساں کی قابلیت سے بیگناہ کا بچنا اصل قاتل کا کیفر کردار کو پہنچنا۔ ۱۲ر

فطرتی جاسوس دو ہم صورت نوجوانوں کی حیرت انگیز جاسوسی اور عصمت و عفت کے قابل دید نظارے۔ قیمت ۸ر

فطرتی قاتل ایک عجیب و غریب قتل بیگناہوں کی گرفتاریاں۔ ایک خفیہ پولیس نوجوان کی لاجواب سراغرسانی۔ ۱۲ر

خوفناک قتل ایک نہایت خوبصورت ہندو خاتون کا قتل بدمعاشوں کی لوٹ مار کے عجیب مناظر۔ قیمت ۸ر

پراسرار قتل ایک فوجی افسر کی آخری وصیت کو رد کرنے کے جرم میں ایک پراسرار قتل نہایت دلچسپ ۶ر

نقاب پوش ڈاکو نقاب پوش ڈاکو کا حملہ ناصر خاں انسپکٹر کا موہنی کو اپنے مکان میں بیہوش پانا اور موقعہ پاکر بھگا لیجانا نہایت دلچسپ ۸ر

بیوی کی شرارت ایک وزیر خارجہ کی بیوی کا اپنا راز چھپانے کیلئے سرکاری کاغذات کا راز داروں کو دینا اور اس کے عوض میں عالم شباب کے خط لینا۔ قیمت ۴ر

ہوائی بندوق۔ شرلک ہومز کا مشہور فسانہ۔ ایک رئیس کا قتل۔ ۴ر

طلسم ستجد۔ شرلک ہومز کا مشہور فسانہ جرائم پیشہ طبقہ کی طلسم سازیاں۔ ۸ر

لال حویلی۔ اس میں تغلق آباد کے رازوں کا انکشاف ہے۔ ۱۲ر

بہرام کی آزادی۔ بہرام کی فراری کا دلچسپ مرقع۔ قیمت ۱۰ر

درد دل۔ ایک حسین دوشیزہ کا درد فراق میں تڑپنا۔ قیمت ۴ر

بہرام کی واپسی۔ دس سال کے بعد بہرام کی واپسی چوریاں وغیرہ ۴ر

اٹھتی جوانی۔ ایک باعصمت خاتون کی رام کہانی اپنی زبانی۔ ۸ر

انجام محبت۔ محبت کا انجام نہایت دردناک طریقہ سے دکھایا ہے۔ ۴ر

شیطان زادہ۔ ایک لڑکے کی حیرت انگیز حرکات کا نقشہ ۴ر

کرشمہ رقابت۔ رقابت میں ارتکاب جرم و قتل۔ قیمت ۱۰ر

درس عبرت۔ بدی میں نیکی اور نیکی میں بدی کا معمہ نصیحت خیز ۶ر

انوکھا فقیر۔ ایک یورپین فقیر کی عجیب و غریب داستان ۴ر

بت شکن۔ شرلک ہومز کا مشہور فسانہ۔ قیمت ۴ر

میاں لوٹ۔ ایک نہایت دلچسپ ظریفانہ ناول۔ ۴ر

عیاش شوہر اور وفادار بیوی۔ اس میں نوجوان عیاشوں کی بدکرداریاں۔ زنان بازاری کا مکر و فریب۔ نکاحی بیوی کی وفا و محبت درج ہے۔ ۶ر

شریف بدمعاش۔ صورت کے شریف لیکن دل کے بدمعاش انسان کی کمینہ پروری کا خاکہ۔ جاسوسی راز کا انکشافات وغیرہ۔ ۴ر

شریف چور۔ ایک سائنسدان کا جواہرات کی تلاش میں قتل ہر دو حصہ ۱۲ر

صنعت و حرفت کی کتابیں

ذخیرہ صنعت و حرفت سات حصے یورپ و امریکہ کی تمام صنعتوں کا مفصل حال۔ ہر چیز کی تیاری کا نسخہ ترکیب وغیرہ مفصل درج ہے۔ اس کتاب کے دس بارہ اڈیشن آجتک فروخت ہو چکے ہیں۔ کئی لوگوں نے صرف اس کتاب کی بدولت ہزاروں روپیہ کمایا ہے۔ حصہ اول۔ اس میں روشنائیوں۔ سیاہیوں۔ سیمنٹ۔ روغن سازی۔

قلعی گری۔ پالش۔ الیکٹرو پلیٹنگ وغیرہ کے حالات درج ہیں قیمت ۸ر

حصہ دوم میں لکڑی پیتل۔ لوہا۔ تانبہ سینگ وغیرہ کے عمل مصنوعات تیار کرنے کا ذکر ہے۔ قیمت عہ

حصہ سوم میں کیمیاگری جڑی بوٹیوں کے خواص و فوائد۔ انگریزی ادویات دیسی و انگریزی کھاتوں کا بیان ہے۔ قیمت ۸ر

حصہ چہارم زیر طبع ہے۔

حصہ پنجم کپڑے سیپ۔ لکڑی پر نقش و نگار صابون سازی عرق سازی۔ روغن سازی کے مفصل حالات قیمت ۸ر

حصہ ششم میں مصنوعی موتی سیپ۔ جواہرات۔ کانچ۔ ایلومنیم کا فور کارک کاغذ وغیرہ کی مصنوعات کا ذکر ہے۔ قیمت ۸ر

حصہ ہفتم مٹی کے تیل پھلی۔ الکوحل۔ چکنائی ہفت دھات۔ وغیرہ کے مرکبات کا ذکر ہے۔ قیمت ۱۴ر

حصہ ہشتم۔ پارچمنٹ سہاگہ مصنوعی موتی پھنکری نیلا تھوتھا۔ رسکپور کسٹرائیل وغیرہ کے بیان میں قیمت ۸ر

مکمل صابون سازی ہر قسم کے دیسی و انگریزی صابن بنانے۔ صابن کے اجزا حاصل کرنے کے مجرب نسخے۔ صابن کا کارخانہ بنانے اور اس کو تجارتی طور پر کامیاب بنانے کی ترکیبوں کا ذکر ہے۔ عہ

چھریاں چاقو ڈاکٹری آلات اور چھریاں چاقو بنا کر روزی کمانے کے آسان طریقے اور حالات۔ قیمت ۴ر

رنگائی چھپائی۔ سوتی ریشمی اور اونی کپڑے پر چھینٹ وغیرہ چھاپنے کے طریقے ۸ر

روشنائی تین سو قسم کی مختلف روشنائیاں بنانیکے مجرب نسخے۔ ۸ر

آتشبازی۔ یورپین اور ہندوستانی آتشبازی تیار کرنیکے ۵۲۵ نسخے ۱۲ر

سیمنٹ۔ ۱۰۴ قسموں کے مختلف سیمنٹ بنانے کی ترکیبیں ۸ر

جلا و آبداری لکڑی۔ لوہے پیتل چاندی سونا کو جلا اور پالش کرنا ۸ر

ہر قسم کے روغن وارنش۔ ہر قسم کے روغن وارنش پکانے کے ۱۰۶ نسخے ۸ر

مصنوعی دھاتیں اور ٹانکے لگانا۔ جرمن سلور اور دیگر ہر قسم کی مصنوعی دھاتیں اور ٹانکے تیار کرنے کے دو سو مختلف نسخے۔ قیمت ۸ر

نیلاری یا رنگریزی ہر قسم کے سوتی ریشمی کپڑوں کو کیمیاوی طریق سے رنگنا ۸ر

مکمل مرغی خانہ سونے کا انڈا دینے والی مرغیاں آجکل بھی مل سکتی ہیں آپ بھی مرغیوں کی تجارت اور پرورش سے ہر روز سونے کا انڈا حاصل کر سکتے ہیں۔ اگر آپ کو شوق ہے۔ تو ہماری کتاب مکمل مرغی خانہ منگا کر پڑھیں قیمت ۸ر

بسکٹ فیکٹری ہندوستان میں ہر سال اسی نوے لاکھ روپے کے بسکٹ غیر ممالک سے آ رہے ہیں بسکٹ بنانا اصل کیمیاگری ہے۔ اس کتاب میں ڈبل روٹی۔ کیک وغیرہ بنانیکی تراکیب درج ہیں۔ ۲ر

موم بتی بنانا مشینری کے ذریعہ موم بتی تیار کرنیکے حالات ۴ر

کلید صنعت حصہ اول سٹیم انجن کی پہلی کتاب مصنفہ مستری عالم الدین انجنیئر عہ

کلید صنعت حصہ دوم 〃 〃 دوسری 〃 〃 〃 عہ

مادر ہند مس میو کی مشہور کتاب مادر انڈیا کا ترجمہ جس کتاب کی وجہ سے ہندوستان میں غارڈ وائیکٹ پاس کیا گیا ہے۔ ہندوستان کی تہذیب تمدن پر عریاں حملے کتاب پڑھنے کے لائق ہے آج تک کئی لاکھ فروخت ہو چکی ہے۔ قیمت تین روپے

فادر انڈیا یا بھارت۔ یہ کتاب مادر ہند کے جواب اہل ہنود نے لکھی ہے قیمت عہ

ویکیوم بریک ویکیوم کے ذریعہ سے ریل گاڑی کو کھڑا کرنے اور بریک کے استعمال وغیرہ پر مفصل کورس قیمت عہ

فائرمین پاکٹ بک ریلوے انجن پر جو فائرمین کام کرتے ہیں ان کے تمام ضروری معلومات درج ہیں۔ قیمت ۴ر

کاغذ سازی کاغذ بنانے کی مشینری اور ہندوستان میں صنعت کاغذ کو زندہ کرنے پر چند خیالات۔ قیمت ۴ر

گنجینہ جواہرات ہر قسم کے جواہرات کی شناخت مع جملہ حالات اور تجارت ۔

رسالہ فوٹوگرافی۔ فن فوٹوگرافی سکھلانے کی مکمل استاد ۔ ۸

چینی مٹی اور اس کے مصنوعات۔ ہر قسم کی مٹیوں کا خمیرہ برتن بنانا ۸

کارخانہ دھلائی لانڈری سرد و گرم کپڑے دھونے کے طریقے۔ دھوبی خانہ بنانے وچلانیکی تراکیب عہ

دباغت بسیدہ سازی۔ بال ارکھال اور چمڑا رنگنے کی آسان ترکیبیں ۴ر

لوہا ڈھالنا سٹیل و کاسٹ آئرن کی ڈھلائی وغیرہ کا مفصل بیان ۶ر

وارنش پالش۔ لکڑی۔ لوہا پتھر وغیرہ پر پالش کرنے کے طریقے۔ ۶ر

مکمل دندان سازی مصنوعی دانت لگانے۔ دانتوں پر پالش کرنے۔ سونا چڑھانے ربڑ کا جبڑا وغیرہ بنانے کے حالات عہ

مکمل گھڑیسازی۔ گھڑیاں۔ ٹائم پیس کلاک وغیرہ درست کرنیکے حالات عہ

گلٹ سازی۔ بجلی کے ذریعہ دھاتوں پر گلٹ کرنیکے طریقے۔ ۱۰ر

دیاسلائی۔ ہندوستان میں دیاسلائی کے کارخانوں کے حالات۔ ان کی کامیابی اور ناکامی کے اسباب پر بحث مصنفہ پروفیسر گودبولے و محمد شفیع۔ ۱۰ر

اینملنگ یا تام چینی۔ لوہے کے برتنوں پر تام چینی چڑھانے کی ترکیب عہ

داغ دھبے دور کرنا کپڑے۔ لکڑی۔ کاغذ دھات کی چیزوں پر سے تیزاب تیل وغیرہ کے داغ دور کرنے کے ۲۵۴ مجرب نسخے۔ ۱۰ر

چینی مٹی کے برتنوں پر کانچ چڑھانا مٹی کے برتنوں پر مختلف طریقوں سے کانچ چڑھانا قیمت ۶ر

آلہ مقیاس۔ دھوپ گھڑی۔ مقیاس المار مقیاس الہوا مقیاس الحرارت بنانے کے طریقے۔ قیمت ۴ر

محب المویشی۔ بھیڑ۔ بکری۔ گھوڑا۔ خچر گدھا وغیرہ پالنے کے فوائد۔ ۶ر

واحدی صاحب کا منجن

اکسیر دنداں

یہ منجن اُس نسخہ سے بنایا گیا ہے جو ملّا واحدی صاحب اڈیٹر نظام المشائخ کو اُن کی اڈیٹری طبیب کے زمانہ یعنی ۱۹۱۴ء
میں مسیح الملک حکیم محمد اجمل خاں صاحب مرحوم نے عنایت فرمایا تھا۔ اِس سے دانتوں اور مسوڑھوں کی تمام
خرابیاں اور تکلیفیں رفع ہو جاتی ہیں۔ چودہ پندرہ سال سے واحدی صاحب اسے خود بھی استعمال کرتے ہیں اور
اپنے شہر کے ہر ضرورتمند کو بھی دیتے ہیں۔ ہر شخص اس کا ثنا خواں ہے اور اسے سب سے اچھا منجن تسلیم کرتا ہے
سینکڑوں ہلتے ہوئے دانت اس منجن نے جوڑ دیئے۔ متعدد آدمی ہیں جنہیں پائریا کی شکایت تھی اور
ہر کھانے کے ساتھ مسوڑھوں کا خون اور مسوڑھوں کی پیپ پیٹ میں اُتر اُتر کر جن کی صحت کو برباد کر رہی تھی
صرف اس منجن کے ملنے سے اُن کے مسوڑھے اچھے ہو گئے اور آج وہ خدا کے فضل سے تندرست ہیں جس منجن
سے پائریا جیسے موذی مرض کو آرام ہوتا ہو اور جس منجن سے ہلتے ہوئے دانت جُڑ جاتے ہوں اس کے دوسرے
معمولی فوائد بیان کرنے فضول ہیں۔ یہ خیال کر کے کہ دہلی سے باہر کے لوگوں کے پاس بھی اس منجن کو پہنچایا
جائے۔ ہم نے واحدی صاحب سے منجن کا یہ نسخہ مانگ لیا ہے اور لاگت کی لاگت اسے فروخت
کر رہے ہیں۔ قیمت فی شیشی آٹھ آنے محصولڈاک ۴ ؍ دو شیشیوں پر محصول صرف پانچ آنے لگتا ہے

المشتہر

احمد مجتبیٰ منیجر رسالہ نظام المشائخ نمبر ۲ لوچہ چیلان۔ دہلی

قرآن اور پردہ

مصنفہ

مرزا عظیم بیگ چغتائی بی اے، ایل ایل بی (علیگ)

معہ مقدمہ

م علامہ فخر قوم آنریبل جسٹس ڈاکٹر سر شاہ محمد سلیمان، ایم اے۔ ایل ایل ڈی بار ایٹ لا جج الہ آباد ہائی کورٹ

پردہ کے مسئلہ کو یہ کتاب ہمیشہ کے لئے حل کرتی ہے اگر آپ کو دیکھنا ہے کہ (۱) پردہ ایام جہالت کی یادگار ہے (۲) قرآن پردہ کا مخالف ہے (۳) رسول خدا نے اس پردہ کی کس قدر شدت کیساتھ مخالفت کی (۴) تمام علمائے دین سلف پردہ کے سخت مخالف تھے مسلمانوں نے کفار سے لیا (۶) چند فقیہوں کی حضور انور سے مخالفت اور پردہ کی حمایت (۷) ائمہ اور مفسرین کے اقوال جو پردہ ...ت ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اگر واقعی آپ یہ خود دیکھنا چاہتے ہیں تو اس کتاب کو پڑھیے جس میں تمام قرآنی آیات متعلق پردہ معہ وہ پچاس سے زائد احادیث نبوی کے درج ہیں۔ پھر شرح احادیث اور حضرت امام رازی سے لیکر محدث دہلوی تک کے مستند مفسرین و محدثین کی تفسیروں کے تمام حوالہ جات خواہ موافق ہوں خواہ مخالف بجنسہ درج کئے ہیں۔ قصہ مختصر پردہ کے موافق و مخالف تمام وہ مواد موجود ہے جو قرآن پاک تفسیر احادیث یا فقہ اسلامی میں موجود ہے۔ کورٹ شپ جائز ہے ...ت موکدہ ہے یا فرض ہے اور پھر اسلامی کورٹ شپ کیا ہے یہ سب پردہ اور کورٹ شپ کے باب میں دیکھئے۔

قیمت ایک روپیہ چار آنہ علاوہ محصول ڈاک۔

ظہر حسین عثمانی آنریری سکرٹری انجمن اصلاح پردہ۔ کھانڈا پالسہ۔ جودھ پور۔ ریاست مارواڑ (راجپوتانہ)

قواعد

۱۔ "ھُمایوں" بالعموم ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔

۲۔ علمی وادبی، تمدنی و اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ معیار ادب پر پورے اتریں درج کئے جاتے ہیں۔

۳۔ دل آزار تنقیدیں اور دل شکن مذہبی مضامین درج نہیں ہوتے۔

۴۔ ناپسندیدہ مضمون ایک آنہ کا ٹکٹ آنے پر واپس بھیجا جا سکتا ہے۔

۵۔ خلافِ تہذیب اشتہارات شائع نہیں کئے جاتے۔

۶۔ ہمایوں کی ضخامت کم از کم بہتّر صفحے ماہوار اور ساڑھے نو سو صفحے سالانہ ہوتی ہے۔

۷۔ رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع دفتر میں ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ کے بعد اور ۱۷ سے پہلے پہنچ جانی چاہئے۔ اس کے بعد شکایت لکھنے والوں کو رسالہ قیمتہً بھیجا جائے گا۔

۸۔ جواب طلب امور کے لئے ۱ر کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ آنا چاہئے۔

۹۔ قیمت سالانہ پانچ روپے، ششماہی تین روپے (علاوہ محصول ڈاک) فی پرچہ ۸ر نمونہ ۶ر۔

۱۰۔ منی آرڈر کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ تحریر کیجئے۔

۱۱۔ خط وکتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر جو لفافہ پر پتہ کے اوپر درج ہوتا ہے ضرور لکھئے۔

مینیجر رسالہ ہمایوں

۲۳۔ لارنس روڈ لاہور

سید عبد اللطیف مینیجر رسالہ ہمایوں نے مسلم پرنٹنگ پریس لاہور میں چھپوا کر شائع کیا

ہمایوں

ایڈیٹر: بشیر احمد بی اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا
جائنٹ ایڈیٹر: منصور احمد

جلد ۱۲ — نمبر ۵

فہرستِ مضامین

بابت ماہِ نومبر ۱۹۳۰ء

تصویر:- بہار

جہاں نما

ترکی سیاسیات

تقریباً چھ سال کی یک جماعتی حکومت کے بعد ترکی سیاسیات نے پھر بحث کا رنگ اختیار کیا ہے عصمت پاشا کے طریق کار پر بعض ذمہ دار لوگوں کی طرف سے اعتراضات کیے گئے ہیں اور وہ بھی مصطفےٰ کمال صدر جمہوریہ کی اجازت سے لیکن ابھی یہ اعتراضات باقاعدہ طور پر پیش نہیں کیے گئے اور ان کی حیثیت فی الحال غیر مرتب ترکایات کی سی ہے۔ یہ مخالفت ترکی کے ایک سابق وزیر فتحی بے کے زیر اہتمام ترتیب پا رہی ہے اور آیندہ اسمبلی کے اجلاس میں اس کا مظاہرہ ہونے کی امید ہے لیکن عصمت پاشا نے اس مظاہرے سے قبل ہی اپنا جواب اور بریت پیش کر دی ہے۔ غلط فہمیوں کے ازالہ کے لئے انہوں نے انگورہ سیواس ریلوے کے افتتاح کی تقریب کو موزوں موقع سمجھا کیونکہ مخالفین نے خاص طور پر ان کے ریلوے تعمیر کرنے کی پالیسی کی شکایت کی تھی۔ ان کا خیال ہے کہ عصمت پاشا موجودہ ترکی نسل پر بہت زیادہ بوجھ ڈال رہے ہیں اور ملک کا روپیہ خرچ کر کے اُسے سخت اقتصادی مشکلات میں پھنسا رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہمیں ابھی توقف کرنا چاہئے ہمیں اُس وقت تک انتظار کرنا چاہئے جب تک کہ غیر ملکی سرمایہ ہمارے اِن عظیم کاموں کو سرانجام دینے کے لئے نہ آ جائے۔"

عصمت پاشا کا جواب جو انہوں نے اپنی اس زبردست تقریر میں دیا یہ تھا کہ "انتظار کا نتیجہ جدید ترکی کی ہلاکت ہو گا۔ کہا جاتا ہے کہ مشرقی سرحد پر تین مرتبہ کردوں نے حملہ کیا ہے اور ابھی کل کی بات ہے کہ وہ پھر ہمارے سر پر آ پہنچے تھے کیونکہ آمد و رفت کا وہ ذریعہ جس سے ہم ان کا مقابلہ کر سکتے ہیں ہمارے پاس موجود نہ تھا۔ سات سال گزرے کہ مغربی تہذیب کے یہ مادی ذرائع انگورہ پر آ کر ختم ہو جاتے تھے۔ آج وہ سیواس تک پہنچ چکے ہیں، گویا اس سے چھ سو کلو میٹر آگے۔ آج غیر ملکی ریشہ دوانیاں اور وہ شرارتیں جو پانچ سال سے ہماری مشرقی سرحد پر ہو رہی تھیں اپنی آدھی طاقت کھو بیٹھی ہیں اور روز بروز اُن کی طاقت اور کم ہوتی جائے گی۔ ترکوں کو چھوڑ کر ترکی میں کوئی قابلِ ذکر اقلیت ایسی نہیں جسے الگ ایک آزاد قومی حیثیت قائم کرنے کا حق ہو۔ جب ہماری ریل کی سڑکیں مشرقی سرحدوں تک پہنچیں گی تو یہ بات خود بخود ظاہر ہو جائے گی اور کسی کو اس کے ماننے میں تامل یا سازشوں سے متاثر ہونے کی مجال نہ ہو گی۔"

عصمت پاشا نے بتایا کہ سیواس ریلوے کی آمد سے ترکی مدافعت ہر سرحد پر پہلے سے دگنی آسان ہو گئی ہے۔ اگر ترکی

پر کوئی حملہ ہوا تو وہ جلد تر اور کم تر نقصانات پر ختم ہو جائیگا۔ ملک کی قوت آج سات سال قبل کی بہ نسبت دگنی ہے۔ قوم نے انگورہ کو صحیح طور پر اپنا دارالحکومت بنایا تھا، لیکن انگورہ اناطولیہ کے مرکز میں نہیں تھا اس لئے ہمارا پہلا فرض یہ تھا کہ ہم یہاں سے مختلف سمتوں میں خصوصاً مشرقی سمت میں ریلوے تعمیر کریں۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ اس سے ہمیں محض فوجی اور دفاعی فوائد حاصل نہیں ہوئے بلکہ اقتصادی فوائد بھی ہوئے ہیں۔ ترکی کے آباد ترین اور زرخیز ترین علاقے ایک دوسرے کے ساتھ مل گئے ہیں اور دور و دراز مقامات کے فاصلے آدھے رہ گئے ہیں۔ انہوں نے اپنے سامعین کو یاد دلایا کہ جنگِ آزادی کے دوران میں مشرقی سرحدوں سے سامانِ جنگ وغیرہ چھ مہینے میں فوج تک پہنچتا تھا۔ اگر ترکوں کے پاس اُس وقت آج کی طرح ریلیں ہوتیں تو دشمن کو کبھی اُن کے ملک میں داخل ہونے اور ان کے ساتھ محض ایک غیر منظم قبیلہ کا سا سلوک کرنے کی جرأت نہ ہوتی۔

اس خیال کے خلاف کہ ترکی کو ان اخراجات کے اٹھانے میں ابھی توقف کرنا چاہئے تھا عصمت پاشا نے کہا کہ ریلوے قومی اتحاد، اقتصادی کامیابی اور ملکی حفاظت کے لئے ایک لابدی چیز ہے۔ یہ سچ ہے کہ اس وقت پیشِ نظر کوئی خطرہ نہیں تھا لیکن قومی اتحاد کے لئے خطرے ہمیشہ چھپے ہوئے ہوتے ہیں۔ وہ غیر متوقع طور پر ظاہر ہو جایا کرتے ہیں۔ ہمیں ان کے لئے ہر وقت تیار رہنا چاہئے۔

انہوں نے پوچھا "کیا تم سمجھتے ہو کہ قوم کے لئے ایک اعلیٰ اور ترقی یافتہ تہذیب کے مقام پر پہنچ جانا بچوں کا کھیل ہے؟ یہ بار نہ صرف موجودہ نسل پر پڑا ہے بلکہ ایک سو سال تک آنے والی تمام نسلیں اس سے متاثر ہونگی۔ جدید ترکی اب آگے بڑھ کر پیچھے نہیں ہٹ سکتا۔ ریلوے، آبپاشی اور بجلی پر تین کروڑ پونڈ سالانہ صرف ہوا کریں گے۔ ہم نے اس طرف بے سوچے سمجھے اور جلد بازی میں قدم نہیں بڑھایا بلکہ اس کی ضرورت محسوس کر کے اور دنیا کے سامنے ترکی کی قوت کا ثبوت پیش کرنے کے لئے بڑھایا ہے۔ اگر گزشتہ سات سال میں ایک لمحہ بھی ضائع کیا جاتا تو ہم سب کچھ کھو بیٹھتے اور ترکی پھر قعرِ مذلت میں جا گرتا۔"

آخر میں انہوں نے اس الزام کی تردید کی کہ اپنے عظیم الشان کام کے لئے قرض حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ انہوں نے سامعین سے پوچھا کہ کیا تم لوگ مجھ کو اتنا ہی احمق خیال کرتے ہو کہ مجھے باہر سے اچھی شرائط پر روپیہ ملتا اور میں اُسے واپس کر دیتا؟ حقیقت یہ ہے کہ آج تک مجھے کوئی ایسا سرمایہ دار نہیں ملا جس نے مجھے قابلِ قبول شرائط پیش کی ہوں۔ اس میں شک نہیں کہ روپیہ پیش کیا گیا مگر اس کی تہ میں سازشیں کام کر رہی تھیں۔ وہ ملک کے جسم میں ہر جگہ اپنی کی کوششیں تھیں۔ بعض سرمایہ دار عجیب مضحکہ خیز شرائط پر ترکی کی تعمیر شدہ ریلوے کو اپنے قبضے میں لانا چاہتے تھے۔ سو تم ہوشیار رہو اگر تم ایسی غلطی کر بیٹھے تو ترکی قوم ہمیشہ کے لئے تم پر لعنت بھیجا کرے گی۔

مسلم خواتین کی بیداری

حال ہی میں دمشق میں خواتین مشرق کی ایک کانگرس منعقد ہوئی ہے جس میں تمام بلادِ اسلامیہ کی عورتیں شامل تھیں۔ اس میں بڑی بحث و تمحیص کے بعد ایک تجویز یہ منظور ہوئی کہ

پردہ منسوخ کر دیا جائے اور عورتوں کو بے نقاب باہر آنے جانے کی اجازت ہو۔

یہ بھی فیصلہ کیا گیا کہ

دولہا اور دلہن کو شادی سے پہلے ایک دوسرے کو دیکھ لینے کی اجازت دی جائے۔

جہیز شادی کے لئے ضروری نہ ہو۔

مسئلۂ طلاق کی اصلاح کی جائے اور خاوند کی طرح بیوی کو بھی اس کا حق دیا جائے۔ موجودہ حالات میں خاوند کو اس معاملہ میں غیر محدود اختیارات حاصل ہیں۔

شادی کے لئے قانونی طور پر کم از کم اٹھارہ سال کی عمر مقرر کی جائے

دونوں اصناف کے بچّوں کے لئے ابتدائی تعلیم لازمی ہو۔

چودہ سال سے کم عمر کے بچوں کو کام میں نہ لگایا جائے۔

عربی تعلیم اور صنعت کو وسیع پیمانہ پر ترقی دی جائے۔

ہندوستان میں مسز شریفہ حامد علی نے مسلم خواتین کے حقوق کے متعلق مندرجہ ذیل شذرہ موتمرِ خواتین ہند کی ممبروں کو بھیجا ہے جو خواتین اس مجلس میں شامل ہیں میں اُن کی توجہ خاص طور پر اس امر کی طرف مبذول کرنا چاہتی ہوں کہ ایک مسلم خاتون ظلم، بدچلنی وغیرہ وجوہ کی بنا پر نہ صرف اپنے شوہر کو طلاق دے سکتی ہے بلکہ ایک طریق سے تعددِ ازدواج کو روک بھی سکتی ہے: اُسے حق حاصل ہے کہ وہ اپنے نکاح کے معاہدے میں یہ شرط لکھوا لے کہ اُس کا شوہر دوسری شادی نہیں کرے گا۔ تعددِ ازدواج کا خاتمہ ہو جائیگا کیونکہ شرط ٹوٹ جانے پر پہلی شادی منسوخ ہو جائے گی۔

ہمیں چاہئے کہ ہم اسلامی قانون کی تعلیم کو پھیلائیں تاکہ ہر اسلامی شادی کے موقع پر دلہن اور اُس کے رشتہ دار بہ نظرِ احتیاط ضروری شرائط پر مُصر ہو سکیں جس طرح دلہن کو "مہر" کا حق دیا گیا ہے بالکل اسی طرح اسے طلاق کا حق بھی ملنا چاہئے۔ مثلاً ان صورتوں میں کہ (ا) شوہر دوسری شادی کرے (ب) بیوی پر ظلم کرے (ج) بدچلنی اختیار کرے (د) اُن ازدواجی فرائض کے ادا کرنے سے انکار کرے جو اسلام نے اس پر عائد کر رکھے ہیں۔

عظمائے ثلاثہ کی ضروریاتِ تحفظ

اسلحہ کے متعلق ایک موتمرِ عمومی میں برطانیۂ عظمیٰ، فرانس اور جاپان کی ضروریاتِ تحفظ کا خاکا امیر البحر سر ہربرٹ

رچمنڈ (مسئلۂ تخفیف کے برطانوی ماہر) ڈاکٹر پال بینٹو نمائندۂ فرانس اور ریوسو کے سوروی نمائندۂ جاپان کی طرف سے یوں کھینچا گیا۔

امیر البحر رچمنڈ نے کہا کہ مسئلۂ تحفظ کے پیش نظر سلطنت برطانیہ کے بکھرے ہوئے مفادات کی حفاظت کا سامان بہم ہونا چاہئے۔ بحری بیڑے کی حیثیت برطانیۂ عظمیٰ کے لئے وہی ہے جو قدیم رومیوں کے لئے سڑکوں کے اُس نظام کی تھی جو یورپ کے طول و عرض میں پھیلا ہوا تھا۔ اس لئے برطانیہ کو سمندر میں آنے جانے کی آزادی درکار ہے تاکہ وہ اپنے دور افتادہ مورچوں کی حفاظت کر سکے۔

ڈاکٹر بینٹو نے کہا کہ فرانس کو زیادہ تر اپنی برّی سرحدات کے تحفظ کی ضرورت ہے لیکن اس وقت فرانسیسی افواج کا $\frac{3}{5}$ حصہ فرانس میں ہے اور باقی سمندر پار ہے۔

جب وہ یہ ذکر کر رہے تھے کہ فرانس لیگ کا ممبر ہے اور معاہدۂ لوکارنو میں شامل ہے تو انہوں نے کہا کہ واقعات معاہدہ کی شرائط کو غیر یقینی یا کمزور کر سکتے ہیں اور اس صورت میں ملک کو مدد کے انتظار میں نقصان نہیں پہنچنا چاہئے جیسا کہ پہلے کئی بار ہو چکا ہے۔ مثلاً جرمنی اور اطالوی سرحدیں ایسی ہیں کہ وہاں آویزش کا امکان ہے"۔

جاپان کے مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے مسٹر سوروی نے کہا "جاپان ایک جزیرہ ہونے کی حیثیت سے جس کی آبادی ہمیشہ بڑھتی رہتی ہے اور جو خوراک اور خام اشیا کے حاصل کرنے کے لئے سمندر پار کی تجارت پر مجبور ہے اپنی حالت کو روز بروز انگلستان سے مماثل پاتا ہے۔

"اگر جاپان کو اپنی قومی ہستی برقرار رکھنے کے لئے برّی اور بحری دونوں قسم کے راستوں کی حاجت ہے۔ جاپانی خطوطِ تحفظ جو جاپان کی کم از کم برّی بحری اور ہوائی قوتوں کا تعین کرتی ہیں وہ ایشیائی برّ اعظم کے ساتھ تجارت کی تین بڑی بڑی مدات میں شمار کی جا سکتی ہیں ان میں سب سے زیادہ اہم وہ راستہ ہے جو کوریا سے ہو کر منچوریا کو گیا ہے۔ یہ سوشیما کی آبناؤں کے آگے ایک سو دس میل اور فوسان سے مکدم تک ریلوے لائن پر مشتمل ہے۔

یہ برآمد کا وہ راستہ ہے جسے اپنے جسم و روح کا اتحاد برقرار رکھنے کے لئے جاپان ہمیشہ کھلا رکھنے پر مجبور ہے خواہ جنگ ہو یا صلح۔ صرف اس راستے کو کھلا رکھنے کے لئے اُسے پانی کے ایک سو دس میل کی حفاظت جہازوں کے ذریعہ سے اور کوریا سے منچوریا تک کی ریلوے لائین کی فوج کے ذریعہ سے کرنی پڑتی ہے۔

"منچوریا کی جنوبی ریلوے جاپان کی اقتصادی بقا کے لئے اُسی قدر اہمیت رکھتی ہے جتنی نہر سویز انگلستان کے لئے اور جتنی نہر پاناما ریاستہائے متحدہ امریکا کے لئے۔ پھر چین کے ساتھ ربط کا آخری ذریعہ ناگاساکی کے راستے سے اوساکا اور شنگھائی کا درمیانی بحری راستہ ہے چین میں ہماری زیادہ تر تجارت انہیں راستوں سے ہوتی ہے منچوریا اور چین خاص کے یہ دو راستے وہ

ہیں جنہیں جاپان بہرحال خلل اندازی سے محفوظ رکھنا چاہتا ہے۔

"اس لئے جاپان کے پاس کم از کم اتنا بڑا بحری بیڑا ہونا چاہئے جس سے ان آبناؤں کی حفاظت ہو سکے اور اتنی طاقتور فوج ہونی چاہئے جو کوریا اور منچوریا میں امن قائم رکھ سکے۔

کلیں اور بیکاری

کلوں کے رواج اور بیکاری کا آپس میں جو تعلق ہے اُس پر "سائنٹفک امریکن" کے ایک شذرہ میں یوں بحث کی گئی ہے:

بیکاری کا الزام ہمیشہ کسی نہ کسی حد تک کلوں کے رواج پر رکھا گیا ہے اور پہلے زمانے میں تو جہاں جہاں ہاتھ سے کام کرنے کا دستور تھا محنت صنعت میں دخل انداز ہونے کے لئے برسر پیکار بھی ہوئی ہے۔ آج کل بھی بہت سے ایسے قنوطی موجود ہیں جو کلوں کے بڑھتے ہوئے رواج پر لاحول بھیجتے ہیں اور انہیں شیطانی کارخانے سے کم نہیں سمجھتے۔ ان لوگوں کا حافظہ کمزور ہے، انہیں کئی دفعہ مزدوروں کے لئے کلوں کی منفعت کا مسئلہ سمجھایا گیا ہے مگر یہ اسے یاد نہیں رکھتے۔ اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اسے یہاں دہرا دیا جائے۔

کلوں کے ذریعہ سے ۱۹۲۵ء میں وہ کام ایک آدمی کر سکتا ہے جسے ۱۹۱۴ء میں ۱۱ء۳ آدمی انجام دیتے تھے۔ آج سے تیس برس پہلے جس کام کو دو سو نا آزمودہ کار آدمی کرتے تھے وہ آج سٹیم کے ایک بیلچے سے انجام کو پہنچ جاتا ہے۔ شیشے کی صنعت میں ایک کل چھ سو ماہر شیشہ سازوں کی جگہ لیتی ہے۔ ۱۹۲۰ء میں ایک ایسی کل ایجاد ہوئی جو خود بخود برقی روشنی کے بلب تیار کرتی تھی۔ اس کل نے ۹۹۴ آدمیوں کو سبکدوش کر دیا، اور اب اس میں اتنی اصلاح ہوئی ہے کہ اس سے دو ہزار آدمیوں کی بچیت ہو گئی ہے۔ اسی قسم کی اور بہت سی مثالیں ہیں۔

ان شمار و اعداد سے معلوم ہوتا ہے کہ قنوطیوں کا قیاس صحیح ہے، لیکن وہ صحیح نہیں۔ مزدوروں کی تعداد ۱۹۱۹ء اور ۱۹۲۷ء کے درمیان، آٹھ سال کے اندر پہلے کی بہ نسبت تین فی صدی بڑھ گئی ہے، لیکن بہت زیادہ اہم بات یہ ہے کہ ہماری پیداوار پچاس فی صدی بڑھی ہے! صنعت کے اس عروج کا نتیجہ یہ ہوا کہ مزدوروں کو پہلے سے زیادہ مزدوری ملنے لگی اور ساتھ ہی وہ محنتِ شاقہ سے بھی چھوٹ گئے۔ کام کے اوقات گھٹا دیئے گئے۔ پہلے بارہ گھنٹوں کے دس گھنٹے رہ گئے، پھر آٹھ اور اب تجویزیں ہو رہی ہیں کہ آٹھ کے بھی چھ گھنٹے کر دیئے جائیں۔ ہفتہ بجائے چھ دنوں کے پہلے ساڑھے پانچ دنوں کا کیا گیا اور اب تجویز ہوئی ہے کہ ہفتہ میں پانچ ہی دن کام کے مقرر کئے جائیں۔ گویا امریکن مزدور کے لئے اس کے کام کا ثمرہ بہتر تنخواہ اور زیادہ فرصت ہے۔ اور اگرچہ کلوں کی وجہ سے کسی قدر بے کاری بھی پیدا ہو جاتی ہے لیکن جو فوائد حاصل ہو رہے ہیں ان کے مقابلے میں اُس کی نسبت کچھ بھی نہیں۔

اقبال کی مثنویاں

ذیل کا مضمون آج سے بارہ سال پہلے ڈاکٹر عبدالرحمان بجنوری مرحوم نے "ایسٹ اینڈ ویسٹ" میں لکھا تھا۔ جس جوشِ بیان اور وسعتِ مطالعہ کا ثبوت اُن کے مقدمۂ دیوانِ غالب میں ملتا ہے اس میں بھی موجود ہے۔ علاوہ ازیں اقبال کے "پیغام" کے مختلف پہلوؤں پر اس مختصر مضمون میں جو جامع اور باترتیب تبصرہ انہوں نے کیا ہے شاید ہی اَور کسی جگہ کیا گیا ہو۔ (اکرام)

ہندوستان کی اسلامی ادبیات میں ایک بلند ترسطحِ خیال کی طرف روح کی پرواز غالب سے لے کر اس وقت تک برابر جاری ہے۔ غالبؔ حالیؔ اور اقبالؔ اقلیمِ سخن کے تین تاجدار ہیں۔ غالبؔ نے دورِ انحطاط کی بےحسی اور جمود کو مٹایا۔ اُس کی ایک بڑی خوبی شکوک پیدا کرنا تھا۔ مگر اس کا شک کامل تھا، اور اپنے شکوک کی صحت کی نسبت اسے کوئی شبہ نہ تھا۔ غالب کا شک ایک آگ کا شعلہ تھا جس نے ایک جہاں کو خاکستر کر دیا۔ مغلوں کی دہلی اُس کی شاعری کی ضربوں کے نیچے گری اور اُس کی آنکھوں کے سامنے ہندوستان میں اسلامی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔

حالی نے جس کے خون میں عرب شعرا کی حرارت تھی اسی بظاہر خوشنما جہان کو پاش پاش ہوتے دیکھا۔ اس دردناک نظارے نے اُسے خون کے آنسو رلائے مگر غم و اندوہ کے ساتھ ہی اُس نے اپنے اندر ایک نئی قوتِ تخلیق محسوس کی۔ اور جس دنیائے خیال کو اُس کے استاد نے برباد کر دیا تھا اُس کے کھنڈروں پر حالی نے ایک نئی عمارت کھڑی کرنے کا ارادہ کیا اور اپنے ذہن میں اُس کی تعمیر شروع کر دی۔ امید کی نمود کے ساتھ ایک نیا دورِ حیات شروع ہؤا اور بہت کچھ جو مٹ چکا تھا دوبارہ زندہ ہو گیا۔

اقبال کا کلام یاس و قنوط کے اثرات سے بالکل آزاد ہے اُس نے مشرقی ادبیات میں خود اعتمادی کی روح پھونکی ہے، اور ساری عمارت کو امید کی بنیادوں پر نئے سرے سے تعمیر کیا ہے۔ اقبال کا فلسفہ خوشخبری اور امید کا فلسفہ ہے۔ اس نے موجودہ ہندوستانی فضا کے مغربی اثرات کو ایک ایسی اخلاقی قوت کی مدد سے زیر کیا ہے جس کے ماخذ خالص اسلامی ہیں۔ اُس کی روحانیت نے اس دورِ مادیات کی خودغرضی

کو مفتوح بنا لیا ہے۔ اقبال اُس قافلے کا کارواں سالار ہے جو مکہ کے جاودانی شہر کی طرف رواں ہے۔ اقبال کے خیالات ایک نوجوان کے خیالات ہیں اور اس کی شخصیت کی بہترین مظہر اس کی فارسی مثنویاں اسرارِ خودی اور رموزِ بیخودی ہیں۔ مجھے اس بات کے کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ اقبال ہمارے درمیان مسیح بن کر آیا ہے اور اُس نے مُردوں میں زندگی کی روح پھونک دی ہے۔ اقبال کے اس پیغام کی اہمیت صرف مستقبل ہی صحیح طور پر آشکار کر سکتا ہے۔

زیرِ تنقید مثنویاں اُس غیر فانی تصنیف کا ایک جزو ہیں جو ختم ہونے پر اسلامی دنیا کی ایک مکمل ترجمانی ہو گی۔ اقبال کے خیال میں اسلام کے موجودہ عالمگیر زوال کی وجہ یہ ہے کہ اب مسلمانوں کے لئے یہ دنیا دنیائے عمل نہیں بلکہ افلاطون کی پیدا کردہ دنیائے تساہل ہے۔ حافظ اور افلاطون کے پیروؤں نے مسلمانوں کو اُس مسرت سے محروم کر دیا ہے جو تکمیلِ کار کے احساس سے ہوتی ہے اور اُس کی جگہ افسردہ تخیل کے ناقص احساسات دے دیئے۔ مسلمان پہلے ہیرے کی طرح سخت تھے اب کوئلے کی طرح نرم ہیں۔ خدا کے خوف سے اُن کے دل خالی ہو گئے ہیں اور غیر اللہ کے خوف نے اُن کے دلوں پر غلبہ پا لیا ہے۔ مگر توحیدِ الٰہی کا کامل یقین ماسوائے اللہ کے خوف کو زائل کر کے انسان کو دلیر اور مضبوط بنا دیتا ہے۔ اقبال نے اس امر کو "شیر اور اورنگ زیب" کی کہانی سے واضح کیا ہے۔ یہ نقطۂ نگاہ خالص اسلامی ہے اور اس کہانی کا اخلاقی مفہوم مسیحی لٹریچر کی شیر اور شیر کا کانٹا نکالنے والے انڈروکلیز کی کہانی کے مفہوم سے بالکل مختلف ہے۔

اسلام کی ایک خصوصیت روحِ مساوات ہے اسے سلطان مراد اور معمار کی تمثیل سے سمجھایا ہے ع

خونِ شہ رنگیں تر از معمار نیست

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اقبال تھوڑے ہی عرصے کے اندر اسلامی اصولوں کو اسی طرح نئے سر سے زندہ کرے گا جس طرح سونے کی راکھ سے کیمیاگر سونا بنا لیتا ہے۔ اقبال پر وہی اثرات کام کر رہے ہیں جن سے اس دور کے دوسرے مسلمان متاثر ہیں۔ مگر وہ اپنے متاخرین سے بہت آگے ہے اور کئی باتوں میں ان سے متفق نہیں۔ اقبال نہیں چاہتا کہ مسلمان بربادی کے شہر میں داخل ہوں خواہ اس شہر کا راستہ افلاطونِ اعظم ہی دکھلائے۔ وہ چاہتا ہے کہ مسلمان ٹھوس واقعات کا مقابلہ کریں۔ افلاطون ایک چنڈول ہے جو تخیل کے آسمان میں تیرتا ہے لیکن اقبال زندگی کے طوفان خیز سمندر کی لہروں پر سوار ہے۔

اقبال کا فلسفہ جدوجہد اور تحصیلِ مقاصد کا فلسفہ ہے۔ اُس نے افلاطون کی جو نکتہ چینی کی ہے وہ

افلاطون کے صوفیانہ پہلو کے خلاف ہے، جسے اُس کے پیروؤں نے اور بھی بڑھا دیا ہے۔ تمام افلاطونیوں میں بدترین انسانی کمزوری یعنی ارادہ کی کمزوری موجود ہے۔ اُن کا فلسفہ زندگی کے مقصد پر پردہ ڈال دیتا ہے اور اُس کی نشوونما کو روک دیتا ہے۔ یقیناً یہ راستہ ہلاکت کی طرف جاتا ہے۔ اقبال کے نزدیک زندگی ایک حقیقت ہے، اور ایک مسلمان کی ہستی سے بالاتر چیز کوئی نہیں۔ خدا خود اپنی کتاب میں فرماتا ہے کہ

ہم زمین پر اپنا خلیفہ بھیجنے والے ہیں

مسلمانوں کی غفلت اور مردہ دلی اقبال کو بہت ناگوار ہے۔ اور اُس کے خیال میں اس کی وجہ تصوّف کے حیات کُش اثرات ہیں۔ اس بحث میں اقبال کا کام ایک مجاہد کا کام ہے۔ اور اس کا مدِمقابل مشہور شاعر حافظ ہے۔ میرا اپنا خیال ہے کہ صحیح تصوف اربابِ راز کا اسلام ہے لیکن موجودہ تصوّف اسلام کے بعد پیدا ہوا ہے اور اُس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ اسلام کا بنیادی اصول توحید ہے۔ موجودہ تصوف کا پہلا اصول مسئلۂ وحدت الوجود ہے۔ موحد خدا کو قادرِ مطلق مانتا ہے، لیکن وحدت الوجودی کسی ہستی کے قادرِ مطلق ہونے سے انکاری ہے۔ ہارن کی رائے میں تصوّف بدھ مت اور زرتشتی خیالات کا آئینہ ہے۔ فان کریمر اس میں ویدانت کا اثر دیکھتا ہے۔ میرے خیال میں موجودہ تصوف افلاطونی اثرات کے ماتحت پیدا ہوا۔ مگر اس کی نشوونما آزادانہ ہوئی۔ صوفیوں کا تصورِ الٰہی اور افلاطون کا ادراک پذیر دنیا کا تصوّر ایک ہی ہے۔ صوفیوں کا وجدانی رقص روح کی نقل ہے جو افلاطون کے خیال کے مطابق ایک دائرہ ہے اور اپنے مرکز یعنی خدا کے گرد جذبۂ شوق کے ماتحت متحرک ہے۔ افلاطون اور صوفی مسئلۂ تخلیقِ عالم کی نسبت بڑی حد تک متفق ہیں نیز براؤن نے ثابت کیا ہے کہ صاحبِ فہرست اور شہرستانی فلاطینوس کی کتابوں سے واقف تھے۔

اسلام ان بیہودہ خیالات سے بالکل پاک ہے۔ خدا مادہ کا جوہر نہیں دونوں جہان کا مالک ہے اور اُس کی پیدا کردہ دنیا سراب کی طرح بے حقیقت نہیں۔ جس طرح لکڑی یا پتھر میں خدا کی تصویر نہیں بنائی جا سکتی اسی طرح جسمانی یا دماغی آنکھوں سے خدا کو نہیں دیکھ سکتے۔ شیخ احمد سرہندی اپنے ملفوظات میں لکھتے ہیں "اگر کوئی صوفی خیال کرے کہ اُس نے خدا کو ظاہری یا باطنی آنکھوں سے دیکھا ہے تو وہ غلطی پر ہے، یہ سب اُس کے فہم کا دھوکا ہے اور وہ شکل اس کی مجذوبانہ حالت کا نتیجہ۔ خدا بے مثال ہے اور ظاہر نہیں ہوتا۔ شریعت کا رستہ خدا کی طرف جاتا ہے۔ صوفی خود گمراہ ہیں اور دوسروں کو بھی غلط رستوں پر لے جا رہے ہیں۔ اقبال کے فلسفہ کا مقصد اعلیٰ اسلامی اصولوں کو اُن عناصر سے پاک کرنا ہے جو افلاطون سے لئے گئے ہیں اور جن کا لازمی نتیجہ نفیِ ہستی اور رہبانیت

ہے۔صوفیوں کے خیال میں دنیا ایک فریب ہے، خواب کے اندر ایک خواب۔ وہ زندگی کا سامنا کرنے کو آمادہ نہیں۔تصوف نے اسلام کی مساعی پسندی کو مٹا دیا ہے اور وہی اس مذہب کی جان تھی۔اقبال اپنے ہم مذہبوں کو عمل کی طرف واپس بلاتا ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ صوفی شعرا کے سرتاج مولانا روم کی مخالفت کے بجائے اقبال حافظ سے کیوں الجھتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ جب صوفی اپنے مشاہدات بیان کریں تو لازم ہے کہ وہ معمولی قابل فہم الفاظ استعمال کریں۔خیالات خواہ آسمانی ہوں زبان اِس زمین کی ہوتی ہے۔ اب اگر عشق آلٰہی کا اظہار شراب، موسیقی اور نسوانی حسن کے استعاروں سے کیا جائے تو اغلب ہے کہ ان سے حیوانی جذبات مراد لئے جائیں۔ لیکن سنائی، عطار، اور رومی کا طرز بیان ایسا ہے کہ اُس سے اصل مطلب واضح ہو جاتا ہے اور جسمانی جذبات مراد نہیں لئے جاتے۔وہ ہماری توجہ اس دنیا سے ہٹاتے ہیں مگر اس سے زیادہ ان کا ضرر کوئی نہیں لیکن خواجہ حافظ نے افیون کے ساتھ شراب بھی ملا دی ہے۔ دیوانِ حافظ میں عرفان کی روشنی اتنی نہیں جتنا نشہ ہے۔خواجہ حافظ کا مقصد انسان کو نقصان پہنچانا نہ تھا مگر اُن کے کلام سے اخلاق پر ضرور اثر پڑا ہے۔خواجہ حافظ کے ہاتھوں بہتوں نے مجاز کی شراب پی ہے، حقیقت کی فقط ایک آدھ نے۔

نکلسن نے دیوانِ غالب کے دیباچے میں لکھا ہے کہ آج کل صُوفی اس قدر گر گئے ہیں کہ وہ مرشد کو صفاتِ آلٰہی سے متصف کرنے سے دریغ نہیں کرتے۔ پیر کے کلماتِ کفر اور پیر کی بداخلاقیوں سے چشم پوشی کی جاتی ہے یہی نہیں اکثر اُن کی ستائش ہوتی ہے۔ان خیالات کا عوام الناس پر جو بُرا اثر پڑتا ہے وہ ظاہر ہے۔ اقبال اور صوفیوں کے درمیان کشمکش کی دوسری وجہ یہی ہے۔جب" اسرارِ خودی" شائع ہوئی تو کئی صوفی پیر جو کورانہ تقلید اور ناواقفیتِ شرع کے بدترین مظہر تھے اُٹھ کھڑے ہوئے "یہ کافر ہے۔ یہ تو مغرب کی مادہ پرستی سکھاتا ہے" اقبال حیران تھا کہ افلاطون کے مقلد اس پر مغربی خیالات سکھانے کا الزام لگاتے تھے۔لیکن وہ صوفی نادان نہیں تھے مکار تھے اور عوام الناس کو دھوکا دینا چاہتے تھے۔

ہندوستانی مسلمانوں کے لئے ایک اہم مسئلہ ملکی اور مذہبی حقوق کا ہے۔حبِ وطن اور اتحادِ بین المسلمین کے جذبات میں اکثر تصادم ہو جاتا ہے۔جہاں کہیں ایسا ہو اقبال کا نقطۂ نظر ایک پکے مسلمان کا ہے اور حقیقت میں اُس کی شاعری مسلمانانِ ہند کے خیالات کی ترجمانی ہے۔میکی اولی جس نے علاقہ وار حکومت کا خیال پیدا کیا اقبال کی نگاہ میں ایک مجرم ہے۔ اس لئے نہیں کہ اس کی کتاب "دی پرنس" جابر حاکموں کا

دستور العمل ہے بلکہ اس لئے کہ اُس نے ڈانٹے کی تصور کردہ سلطنتِ اعلیٰ کا خیال لوگوں کے دلوں سے محو کر دیا۔ میکی اولی نے روما کی عیسائیت کو اٹلی کی چار دیواری میں مقید کر دیا۔ اقبال نہیں چاہتا کہ دنیائے اسلام ملکوں کی تنگ حدود کی وجہ سے حصّوں میں تقسیم ہو جائے۔ اقبال کی سیاسیات محبت کی سیاسیات ہیں، خود غرضی کی نہیں۔ سیاسی زندگی کی اصل محافظ شریعت ہے، ملک ایک جغرافیائی صورتِ حالات ہے جو آئے دن تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ تواریخ کے واقعات ایک ملک کی حدود اور اُس کے باشندوں کے خیالات کو بدلتے رہتے ہیں۔ ایک ملک کی عمر بہت تھوڑی ہے۔ چند صدیوں سے زیادہ قیام اس کے لئے ممکن نہیں۔ اقبال کی تصور کردہ سلطنتِ اعظم غیر فانی ہوگی۔ لیکن اقبال کے خیال میں وطن کی محبت اور مذہب کی حمایت دو متضاد جذبات نہیں۔ اُس کی شاعری میں مذہب کا ہمہ گیر تخیل اور جذبۂ حبِ وطن ایک جا ہیں مگر اتنا فرق ہے کہ اُس کی ملکی خواہشات ایک مقصدِ اعلیٰ کے تابع ہیں۔ سیاسی اور مذہبی نقطۂ نگاہ کی اس آمیزش نے اقبال کے سیاسی فلسفہ کو ایک نئی اخلاقیات کا رتبہ دے دیا ہے۔

نٹشے کے خیال میں آرٹ کی دو قسمیں ہیں۔ ایک میں سکون اور خاموش تخیل ہوتا ہے دوسری میں بے قراری اور تڑپ۔ نٹشے کی کتاب قولِ زرتشت اور اسرارِ خودی اور رموزِ بیخودی دوسری قسم کی تصانیف ہیں۔ اِس سوال کا جواب کہ آیا اقبال پر نٹشے نے اثر کیا ہے میرے خیال میں اثبات میں ہے لیکن اقبال نے استعارِ نٹشے پر محنت کر کے اُسے قیمتی اور نادر بنا لیا ہے۔ اسرارِ خودی کی حکایتِ الماس و زغال قولِ زرتشت سے ماخوذ ہے لیکن اقبال نے پتھر کو تراش کر ایک ہیرا بنایا ہے جو یقیناً اس کا اپنا ہے۔ نٹشے کی طرح اقبال بھی آزادیٔ عمل اور آزادیٔ خیال کا حامی ہے۔ اقبال نے موجودہ نسل کو زندگی کا سامنا کرنے کی طاقت دی ہے۔ اُس کی مثنویوں نے لوگوں کے حوصلے بڑھائے ہیں اور امید ہے کہ اس کا نتیجہ عملی صورت میں ظاہر ہوگا۔

مردوں اور عورتوں کو اس طرح ہونا چاہئے کہ مرد لڑائی کے قابل ہوں اور عورتیں اُمومت کے" اقبال کے خیال میں نسوانیت اُمومت کے مترادف ہے "اے لوگو ڈرو اس خدا سے جس نے تمہیں اور تمہارے شریکِ حیات کو ایک نفس سے پیدا کیا اور دونوں میں سے بعضوں کو مرد اور بعضوں کو عورت . . . اور عورتوں کی عزت کرو" عورتوں کے لئے قابلِ تقلید زندگی فاطمۃ الزہرا کی ہے، جو رسولِ کریم کی بیٹی، علی کی بیوی اور شہیدانِ کربلا کی والدہ تھیں۔ جب اقبال عورتوں کو دیکھتا ہے تو اُس کی آنکھیں خاتونِ جنت کی طرف ہوتی ہیں جو رات دن اپنی امت کو دیکھ رہی ہیں اور دنیائے اسلام کو ایک آسمانی روشنی سے منور کر رہی ہیں۔ عورتوں کی نیک چلنی مذہب اور حکومت کا

سنگ بنیاد ہے۔ آزاد اور بے حیا عورتوں کا وجود قوموں کے تنزل اور تہذیب کے خاتمہ کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔

اقبال نے ایک اہم مسئلہ ملک کے سامنے پیش کیا ہے مگر اُس نے عمداً اس سوال کے تمام پہلوؤں پر بحث نہیں کی۔ معلوم نہیں کہ اقبال عورت اور مرد کو غیر مساوی حقوق دینے والے قانون کے نئے معنی ڈھونڈیگا یا پرانے قانون کی کوئی جدید فلسفیانہ تاویل پیش کرے گا۔ بہرحال اس موضوع پر اقبال کی رائے بہت دلچسپ ہوگی۔

اقبال کئی ایک باتوں میں روسو سے مشابہ ہے۔ وہ بھی روسو کی طرح اپنے ماحول میں ایک عظیم تبدیلی دیکھنے کا خواہاں ہے۔ لیکن جس عہدِ زریں کا خواب اقبال دیکھتا ہے اُس کا تصور اُس نے پیغمبر صلعم کے زمانے سے لیا ہے۔ روسو لوگوں کو سادہ زندگی کی تلقین کرتا ہے۔ اقبال بھی اپنے ہم مذہبوں کو دشتِ حجاز کی طرف بلاتا ہے۔ مغربی طرزِ معاشرت کی عیاری اور عیاشی اقبال کو بہت ناگوار ہے۔ اسلامی روایات عرب کی سادہ زندگی سے وابستہ ہیں۔ مسلمانوں کو چاہئے کہ اپنی طبعی خوبیوں اور شریفانہ خصلتوں کو برقرار رکھیں۔ یورپ کی غلامانہ تقلید کا ان پر وہی اثر ہوگا جو ماضی میں عجمی تمدن کی پیروی کا ہوا تھا۔ اجنبی تمدن کی غلامانہ تقلید ہر قوم کے لئے مہلک ہوتی ہے۔

مگر سوال پیدا ہوتا ہے کہ کس طرح ملتِ اسلامیہ کو عہدِ نبوت کے شاندار اصولوں پر منظم کیا جائے۔ اس کے لئے ہمیں تاریخ سے مدد لینی ہوگی۔ کسی قوم کی تاریخ اُس کے لئے وہی اہمیت رکھتی ہے جو ایک فرد کے لئے اس کا حافظہ۔ اسلام کی ساری سرگزشتِ زندگی (قومیت کے ابتدائی احساس سے اس وقت تک مسلمانوں کے خیالات، جذبات ارادے اور کارنامے) اُس کی تاریخ میں محفوظ ہیں۔ ان واقعات کا اعادہ ہونا چاہئے۔ طرزِ معاشرت کو سادہ بنایا جائے اور اسے تصنع، فرقہ وارانہ جذبات، بددیانتی اور خودغرضی سے پاک کرنا چاہئے۔ اخلاقی، ذہنی اور سیاسی بزدلی اسلامی شخصیت کو جڑ سے کھا رہی ہے۔ اس کا جلد خاتمہ ہونا چاہئے۔ اقبال ماضی کی طرف بلاتا ہے لیکن اُسے رجعت پسند نہیں کہہ سکتے۔ اُس کا مدعا تو زمانہ ماضی میں ایک خوشگوار صورتِ حالات دکھاتا ہے۔ اُس کے خیال میں سادہ اخلاقی تعلیم، مشکلاتِ زندگی کا دلیرانہ مقابلہ اور عرب قدیم کی شجاعانہ عادات اختیار کرنے سے مسلمان اپنے مذہب کی صحیح پیروی کر سکیں گے۔ اور ان کی حالت بہتر ہو جائے گی۔ جب مثنویوں کی یہ درست منطق ہر جگہ سمجھی جائے گی تو امید ہے اس سے اسلامی دنیا کو ایک نئی زندگی عطا ہوگی اور آیندہ عظمت کا راستہ کھل جائیگا۔ اقبال کو خدا نے چشمِ بصیرت عطا کی ہے اور وہ اسلام کے عہدِ زریں کی شان و شوکت ماضی اور مستقبل دونوں زمانوں میں دیکھ رہا ہے۔

ہندوستان میں بعض لوگ پوچھتے ہیں کہ مثنویاں بجائے اردو کے فارسی میں کیوں لکھی گئی ہیں - وجہ یہ ہے کہ اقبال اُن برگزیدہ آدمیوں میں سے ہے جو وقتاً فوقتاً ایک عظیم مشن لے کر پیدا ہوتے ہیں - اُس کا مشن فقط ہندوستان کے لئے نہیں ساری دنیائے اسلام کے لئے ہے - یہ مثنویاں مدرسوں میں سعدی کی بوستان کی جگہ پڑھائی جائیں گی اور دہلی، کابل، طہران کی جامع مسجدوں میں مثنوی مولانا روم کی جگہ اسرارِ خودی اور رموزِ بیخودی کے اشعار سنائے جائیں گے -

پہلی مثنوی حقیقت سے زیادہ قریب ہے - دوسری میں قیاس کا عنصر غالب ہے - رموزِ بیخودی میں بالخصوص اس کے دوسرے نصف میں تمثیلیں تھوڑی ہیں جس کی وجہ سے نفسِ مضمون اتنا واضح نہیں مگر مصنف یہ نقص دوسرے ایڈیشن میں رفع کر سکتا ہے - اقبال نے فارسی لٹریچر کا رخ تصنع سے مستند طرزِ تحریر کی طرف پھیرا ہے اور فارسی کے قدیم شعرا کی پیروی کی ہے - اساتذہ کے طرزِ تحریر کی طرف اقبال کی بازگشت اس وجہ سے ہوئی کہ وہ بیدل اور اس کے پیروؤں کے کھوکھلے تصنع کے خلاف ہے جس میں ایک طرح کی دلکشی ضرور ہے لیکن جان بالکل نہیں - اقبال کی طرزِ تحریر مثنوئی معنوی سے زیادہ مشابہ ہے - اس کے الفاظ تلوار کے قبضے میں جڑے ہوئے ہیروں کی طرح چمکتے ہیں - بیدار شدہ مشرق کی روح کو ایک جسم کی تلاش تھی جو اقبال کی شاعری نے مہیا کر دیا - اُس نے فارسی شاعری کی "عروقِ مردہ" میں "خونِ زندگی" دوڑا دیا ہے اور اپنے شعروں میں شیرینیٔ کلام اور پُرشوکت طرزِ ادا کو یکجا کیا ہے - جو ایک آسان کام نہیں - مثنویوں کی زبان پُرشوکت ہے مگر رواں بھی بے حد ہے - اور ان دنوں جب کہ فارسی زبان ایران میں تنزل کر گئی ہے اسرار و رموز کی زبان وہی ہے جو فارسی کے عہدِ شباب میں تھی - فارسی ادب ایک نازک مرحلے سے گزر رہا ہے اور ایک طرف جب کہ اس کا معیار ایران میں گر چکا ہے - ہندوستان میں عصائے موسوی کی ضرب سے چٹان پھٹی ہے اور بنی اسرائیل کے بارہ چشموں کی طرح ایک نئی کوثر بہنی شروع ہو گئی ہے -

(عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم)

مترجمہ
شیخ محمد اکرام، ایم اے

اقبال

تلخیِ ایّام سے جب تنگ آ جاتا ہوں میں
اور پیکارِ عمل کا حوصلا ہوتا نہیں

جب ہجومِ یاس ہوتا ہے سکوں آموزِ دل
جب دلِ مایوس وقفِ مدّعا ہوتا نہیں

جب دلِ ہنگامہ آرائے جہانِ آرزو
سوز و سازِ زندگی سے آشنا ہوتا نہیں

جب بھٹک جاتا ہوں راہِ منزلِ مقصود سے
رہنمائے شوق میرا رہنما ہوتا نہیں

شہریاری کے طلسمِ حرص کا ہو کر اسیر
شوقِ آزادی سے جب میں آشنا ہوتا نہیں

ہو کے بیخود جب کلیسائی فضاؤں میں کبھی
پیروِ دینِ متینِ مصطفےٰ ہوتا نہیں

جب سکوتِ مرگ ہوتا ہے مرے جذبات پر
زندگی کا دل میں کوئی ولولہ ہوتا نہیں

بے دلی میں جب مرے احساس مٹ جاتے ہیں سب
اور ذوق و شوق مجھ کو شعر کا ہوتا نہیں

جب حسینانِ جہاں کا بھی جمالِ جاں فروز
ذوق افزائے دلِ بے مدعا ہوتا نہیں

نغمہ و صہبا و فرشِ سبزہ و سرو و سمن
کوئی بھی عیشِ جہاں کلفت ربا ہوتا نہیں

تیرے نغمے پھونکتے ہیں مجھ میں افسونِ حیات
موجزن ہوتا ہے رگ رگ میں مری خونِ حیات

جلال الدین اکبر

یورپ میں وسطِ ایشیا کا تعارف

تیرھویں صدی ختم ہو رہی تھی کہ ایک روز شام کے وقت وینس کی خوبصورت بندرگاہ پر ساحلِ لبنان سے واپس آنے والے ایک جہاز سے تین آدمی اتر کر شہر کی طرف روانہ ہوئے۔

اُن کی شکستہ حالی اُن کے پھٹے ہوئے کپڑے، اُن کی عجیب و غریب وضع اُن کے سنولائے ہوئے چہرے غرض ہر چیز ظاہر کر رہی تھی کہ برسوں کے سفر کے بعد وطن کی طرف واپس آئے ہیں۔ ان میں دو معمر تھے جن کی آنکھیں گوناگوں مناظر دیکھ دیکھ کر پتھرائی ہوئی نظر آتی تھیں، اور تیسرا جوان تھا جس کا کشیدہ قامت، دراز زلفیں، سیاہ لمبی داڑھی اور بے چین متجسس نظریں دیکھنے والوں کو بے اختیار اپنی طرف متوجہ کر رہی ہیں۔

چوبیس سال کی طویل مدت کے بعد ان کو وینس کی دلفریبی میں کوئی کمی محسوس نہ ہوتی تھی۔ بازار گاہ پیازا سے گزرتے ہوئے انہوں نے دیکھا کہ قسطنطنیہ سے آئے ہوئے چاروں عالیشان سنگین گھوڑے اپنی قدیم جگہ پر قائم تھے۔ عکرہ سے آتے ہوئے مرمریں ستون بھی وہیں نصب تھے جہاں یہ لوگ ان کو چوبیس سال قبل چھوڑ کر گئے تھے۔ ریشمی کپڑا بننے والوں، جوہریوں، آئینہ سازوں، علاج تراشوں، شمشیر سازوں اور صیقل گروں کی دکانیں بدستور سابق اپنی پوری آب و تاب پر تھیں۔ گرم مسالوں کی تیز خوشبوؤں سے ہوا معطر تھی اور وینس کی منڈی میں جزائر شرق الہند سے اس نئی تجارت کی ابتدا کا پتہ دے رہی تھیں۔ شہر کے اندر بے شمار نہروں پر سینکڑوں کشتیاں مالِ تجارت سے لدی ہوئی دور دراز ممالک سے چلی آ رہی تھیں اور مختلف مقامات پر اپنا مال اتار رہی تھیں۔ ایک جنگی بیڑا جنیوا پر حملہ کرنے کے لئے روانگی کے احکام کا انتظار کر رہا تھا۔

اب آفتاب غروب ہو چکا تھا اور وینس کے خوبصورت چہرے پر تاریکیٔ شب کا نقاب پڑ چکا تھا مگر جا بجا نہروں پر کشتیوں کی روشنیاں بے شمار کرمہائے شب تاب کی طرح جگمگا رہی تھیں۔

ہمارے تینوں مسافر فی الحقیقت شہرۂ آفاق تاجرانِ وینس اور سیاحانِ ایشیا موسوم بہ "پولو" ہیں۔ جوان کا نام مارکو پولو ہے اور دونوں بوڑھوں میں سے ایک اُس کا باپ نکولو پولو اور دوسرا چچا میفیو پولو ہے۔ یہ تینوں وینس کی شاہراہوں سے گذرتے ہوئے بالآخر ایک عالی شان مکان کے سامنے ٹھہرے۔ انہوں نے اپنی

قیام گاہ کو پہچان کر اندر داخل ہونا چاہا مگر نوکروں نے اُن کو دروازے ہی پر روک دیا۔ اِدھر یہ باوازِ بلند مکان پر اپنی ملکیت کا دعویٰ پیش کر رہے تھے اُدھر نوکروں کو انکار پر اصرار تھا۔ ہمسائے بھی یہ شور وغل سُن کر جمع ہو گئے۔ اُن کی چوبیس سال کی غیر حاضری کے دوران میں ان کا ایک دور کا رشتہ دار اُن کے مکان پر قابض ہو چکا تھا اس شور و شغب نے اُس کو بھی اس ہنگامہ کی طرف رجوع کیا۔

"مارکو تو سترہ سال کا ایک لڑکا تھا۔ یہ شخص جس کو تم مارکو بتاتے ہو چہل سال معلوم ہوتا ہے"

"ہم کو وینس چھوڑے چوبیس سال ہو چکے ہیں کیا اس عرصہ میں مارکو کو چہل سال نہ ہو جانا چاہئے؟"

"چوبیس سال تک تم کہاں دھکے کھاتے رہے کہ آج یہاں آکر مکان کے دعوے دار بنتے ہو؟"

اس سوال کے جواب میں مارکو پولو نے اپنی طویل سیاحت کا ذکر کرتے ہوئے بیسیوں ایسے شہروں کے نام لئے جو وینس کے باشندوں کے لئے پرستان کے شہروں سے کچھ کم عجیب و غریب نہ تھے۔ مگر جب انہوں نے غیر ممالک میں سفر کرنے کے پروانے دکھائے اور بدخشاں کے لعل اور ترکستان کے یاقوت اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش کئے تو مکان کے اندر داخل ہونے کی اجازت مل گئی۔

چند ہی روز میں تمام وینس ان سیاحوں کی حیرت انگیز داستانوں سے گونج رہا تھا۔ ملّاحوں، قلیوں، دباغوں، نداّفوں میں شب و روز یہی چرچے تھے۔ ایک ایک واقعہ بار بار بیان کیا جاتا تھا۔

"میاں کچھ اور بھی سنا؟ یہ لوگ بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے ایسی بھیڑیں دیکھی ہیں جن کی دُمیں بیس بیس سیر کی ہوتی ہیں!"

"بھئی ہمیں تو یقین آتا نہیں۔ یہ بھی تو بیان کرتے ہیں کہ چین میں لوگ زمین سے پتھر کھود کر جلاتے ہیں۔ تاتاری اپنے محلات کو پہیوں پر لڑھکاتے پھرتے ہیں۔ نمک کا پہاڑ انہوں نے بچشم خود دیکھا ہے اور ایسے چشمے دیکھے ہیں جن کا پانی تیل کی طرح جلتا ہے۔ ایسی اُون دیکھی ہے جو آگ میں جلتی نہیں۔ ایسے سانپ دیکھے ہیں جو تیس تیس فٹ لمبے ہوتے ہیں"

"کل تو ان میں سے ایک بیان کر رہا تھا کہ چین میں گرم شراب پیتے ہیں"

"مگر ان میں سب سے زیادہ حیرت خیز وہ واقعات ہیں جو یہ خاقانِ چین کے متعلق بیان کرتے ہیں کہ اُس کے پاس لاکھوں سپاہی ہیں۔ اُس کے باغات لاکھوں میل میں پھیلے ہوئے ہیں۔ لاکھوں خادم اُس کی خدمت کرتے ہیں۔ غرض یہ کہ ہر چیز لاکھوں کی تعداد میں اُس کے پاس موجود ہے۔ اُس کی عظمت کا معیار یہ بتایا جاتا ہے

کہ تمام سلطنت میں صرف بارہ آدمی اُس کی ملاقات کا شرف حاصل کر سکتے ہیں۔ مارکو کہتا ہے کہ خاقان نے اُس کو اپنا سفیر بنا کر مختلف ممالک میں بھیجا۔ اور پھر ایک شہر کا حاکم مقرر کیا۔"

جب لوگوں کا اشتیاق حد سے تجاوز کر گیا تو ایک روز انہوں نے باشندگانِ وینس کو دعوت دی، اور اس تقریب پر اپنے مکان کو خوب آراستہ کیا۔ لوگ کھانا کھانے کے لئے ہاتھ دھو چکے تو تینوں سیاح ایک شہ نشین پہ لوگوں کے سامنے قرمزی ساٹن کی قبائیں پہن کر نمودار ہوئے۔ پھر ان کو اتار کر قینچی سے پارہ پارہ کر ڈالا اور ٹکڑوں کو حاضرین میں تقسیم کر دیا۔ اس کے بعد قرمزی رنگ کی حریری قبائیں پہن لیں۔ پھر ان کو بھی چاک چاک کر کے ان کے ٹکڑے سب میں تقسیم کر دیئے۔ اس دفعہ انہوں نے نہایت خوبصورت مخمل کی قبائیں زیبِ تن کیں لیکن تھوڑے سے وقفہ کے بعد ان کو بھی کاٹ کر دھجیاں کھانا کھانے والوں میں بانٹ دیں اور خود وینس کے رائج الوقت لباس میں ملبوس ہو گئے۔ لوگ کھانے سے فارغ ہو چکے تو ہمارے تینوں سیاح پھر کمرے کے اندر آ گئے اور وہی پھٹے پرانے عجیب الوضع کپڑے پہن کر نمودار ہوئے جن کو وہ جہاز سے اترتے وقت پہنے ہوئے تھے۔ حاضرین کے استعجاب کی انتہا نہ رہی۔ جب انہوں نے ان کپڑوں کی سلائیاں چاقو سے کھول ڈالیں اور اُن کی تہوں سے لعل بائے درخشاں سینکڑوں کی تعداد میں بکھر گئے۔ یہ جواہرات اس خوبی سے تہوں کے اندر سلے ہوتے تھے کہ ایک لمحے کے لئے بھی کسی کو یہ شبہ نہ ہو سکتا تھا کہ ان گدڑیوں میں اس قدر لعل پوشیدہ ہونگے۔ اس دعوت نے آخر پوری طرح ثابت کر دیا کہ یہ لوگ واقعی وینس کے جوہری پولو ہیں۔ مگر لوگوں نے مارکوپولو کے اس بیان پر مشکل سے اعتبار کیا کہ یہ بے شمار اور بیش بہا جواہر اس طرح حاصل ہوئے تھے کہ جو دولت قبلائی خان نے ان کو عطا کی تھی وہ انہوں نے جواہرات کی شکل میں تبدیل کر لی تاکہ اس کا لے جانا دشوار نہ ہو۔

لباس اور جواہرات کی اس نمائش کے بعد مارکو نے اپنے سفر کے تحیر خیز واقعات تفصیل کے ساتھ یوں بیان کئے ہونگے کہ وہ یورپ کا پہلا باشندہ ہے جس نے ایشیا کے وسیع طول و عرض میں اِدھر سے اُدھر تک سفر کیا، کوہستانِ پامیر کے خطرناک دروں کو عبور کیا، بارہا خونخوار خانہ بدوش اقوام سے جان بچا کر لے گیا، بدخشاں کی سنسان گھاٹیوں سے گذرا اور صحرائے گوبی کے بے آب و دانہ میدانوں کو پامال کیا۔

اس کے بعد مارکو نے الف لیلہ کے بغداد، پُراسرار منگولیا، ختن کے جواہر خیز دریاؤں، افغانستان کی بلند سطوح مرتفع وغیرہ ایسے امور کے متعلق ذکر کیا ہوگا جن سے اُس وقت یورپ کے لوگ قطعاً ناآشنا تھے۔

پھر مارکو نے تبت کی گندگی، جاپان کی غرابت، برہما کے مندروں اور ہندوستان کے جواہرات کی کانوں

کے متعلق عینی شہادت پیش کی ہو گی۔

پھر اُس نے چین کے بڑے شہروں، چوڑے دریاؤں اور عجیب پیداواروں کا ذکر کیا ہو گا۔ سب کے بعد یہ بھی ضرور بتایا ہو گا کہ قبلا۔ئی خاں دنیا کا سب سے بڑا اور با اقتدار بادشاہ ہے جس کی وسیع سلطنت تمام ایشیا پر دریائے والگا سے دریائے زرد تک اور سائبریا کے برفانی میدانوں سے پنجاب کے زرخیز میدانوں تک پھیلی ہوئی ہے۔

"جب یہ خاقان شکار کے لئے جاتا ہے تو دو امیر اُس کے ہمرکاب ہوتے ہیں۔ اور اُن میں سے ہر ایک کے ماتحت دس ہزار سپاہی ہوتے ہیں۔ ان فوجوں میں سے ایک سرخ وردی پہنے ہوئے ہوتی ہے اور دوسری اُودی۔ جب خاقان کی سواری روانہ ہوتی ہے تو ان امیروں میں سے ایک مع اپنے دس ہزار سپاہیوں اور پانچ ہزار کتوں کے داہنی طرف ایک قطار بنا کر چلتا ہے۔ اور دوسرا اسی طرح بائیں طرف چلتا ہے۔ یہ دونوں فوجیں شانہ سے شانہ ملائے پورے ایک دن کی مسافت میں پھیلی ہوئی ہوتی ہیں اور کوئی جانور ایک دفعہ ان کے حلقے میں آکر پھر باہر نہیں جا سکتا۔ ایسے موقع پر اس شکار کے جلوس کا شان وشکوہ قابل دید ہوتا ہے۔ ایک طرف کتوں کا ایک غول کسی ریچھ کے پیچھے بھاگا جاتا ہے۔ دوسرا غول ایک کالے ہرن کو گھیر رہا ہے۔ خود خاقان ایک لکڑی کی عالی شان عماری پر سوار ہے جس کو چار ہاتھی اپنی پشت پر اٹھائے ہوئے ہیں۔ عماری کی سنہری دیواریں سورج کی روشنی میں دیکھنے والوں کی نظروں کو خیرہ کر رہی ہیں۔ خاقان کے پاس ایک درجن بڑے بڑے شکاری باز عماری کے اندر موجود ہیں۔ جوں ہی شکار نظر آیا بادشاہ نے عماری کی چھت کھلوا کر ایک باز اُڑایا اور بادشاہ کی نظروں کے سامنے شکار پکڑا گیا!"

اسی رات مارکو نے مندرجہ ذیل حکایت بھی بیان کی ہو گی جس کی وجہ سے اُس کے تمام سابقہ بیانات ناقابل یقین قرار دئیے گئے ہونگے۔

"خاقان کے محل کے گرد جو پیکین میں واقع ہے دیواروں کی ایک بھول بھلیاں ہے۔ جو درحقیقت ایک چینی چیستان کی طرح ناقابل فہم ہے۔ بیرونی دیوار کے ایک ایک ضلع کا طول آٹھ آٹھ میل ہے۔ اس دیوار اور خندق اور اندرونی دیوار کے درمیان چھاؤنی ہے۔ دوسری دیوار کے اندر آٹھ بڑی بڑی عمارتیں ہیں جن میں سامانِ حرب رکھا جاتا ہے۔ مثلاً ایک میں زین لگام ورکاب اور دیگر نیزہ بازی کا سامان رہتا ہے اور دوسری میں تیر کمان ترکش زرہ تیراندازی کا سامان اور کچھ اور متفرق چیزیں۔ دوسری دیوار کے بعد ایک تیسری ۲۵ فٹ اونچی دیوار حائل ہے جس کے اندر آٹھ عمارتیں ہیں۔ ان میں بادشاہ کا توشہ خانہ رہتا ہے۔ اس تیسری دیوار کے پیچھے

ایک چوتھی دیوار ہے جس کے اندر شاہی محلات ہیں۔ یہ محلات اپنی عظمت کے لحاظ سے صفحۂ عالم پر عدیم المثال ہیں اور سنگِ مرمر کی ایک بلند اور وسیع کرسی پر تعمیر کئے گئے ہیں۔ محل کے کمروں کی دیواروں پر طلائی ملمع کیا گیا ہے اور پتھر تراش کر اژدھوں، درندوں، چڑیوں، سپاہیوں کی شکلیں اور گوتم بدھ کی مورتیں بنائی گئی ہیں۔ اسی طرح مرتفع چھتیں بھی روپہلی اور سنہری بیل بوٹوں سے مرصع ہیں، اور محلات تک پہنچنے کے لئے ہر طرف مرمریں زینے بنے ہوئے ہیں۔

"ان محلات کے سب سے بڑے ہال کی وسعت کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ خاقان اس ہال میں چھ ہزار مہمانوں کو ایک وقت میں کھانا کھلا سکتا ہے۔ اس ہال کے چاروں طرف بے شمار چھوٹے چھوٹے ہال اور کمرے بنے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک طرف کے کمرے صرف بادشاہ کے خزانے رکھنے کے کام آتے ہیں، جن میں سونے چاندی کی اینٹیں اور برتن، جواہرات اور موتی، بیویاں اور لونڈیاں رہتی ہیں محل کی چھتوں پر باہر کی طرف سرخ، سبز، فیروزی اور بنفشئی روغن پھرا ہوا ہے۔ سورج کی شعاعوں کے انعکاس سے یہ چھتیں بلور کی طرح چمکتی ہیں اور میلوں کے فاصلے سے نظر آتی ہیں۔ اسی طرح کھڑکیوں کے شیشے بھی اسی قسم کی رنگ آمیزی سے سجائے گئے ہیں۔

"خاقان کے محلات و باغات کا انتظام اور اس کی وسیع سلطنت کے نظم و نسق میں محض وحشیانہ شان و شوکت ہی نہیں۔ بلکہ اُس کے دیکھنے سے ایک اعلیٰ تہذیب و تمدن کا پتہ چلتا ہے۔ فصیلوں کے درمیان کے میدانوں میں جا بجا درخت لگائے گئے ہیں جن میں شکار کھیلنے کے لئے ہرن چھٹے ہوئے ہیں۔ سڑکیں سرسبز میدان سے تین تین فٹ بلند ہیں اور ان پر پتھر کا ہموار فرش بنا ہے تاکہ بارش کا پانی یا کیچڑ ان پر نہ ٹھہرے بلکہ اِدھر اُدھر کی زمین میں بہہ کر اُس کو زرخیز بنائے۔

"یہاں قابلِ دید چیزوں میں سے ایک وسیع اور بلند ٹیلا تھا۔ خاقان جہاں کہیں عمدہ درخت کی خبر سنتا تھا اس کو وہاں سے اکھڑوا کر اور ہاتھیوں پر مع شاخ و بُن اٹھوا کر اس ٹیلے پر نصب کرا دیتا تھا۔ اس ٹیلے کی چوٹی پر ایک خوبصورت عمارت بنی ہوئی تھی جہاں سے کوسوں دور تک کا منظر نظر آتا تھا۔ جن مقامات سے یہ درخت منتقل کئے گئے تھے وہاں کی زمین کھد کر بڑے بڑے تالاب بن گئے تھے، اور ان ہی تالابوں میں سے ایک میں خاقان کی مچھلیوں کے ذخائر رہتے تھے۔"

وینس کے لوگوں نے ان واقعات کو سن کر مبالغہ خیال کیا۔ مگر جب مارکو پولو نے یونان (چین)، سیام، سماترا،

جاوا، لنکا کا ذکر شروع کیا تو سب یہ سمجھ کر ہنس دیئے کہ محض من گھڑت افسانے سنا کر سامعین کو خوش کرنا مقصود ہے۔ لطف یہ ہے کہ وینس کے بازاروں میں گولکنڈے کے ہیروں، لنکا کے موتیوں اور جاوا کے گرم مسالوں کی خرید و فروخت ہر وقت جاری تھی۔ امرا چین کے ریشم پہن کر ہم چشموں میں فخر کرتے تھے اور ایران کے اونی قالینوں سے وینس کے بیشتر محلات آراستہ تھے۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ وینس بحیرۂ روم میں ان اشیا کی تجارت کا آڑھتی تھا جو اقصائے مشرق سے آتی تھیں اور یورپ میں کثیر نفع پر فروخت ہوتی تھیں۔ وینس کے تاجر ان چیزوں کو فلسطین اور شام کی بندرگاہوں پر مسلمان تاجر قافلوں سے خرید کرتے تھے یا اسکندریہ کی بندرگاہ پر خریدتے تھے جہاں ممالیکِ مصر اس قدر زبردست ٹیکس وصول کرتے تھے کہ ان چیزوں کی اصلی قیمت پر دو سو فی صدی کا اضافہ ہو جاتا تھا۔

مارکو پولو کے قابلِ یادگار سفرِ چین نے یورپ کی جغرافیائی معلومات میں جس قدر اضافہ کیا باستثنائے کولمبس کسی ایک سیاح نے نہیں کیا۔ اس سفر کا باعث قبلائی خان کی رواداری اور بلند نظری ہوئی۔ اسی کی بدولت مارکو نے وسطِ ایشیا کے ہولناک بیابانوں اور خونخوار قبائل کے باوجود اپنی سیاحت کو ممکن بلکہ کامیاب بنایا۔

نکولو پولو اور میفیو پولو نے اول بار سنہ ۱۲۶۶ء میں قبلائی خاں سے ملاقات کی۔ قبلائی خاں نے ان کو دعوت دی کہ وینس جا کر اپنے ہمراہ ایک سو عیسائی مبلغین لے آئیں تاکہ وہ تاتاریوں میں عیسائی مذہب کی تبلیغ کریں۔ مگر یہ دونوں سوداگر وینس آ کر دو سال تک تو نئے پوپ کے انتخاب کا انتظار کرتے رہے اور بالآخر صرف دو عیسائی پادریوں کو اپنے ہمراہ تاتار جانے پر آمادہ کر سکے اور یہ بھی آرمینیا کے فسادات کی خبر سن کر راستے ہی سے واپس چلے گئے۔ عیسائی دنیا آج تک کفِ افسوس ملتی ہے کہ کاش سو عیسائی مبلغین اُس وقت بھیج دیئے جاتے اور آج تمام چین عیسائی ہوتا۔

بہر حال مارکو، نکولو اور میفیو تینوں جوہریوں نے اپنا یہ بڑا سفر بندرگاہ ایاس سے جو ساحلِ لبنان پر واقع ہے شروع کیا۔ اور مشرقی ٹرکی یا اناطولیہ سے گذرتے ہوئے انہوں نے چاندی کی کانیں دیکھیں پھر کوہِ جودی کے گرد گھومتے ہوئے جارجیا میں داخل ہوئے تو انہوں نے ایسے قدرتی چشمے دیکھے جن سے بجائے پانی کے تیل برآمد ہوتا تھا جو کھانے کے کام تو نہ آتا تھا مگر جلانے کے کام آتا تھا یا خارش کے مریض اونٹوں کے جسم پر ملا جاتا تھا۔

زمانۂ حال کی عکسی تصاویر مارکو کے اس بیان کی تصدیق کرتی ہیں کہ جارجیا کے لوگ نہایت قوی ہیکل ہوتے

ہیں اور تاریخیں دربند کی آہنی دیوار کے متعلق اُس کے بیانات کی سچائی پر شاہد ہیں۔

پھر اس سفر کے دوران میں مارکو تفلس میں ریشمی کپڑے کی صنعت اور موصل میں سوتی کپڑے کی صنعت کا ذکر کرتا ہے۔

یہ لوگ تبریز کے مقام پر ایران میں داخل ہو کر قزوین پہنچے اور وہاں سے یزد کا سفر کیا، جو موجودہ زمانے کی طرح اُس وقت بھی ریشم بافی کا مرکز تھا۔ مارکو نے یہاں کی عورتوں اور لڑکیوں کے بنے ہوئے ریشمی کپڑوں کی خوبصورتی، نرمی، چمک اور مرصع کاری کی تعریف کی ہے۔ یزد سے ہمارے مسافر کرمان پہنچے جہاں تلوار، خنجر، تیر اور کمان خوب بنتے تھے۔

انہوں نے کرمان اور ہرمز کی وادی دیکھی جہاں کھجور اور پستے کے درخت بے شمار اُگے ہوئے تھے۔ یہاں انہوں نے ایک قسم کا تیتر دیکھا جس کے پر سفید و سیاہ تھے اور پنجے اور چونچ سرخ تھی۔ یہیں انہوں نے پہلی بار کوہان والے بیل دیکھے اور ایسی بھیڑیں دیکھیں جن کی دُمیں بیس بیس سیر کی تھیں (یعنی دنبے)

یہاں قصبوں کے گرد مارکو نے اونچی اونچی مٹی کی دیواریں دیکھ کر سبب دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ اس علاقے میں ڈاکے بکثرت پڑتے ہیں۔ ڈاکو ایک خاص وحشی قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں جو کچھ ایسے منتر جانتے ہیں کہ ان کے پڑھنے سے ایک تند و تاریک آندھی اُن کے پیش پیش چلتی ہے اور اس طرح یہ لوگ اچانک قصبوں اور قریوں پر حملہ کرتے ہیں۔ بوڑھوں کو قتل کر دیتے ہیں اور جوانوں کو غلام بنا کر بیچ دیتے ہیں۔ بعد کی تحقیق سے ثابت ہوا کہ اس قسم کی آندھیاں بکثرت اس وادی میں چلا کرتی ہیں اور یہ ڈاکو خود ان کو پیدا نہ کرتے تھے بلکہ ان سے فائدہ اٹھاتے تھے۔

ہرمز کی بندرگاہ پر انہوں نے ایک نئے شہر کی بنیاد پڑتے دیکھی۔ یہاں ہندوستان سے بیش بہا اسبابِ تجارت بالکل ٹوٹے پھوٹے جہازوں میں آتا تھا ان میں سے اکثر راستے ہی میں غرقاب ہو جاتے تھے۔ ان جہازوں کے اجزا کیلوں سے نہ جوڑے جاتے تھے بلکہ ناریل کے ریشوں کی رسیوں سے بندھے ہوتے تھے۔ ان میں صرف ایک مستول اور ایک بادبان اور ایک پتوار ہوتا تھا۔ ان پر چھت بھی نہ ہوتی تھی۔ سامانِ تجارت لاد کر اوپر سے ایک چمڑے کی چادر سے ڈھک دیتے تھے[1]

---

[1] اس قسم کی کشتیاں آج کل بھی کراچی کی بندرگاہ میں نظر آتی ہیں۔ اومان میں سے بعض ساحل کے کنارے کنارے خلیج فارس تک مالِ تجارت لے جاتی ہیں۔

ہمارے سیاح ہرمز سے شمال کی طرف روانہ ہوئے اور دشتِ لوط سے گذرے جس میں سینکڑوں کوس تک درخت، سبزے یا پانی کا نام و نشان تک نہیں ملتا۔ اور جو تھوڑا بہت پانی کہیں دستیاب ہوتا ہے وہ سخت کڑوا اور زہریلا ہوتا ہے۔

یہاں سے یہ لوگ خراسان اور مغربی افغانستان سے گذرتے ہوئے بدخشاں کے مہیب دروں میں داخل ہوئے اور پہلی بار نمک کا پہاڑ دیکھ کر حیرت زدہ ہو گئے۔ انہوں نے ایک اور عجوبۂ روزگار جانور دیکھا جس کے جسم پر بجائے بالوں کے لمبے لمبے کانٹے ہوتے ہیں اور بحالتِ غضب یہ کانٹے کھڑے ہو کر آلۂ حرب کا کام دیتے ہیں۔

اہلِ بدخشاں کے متعلق مارکوپولو بیان کرتا ہے کہ یہ ایک خونخوار اور مردم آزار قوم ہے۔ یہ لوگ بہت اچھے شکاری ہیں۔ مرد جانوروں کی کھالیں بجائے لباس کے پہنتے ہیں اور سر کے گرد پیچ در پیچ ایک رسی لپیٹے رکھتے ہیں اکثر غاروں کے اندر زندگی بسر کرتے ہیں مگر کانوں میں بیش بہا جواہرات کے آویزے لٹکائے رکھتے ہیں۔

اس علاقے میں جو آج تک غیر دریافت شدہ ہے اور ہمیشہ دنیا کی تاریخ سے علیحدہ رہا ہے مارکو ایک سال تک مقیم رہا۔ اس لئے یہاں کا حال بہت زیادہ شرح و بسط کے ساتھ تحریر کرتا ہے۔ دورِ جدید تک یہ بیانات ناقابلِ یقین سمجھے جاتے تھے، مگر کپتان جان وڈ نے اس علاقہ میں سفر کرتے ہوئے جو بیانات شائع کئے ہیں ان سے مارکو کے بیانات کی پوری پوری تصدیق ہوتی ہے۔ چنانچہ مارکو نے اس علاقہ میں ایک عظیم الجثہ مینڈھے کا ذکر کیا ہے جس کے سینگ چھ چھ بالشت لمبے ہوتے ہیں۔ کپتان مذکور نے اس مینڈھے کے سینگ ناپے اور معلوم کیا ان میں سے بعض ایک گز لمبے تھے۔ مارکو نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ سطحِ مرتفع پامیر پر آگ کی گرمی کم ہو جاتی ہے اور کھانا آسانی سے نہیں پکتا۔ موجودہ تحقیقات نے ثابت کیا ہے کہ سطحِ سمندر پر پانی ۲۱۲ درجے حرارت پر جوش کھاتا ہے مگر اس قدر بلندی پر پہنچ کر ۱۸۰ درجے ہی پر جوش کھا جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ پانی ابلنے لگتا ہے مگر کھانا نہیں پکتا۔

اس کے بعد ہمارے مسافر ریگستانِ گوبی میں داخل ہوتے ہیں جس کے متعلق عجیب اور دہشت انگیز واقعات سن کر لوگوں کے بدن پر رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ وہ کہتا ہے کہ قافلہ سے پیچھے رہ جانا یہاں غضب ہے۔ یہاں انسان طرح طرح کی آوازیں سنتا ہے اور عجیب عجیب مناظر دیکھتا ہے تشنگی کی حالت میں موج زن دریا نظر آتا ہے۔ کبھی آوازِ جرس کانوں میں آتی ہے اور کبھی بانگِ دہل سنائی دیتی

ہے۔ دورِ جدید کے سیاحوں نے لفظ بلفظ اس کی تصدیق کی ہے۔

ہمارے سیاح اس دشتِ مصائب سے گذر کر چین کی سرحد: شہر کنچاؤ میں داخل ہوئے اور اس وسیع اور خوبصورت شہر میں تین کلیسا دیکھ کر سخت متعجب ہوئے۔ یہ علاقہ چنگیزی مغلوں کا اصلی مرکز ہے۔ یہ لوگ بڑے بڑے گلّے پالتے ہیں اور اُن کے لئے نئی چراگاہوں کی تلاش میں نقل مکان کرتے رہتے ہیں۔ اُن کے خیمے سیاہ بانات کے بنے ہوئے مدوّر شکل کے ہوتے ہیں۔ اور جہاں کہیں نصب کئے جاتے ہیں اُن کے دروازے جنوب کی جانب رکھے جاتے ہیں۔ بحالتِ سفر ان کو بجنسہٖ گاڑیوں پر رکھ لیتے ہیں جن کو بائیس بائیس بیل یا اونٹ کھینچتے ہیں۔ ان گاڑیوں کے بیس بیس پہیئے ہوتے ہیں اور دُھروں کا طول ۲۰ فٹ ہوتا ہے۔

عورتیں امن و امان کے زمانے میں ہر قسم کی خدمت کرتی ہیں، مگر دورانِ جنگ میں مرد ہر قسم کی سختیاں بخوشی برداشت کرتے ہیں۔ بحالتِ سفر ہر سوار کے پاس مندرجہ ذیل سامان ہوتا ہے:۔ دو چرمی بوتلوں میں جما ہوا دودھ کھانا پکانے کے لئے ایک مٹی کی ہنڈیا اور ایک مختصر سا خیمہ۔ یلغار کی حالت میں دس دس روز مسلسل گھوڑے کی پشت سے ایک لحظہ کے لئے بھی جدا نہیں ہوتے۔ سپاہیوں کو گھوڑے کی پشت پر ہی سونے کی عادت ڈالی جاتی تھی۔

مارکو تاتاری عورتوں کی عصمت کی تعریف کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ایک ایک آدمی کی سو سو بیویاں ہوتی تھیں مگر پہلی بیوی کی بڑی عزت کی جاتی تھی۔

گھوڑی کا دودھ یہ لوگ بکثرت استعمال کرتے تھے۔ امرا ریشم، زری اور سمور کا لباس پہنتے تھے۔ گھوڑے، اونٹ، بیل، گائے تمام مویشیوں پر نشان لگایا جاتا تھا، اور گھوڑے کے چور کی سزا قتل سمجھی جاتی تھی۔

یہاں کے جانوروں میں بالخصوص یاک اور مشک آہو کا ذکر کرتا ہے۔ اور مشک کے نکالنے کا طریقہ یوں بیان کرتا ہے:۔

"جب پورا چاند نظر آتا ہے تو اس جانور کی ناف میں ایک غدود پیدا ہوتا ہے، جس کو کاٹ کر دھوپ میں خشک کر لیا جاتا ہے۔ اس کے اندر کا خون جم کر عمدہ خوشبو بن جاتا ہے"۔

وینس سے روانہ ہونے کے چار سال بعد ہمارے سیاح شہر زانڈو جا پہنچے اور شاہی پارک میں داخل ہوئے جس کے گرد ۱۶ میل لمبی دیوار محیط تھی اور جس کے اندر بے شمار فوارے اچھلتے اور نہریں اور دریا بہتے تھے۔ سرسبز چراگاہیں پھیلی ہوئی تھیں اور انواع و اقسام کے چرند و پرند چھٹے ہوئے تھے۔ اس پارک کے وسط میں ایک مرمریں قصر غیرتِ باغِ ارم تھا جس کی ہر دیوار طلائی نقش و نگار سے آراستہ تھی۔ اس کے قریب ایک اور محل تھا جو تمام بید کا

بنا ہُوا تھا اور اُس پر بھی طلائی روغن چڑھا ہُوا تھا - یہ مقام موسم گرما میں خاقان کی قیام گاہ تھا - یہاں دس ہزار گھوڑے اور گھوڑیاں رہتی تھیں - اسی محل میں پہلی بار مارکو پولو نے خاقان کے دربار میں شرفِ باریابی حاصل کیا - اور خاقان کو بہت جلد اپنے حسنِ قابلیت اور جادو بیانی کا گرویدہ بنا لیا - خاقان نے مارکو کے سپرد یہ خدمت کی کہ تمام ممالک محروسہ میں سفر کر کے وہاں کے دلچسپ حالات خاقان کے سامنے پیش کرے - اس سفر کے حالات دنیا کے دلچسپ ترین سفرناموں میں سے ہیں - مارکو نے اپنا بیان خاقان کے دربار کے حالات سے شروع کیا ہے، اور ابتدا ہی میں ایک جنگ کا حال یوں درج کیا ہے:-

"خاقان ایک پہاڑی پر ایک خوبصورت چوبی عماری میں ایک شان دار ہاتھی کی پشت پر بیٹھا جنگی نقل و حرکت کا معائنہ کر رہا تھا - اُس کے اوپر اُس کا شاہی پرچم لہرا رہا تھا اور نیچے اُس کی افواج تیس تیس ہزار کے ٹکڑوں پر منقسم کھڑی تھیں - ہر سوار کے پیچھے ایک ایک پیدل سپاہی بھی نیزہ لئے کھڑا تھا طبلِ جنگ بجتے ہی افواج نے پُرجوش حملہ کیا۔"

مارکو بیان کرتا ہے کہ خاقان کی چار بیویاں ہیں جو ملکہ کہلاتی ہیں - ان میں سے ہر ایک کا دربار جداگانہ اور نہایت شان دار ہے - اِن درباروں میں علاوہ خواجہ سراؤں اور غلاموں کے تین تین سو حسین اور نوخیز لڑکیاں رہتی ہیں - ہر ایک دربار میں خدام کی تعداد دس ہزار ہے - علاوہ ان بیویوں کے بے شمار حرم ہیں - ایک خاص قبیلہ سے جس کی عورتیں حسن و جمال میں شہرتِ عام رکھتی ہیں ہر سال سو عورتیں حرم بننے کے لئے خاقان کے دربار میں بھیجی جاتی ہیں -

خاقان کے سرمائی محل واقع پیکین کا ذکر پہلے ہو چکا ہے، اور اسی سلسلہ میں اُس ہال کا ذکر بھی ہو چکا ہے جس میں چھ ہزار آدمی ایک وقت میں کھانا کھاتے تھے - دعوت کے موقعوں پر خاقان کی نشست اس قدر بلند ہوتی تھی کہ خاقان کے پَیر اور حاضرین کے سر ایک سطح میں ہوتے تھے - مدعوئین کو مناسب مقامات پر بٹھانے کے لئے چند امرا مقرر کئے جاتے تھے، اور ہر دروازے پر دو دو قوی ہیکل سپاہی لاٹھیاں لئے کھڑے رہتے تھے - اگر اندر آتے ہوئے کوئی شخص چوکھٹ پر پیر رکھ دیتا تھا تو اُس کی کپڑے اتار کر تذلیل کی جاتی تھی - مگر باہر جاتے وقت اس قاعدہ کی پابندی نہ ہوتی تھی - جو خدام خاقان کے سامنے کھانا چنتے تھے - اُن کے منہ اور ناک پر ڈھاٹا بندھا رہتا تھا تاکہ اُن کے منہ کی بدبو خاقان تک نہ پہنچے - ہر امیر جو اس ہال میں کھانا کھانے آتا تھا اپنے ہمراہ ایک پیک دان بھی لاتا تھا -

اِن دعوتوں میں سب سے زیادہ شاندار خاقان کی سالگرہ کی تقریب ہوتی تھی - اُس روز خاقان ایک زرنگار

مرصع کار ریشمی لباس زیبِ تن کرتا تھا اور اُس کے بارہ ہزار امرا بھی اسی قسم کا لباس پہنتے تھے۔ ایسے لباس ان امرا کو بادشاہ کی طرف سے سال میں تیرہ دفعہ ملتے تھے۔

نوروز کی دعوت میں لباس کا رنگ سفید ہوتا تھا۔ اُس روز ہر امیر خاقان کے روبرو نذر پیش کرتا تھا اور سونے چاندی کی مورتیوں اور جواہرات ریشم اور سفید گھوڑوں کے تحفے دیتا تھا۔ اس طرح اُس روز ایک لاکھ سفید گھوڑے مع بیش قیمت ساز و یراق کے جمع ہو جاتے تھے۔ اُس روز خاقان کے پانچ ہزار ہاتھیوں کا جلوس بھی نکلتا تھا۔ کھانے کے بعد مداری تماشے دکھا کر حاضرین کو محظوظ کرتے تھے۔ پیکن کے متعلق مارکو بیان کرتا ہے کہ شہر ایک دریا کے اوپر آباد تھا۔ ایک ہزار جوان اُس کے بارہ دروازوں کی حفاظت کرتے تھے۔ رات کے وقت ایک بڑا گھنٹہ بجتا تھا جس کے بعد شہر میں کسی کو گھر سے باہر نکلنے کی اجازت نہ ہوتی تھی۔ مگر بیمار یا زچہ کی ضروریات کیلئے نکلنے کی اجازت تھی۔ شہر کے باہر کی آبادی اندر کی آبادی سے بھی زیادہ تھی۔ اور ممالکِ غیر سے آنے جانے والے تجار کے قیام کے لئے بے شمار سرائیں بنی ہوئی تھیں۔ اسی حصہ میں پچیس ہزار طوائف بھی آباد تھیں۔ پیکن میں حفظانِ صحت کا انتظام نہایت معقول تھا۔ مُردے شہر سے باہر بہت دور لے جا کر جلائے یا دفن کئے جاتے تھے۔ مارکو بیان کرتا ہے کہ یہاں سکّے کے بجائے شہر میں کاغذ کے نوٹ چلتے تھے۔ ان نوٹوں کا کاغذ شہتوت کے درخت کی چھال سے بنایا جاتا تھا۔ قانوناً اگر کوئی شخص اس کاغذی سکّے کے لینے سے انکار کرتا تو سزائے موت کا مستحق ہوتا۔ ان کاغذ کے ٹکڑوں کو چھاپ کر ٹکسال کے حکام دستخط کرتے تھے پھر شاہی خزانچی ان پر شاہی سرخ مہر لگا دیتا تھا۔ تین فی صدی بٹہ دے کر پرانے نوٹ بدل دیئے جاتے تھے۔ خاقان ہر سال اپنے سونے چاندی کے ذخائر میں سے ایک بڑی مقدار رعایا کے ہاتھ فروخت کر کے نوٹ واپس لے لیتا تھا۔ اس طرح ان نوٹوں کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔

خاقان کی ڈاک کا انتظام بھی نہایت قابلِ تعریف تھا۔ پیکن سے تمام شہروں تک پختہ سڑکیں بنی ہوئی تھیں اور ان سڑکوں پر پچیس پچیس میل کے فاصلہ پر ڈاک چوکیاں بنی ہوئی تھیں۔ جن میں بعض بعض جگہ چار چار سو گھوڑے رہتے تھے۔ جن علاقوں میں سڑکیں نہ تھیں وہاں بھی ڈاک چوکیاں موجود تھیں۔ دو ڈاک چوکیوں کے درمیان پیدل ہرکاروں کے لئے قیام گاہیں بنی ہوئی تھیں۔ ان ہرکاروں کی پیٹیوں پر گھنٹیاں لگی ہوتی تھیں جن کی آواز دور سے سنائی دیتی تھی۔

اس ڈاک سے نہ صرف خط جاتے تھے، بلکہ پارسل بھی جاتے تھے اور کم وقت میں ڈاک پہنچنے کا انتظام بھی تھا۔ چنانچہ پیکن میں صبح کے توڑے ہوئے پھل ژانڈو میں شام کے کھانے کے ساتھ دسترخوان پر چنے جاتے تھے۔ حالانکہ عام حالتوں میں ڈاک دس دن میں پہنچتی تھی۔ ڈاک لے جانے والے سوار دن میں دو تین سو میل سفر کرتے تھے اور رات کو بھی اسی رفتار سے چلتے رہتے تھے۔ ہر چوکی پر سوار گھوڑا لئے ڈاک کا منتظر رہتا تھا اور ڈاک لیتے ہی روانہ

جاتا تھا۔ ان ڈاک کے سواروں کو معقول تنخواہیں ملتی تھیں۔ سفر کرتے وقت یہ سوار اپنے سر سینہ اور پیٹ کو پٹیوں سے مضبوط باندھ لیتے تھے۔

چونکہ یورپ میں ڈاک کا انتظام عمدہ نہ تھا اس لئے مارکو یہ حالات دیکھ کر ششدر رہ گیا۔

چین میں اُس زمانے میں قحط بہت پڑتے تھے۔ ان کے اثرات کو روکنے کے لئے خاقان نے یہ انتظام کیا تھا کہ جب غلہ سستا ہوتا تو خود اس کی بہت بڑی مقدار خرید کر مختلف صوبجات میں شاہی ذخائر پر کرلیتا تھا۔ جب فصل نہ ہوتی تھی یا ٹڈیاں فصل خراب کردیتی تھیں تو ان ذخائر سے غلہ نکال کر معمولی نرخ پر فروخت کیا جاتا تھا۔

اشیائے خوردنی و پوشیدنی کے تیار کرنے والوں سے جنس کی صورت میں ٹیکس لیا جاتا تھا، اور یہ اشیا پھر غربا میں تقسیم کردی جاتی تھیں۔ اس طرح روزانہ تقریباً تیس ہزار آدمیوں کو غذا اور خوراک مفت ملتی تھی۔

بیس برس چین کے عجائب و غرائب مشاہدہ کرنے کے بعد بالآخر پولو وطن کی یاد سے بے چین ہونے لگے مگر دربار سے رخصت نہ ملتی تھی، یہاں تک کہ ایران کے ایلخانی سفیر یہ خبر لائے کہ غازان خاں کی ملکہ مر چکی ہے اور اس کی آخری وصیت کے مطابق غازان خاں چاہتا ہے کہ اس کی نئی ملکہ منگولیا سے بھیجی جائے۔ چونکہ ترکستان میں جنگ چھڑ چکی تھی۔ برّی راستہ بند تھا۔ اس لئے یہ تجویز ہوئی کہ ایلخاں کی نئی ملکہ "کوکاچین" پولو کی معیت میں بحری راستہ سے ایران بھیجی جائے۔ خاقان نے تیرہ جہاز تیار کرائے اور اُن میں دو سال کی خوراک اور دیگر سامانِ ضروری بار کیا پھر بادلِ ناخواستہ تینوں وینس کے جوہریوں کو رخصت کیا۔ علاوہ ملّاحوں کے چھ سو آدمی ان کے ہمراہ تھے۔ ان میں سے صرف تیرہ آدمی منزلِ مقصود تک زندہ پہنچے۔ دو سال کے بعد اُن کے جہاز ساحلِ ایران پر لنگر انداز ہوئے اور "پولوؤں" نے شہزادی "کوکاچین" کو ایلخانی دربار میں بعافیت پہنچا دیا۔ شہزادی نے ان کو باچشمِ نم رخصت کیا۔

۱۲۹۵ء میں یہ لوگ وینس جا پہنچے۔ تین سال تک عیش و آرام سے زندگی بسر کرتے رہے ۱۲۹۸ء میں وینس والوں نے جنیوا پر حملہ کیا۔ مارکو بھی اس بحری مہم کے ہمراہ تھا۔ باشندگانِ وینس کو شکست ہوئی، اور ۷۰۰۰ قیدیوں کے ہمراہ مارکو بھی جنیوا کے جیل میں مقید ہوگیا۔ قید خانے میں اس کا تعارف ایک ادیب پیسان سے ہوا جس نے مارکو کے سفر کے حالات بڑی دلچسپی سے سنے اور اُن کو قلمبند کرتا رہا۔

آج کل ایک سیاح کے حالاتِ سفر اس کی مراجعتِ سفر کے چوبیس گھنٹے بعد تمام دنیا میں شائع ہو جاتے ہیں مگر مارکو کے حالاتِ سفر ۱۴۴۷ء تک شائع نہ ہوسکے، اور جب تک موجودہ سیاحوں کے بیانات نے ان واقعات کی حرف بحرف تصدیق نہ کی لوگ ان کو محض افسانہ سمجھتے رہے۔

محمد بدرالاسلام فضلی

ایک نئے رنگ کی غزل

تلوّن دکھانے سے کیا فائدہ — تحیّر بڑھانے سے کیا فائدہ

لبھا کر ستانے سے کیا فائدہ — لگا کر بجھانے سے کیا فائدہ

ادائیں دکھانے سے کیا فائدہ — ستم ڈھائے جانے سے کیا فائدہ

محبّت جتانے سے کیا فائدہ — پتنگے لگانے سے کیا فائدہ

جو آنا ہے، دکھ کی دوا بن کے آ — قضا بن کے آنے سے کیا فائدہ

ستانا روا ہے تو بے شک ستا — مگر بھول جانے سے کیا فائدہ

جو شوقِ جفا ہے، جفا کر، مگر — وفا کے بہانے سے کیا فائدہ

جو خوفِ خدا ہے تو غافل نہ ہو — غلط رحم کھانے سے کیا فائدہ

دغا دے کے عذرِ دغا رائیگاں — پڑھا کر بھلانے سے کیا فائدہ

اب آنکھوں کے آگے وہ جلوے کہاں — اب آنکھیں اٹھانے سے کیا فائدہ

کسی دن کھلا روئے زیبا دکھا — چھپا کر دکھانے سے کیا فائدہ

اُٹھا پردۂ شرمِ بے جا اُٹھا — حقیقت چھپانے سے کیا فائدہ

بس، اے فتنۂ قامتِ یار، بس — بہت سر اٹھانے سے کیا فائدہ
بس، اے جلوۂ محشر آثار، بس — بہت قہر ڈھانے سے کیا فائدہ
تھم، اے گردشِ چشمِ مخمور تھم — پیاپے پلانے سے کیا فائدہ
تھم، اے بارشِ بادۂ نور، تھم — دمادم چھکانے سے کیا فائدہ
جنونِ تجسس کہاں لے چلا — پریشاں پھرانے سے کیا فائدہ
کمالِ طلب! سوئے منزل بڑھا — تھکا کر بٹھانے سے کیا فائدہ
سزا کے مزے لوٹنے دیجئے — خطا بخشوانے سے کیا فائدہ
اوائل ہیں یعنی دمِ جوشِ عشق — عواقب سجھانے سے کیا فائدہ
کہیں اہلِ طاعت کی پرسش نہیں — جبینیں گھسانے سے کیا فائدہ
گدائے درِ دوست! چپ سادھ جا — صدائیں لگانے سے کیا فائدہ
مقاصد کے در زورِ بازو سے کھول — فقط کھٹکھٹانے سے کیا فائدہ

اب آزاد! اٹھو اور سوئے راہِ حق
بڑھو، ہچکچانے سے کیا فائدہ

حکیم آزاد انصاری

ہندِ قدیم اور صنفِ نازک

عہدِ عتیق اور قرونِ وسطیٰ میں عورت کو عموماً ایک قسم کی ملک سمجھا جاتا تھا۔ اخلاقاً اس کی موافقت کیلئے کوئی تیار نہ تھا۔ اس کو نفسِ امّارہ کی "طلب" اور شیطان کا "دامِ فریب" تصور کیا جاتا تھا۔ قیمتاً اس کی خرید و فروخت ہو سکتی تھی۔ چنانچہ ایتھنز والے اس کو عاریۃً بھی لے لیتے تھے۔ بہادر اور جوانمرد لوگ اس کو قوت و جوانمردی کے لئے سمِ قاتل سمجھتے تھے۔ معاشرۃً وہ ایک قسم کا کھلونا تھی۔ اہلِ اسپارٹا کو اس بات پر فخر تھا کہ ان کے یہاں قانونی اور نصف قانونی بیویاں بھی مل سکتی ہیں۔[1] اہلِ روم میں عورتوں کا ادل بدل بھی ہو سکتا تھا۔ ہنود اس کو جوئے میں ہار جیت سکتے تھے۔[2] قدیم عرب اس کو ترکے میں لے سکتے تھے اور زندہ دفن کر سکتے تھے، اور قدیم اہلِ مصر اس کو دریائے نیل کے کنارے لے جاکر بطورِ قربانی ذبح بھی کر سکتے تھے۔

تعددِ ازواج کی یہ حالت تھی کہ بابل اور اسیریا کے مہذب لوگ جتنی عورتیں چاہتے اپنی زوجیت میں لاتے، کوئی مذہبی، قانونی یا معاشرتی روک نہ تھی۔ ایرانیوں میں ایک شوہر کے جتنی زیادہ بیویاں ہوں اتنا ہی زیادہ انعام ملتا تھا۔ فنیشیا والے اور بگڑے ہوئے بنی اسرائیل نکاح اور بیاہ کی رسم کو بالکل غیر ضروری سمجھے ہوئے تھے۔ مذہب نے بھی اس کو اسی نگاہ سے دیکھا جس نگاہ سے اخلاق نے دیکھا۔ حتیٰ کہ حضرتِ عیسیٰ نے گو شادی کو منع نہیں کیا مگر بُرا ضرور بتایا۔ مسیحی تاریخ میں دیکھیے تو سینٹ پال نے اپنی تعلیم کے بموجب اس کو انسانیت سے بھی گرا دیا۔ سینٹ جروم نے اس کو تمام خرابیوں اور برائیوں کی جڑ قرار دیا۔ اور سینٹ آگسٹائن کے قول کے مطابق اُمُّ البشر جو اسے پیدا کرنے کی غرض و غایت صرف یہ تھی کہ وہ آدم علیہ السلام سے اللہ کے حکم کی نافرمانی کرانے میں شیطان کی معاون ہوں۔

الغرض عہدِ قدیم میں کوئی قوم ایسی نظر نہیں آتی جس نے عورت کی حمایت میں کچھ بھی کیا ہو۔ کسی نے اُس کو شیطان کا دروازہ بنایا اور کسی نے ناگن سے زیادہ زہریلی۔ مگر فطرت نے اہلِ نظر کی نگاہوں میں اس کی وقعت قائم رکھی۔ صنفِ نازک کی بے بسی پر اگر کسی کو رحم آیا تو دنیا میں صرف دو مقدّس ہستیوں کو۔ اُن میں سے ایک

---

[1] Demosthenes.

[2] مہابھارت۔

شاندار ہستی کرشن اعظم کی ہے، دوسری مقدس ذات پیغمبر اسلام محمد صلعم کی۔ کرشن جی نے عورت کی عزت وحرمت برقرار رکھنے کے لئے پانڈو کو مہابھارت کی لڑائی لڑنے پر آمادہ کیا اور ہندو دیں عورت سے محبت کرنے کا احساس پیدا کیا اور پیغمبر اسلام نے سب سے پہلے اس غریب جنس کو انسانیت کے دائرے میں شامل کیا۔ اس کو زندہ درگور ہونے سے بچایا، اس کو دریائے نیل کی قربانی بننے سے روکا اور اس کو ناموسِ وفا ثابت کرکے نفس پرستوں کے پنجوں سے چھڑایا۔ اس کے حقوق کی نگہداشت شرعاً سب پر فرض کی، اُس کے لئے ترکہ مقرر کیا اور اولادِ نرینہ کی موجودگی پر بھی وہ اپنے باپ کی جائداد میں سے حصہ پانے کی مستحق قرار دی گئی۔ رقمِ "مہر" ایک ایسی ایجاد ہے جس سے عورت کو تقویت ہی نہیں دی گئی بلکہ شوہر کو اس کی پاسداری پر مجبور کیا گیا ہے۔ برخلاف اس کے عہدِ قدیم میں اور نیز زمانۂ حال میں ہر قوم نے ازروئے قانون ومذہب، بہ موجودگیِ اولادِ نرینہ عورت کو محجوب الارث قرار دیا اور اس کی وجہ سے وہ باپ کے گھر سے بھی محروم رہی کیونکہ شوہر کے گھر سے تو اس کو کبھی بھی امید نہ تھی۔

اس مختصر تمہید کے بعد اگر قدیم ہندوستان کی معاشرت کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ قدیم ہندو سوسائٹی میں عورت ایک مقدس وجود سمجھی جاتی تھی جس کی تصدیق رِگ وید سے ہوتی ہے۔ آریہ لوگ مذہبًا اور معاشرۃً اس کو محبت اور احترام کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ گو مرد کے مقابلے میں اس کو برتری کا دعویٰ نہیں ہو سکتا تھا اور عمومًا مرد کی وجہ سے اس کو طرح طرح کی آزمائشوں میں پڑکر اپنی پاک دامنی کا ثبوت دینا پڑتا تھا۔ تاہم اس تمام اطاعت اور فرمانبرداری کے باوجود وہ اپنے شوہر اور خاندان کے بزرگوں سمیت عبادت وقربانی وغیرہ کے رسوم میں شرکت کرتی تھی اور سب ساتھ مل کر دیوتاؤں کے سامنے دعائیہ گیت گاتے تھے۔

پوجا وغیرہ کی تیاری کے لئے آریہ عورتوں کا یہ فریضہ تھا کہ دیوتاؤں پر چڑھانے کے لئے "سوم رس" پہلے سے تیار کر رکھیں۔ اس زمانہ میں بھی عورتیں زبانی علوم حاصل کرنا فرض سمجھتی تھیں۔ اور ان میں سے اکثر شاعرہ بھی ہوتی تھیں جو عمومًا دعائیہ گیت نظم کرتی تھیں۔ البتہ رسمیں اُس وقت ایسی بھی جاری تھیں جو آج کل اخلاقًا بری سمجھی جائینگی مگر ان رسموں سے کسی کو عار نہ تھا، گو اخلاقًا ہی نہیں بلکہ فطرۃً بھی یہ رسمیں اچھی نہ تھیں۔ ان رسموں میں سے ایک بیوی اور کئی شوہر" کی رسم جس کو ہم "تعددِ شو" کہیں گے "تعددِ زن" کے دستور کے مطابق مگر اس کے بالکل برعکس تھی۔ باوجود اس دستور کے قدیم ہندو عورتیں اپنے خاوند کی اطاعت میں مساوات اور احترام کا یکساں لحاظ رکھتی تھیں مگر اس رسم کی بابت یہ بھی مشہور ہے کہ اس کا رواج شاہی خاندانوں تک محدود تھا۔ غرض ایسی چند رسوم کے سوا

پارسائی اور پاک دامانی کا زمانہ تھا۔ یہ وہی عہدِ جاہلیت تھا جس پر آج کل کی سیکڑوں تہذیبیں قربان کر دینے کے قابل ہیں۔

اس پاک زمانہ کے تھوڑے ہی عرصہ بعد ستی کی بُری رسم رائج ہوگئی۔ نہیں معلوم کس ظالم ہستی نے اس ہلاکت آفریں رواج کو قائم کیا۔ کہا تو یہ جاتا ہے کہ زن و شوہر میں "پریم" کی انتہائی قوتوں کی وجہ سے شوہر کی وفات پر عورت خود موت کو زندگی پر ترجیح دیتی تھی لیکن عورت کے لئے تو یہ رسم وفاداری اور مروت کے پردے میں ایک قسم کی زبردستی اور ستم ثابت ہوئی۔ اس بُرے رواج کا دھبّا آریہ قوم پر نہیں آ سکتا کیونکہ یہ ان کے زمانہ کے بعد رائج ہوا ہے۔ آریہ لوگ عورت کو گھر کی زینت سمجھتے تھے۔ اس کی پاکدامانی کی دعائیں مانگی جاتی تھیں اور خواہش کی جاتی تھی کہ دیوتا اُس کو صاحبِ اولاد کریں۔ وہ گھر میں ایک باحرمت رانی سمجھی جاتی تھی۔ رگ وید میں لکھا ہے:۔

"اے بخشش کرنے والے اِندر اس عورت کی گود سعادت مند اولاد سے بھر دے اور اس کے شوہر کو گیا ہوا دیوتا بنا دے"[1]

شادی کے بعد جب نئی دلہن گھر میں آتی تو اس سے مخاطب ہو کر کہا جاتا تھا:۔

"اے عروس پاک دامن اپنی خوش دامن، خسر اور شوہر کے بہن بھائیوں پر حکومت کر۔ تو گھر کی رانی ہے"[2]

عورت کے متعلق سب سے اچھی رسم جو آریوں کے زمانے میں رائج تھی وہ "سوئمبر" یعنی "انتخابِ شوہر" ہے جس کو آج کل ایک قسم کی "فوری کورٹ شپ" کہنا چاہئے۔ نہیں معلوم یہ رسم ہنود سے بہت جلد کیوں اٹھ گئی۔ گو یہ راجوں مہاراجوں کے حلقہ تک محدود تھی تاہم اس کے محاسن کا احساس اس زمانہ میں بھی ہوتا ہے۔

آریوں کی معاشرتی زندگی میں وہ وقت نہایت دلچسپ ہوتا تھا جب اپنے گھرانے کے ساتھ عورت بھی سرخیِ شفق کی عبادت کرتی تھی۔ اُس وقت حسنِ فطرت کی رنگینیوں سے اُس کی پاک خوبصورتی اور بھی دوبالا ہو جاتی تھی۔ وہ سماں کیا ہی دلفریب ہوگا جب شفقِ صبح کی سرخی اور اس کے بعد نکلتے ہوئے سورج کی نازک کرنوں سے اُس کے حسین جسم پر ایک زرّیں عکس پڑتا ہوگا اور وہ سریلی آواز میں شفق کو مخاطب کر کے یہ مقدس گیت گاتی ہوگی:۔

سما کی دیوی فلک کی ملکہ ۔۔۔ اِدھر بھی ہو اک نگاہ تیری
یہ سرخ چادر اُڑھا دے مجھ کو ۔۔۔ کہ چاہتی ہوں پناہ تیری

---

[1] ۔ رگ وید باب دہم ۸۵ + [2] ۔ رگ وید باب دہم ۴۵ - ۴۶ +

تجھی سے دولت تجھی سے برکت ۔۔۔ تجھی سے سب آن بان اپنی
یہ آرزو ہے، رہے حکومت ۔۔۔ ہمیشہ شام و پگاہ تیری
نہ دیر کر منتظر ہے دنیا ۔۔۔ کہ ہو فلک پر ظہور تیرا"
ہے تیرا آنا بہت ضروری ۔۔۔ ہر ایک شے میں ہو نور تیرا[۵۱]

قدیم آریوں میں کوئی عورت ایسی نظر نہیں آتی جو نام آور ہو یعنی کسی نہ کسی اعتبار سے نمونۂ کمال ثابت ہو کہ ہم اس کو یہاں بطور مثال پیش کر سکیں۔ شاید وہ رشی منی کے مدارج تک پہنچنے سے قاصر سمجھی گئی اور اس کو بالکل شوہر اور اُس کے خاندان کے ماتحت رکھا گیا۔ عہد جاہلیت کے عربوں کی طرح لڑکی پیدا ہونے سے آریہ بھی خوش نہ ہوتے تھے۔ غرض عورت اپنے شوہر کی اطاعت سے کبھی اغماض نہیں کر سکتی تھی، لیکن زمانہ گذرنے پر شوہر اُس کو اپنی دولت یا جائداد سمجھنے لگا۔ اور رفتہ رفتہ وہ طرح طرح کی آزمائشوں کا شکار ہوگئی، کیونکہ اُس کو دریائی دیوتاؤں پر قربان کیا جا سکتا تھا۔ اور وہ جیتی اور ہاری جا سکتی تھی۔ وہ خاوند کی دولت تھی اور اپنی اس حالت میں تمام تکالیف برداشت کرنے کے لئے تیار رہتی تھی۔

تاریخ ہند میں ہار جیت کی زندۂ جاوید مثال رانی دروپدی ہے اور تکالیف و مصائب کا نمونۂ کمال صبر و استقامت کی دیوی سیتا جی کی مقدس ہستی ہے۔ آگے ایک نمونۂ محبت یعنی رادھا کا بھی مختصر سا ذکر کیا جائے گا۔ کیونکہ کرشن اعظم کی مقدس ذات نے غریب جنسِ نازک پر وشنو صفت عنایتیں ہی نہیں کیں بلکہ اس کو "حسن و محبت" کا ایک قدرتی مظہر بھی ثابت کر دیا۔

الغرض جب دروپدی کو "پانڈو" جوئے میں ہار گئے۔ اور وہ غریب خاوندوں کو وعدہ خلافی کے برے نتائج سے بچانے کے لئے "کورو" کے پاس جانے پر مجبور ہوئی تو کرشن اعظم نے اس بداخلاقی کو منظور نہ کیا اور پانڈو سے کہا کہ تم اپنے اخلاقی حق کے لئے لڑو کیونکہ

"جو ناخواستہ لڑائی آپڑے وہ سرگ کا دروازہ ہے اور صرف خوش نصیب کشتریوں کو ایسی لڑائی میسر ہوتی ہے۔"[۵۲]

اس پر پانڈو میں سے ایک بہادر نوجوان "ارجن" نے کہا کہ:-

"اے کیشو سب شگون برخلاف دیکھتا ہوں کیونکہ یگانوں کو مار کر بہتری دکھائی نہیں دیتی"[۵۳]

---

[۵۱] رگ وید باب اول - ۴۸ (۱) [۵۲] گیتا دوسرا ادھیائے ۳۲- [۵۳] گیتا پہلا ادھیائے ۳۱+

ارجن کے اس کہنے پر کرشن جی نے نہایت متانت اور سنجیدگی سے فرمایا :-

لڑائی ہے عزت کی جی مت چھپاؤ　　جو غیرت ہے تو آج میدان میں آؤ
یگانوں کی حرمت پہ جو ہاتھ ڈالے　　یگانہ وہ دشمن ہے دھوکا نہ کھاؤ

لڑو یہ لڑائی کہ عزت ملے گی
اگر جان جائے تو جنت ملے گی

اس طرح کرشن اعظم کی کوششوں سے قدیم آریوں کے سپوت عورت کی عزت و حرمت برقرار رکھنے کے لئے بھارت ماتا کی چھاتی پر سب سے پہلے آمادۂ پیکار ہوئے اور کرشن اعظم کی مقدس تائید سے فتح یاب بھی ہو گئے۔

بہ اعتبار وفاداری و آزمائش قدیم ہندوستان میں سیتا جی سے بڑھ کر عورتوں میں کوئی نمونۂ کمال نہیں۔ راجہ جنک کی یہ نازک اندام "راج کنیا" چودہ سال تک جنگلوں میں پھرتی - راون کے مظالم سہے - جلتے توؤں پر برہنہ پا چلنے پر مجبور کی گئی اور نہیں معلوم کیسی کیسی سخت آزمائشوں کا سامنا کیا، مگر ہمیشہ ان صبر آزما امتحانوں میں کامیاب رہی - جب رام چندر جی بن باس ہو رہے تھے اور سیتا کی بابت یہ رائے قرار پائی تھی کہ وہ محل ہی میں قیام کرے تو سیتا نے کہا کہ نہیں میں اپنے گھر بار، دولت و ثروت اور اعزہ تک کو خیرباد کہتی ہوں - عورت کا فرض ہے کہ وہ اپنے خاوند کی تکلیف کے وقت اُس کے آرام کے اسباب بہم پہنچانے کی کوشش کرے کیونکہ :-

یہ فرض ہے مجھ پر دنیا میں　　میں ساتھ نہ چھوڑوں شوہر کا
گر رام رہیں گے جنگل میں　　ہے پاپ مجھے رہنا گھر کا
گر سچا بیٹا راگھو کا　　بن باس ہوا تو سیتا بھی
ہے سایہ اپنے شوہر کا　　یا پرچھائیں جو ساتھ رہی

ہے رام ہی میرے دل کا راجہ، رام ہی ہو سرتاج مرا
ہے رام کی قسمت قسمت میری، رام ہے دم تک راج مرا[۲]

عورتوں کی اس پاک اور مقدس محفل میں بہ اعتبار عشق و محبت رادھا کا مرتبہ بھی بہت بڑا ہے - اُس کی محبت لاانتہا تھی - محویت کے عالم میں بعض اوقات وہ اپنے ہوش و حواس میں بھی نہیں رہتی تھی - اس کی لذا

---

[۱] گیتا دوسرا ادھیائے - ۳۱ -　　[۲] رامائن

کنھیا جی کی محبت اور اُن کی یاد میں صرف اشعار پڑھنا تھی، گوکل کے کسی باغ میں گوپیاں اُس کو پھولوں سے لدے درخت کی شاخ پکڑے ہوئے دیکھتی تھیں اور رادھا کیف و محبت میں یہ اشعار پڑھتی ہوئی سنائی دیتی تھی ؎

نہیں اظہار ہو سکتا زباں سے دل کی حالت کا | یہ میرا دل نہیں ہے ایک پیکر ہے محبت کا

مری اس زندگی، اور موت، اور عہدِ تناسخ میں | تمنا ہے نہ ہو خاموش دل میں سازِ الفت کا

تمہیں رہتے ہو گوکل میں، تمہیں ہو آسمانوں پر

تمہارا ہی مقدس نام ہے سب کی زبانوں پر[1]

المختصر قدیم ہندو تاریخ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ عورت اپنے شوہر پر جان دیتی تھی۔ وفاداری، فرمانبرداری اور صبر و تحمل میں وہ نمونۂ کمال تھی۔ مرد اپنی عزت اور اپنی ذات و خاندان کی عزت پر فدا تھے۔ اس لئے عورت کو بھی تقدیس اور عزت کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ محبت کا جذبہ عموماً عورت میں زیادہ ہوتا تھا۔ لٹریچر میں بھی عورت ہی سچی عاشق بتائی گئی ہے۔ مرد اپنی مردانگی کے زعم میں مست تھے۔ اُن کو نہ اُس کی نزاکت کی پروا تھی نہ حسن کا خیال۔ حتیٰ کہ زمانہ گذرنے پر منوجی نے اپنی کتاب "منوسمرتی" میں عورت کی عزت اُس کی پاسداری اور حرمت پر تاکید کرتے ہوئے یہ بھی لکھا کہ:-

"باپ، بھائی یا شوہر سے عورت کو کبھی علیحدگی نہ حاصل ہونا چاہئے۔ کیونکہ اس کی حسب خواہش علیحدگی اس کے شوہر کے خاندان پر دھبا لگاتی ہے۔"

دھرم شاستر میں عورت کی تنبیہ و تاکید پر بہت کچھ لکھا گیا ہے مگر ہم یہاں مقدس رشی کے یہ الفاظ لکھنا زیادہ مناسب سمجھتے ہیں کہ "جس خاندان میں عورت کا دل دکھایا جاتا ہے اور اُس کو پریشان کیا جاتا ہے وہ تباہ ہو گا اور جس گھرانے میں اس کی عزت اور پاسداری کی جاتی ہے وہ سرسبز ہو گا۔"[2]

ہم آج بھی ہندوستان میں ہندو عورت سے زیادہ صابر و شاکر کسی قوم کی جنس نازک کو نہیں پاتے اُس کے خاندان اور اس کے ماں باپ پر اب بھی "رقم ازدواج" اور "جہیز" کے بے بار ڈالے گئے ہیں۔ اس کو ایک شادی کے بعد دوسری شادی سے محروم کیا گیا ہے۔ شادی کے وقت اُس کے ماں باپ کے یہاں بارات کیا آتی ہے گویا "ڈاکوؤں" کا ایک گروہ آتا ہے جو اس کے والدین کو قرضدار ہی نہیں بلکہ فقیر بھی کر

---

[1] گیتا گووند

[2] منوسمرتی

دیتا ہے۔ اس بارِ گران کو برداشت کرنے کے خوف سے اکثر شریف گھرانوں میں اب بھی لڑکی بڑھاپے کی سرحد تک پہنچ جاتی ہے۔ مگر شادی نہیں کی جاتی۔ ابھی سنہ ۱۹۳۱ء کا واقعہ ہے کہ ایک شریف، مگر غریب بنگالی خاندان کی لڑکی "رسم و رواج کی ملعون زنجیروں سے عاجز آکر" اور خصوصاً اس قسم ازدواج سے ماں، باپ کو بچانے کیلئے جل کر مرگئی۔[1]

غرض محبت اور وفاداری کی سینکڑوں مثالیں ہندو عورتوں نے دنیا کے لئے چھوڑی ہیں۔ اُن کی پاکدامنی کی تصدیق چندر گپت موریا کے عہد میں میگاستھنیز کی زبان سے یونانیوں نے کی، ان کی عفت و عصمت کی مدح و ثنا فاہیان کی زبان سے چینیوں نے کی، اُن کی محبت اور وفاداری کو دیکھ کر ابنِ بطوطہ کی زبان سے اہلِ اسلام نے آفرین کہی۔ سچ ہے جمالِ حقیقت کی جھلک ہماری مادی آنکھوں کے سامنے عموماً "لباسِ مجاز" ہی میں ظاہر ہوتی ہے۔ ایسے ہی مظاہر کی ایک قسم جنسِ نازک کا حسن بھی ہے اور چونکہ یہ حسن طبعی او رفطرتی ہے اس لئے صنفِ نازک سے جو گہوارہ حسن و جمال ہے محبت کرنا، حقیقت کی پرستش کرنا، اور قانونِ فطرت پر قائم رہنا ہے۔

مقبول حسین

احمد پوری

[1] "الہلال" مارچ سنہ ۱۹۳۱ء

عدم

طلسمِ اعتبارِ خوبیٔ تدبیر قائم ہے
ابھی ہم اپنی بربادی کو قسمت تو نہیں کہتے

وہ آتے ہیں تو دل میں کچھ خلش معلوم ہوتی ہے
میں ڈرتا ہوں کہیں اس کو محبت تو نہیں کہتے

وقارِ عشق پروانوں کی جانبازی سے قائم ہے
جوانمردی کو اہلِ ہوش وحشت تو نہیں کہتے

سفینہ غرق ہے ملاح نذرِ موجِ دریا ہے
مرے مولا اسے طوفانِ رحمت تو نہیں کہتے

ممتحن کا پان

ریل کے سفر میں اگر کوئی ہم مذاق مل جاتے تو تمام راہ مزے سے کٹ جاتی ہے۔ گو بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں کہ انہیں کوئی بھی مل جائے وہ اس کے ساتھ وقت گذاری کر لیتے ہیں مگر جناب میں غیر جنس سے بہت گھبراتا ہوں اور خصوصاً جب وہ پان کھاتا ہو۔ اب تو نہیں لیکن پہلے میرا یہ حال تھا کہ پان کھانے والے مسافر سے لڑائی تک لڑنے کو تیار ہو جاتا تھا۔ اگر جیت گیا تو خیر ورنہ شکست کی صورت میں خود وہاں سے ہٹ جاتا تھا۔ میں ایک بڑے ضروری کام سے دہلی سے آگرہ جا رہا تھا۔ خوش قسمتی سے ایک بہت دلچسپ ساتھی غازی آباد سے مل گئے۔ یہ ایک ہندو بیرسٹر کے لڑکے تھے اور ایم ایس سی میں پڑھتے تھے۔ خورجہ کے اسٹیشن پر ایک صاحب اور وارد ہوئے۔ یہ بھی ہم عمر ہونے کی وجہ سے ہماری ہی بنچ پر آ گئے۔ اور بہت سے لوگ آ گئے اور منجملہ ان لوگوں کے میں نے نہایت بے کلی سے دیکھا کہ ان میں ایک صاحب پان کھانے والے ہیں۔ ان حضرت نے ہماری ہی طرف رخ کیا اور ادھر میں گھبرایا۔ انہوں نے میری بنچ پر بیٹھنے کی نیت سے قلی سے اسباب میری طرف رکھوانا چاہا۔

"آپ اس طرف نہایت آرام سے بیٹھ سکتے ہیں۔" میں نے ایک کھچا کھچ اسباب اور مسافروں سے بھری ہوئی بنچ کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

انہوں نے اس کو شاید بدتمیزی خیال کر کے بُرا مانتے ہوئے کہا "جناب خود تکلیف کریں۔"

"یہ جگہ گھری ہوئی ہے۔" میں نے غلط بیانی سے کام لیتے ہوئے کج خلقی سے کہا۔

مگر وہ اتنے میں اسباب رکھوا کر بیٹھ بھی چکے تھے . . . میری طرف انہوں نے غور سے دیکھا . . . میں ان کی طرف نفرت نہیں بلکہ کچھ غصہ سے دیکھ رہا تھا کیونکہ مجھے پان کھانے والے سے اتنی نفرت نہیں ہوتی تھی جتنا کہ اس پر غصہ آتا تھا (اب بالکل نہیں آتا)

یہ حضرت فاختئی رنگ کی شیروانی پہنے ہوئے تھے۔ ترکی ٹوپی تھی۔ شاید چالیس اور پنتالیس برس کے درمیان عمر تھی۔ کپڑے صاف ستھرے اور پاکیزہ تھے۔

ریل چلی تو میں اس فکر میں تھا کہ اب ضرور یہ اپنی ڈبیا میں سے نکال کر پان کھائیں گے۔ کیونکہ ان کے منہ کی رفتار سے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے پان اب ختم ہونے والا ہے۔ اتنے میں میری نظر اُن کے ہینڈ بیگ پر پڑی جس سے میں نے فوراً معلوم کر لیا کہ یہ حضرت کسی بیرسٹر صاحب کے منشی ہیں کیونکہ اس پر لکھا تھا ٹی، ایچ بار ایٹ لا۔

میں نہ اب بداخلاق یا کج خلق ہوں اور نہ پہلے کبھی تھا مگر پان کھانے والے مسافروں سے مجھے چونکہ بغض تھا لہذا میں اب یہ سوچ رہا تھا کہ ان کو یہاں سے کس طرح ہٹاؤں۔ مگر تھوڑی ہی دیر میں اپنے دونوں ساتھیوں سے باتوں میں مشغول ہو گیا۔ زیادہ دیر باتیں کرتے نہ گذری تھی کہ کھٹکا ہؤا۔ سگرٹ کیس کے کھٹکے اور پان کی ڈبیا کے کھٹکے میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ حالانکہ اُن کی طرف میری پشت تھی مگر میں جان گیا اور پان کی ڈبیا کا گیلا گیلا سرخ کپڑا میری نظر کے سامنے بغیر دیکھے ہی آ گیا۔ مڑ کر دیکھا تو ان کے ہاتھ میں ایک پان کا ٹکڑا ہے۔ اخلاقاً انہوں نے میرے سامنے پیش کیا۔ یہ گویا تازیانہ ہو گیا۔ میں نے جل کر کہا "مجھے اس حماقت سے معاف کیجئے"۔

میں نے دیکھا کہ اس جملہ نے کیا کام کیا۔ مگر انہوں نے سوائے ایک سر کی جنبش کے زبان سے کچھ نہ کہا۔ نہ تو میں شرمندہ تھا اور نہ مجھ کو افسوس تھا۔ تھوڑی دیر بھی نہ گذری تھی کہ انہوں نے کھڑکی کے باہر سر ڈال کر تھوکا میں نے مڑ کر برجستہ کہا، "قبلہ اگر یہ دھندا کرنا ہے تو براہِ کرم دوسری جگہ تلاش کیجئے"۔

"کیا فرمایا جناب نے؟"

"میں نے یہ فرمایا کہ جناب یہ لال پچکاریاں کسی دوسری جگہ چھوڑیں"۔

انہوں نے نہایت ضبط سے کام لیتے ہوئے کہا "معاف کیجئے گا میں اس قسم کی گفتگو کا عادی نہیں"۔

"اگر جناب ایسی گفتگو کے عادی نہیں تو میں بھی اس کا عادی نہیں کہ آپ میرے پاس بیٹھ کر گندگی پھیلائیں......"

"جناب آپ ذرا......"

"لاحول ولاقوۃ" میں نے بھی بات کاٹتے ہوئے کہا "ذرا غور تو کیجئے کہ بکری کی طرح پتّے چبانا..... قسم خدا کی" میں نے اپنے ساتھی کو مخاطب کر کے کہا "یہ چھالیا بھی خوب ہے!! گویا ایندھن یا لکڑی چبا رہے ہیں"۔

مارے غصہ کے اُن حضرت کا منہ لال ہو گیا مگر نہایت ہی تحمل سے انہوں نے بالکل خاموش ہو کر میری طرف

سے منہ موڑ لیا اور سنی ان سنی ایک کر دی۔"

"آپ کو یہ نہیں چاہئے تھا" میرے ساتھی نے میری بد اخلاقی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں نہیں کہہ سکتا کہ مجھ کو پان سے کتنی نفرت ہے۔"

(۲)

ہمارے نئے ساتھی جو غازی آباد سے بیٹھے تھے عجب کہ کلاس فیلو نکلے۔ انہوں نے بھی ایل ایل بی فائینل کا امتحان علی گڈھ سے دیا تھا اور میں نے بھی دیا تھا۔ ایک دوسرے کو قطعی نہ جانتے تھے کیونکہ جماعت میں لونے دو سو لڑکے تھے اور رات کو لیکچر ہوتے تھے۔ اتفاق کی بات نظر ایک دوسرے پر نہ پڑی تھی یا اگر کبھی پڑی ہوگی تو خیال نہ رہا ہوگا۔ دوسرے ساتھی صاحب کو اس پر تعجب ہوا۔ امتحان کا نتیجہ ابھی شائع نہ ہوا تھا صرف پچیس دن امتحان کو گذرے تھے۔ لامحالہ امتحان کا ذکر ہونے لگا۔ ان کے سب پرچے اچھے ہوئے تھے اور میرے بھی سب پرچے اچھے ہوئے تھے۔ گذشتہ سال وہ سیکنڈ ڈویژن میں پاس ہوئے تھے اور میں فرسٹ ڈویژن میں پاس ہوا تھا۔ اپنے پاس ہونے کا مجھ کو قطعی یقین تھا اور وہ حضرت کہنے لگے کہ جناب سیکنڈ ڈویژن تو آپ کی کہیں گئی ہی نہیں ہے۔" . . . . یہ جملہ میرے لئے کس قدر خوشگوار تھا! دل سے خدا کا شکر ادا کر رہا تھا کہ تعلیم کی آخری منزل بھی ختم ہوئی کیونکہ مجھ کو اپنے پاس ہونے کا قطعی یقین تھا جس میں شبہ تک کی گنجائش نہ تھی تاوقتیکہ کوئی غیر معمولی واقعہ رجسٹرار یونیورسٹی کے دفتر میں پیش نہ آجائے۔ ہر پرچہ کا ذکر کیا گیا اور ہر پرچہ میں کتنے نمبر ملنے کی امید تھی اس کا اندازہ لگایا گیا اور کم از کم جو اندازہ لگایا وہ یہ تھا کہ سیکنڈ ڈویژن تو کہیں گئی نہیں ہے۔ کس جگہ وکالت شروع کی جائے گی کچھ اس پر بحث ہوتی رہی۔ پھر وکالت نہ چلنے کے امکان پر گفتگو اس پہلو سے کی گئی کہ دونوں طرف سے اس کی خوب تردید ہوئی۔

علی گڈھ کا اسٹیشن آیا اور وہ صاحب جو خورجہ سے بیٹھے تھے اتر گئے۔ اترتے وقت ہم نے ایک دوسرے کے رول نمبر مع نام و پتہ لکھ لئے اور خط و کتابت کا وعدہ بھی کیا . . . . (ابھی تک نہ انہوں نے مجھے خط لکھا اور نہ میں نے انہیں)

علی گڈھ سے گاڑی چلی۔ ایک بات میں نے عجیب نوٹ کی۔ اب تک تو وہ پان کھانے والے حضرت کچھ رنجیدہ اور کبیدہ تھے مگر اب وہ میری طرف بڑی دیر سے دیکھ رہے تھے۔ اُن کے چہرہ سے تمام غصہ رفو چکر ہو چکا تھا شاید وہ صاف دل تھے اور میری بد اخلاقی کو بھول گئے۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا "آپ نے امسال ایل ایل بی

فائنل کا امتحان دیا ہے"؟ یہ کہتے ہوئے ڈبیا کھولی اور میں نے بمشکل "جی ہاں" کہا تھا کہ انہوں نے ایک پان مجھے پھر پیش کیا۔ مسکراتے ہوئے انہوں نے کہا " آپ کو پان سے نفرت ہے، مگر آپ اس کو کھا کر دیکھیں"

میں نے ان کی طرف دیکھا.......... کیا یہ ممکن تھا کہ وہ تمام سنجیدگی کو رخصت کرکے مجھ کو چڑا رہے تھے، تاکہ بدلہ لیں.......... قطعی یہی ہے.......... یہ خیال کرتے ہی مجھ کو سخت غصہ آیا۔...اُن کے چہرہ سے واقعی یہ ظاہر ہوتا تھا کیوں کہ ان کے چہرہ پر ایک شرارت آمیز تبسم تھا۔ انہوں نے پان اور آگے بڑھایا اور میں نے اس کا جواب یہ بہتر سمجھا کہ تسلیم کرکے ان سے لے کر کھڑکی کے باہر پھینکدیا مجھے یقین ہوا کہ میں کامیاب رہا۔ مگر وہ حضرت بجائے خفا ہونے کے اب شاید مجھے تختۂ مشق بنانے پر تُلے ہوئے تھے۔ دوسرا پان پیش کرکے بولے اگر اب اس کو بھی آپ نے پھینک دیا تو عمر بھر پچھتانا پڑے گا"

میں بدتمیز و بدگو یا زبان دراز نہیں۔ مگر منہ سے کچھ سخت جملہ نکلتے نکلتے رہ گیا۔ لیکن پھر بھی بجائے ان کو بُرا کہنے کے پان کی مذمت کرنے لگا۔ اور بوجہ پان کے گندہ ہونے کے اس کے چھونے سے بھی مجبوری ظاہر کی +

"معاف کیجئے گا" انہوں نے پان کھا کر کہا " آپ میں تہذیب نہیں ہے"۔ یہ الفاظ انہوں نے رویہ بدل کر کچھ سنجیدگی سے کہے +

میں نے کہا" جی ہاں آپ صحیح فرماتے ہیں لیکن مجھ کو اس پر فخر ہے کہ پان کھلانے والوں کی بدتہذیبی کا جواب بدتہذیبی سے دوں" +

" ماشاءاللہ" یہ کہکر وہ اُٹھے اور اپنا سوٹ کیس کھولنے لگے۔ میں اپنے ساتھی سے جو غازی آباد سے میرے ساتھ بیٹھے تھے باتیں کرنے لگ گیا کہ اتنے میں انہوں نے میرا بازو پکڑ کر اپنی طرف متوجہ کرکے ایک کاپی میرے سامنے کرکے کہا:۔ آپ اس خط کو پہچانتے ہیں"؟

میں کچھ سٹ پٹا سا گیا اور کچھ عقل نے کام نہ کیا۔ میں نے ان حضرت کے چہرہ کی طرف دیکھا جو میرے سٹ پٹا جانے سے لطف اندوز ہو رہے تھے.......... میں علاوہ گھبرانے کے سخت خفیف سا ہو رہا تھا.......... یہ واقعہ تھا کہ میرے سامنے محمڈن لا (قانون محمدی) کی امتحان کی کاپی تھی اس پر سرخ رنگ سے نمبر اس طرح دیئے ہوئے تھے ۶۵ + ۱۰ گویا میں نے سو نمبروں میں سے پچھتر نمبر پائے تھے۔ نمبروں کو دیکھ کر کچھ خوشی سی ہوئی تھی کہ وہ بولے۔ آپ نے پرچہ بہت اچھا کیا تھا۔ اور آپ نے

۶۵ نمبر حاصل کئے تھے لیکن چونکہ آپ نے علاوہ قانون کے حوالہ کے تمام اُن احادیث کا بھی حوالہ دیا تھا جن پر قانون کی دفعات اور سوالات اور جوابات کا دارومدار تھا لہٰذا میں نے آپ کو دس نمبر اَور دیئے تھے لیکن اب مجھ کو معلوم ہؤا کہ آپ اسلامی قانون تو بڑی چیز ہے اسلامی تہذیب سے بھی ناواقف ہیں - لہٰذا میری دانست میں تو آپکو کل ۱۰ نمبر سے زائد نہ ملنا چاہئیں" یہ کہکر انہوں نے میرے اور میرے ساتھی کے سامنے سرخ پنسل جیب سے نکالکر ۶۵ نمبر کو سرخی سے کاٹ دیا اور اپنے وہاں دستخط بھی کر دیئے - اب مجھ کو حروف "ٹی - ایچ" کے معنی بھی معلوم ہو گئے تھے جو میں نے اُن کے ہینڈ بیگ پر دیکھے تھے +

یہ حضرت میرے ممتحن تھے !! .... میری حالت جو تھی وہ تھی مگر میرے ساتھی جو خود طالبعلم تھے سخت متعجب اور متاثر تھے - دراصل ہم دونوں ہی ہکا بکا تھے +

میری کاپی وہ اطمینان سے اپنے سوٹ کیس میں رکھتے ہوئے بولے "کم ازکم تین سال تک تو آپ پاس ہونے کا خیال ہی ترک فرمادیں - کیوں کہ میں ممتحن ضرور ہوں گا ، اور آپ کو فیل کروں گا - کیونکہ میرا خیال ہے - کہ ایک بدتہذیب شخص اس سے کم عرصہ میں تہذیب نہیں سیکھ سکتا "

میں اس کا جواب سختی سے بھلا کیسے دیتا ، میرے تو ہوش ہی بجا نہ تھے وہ غیر متعلق ہوکر اپنا چہرہ اخبار سے چھپائے ہوئے دوسری بنچ پر جا بیٹھے - تھوڑی دیر بعد جب ذرا دل کی دھڑکن کم ہوئی تو میرے ساتھی نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر گفتگو کرنا شروع کی - خوشامد کا تو خیال ہی انہیں کیا تھا - کہنے لگے کہ میں گواہ ہوں - آپ اپنر دعویٰ کر دیجئے گا - شاید انہوں نے یہ سن لیا جو اخبار پھینک کر بولے " شاید آپ دونوں صاحبوں سے قانون میں زیادہ جانتا ہوں - جناب من اگر یہ ممکن ہوتا تو ہر ممتحن پر طالب علم ایک گواہ تلاش کر کے مقدمہ دائر کر دیتے - خواہ واقعہ ہو یا نہ ہو - میں آپ دونوں صاحبان کو یقین دلاتا ہوں کہ میرا فیصلہ اٹل ہے - آپ شوق سے دعویٰ کریں" میں تو چپ تھا - مگر میرے ساتھی نے ان سے بحث کرنا شروع کی - مگر تھوڑی دیر میں مجبوراً مجھے ان کا مُنہ بند کرنا پڑا کیوں کہ ممتحن صاحب غصہ ہوئے جاتے تھے - تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد میرے ہمدرد ساتھی ممتحن صاحب کو قائل کرنے کی کوشش کر رہے تھے ، اور نرمی کی تلقین کر رہے تھے - میں چُپ بیٹھا دعا مانگ رہا تھا کہ خدا کرے یہ راضی ہوجائیں - مگر توبہ کیجئے .... "میری جان مت کھایئے" - یہ کہکر وہ اخبار پڑھنے میں مشغول ہوگئے +

(۳)

ہاتھرس کا اسٹیشن قریب آرہا تھا اور میرے ساتھی اترنے والے تھے - ممتحن صاحب اپنی پان کی ڈبیا

لینے اٹھے - انہوں نے ڈبیا کھول کر ایک پان نکالا اور میرے سامنے پیش کیا - میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا - میں نے معصومیت سے رنجیدہ صورت بناتے ہوئے ان کی طرف دیکھا - میرا ہاتھ خود بخود پان کی طرف بڑھ گیا............. آپ یقین کریں کہ میں پان کھا رہا تھا!!!

"چھالیا تو لیجئے" ممتحن صاحب نے بٹوا سامنے کرتے ہوئے کہا - کیونکہ میں بغیر چھالیا کے پان کھا رہا تھا اور وہ قریب الختم تھا - انکار کرتے ڈر لگا لہذا لے کر منہ میں ڈال لی - وہ اپنی جگہ پھر جا بیٹھے، اور یہاں چھالیا ایسی معلوم ہو رہی تھی جیسے منہ کو کوئی چھیل رہا ہے - حالانکہ ممتحن صاحب میری طرف دیکھ نہیں رہے تھے مگر پھر بھی میں نے تھوکنا مناسب نہ سمجھا کہ کہیں دیکھ نہ لیں - چونکہ قطعی عادت نہ تھی مجھے چھالیا مصیبت معلوم ہونے لگی - لیکن میں نے چبا چبا کر اس کو سرمہ کر ڈالا - پان کھانے کے قواعد کی رُو سے اس منزل پر پہنچکر پان کھانے والا تھوک سکتا ہے - مگر مجھ کو شاید معلوم نہ تھا - گو دیکھا تو تھا کہ لوگ اگال کو تھوک دیتے ہیں تھوڑی دیر میں چھالیا کا پھوک رہ گیا - چونکہ ضرورت سے زیادہ کھالی تھی لہذا اتنی مقدار نگل بھی نہ سکتا تھا - بڑی دیر تک منہ میں پھراتا رہا پھر تھوکنے کیلئے بیت الخلا کو بہتر سمجھا تاکہ ممتحن صاحب نہ دیکھ سکیں - وہاں سے جو چھالیا تھوک کر نکلا تو ممتحن صاحب کچھ تحکمانہ لہجہ میں بولے "کیا آپ نے پان تھوک دیا ؟" میں سن سے ہو گیا - اور جھوٹ بولا "جی نہیں" مگر نہایت ہی مردہ آواز سے کہا +

اس دوران میں میرے ساتھی گو ایم ایس سی کے طالب علم تھے مگر میرے چہرے کو فلسفیانہ انداز سے دیکھ رہے تھے، میرا چہرہ واقعی ہوگا بھی اسی لائق کیوں کہ خفت، حماقت، رنج، تکلیف وغیرہ وغیرہ علاوہ گھبراہٹ اور پریشانی کے ضرور میرے چہرہ سے عیاں ہو رہی ہوگی - ہاتھرس کا اسٹیشن آیا اور وہ اتر گئے +

(۴)

میرے ساتھی کے چلے جانے کے بعد اب میں نہ معلوم کن کن خیالات میں غرق تھا.......... خوشامد کروں.......... کبھی کی نہیں، بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ آتی ہی نہیں .... مگر ہاتھ جوڑنے سے کام بن جائے گا! اگر نہ مانیں تو قدموں پر سر رکھ دینا چاہیئے - پھر خیال آیا لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ آیندہ سال دیکھا جائیگا - ورنہ پھر نوکری کرلیں گے - ایسی خوشامد سے تو موت بہتر ہے +

ٹونڈلہ کا اسٹیشن آیا - میں آگرہ جا رہا تھا کیوں کہ سخت ضروری کام تھا - میں چونک سا پڑا - اب کیا کروں؟ یہ سوال تھا - واللہ اعلم ممتحن صاحب کہاں جا رہے ہیں - خیر کم ازکم کانپور کا تو ٹکٹ لے لینا چاہیئے - چنانچہ یہی کیا -

ٹکٹ لے کر واپس آیا۔ تو ممتحن صاحب بیٹھے ہوئے ایک صاحب سے باتیں کر رہے تھے۔ شاید اُن کے ملاقاتی ہیں میں نے دِل میں کہا۔ میں بھی بیٹھ گیا۔ ممتحن صاحب نے پان کی ڈبیا نکالی .... میں گھبرایا مگر مجبوری انہوں نے پیش کیا اور مجھے خوش ہو کر کھانا پڑا۔ "کیوں جناب پان بھی خوب چیز ہے" ممتحن صاحب نے اپنے دوست سے کہا +

انہوں نے جواب دیا "جی ہاں مجھے تو بغیر پان کے سفر دوبھر ہو جاتا ہے "۔

"یہی میرا حال ہے" ممتحن صاحب بولے اور پھر میری طرف مخاطب ہو کر پوچھا "کیوں جناب آپ کی کیا رائے ہے"؟ +

میری حالت کا اندازہ لگانا آسان ہے۔ ممتحن صاحب کے چہرہ سے فتح کی مسرّت عیاں تھی۔ میں بُت کی طرح شکست خوردہ تھا۔ گلا صاف کر کے کہا "جی ہاں"

"اوہو آپ تو پان بڑی تیزی سے کھاتے ہیں۔ ختم ہو گیا۔ اور لیجئے" بیرسٹر صاحب نے کہا + حالانکہ ختم نہ ہوا تھا۔ مگر کیسے کہتا کہ ختم نہیں ہوا، اور دوسرا نہیں لوں گا۔ لیا اور کھایا۔ میں خاموش تھا اور ایک گونہ خوشی تھی، کہ بیرسٹر صاحب اپنے دوست سے باتیں کرنے میں مشغول ہیں۔ تھوڑی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ میں سنتا رہا۔ مجھے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اب مُجھے کہاں جانا ہے +

اتنے میں بیرسٹر صاحب نے شاید میری مصیبت کا اندازہ لگا لیا اور شش و پنج میں پا کر کہا تھوک دیجئے۔ آپ تو چھالیا کھا رہے ہیں"۔ میں نے تھوک کر خلاصی پائی۔ شکر ہے کہ انہوں نے دوسرا پان نہیں دیا۔

(۴)

کانپور کے اسٹیشن پر میں نے بیرسٹر صاحب کی خدمت میں التجا کی۔ وہ کیا التجا تھی میں خود نہیں کہہ سکتا کیوں کہ نہ میں نے کچھ کہا اور نہ وہ سُن سکے۔ مجبوراً انہوں نے کہا "فرمایئے .... کیا کہتے ہیں .... بقولِ کسے یہاں صورت سوال تھی۔ بڑی مشکل سے میں نے کہا "میری زندگی تباہ ہو جائے گی .... میں کہیں کا نہ رہوں گا .... وغیرہ وغیرہ .... ان باتوں کا مختصر جواب صرف یہ تھا" معاف کیجئے۔ میں جب ایک مرتبہ کوئی کام کر چکتا ہوں تو رائے مشکل سے تبدیل کر سکتا ہوں"۔ یہ کہہ کر انہوں نے لکھنؤ والی گاڑی کا رُخ کیا۔ میں نے بھی دِل میں کہا کہ نہ چھوڑوں گا +

میں نے بیرسٹر صاحب کو نہ چھوڑنا تھا نہ چھوڑا۔ خدا کی پناہ۔ ضلع جونپور کے ایک غیر معروف گاؤں میں جانا تھا

راستہ میں نہ میں نے ایک لفظ بیرسٹر صاحب سے کہا اور نہ انہوں نے۔ میں بالکل بے تعلق دُور بیٹھا تھا۔ نہ انہوں نے پان دیا اور نہ بات کی۔ اتنا ضرور تھا کہ وہ مجھے کبھی کبھی غور سے ضرور دیکھ لیتے تھے۔ ضلع جونپور کے ایک غیر معروف ریلوے اسٹیشن پر شاید بیرسٹر صاحب اور میں یہ دو ہی اترنے والے تھے۔ بیرسٹر صاحب نے شاید مجھ کو عمداً دیکھا تک نہیں۔ ایک چھوٹی سی بیلوں کی گاڑی پر ان کا مختصر اسباب رکھدیا گیا۔ اور میں نے دیکھا کہ گرد و غبار میں بیل تیزی سے چلے جا رہے ہیں۔ دن کے دس بجے ہوں گے، نہ ناشتا میں نے کیا تھا اور نہ بھوک ہی تھی۔ گاڑی کو دیر تک کھڑا دیکھتا رہا کہ ایک دم سے چونک پڑا۔ میں نے یہ بھی نہ معلوم کیا تھا کہ وہ کون سا گاؤں ہے، جہاں بیرسٹر صاحب گئے ہیں۔ مگر ایک دہقانی نے ازراہِ عنایت مجھے یہ پتہ دے دیا۔ کہ فلاں فلاں گاؤں کے زمیندار صاحب کی گاڑی تھی۔ میں نے مزدور تلاش کیا اور اس کے سر پر اسباب لدوا کر چلدیا۔

شام کے چار بجے میں اس گاؤں میں پہنچا۔ زمیندار صاحب کا پتہ لگنا کیا مشکل تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں اُن کے عالیشان قلعہ کے باہر کھڑا سوچ رہا تھا کہ اب کیا کروں۔ مزدور کے ساتھ اسباب باہر چھوڑا اور اندر داخل ہوا۔ سامنے چبوترے پر بیرسٹر صاحب پنکھے کے نیچے لیٹے ہوئے تھے۔ دو آدمی اَور بھی کرسیوں پر لیٹے تھے۔ کچھ باتیں ہو رہی تھیں۔ کچھ ٹھٹکا مگر آگے بڑھا اور جیسے نووارد پہنچتا ہے پہنچا۔ بیرسٹر صاحب نے سلام کا جواب دیا۔ اٹھ کھڑے ہوئے۔ خندہ پیشانی سے ملے۔ دریافت کیا کہ اسباب کہاں ہے۔ نوکر سے اسباب منگایا ایک کمرے کی طرف اشارہ کر کے بتایا کہ جا کر غسل کر لیجئے اور کپڑے اُتاریئے۔ میں بھی بے تکلفی سے سیدھا چلا گیا۔ نہا دھو کر نکلا تو کمرے ہی میں دودھ کا دیہاتی مقدار میں شربت موجود تھا۔ شاید بیرسٹر صاحب نے صورت سے معلوم کر لیا ہو گا کہ بھوکا ہے۔ کمرے سے نکل کر باہر آ بیٹھا۔ بیرسٹر صاحب نے پان پیش کیا جو کھانا پڑا۔ میں بالکل ہی خاموش بیٹھا رہا۔ حتیٰ کہ دونوں آدمی اٹھ کر چلے گئے۔ مگر قبل اس کے کہ وہ جائیں مجھ کو بیرسٹر صاحب چار پان کھلا چکے تھے، وہ شاید غور سے دیکھتے رہتے تھے اور پان ختم ہونے ہی مجھ کو دوسرا پان دے دیتے تھے۔ تھوڑی ہی دیر بعد میں آپ سے کیا کہوں کہ پان کھانے کھاتے میرا کیا حال ہو گیا۔ دو تین پانوں تک تو اس کا احساس بھی رہا کہ چونا منہ میں لگ رہا ہے مگر شام تک تو منہ کی حالت ہی اَور ہو گئی۔

یہ بیرسٹر صاحب کی سُسرال تھی اور شام کو ان کے خسر صاحب نکلے۔ میرا تعارف کرایا گیا کہ میں ایک کرم فرما ہوں اور خوبیوں کا مجموعہ ہوں۔ رات کے آٹھ بجے تک داماد اور خسر اور کرم فرما بیٹھے باتیں کرتے رہے مگر جو حال کرم فرما کا پان کھاتے کھاتے ہو گیا اس کو خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ کھانا کھایا گیا تو میرا منہ نہ چلتا تھا کیوں کہ

نوں نے سارا منہ اندر سے زخمی کر دیا تھا۔ اور پھر اس پر چھالیا گویا نمک پاشی کرتی تھی"۔ پان بھی خوب چیز ہے"
بیرسٹر صاحب نے کھانا کھانے کے بعد مجھے پان پیش کرتے ہوئے کہا

"جواب نہیں رکھتا" مجھ کو کہنا پڑا۔

"کھانے کو ہضم کرتا ہے اور منہ کی گندگی کو دور کرتا ہے اور مفرح ہے" بیرسٹر صاحب نے کہا۔

"مفرح بھی ہے"! میں نے ازراہ تعجب کہا۔

"بہت عمدہ چیز ہے" خسر صاحب بولے "لیکن اعتدال کے ساتھ"

(۵)

صبح کو مجھے موقع ملا کہ خسر صاحب سے اپنی مصیبت کا حال بیان کروں۔ صرف میں اور وہی تھے اور بہترین موقع تھا کیوں کہ انہوں نے خود بخود بہ سلسلۂ گفتگو میری آئندہ زندگی کے بارے میں سوالات کئے تھے۔ انہوں نے میری داستان تعجب سے سنی۔ لیکن ہنسے بھی اور مجھ سے وعدۂ سفارش کیا۔ اتنے میں بیرسٹر صاحب بھی آ گئے۔ میں نہیں بیان کرنا چاہتا تھا کہ کیا گفتگو ہوئی اور کیا ہوا۔ قصہ مختصر، یہ طے ہوا کہ میں چار دن اور ٹھہروں اور دن رات پان کھاؤں۔ بمصداق ع ایں ہم اندر عاشقی بالائے غمہائے دگر۔ ان چار دنوں میں کیا بتاؤں کہ کتنے پان کھانا پڑے۔ منہ کا برا حال تھا۔ مگر پان پر پان کھاتا تھا اور اف نہ کرتا تھا۔ چلتے وقت بیرسٹر صاحب نے کہا کہ میرا پان اب آپ کبھی نہ بھولیں گے اور بیشک حالانکہ سال بھر سے زائد گذر گیا۔ مگر ہنوز یاد تازہ ہے، جو شاید کبھی نہ بھولے۔

نتیجہ

اب خوب پان کھاتا ہوں +

مرزا عظیم بیگ چغتائی

کیسی رنگینیوں کا نقشہ ہے؟

کیسی رنگینیوں کا نقشہ ہے   اے خُدا! خوب تیری دُنیا ہے
چوٹیاں برف کی چمکتی ہیں   کیسی چاندی ہے کیا ہی سونا ہے!
چوٹیوں پر ہیں چوٹیاں قائم   سلسلہ دُور تک یہ پھیلا ہے
غیر ہے کوئی یا ہمیں خود ہیں   جلوہ کیا جانئے یہ کس کا ہے؟
راج جنگل میں ہے خموشی کا   شہر میں ایک شور برپا ہے
آدمی ہے اُدھر اِدھر فطرت   اِک یہ دنیا ہے اک وہ دنیا ہے
کونسی اصل کونسی ہے نقل   مدتوں سے یہاں یہ جھگڑا ہے
ذرّہ پھل پھول جانور انساں   اپنی اپنی ہر اک کی دُنیا ہے!
منحصر ہے خیال پر سب کچھ   زیست وہم و گمان و سودا ہے
تو ہے دنیا کا ایک باشندہ؟   یا کہ تیری بھی کوئی دُنیا ہے؟
تیرتا ہے تو زورِ بازو سے؟   یا کہ دریا کی رَو میں بہتا ہے؟
مشکلیں ہیں تو ان کو آساں کر   رنج کیا درد کیا جفا کیا ہے؟
تیری ہمّت ہی تیری قسمت ہے!   حکمِ تقدیر کیا قضا کیا ہے؟
اور جو ہونا ہے کچھ تو ہونے دے   رونے دھونے سے یوں ہُوا کیا ہے؟
کام سے اپنے کام رکھ غافل!   کام اَوروں کے دیکھنا کیا ہے؟
کام کر تُو بھی کچھ کبھی تو بشیر   کہنے سُننے کا تجھ کو سودا ہے!

ب

دلچسپیاں

محبت، عالمگیر محبت! یہ ہو میری ساتھی!

ایمان محکم اور ہر لمحہ جدید ایمان! یہ ہو میرا رہبر!

لوگ بُرے کہاں ہیں اور جو ہیں اور جو برائیاں بھی ہر انسان میں ہیں کیا وہ بے جانے بوجھے بھی ساعی نہیں نیکی کی طرف؟ اور اس جدّ و جہد میں انہیں ضرورت ہے میری محبت کی، محبت جو بغیر احسان کے دی جائے اسے اور اُسے اور ہر کسی کو!

میں جانتا ہوں کہ میری مساعی دنیا کو جنت نہیں بنا سکتیں۔ میں مانتا ہوں کہ مایوسیاں مساعی کے لئے قدم قدم پر موجود ہیں اِس دنیا میں، لیکن پھر کیا یہ زندگی کامیابی کے لئے ہے؟ نہیں کامیابی کیسی اور ناکامی بھی کیوں؟ یہ زندگی دلچسپی کے لئے ہے، دلچسپی کاموں کی، دلچسپی نئی سے نئی باتوں کی! اور کام وہی ہے جو کیا جائے اور پھر اُس کی جگہ کوئی اَور کام لے کہ کام وہ نہیں جسے انسان کرے اور پھر انتظار کیا کرے بیتابی سے اُس کے نتیجے کا۔ نتیجے کا منتظر تو خدا ہے اور منتظر اِس لئے کہ وہ پہلے سے واقف ہے واقعات سے، وہ منتظر ہے کہ ہونا وہی ہے جو اُسے معلوم ہے! اور اچھا نتیجہ جو ہُوا بھی وہ کب تک اچھا رہا، وہ کب تک قائم رہا؟ اور قیام کس شئے کو ہے؟ اور کس قدر سچ ہے کہ "فانی ہر ایک شے ہے اور بقا صرف تیرے خدا کی ذات کو ہے خدا وہ ربِّ ذوالجلال والاکرام"!

اور ہمارا رب بھی جو اپنا نہیں بلکہ ہم سب کا ہی ہے وہ بھی کس طرح قائم ہے؟ اور تھا اور رہے گا؟ اِس کا علم کس کو ہے؟ ہمیں تو نہیں اور نہ ہوگا جب تک بھی، تو نہ ہو کہ ہمارا کام اور اس کام کی جزا دونوں ایک ہی ہیں! کیا؟ یہی نئی سی نئی خوبصورتیوں کا نظارہ دیکھتی آنکھوں اور تڑپتے دلوں کے لئے!

نہ کبھی مایوسی کے جہنم میں نہ کبھی تکبر کے فردوس میں، نہ وہاں جا نہ یہاں! صراط پر چلے جا، صراط پر کہ صراط ہی زندگی ہے بال سے زیادہ باریک، تلوار سے زیادہ تیز؛ زندگی یہ رستہ ہے اور انسان اِس کا رہ رو!

گرنا پڑتا ہمیشہ، نرا اطمینان کبھی نہیں، لیکن اک سچے انسان کے لئے غایت درجہ دلکش و روح پرور! اور روح کو موت بھی تباہ نہیں کر سکتی اور نہ صرف دنیا کی زندگی ہی اُس کے لئے کافی ہے!ـــــ سو بیدھڑک اس توسن کو دوڑائے جا بھگائے جا اور پھر جہاں یہ لے جائے تجھے چلا چل!

ب

فاتحانہ انداز

"اگر تم دلیری، سنجیدگی اور متانت کے ساتھ زندگی بسر کرو تو کوئی قوت تمہارا مقابلہ نہیں کر سکتی"

(براؤننگ)

"اگر ہم ہر شئے کی طرف فاتحانہ انداز اختیار کریں، تو یقیناً ہم ہر شے پر کامل اختیار پا سکتے ہیں، تمام دشواریاں ہماری راہ سے دور ہو جائیں گی اور جب کائنات کی قوتِ فاعلی پر ہمیں اقتدار حاصل ہو جائے گا تو پھر ہمیں حسبِ منشاء زندگی بنانے کے لئے کافی مواد مل سکے گا" +

حصولِ کامیابی کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ انسان کا انداز اور طرزِ عمل فاتحانہ ہو۔ اس سے دوسروں کے اور خود اپنے اندر وثوق پیدا ہوتا ہے۔ تمہاری چال ڈھال گفتگو اور افعال سے یہ ظاہر ہونا چاہیئے کہ تم بھی کوئی چیز ہو یا آئندہ تمہاری شخصیت کے وقیع ہو جانے کی کافی توقع ہے۔ لوگوں سے اس طرح ملو جلو جس سے شانِ امتیازی ٹپکے۔ تمہارے چہرے بلکہ تمہارے طور طریق سے کامیابی مترشح ہونی چاہیئے۔ اپنی زندگی یہ سمجھ کر بسر کرو کہ دنیا میں تم کو کوئی عظیم الشان کام انجام دینا ہے۔ تمہاری شخصیت سے امید، شادمانی اور کامرانی کا اظہار ہونا چاہیئے۔ دوسرے لفظوں میں، تمہاری شخصیت، اُس کامیابی کا جو تمہارا مقصود ہے زندہ اشتہار ہونی چاہیئے +

اگر تم شکوک، شبہات، ناامیدی اور حرماں کا شکار ہو تو نہ صرف تم دوسروں کی نظروں میں ذلیل ہو جاؤ گے جو تم کو ایک کمزور طبع اور ناکام شخص تصور کریں گے، بلکہ ان باتوں کا خود تمہاری ذہنیت پر ایسا ناگوار اثر پڑے گا کہ تمہارے اندر سے اعتمادِ ذاتی، قوتِ ارادی، قابلیت اور استعداد بھی زائل ہو جائے گی۔ ان باتوں سے تم گویا دنیا کے افراد کو جن سے تمہیں ملنے کا اتفاق ہو گا، یہ بتاؤ گے کہ کارزارِ زندگی میں تم ایک شکست خوردہ انسان ہو۔ اور کامیابی کی جھلک یا فاتحانہ انداز اگر تمہارے چہرہ سے مترشح ہو تو دوسرے بھی تم پر اعتماد کریں گے اور تم خود بھی اپنے آپ پر اعتماد کرو گے۔ ناامیدی، یاس و حرماں کی جھلک دوسروں کو تم سے بدگمان کر دے گی اور تمہاری شخصیت کا اثر بھی اُن پر برا ہی پڑے گا +

اگر تمہارے چہرہ سے شادمانی عیاں نہیں ہوتی، اگر تمہارے بشرے سے کامیابی نہیں ٹپکتی، تو دنیا میں کسی کو تمہاری ضرورت نہیں۔ جس کسی سے تم کام کاج کے طالب ہو گے وہ تمہاری طرف سے پیٹھ پھیرے گا۔ پھر

اگر تم عرصہ بیکار بھی ہو، تو بھی لازم ہے کہ اپنی صورت کو شادمان اور اپنی ہمت کو بلند رکھو ورنہ جس شے کے حصول کی تمہیں فکر ہے اس میں ناکامی ہوگی یاد رکھو کہ دنیا میں وہ لوگ کسی کام کے نہیں جو رات دن اپنی بدقسمتی کا رونا روتے رہتے ہیں اور رنج وغم کی تصویر بنے پھرتے ہیں +

لوگوں کے اُس اندازے سے بچنا نہایت مشکل ہے جو وہ ہماری سیرت کے متعلق لگاتے رہتے ہیں ۔ اگر کسی شخص کے دل میں ہماری سیرت کے متعلق ابتدائی خیال بُرا ہو جائے تو پھر اس خیال کو آگے چل کر زائل کرنا نہایت مشکل ہو جاتا ہے ۔ اسی لئے ہمیشہ ایسا نقش دوسرے کے دل پر جمانا جو بجائے نقصان، نفع رساں ہو نہایت ضروری ہے +

اِس سے میرا یہ مطلب نہیں کہ تم دوسروں کو دھوکا دو ، اور اپنی سیرت کو واقعیت کے خلاف ظاہر کرو بلکہ کہ تم کو اپنی سیرت کا روشن ترین پہلو ہمیشہ دوسروں کو دکھانا چاہیئے، نہ کہ اُدلٹے یا بُرا پہلو +

ہمارا ظاہر اُس شیشہ دار کھڑکی کی طرح ہے جس میں گاہکوں کی توجہ جذب کرنے کے لئے خوشنما چیزیں لگائی جاتی ہیں ۔ اور جو چیزیں ہم وہاں رکھتے ہیں اُن ہی کو دیکھ کر لوگ ہمارے سامان کی خوبی کا اندازہ لگاتے ہیں جس بات کو ہر لحظہ پیشِ نظر رکھنے کی ضرورت ہے وہ زندگی کا کامیاب تخیل ہے نہ کہ ناکام تخیل، اور کامیابی کا تصور نہ کہ ناکامی کا تصور، اور اسی خیال کی بدولت تمہیں کامیابی نصیب ہوگی +

تمہیں اپنی شخصیت سے یہ ظاہر کرنا چاہیئے کہ تم یا تو ایک کامیاب انسان ہو یا آئندہ کامیابی حاصل کروگے ورنہ تم کتنی ہی زبردست سند کیوں نہ پیش کرو وہ اُس بُرے اثر کو زائل نہ کر سکے گی جو تمہاری ناخوش آئند شخصیت سے لوگ قبول کرلیں گے +

ہماری کامیابی کا انحصار زیادہ تر ہماری شہرت اور دوسروں کو عمدہ طور سے متاثر کرنے پر ہے ۔ پس لازم ہے کہ تم اپنے اندر دماغی قوتِ عمل پیدا کرو کیوں کہ قوی شخصیت کا دارومدار قوی دماغ پر ہے اور اسی کی بدولت ہماری سیرت میں پختگی پیدا ہوتی ہے ۔ اگر ہم قوتِ ارادی، قوتِ فیصلہ اور اثباتی تخیل اپنے اندر پیدا کرلیں تو یقیناً دوسروں کے دلوں میں ہماری برتری کا نقش قائم ہو جائے گا اور یہی بات ترقی کا زینہ ہے ۔ کامیابی اسی قوت سے حاصل ہوتی ہے اور اگر ہمارے بشرے سے یہ رنگ نہیں جھلکتا تو لوگوں کو ہماری استعدادِ کامیابی کا یقین نہیں ہو سکتا ۔ وہ یہ فیصلہ تو کر سکتے ہیں کہ ہم اُن کے ماتحت، ہوشیاری اور دیانت سے کام کر سکتے ہیں یا مقررہ نظام پر عامل ہو سکتے ہیں لیکن وہ ہمارے متعلق یہ خیال نہیں کر سکتے کہ ہم دوسروں پر حکمرانی کیلئے

پیدا ہوئے ہیں یا ضرورت کے وقت مشکلاتِ پیش آمدہ کا کوئی فوری حل تجویز کر سکتے ہیں +

ایسی کوئی بات نہ کہو نہ کرو جس سے تمہاری ذاتی کمزوری عیاں ہوتی ہو یا کم مائیگی اور ناکامی کا اظہار ہوتا ہو مصیبت زدہ مفلسوں کی سی صورت کبھی ہرگز مت بناؤ، اور دنیا پر یہ بات ہرگز ظاہر نہ کرو کہ تم مصیبت میں ہو، نہ اداس چہرہ یا روتی صورت بناؤ جس سے لوگ یہ سمجھیں کہ تمہاری زندگی بجائے کامیاب اور شاندار ہونے کے محض ناکام ہے +

اپنی گفتگو، بُشرے، چال ڈھال، یا اطوار، سے یہ ظاہر مت کرو کہ تمہیں کسی قسم کی پریشانی ہے - چست و چالاک اور ہشاش بشاش رہو - سر بلند کرکے چلو، ہر شخص سے آنکھ ملا کر بات کرو - خواہ تم کتنے ہی مفلس اور نادار کیوں نہ ہو، خواہ تم بیکار، بگھرے، اور بیکس ہی کیوں نہ ہو، لیکن دنیا پر یہی ظاہر کرو کہ تم اپنی عزت آپ کرتے ہو، اور اعتماد علے النفس رکھتے ہو، اور اگرچہ تمہارے راستہ میں صدہا مشکلات حائل ہیں لیکن تمہارا ہر قدم کامیابی ہی کی طرف اٹھ رہا ہے - اپنے بشرے سے یہ بات ثابت کرو کہ تم اپنی بہبود کے لئے تدابیر سوچ سکتے ہو، اور تمہاری دماغی قوت زوردار ہے +

فاتحانہ انداز اختیار کرنے کی وجہ سے تم کو کامیابی کے وہ ذرائع حاصل ہو سکیں گے جو بُزدلانہ اور استعدادِ ذاتی کی تنقیص کرنے والے انداز سے حاصل نہیں ہو سکتے - اس بات کی ایک بڑی عمدہ مثال شہر بوسٹن کی ایتھینیم لائبریری کے ایک تماشائی کے طرزِ عمل سے مل سکتی ہے +

ایک عورت جو اِس کتب خانہ کے اس اُصول سے ناواقف تھی کہ صرف باضابطہ ممبر ہی اندر بیٹھ کر مطالعہ وغیرہ کر سکتا ہے، نہایت تمکنت کے ساتھ اندر داخل ہوئی - ایک آرام دہ کرسی پر بیٹھ گئی اور وہاں بیٹھ کر باطمینان نوشت و خواند میں مصروف ہو گئی - شام کو ایک دوست سے ملنے گئی تو بسبیلِ تذکرہ وہاں جانے کا واقعہ بھی بیان کیا - اس پر اُس کے دوست نے کہا "خوب! مجھے آج تک یہ معلوم نہ تھا کہ تم بھی اس لائبریری کی ممبر ہو" عورت نے کہا "میں ممبر تو نہیں ہوں، لیکن یہ بتاؤ کہ ممبر ہونے سے کیا بات حاصل ہو جاتی ہے؟" اُس نے قرطاس رکنیت دکھا کر کہا "صرف وہی لوگ اس کے اندر جا کر مطالعہ سے بہرہ اندوز ہو سکتے ہیں جن کے پاس یہ "اجازت نامہ" ہو +

ہمارے اطوار اور اوضاع پر ہمارے خیالات کا زبردست اثر پڑتا ہے - اگر ہم ہر وقت ناکامی کا تصور کرتے رہیں تو یقیناً ہماری صورت ناکام لوگوں کی سی ہو جائے گی، اور سچ تو یہ ہے کہ ناکامی سے پہلے ہی ہم ناکام ہو چکے - اور اگر ہم کامیابی کے خیال میں غرق رہیں، اور یہ سمجھیں کہ اب چند روز میں کامیابی حاصل ہوئی تو ہماری شکل

کامیاب لوگوں کی سی ہو جائے گی، بلکہ یہ سمجھ لو کہ ہم کامیاب ہو چکے۔ اندازِ ناکامی، واقعی ناکامی کا پیش خیمہ ہوتا ہے اور اسی طرح اندازِ کامیابی، کامیابی کا +

اگر اُس عورت کے دل میں لائبریری میں داخل ہونے کے حق کے متعلق کچھ شبہ ہوتا تو اس کے اوضاعِ ظاہری سے اس کمزوری کا پتہ چل جاتا اور وہاں کے خدام فوراً بھانپ جاتے اور اس سے کارڈ طلب کرتے۔ لیکن اُس کی پُراطمینان حالت سے سب کو یہی خیال ہوا کہ وہ باقاعدہ ممبر ہے یعنی اس کا فاتحانہ انداز موقع کی نزاکت پر غالب آگیا۔ اور اُسے وہ ذرائع عطا کر دیئے جو ویسے حاصل نہ ہوتے +

تمہاری زندگی کی شاندار کامیابی یا ذلیل ناکامی کا انحصار زیادہ تر اس بات پر ہے کہ تم پیش آمدہ مشکلات کا مقابلہ فاتحانہ انداز، کامل قوتِ ارادی، زبردست عزم، اور جرأت کے ساتھ کرتے ہو یا بزدلی، تھڑدلی، کم ہمتی اور تشکوک کے ساتھ +

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس طرح زندگی بسر کرو کہ جب لوگ تمہیں آتا ہوا دیکھیں تو آپس میں کہیں: "وہ دیکھو ایک کامیاب انسان چلا آتا ہے، جو ہر شے پر فاتحانہ انداز سے قابو پالیتا ہے" +

اگر تم اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھنے لگو گے تو ہو بھی جاؤ گے۔ اسی طرح اگر ہر وقت اپنی بدقسمتی کا تصور کرو گے اور ہر لمحہ ناکامی کے خیال میں رہو گے تو رفتہ رفتہ ایسے ہی ہو بھی جاؤ گے +

جو اندازِ دماغی تمہارے خیالات اور احساسات کی بنا پر قائم ہو گا وہ ایک حقیقی قوت ہے جو تمہاری زندگی کو شاندار بھی بنا سکتا ہے اور ذلیل و خوار بھی۔ ہمیشہ اپنے کو خوش قسمت تصور کرنے اور موجودہ زندگی کو نعمت سمجھنے سے تمہارے اندر وہ انداز پیدا ہو جائے گا، جو کامیابی کی مستقل ضمانت ہے +

ہم سب کو زندگی اس طرح بسر کرنی چاہیئے گویا ہم ایک عظیم الشان مقصد کو انجام دینے کے لئے آئے ہیں۔ بنی نوعِ آدم کو ارفع بنانے کے لئے، ان کی مدد کرنے کے لئے، نہ کہ ذلیل و پست کرنے اور مشیتِ الٰہی کی تخریب کرنے کے لئے۔ ہمارے طرزِ عمل سے یہ بات مترشح ہونی چاہیئے کہ ہمیں اس دنیا میں بڑے بڑے کام انجام دینے ہیں اور انسانیت کی عظیم الشان خدمت ہمارے سپرد کی گئی ہے +

بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ زندگی ایک قسم کی قمار بازی ہے جس میں جیت کا امکان بہت کم ہے۔ اس اعتقاد کا اثر اُن کے رجحانِ طبع پر پورے طور سے چھا جاتا ہے اور بہت سی ناکامیوں کا باعث ہوتا ہے گھوڑدوڑ میں بازی لگانے والے، اپنے اپنے جیتنے کے موقعے خود معین کرتے ہیں۔ مثلاً پانچ سو

آدمی ایک گھوڑے پر شرط لگائیں اور سو آدمی دوسرے پر تو پہلے گھوڑے کو خواہ مخواہ دوسرے سے پانچ اور ایک کی نسبت ہو جائیگی۔ یعنی اُس کے آگے نکلنے کا امکان دوسرے سے پانچ گنا زیادہ ہوگا۔ زندگی کی دوڑ میں بہت سے آدمی اپنی ناکامی کے امکان پر بازی لگا دیتے ہیں +

گھوڑ دوڑ میں کسی گھوڑے کے آگے نکلنے کے متعلق حکم لگانے کے لئے مختلف گھوڑوں کی دوڑنے کی قابلیت کا کچھ نہ کچھ علم ضرور رہتا ہے۔ لیکن زندگی کی دوڑ میں اگر انسان اپنی ناکامی کے امکانات کے متعلق حکم لگا بیٹھتا ہے تو یہ حکم کسی علم پر مبنی نہیں ہوتا۔ بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ فلاں معاملہ میں وہ کامیاب ہو ہی نہیں سکتے۔ جب وہ اپنے ارد گرد نظر ڈال کر یہ دیکھتے ہیں کہ بہت کم لوگ کامیاب زندگی بسر کر رہے ہیں تو وہ اپنے دل میں یہ کہتے ہیں کہ ہمیں کیا حق حاصل ہے کہ اپنی کامیابی کے متعلق ان لوگوں کی بہ نسبت زیادہ امکانات کی امید رکھیں؟ آخر ان لوگوں میں بھی اتنی ہی لیاقت موجود ہے جتنی ہم میں، ممکن ہے زیادہ ہو، پس جب وہ زندگی کی مشکلات سے عہدہ برا نہیں ہو سکتے تو ہمیں تقدیر سے بر سر پیکار ہو کر کیا ہاتھ آسکتا ہے؟

اس طرح جب لوگ اپنی آئندہ ناکامی کا یقین کر لیتے ہیں، اور اس یقین کے ماتحت زندگی بسر کرتے ہیں کہ وہ کامیاب نہ ہو سکیں گے تو کوئی تعجب نہیں اگر دنیا میں ان کی کامیابی کے امکانات نہ نکل سکیں +

جب کوئی بظاہر مفلس اور مصیبت زدہ کسی گوشہ میں دم توڑ دیتا ہے تو لوگ کہتے ہیں کہ وہ پاگل، احمق مراقی اور خبطی سا تھا۔ نعش کا معائنہ کرنے والا سرکاری عہدہ دار بھی یہی فیصلہ دیتا ہے کہ بوجہ گرسنگی موت واقع ہوئی، لیکن مزید تلاش کے بعد متوفی کے سامان میں سے یا تو کسی بنک کی چیک بک نکلتی ہے یا کسی کونے کھدرے میں دبی ہوئی دولت۔ پس ہماری رائے میں یہ مراقی اور خبطی سے لوگ جو دولت جمع کر کے چھوڑ جاتے ہیں اور قوتِ لایموت کے لئے بھی خرچ نہیں کرتے ان لوگوں ہی کی طرح بد نصیب ہیں جو رونی صورت اور ناکام آدمیوں کی شکل بنائے رہتے ہیں اور دنیا کی نعمتوں سے بہرہ اندوز ہونے کا سلیقہ نہیں رکھتے۔ کوئی تعجب نہیں کہ اس قسم کے لوگوں کو پے در پے ناکامیاں نصیب ہوں۔ بہر حال انہیں وہی ملتا ہے جس کی وہ توقع کرتے ہیں +

اچھا آپ اُس ایکٹر کے متعلق کیا خیال کرتے ہیں جو اسٹیج پر کسی ہیرو کا پارٹ ادا کرنے کے لئے آئے لیکن اپنا انداز بزدلوں کا سا بنائے، اور اپنی شکل اور ہیئت ان لوگوں کی سی بنائے جو سمجھتے ہیں کہ وہ کبھی کامیاب ہی نہیں ہو سکتے۔ اور اپنے دل میں یہ یقین رکھتے ہیں کہ وہ کوئی بڑا کام انجام نہیں دے سکتے۔ یقیناً

پ یہی کہیں گے کہ ایسا شخص کبھی بھی ایک کامیاب ایکٹر نہیں ہو سکتا۔ اس کی کامیابی کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو ہیرو کی طرح بنائے اور اسی کا سا انداز اختیار کرے۔ دنیا کے مشہور ایکٹر بالکل یہی کرتے ہیں۔ وہ سرتاپا اس شخص کی حالت اپنے اوپر طاری کر لیتا ہے جس کا پارٹ اسے ادا کرنا ہوتا ہے بلکہ تھوڑی دیر کے لئے وہ اپنے آپ کو وہی ہستی تصور کر لیتا ہے خواہ وہ پارٹ کسی بادشاہ کا ہو یا کسی فقیر کا، ایکٹر اسے ہو بہو ادا کرتا ہے۔ اگر وہ کسی ہیرو کا پارٹ ادا کرتا ہے تو اپنے آپ کو ہیرو سمجھتا ہے اور اگر کسی فقیر کا تو اپنے آپ کو فقیر خیال کرتا ہے۔ فقیروں ہی کے لباس میں اسٹیج پر آتا ہے انہی کی صورت بناتا ہے انہی کی سی باتیں کرتا ہے ٭

اسی طرح اگر تم کامیاب ہونا چاہتے ہو تو کامیاب آدمیوں کا سا انداز مزاج اختیار کرو، نشست و برخاست، گفتگو، سب کچھ کامیاب آدمیوں ہی کا سا ہونا چاہیئے۔ اور جس کام میں ہاتھ ڈالو اُس کے متعلق یقین رکھو کہ تم اسے پورا کر کے رہو گے۔ اگر تم اپنی صورت اور ذہنیت ناکام لوگوں کی سی بناؤ گے، اور ہر شخص سے یہی بیان کرو گے کہ تمہیں کامیابی کی کوئی امید نہیں کیوں کہ دنیا میں بہت کم لوگ کامیاب ہوتے ہیں اور زیادہ تر لوگ ادنےٰ درجہ ہی کی زندگی بسر کرتے ہیں تو تمہیں اسی قدر کامیابی ہوگی جس قدر اس ایکٹر کو جو اسٹیج پر بادشاہ کا پارٹ ادا کرنے آئے اور صورت بنائے فقیروں کی سی ٭

نفسیاتی اصول یہ ہے کہ ہم صرف اُن چیزوں کو اپنی طرف جذب کر سکتے ہیں۔ جو ہماری ذہنیت سے مطابقت رکھتی ہیں یا ہمارے ایمان، عقاید، امید، آرزو اور تمنا کے دائرہ میں ہوتی ہیں یا جن کا تعلق ہمارے شکوک اور شبہات خطرات اور وساوس سے ہوتا ہے۔ اگر اس نکتہ کو اچھی طرح سمجھ کر اصول زندگی بنا لیا جائے تو نہ پھر افلاس ہو نہ قزاقی نہ ناکامی نہ جرائم، اور اس قسم کے لوگ کہیں نظر نہ آئیں جن کے چہروں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ دنیا میں انہیں کوئی راحت نصیب نہیں اور جو اس مسئلہ کو نہایت اہمیت دیتے ہیں کہ یہ دنیا رہنے کے قابل ہے یا نہیں، ایسی دنیا میں جہاں تکلیف زیادہ اور راحت کم ہے۔ مسلسل دشواریوں کا مقابلہ کرنا دانشمندی ہے یا نہیں ٭

ہر لڑکے اور لڑکی کو فاتحانہ انداز اختیار کرنے کی تعلیم دینی چاہیئے۔ بچپن ہی سے یہ خیال اس کے دل میں جاگزین کرنا چاہیئے کہ وہ ایک کامیاب انسان بننے کے لئے پیدا ہوا ہے وہ ایک شاہزادہ ہے اور ایک بڑا آدمی ہوگا۔ شروع ہی سے اسے بلند نظری کی تعلیم دینی چاہیئے تاکہ وہ اپنے آپ کو بادشاہوں کی اولاد تصور کرے اور یہ یقین اس کے دل میں پیدا ہو جائے کہ وہ اس دنیا میں کارنمایاں کرنے کیلئے پیدا ہوا ہے، بچوں کی تربیت صحیح معنوں میں کامل اسی وقت ہوگی جب ان کے دلوں میں حسِ کامیابی پیدا ہو جائے گا اور انہیں

حالات پر قابو پانے کا طریق معلوم ہو جائے گا - جب کوئی نوجوان، جس کا سینہ امنگوں اور بلند خیالات سے لبریز ہونا چاہیئے، اپنی آیندہ زندگی کے متعلق شکوک ظاہر کرتا ہے تو مجھے بہت تکلیف ہوتی ہے - آیندہ ناکامیوں کا ذکر کرنا گویا خالقِ کائنات سے غداری کرنا ہے - غور سے دیکھا جائے تو نوجوانی خود ایک کامیابی ہے اور آیندہ بہبود کا پیش خیمہ ہے - کسی نوجوان مرد یا عورت کا اپنی آیندہ ناکامی کے متعلق ذکر و فکر کرنا ایسا ہی ہے جیسا کسی خوبصورت آدمی کا یہ کہنا کہ میں بدصورت ہوں، یا کسی تندرست آدمی کا یہ کہنا کہ میں بیمار ہوں - نوجوانی کے معنی ہی کامیابی ہیں کیوں کہ نوجوان آدمی کی زندگی میں ہر بات ترقی ہی طرف مائل ہوتی ہے تنزل کا تو کہیں نام و نشان ہی نہیں ہوتا - نوجوانی کی خاصیت ہی ترقی کرنا اور بلند ارادے قائم کرنا ہے، اور اُس کی فضا میں امید اور کامیابی کے خیالات کے علاوہ اور کچھ نہیں پایا جا سکتا +

اگر تمام بچوں کو ابتدا ہی سے کامیاب زندگی کا تخیل سکھایا جائے اور ان کے دلوں میں خدا کی اس نعمت عظمیٰ کا یقین پیدا ہو جائے جس کی وجہ سے کوئی بات انہیں [illegible] کی طرف مائل نہ کر سکے تو پھر ناکامیوں کے تذکرے دنیا سے یک لخت محو ہو جائیں - اور اگر انہیں یہ بات معلوم ہو جائے کہ صرف ایک "ناکامی" ایسی ہے جس سے بچنا چاہیئے یعنی کیرکٹر کی ناکامی، ترقی اور زندگی کو اعلےٰ بنانے میں ناکامی اور امورِ متعلقہ کو سرانجام دینے میں ناکامی، تو یہ دنیا جیتے جی بہشت ہو جائے +

اگر وہ لوگ جو اپنے آپ کو ناکام سمجھتے ہیں یا ادھوری لیاقت کے مالک، یہ فاتحانہ انداز اپنے اندر پیدا کر لیں اگر وہ اُن کامیابیوں کی ایک جھلک دیکھ لیں جو اُن سے ممکن ہیں اور ہمت باندھ لیں تو سوچو تو سہی اس دنیا میں کس قدر عظیم الشان انقلاب رونما ہو جائے گا - پھر وہ ادنےٰ درجہ کی زندگی بسر کرنے پر ہرگز نہ قانع ہوں گے - اگر وہ اپنی آیندہ زندگی کی شان و شوکت کا نظارہ دیکھ لیں تو موجودہ عسرت و افلاس کی زندگی سے کبھی مطمئن نہ ہوں - لیکن افسوس تو یہ ہے کہ لوگ بجائے اپنی حالت کو بہتر کرنے کے، بجائے اس مفلسی اور مصیبت زدہ ماحول سے نکلنے کے، اور اُسی میں پھنسے رہتے ہیں اور خود ساختہ دلدل میں اور گہرے دھنستے چلے جاتے ہیں - اور نتیجہ یہ ہے کہ ہم ہر جگہ لوگوں کو یہی کہتے ہوئے سُنتے ہیں کہ "دنیا رہنے کے لائق نہیں، ہماری زندگی بالکل بیکار ہے، یہ زندگی تو سراسر رنج و الم کا مجموعہ ہے" وغیرہ وغیرہ +

لیکن زندگی ناکامی سے عبارت نہیں ہے، اگر معقول طور پر بسر کی جائے تو ہمیشہ کامیابی ہوگی - قصور زندگی کا نہیں ہوتا بلکہ زندگی بسر کرنے والوں کا - ناکامی ہونی اسی وجہ سے ہے کہ لوگ زندگی کو صحیح طریق پر بسر نہیں کرتے

اور انہیں بچپن میں یہ بات سمجھائی نہ گئی تھی کہ جو بات زندگی سے حاصل کرنی چاہتے ہو وہ پہلے دماغ میں پیدا کرو۔ زندگی کی کامیابی کا انحصار زیادہ تر تمہارے دماغ اور اس کی قوتِ مفکرّہ پر ہے۔ ہاتھ پاؤں سے جو کچھ کرتے ہو وہ ضمنی بات ہے۔ بحث تو اُس سے ہے جو اپنے دماغ سے کرتے ہو کیوں کہ ابتدائے کار بہرحال دماغ کی حرکت کا نتیجہ ہے۔ ہم میں سے بعض لوگ دماغ سے کام لینا ہی نہیں جانتے۔ بلکہ ہاتھوں سے کام لیتے ہیں اور دوسروں کی امداد پر جیتے ہیں اور خارجی اشیا پر بھروسا کرتے ہیں۔ حالانکہ زندگی کا سرچشمہ اور وہ قوت جو دنیا کو مسخر کر لیتی ہے باہر نہیں ہے بلکہ اندر ہے +

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہم سے کوئی طریقِ کار دریافت نہیں ہو سکتا اور ہم ناامیدی کی تاریکی میں آ جاتے ہیں۔ لیکن جب کبھی ناکامی کا اندیشہ ہو تو ایک بات کرو: خواہ مطمحِ نظر نگاہ سے اوجھل ہو جائے لیکن ہمت اور استقامت، استقلال اور عزم کے ساتھ اسی کی طرف بڑھے چلو۔ مشکلات پر غالب آنے کی یہی ایک صورت ہے۔ اگر اس موقع پر ہمت ہار دیں یا مقصد سے قطعِ نظر کر لیں تو تباہی اور بربادی یقینی ہے +

خواہ تمہارے راستے میں کیسی ہی مشکلات کیوں نہ ہوں اگر تم "ہمت کا بلند اپنی زینہ رکھو" "خاطر مضبوط دِل توانا رکھو" اور مسلسل کوشش کئے جاؤ تو لازمی طور پر کامیابی نصیب ہوگی۔ زندگی بسر کرنے کے لئے خواہ کچھ ہی کیوں نہ کرو اور تم پر خواہ کیسی ہی مصیبت کیوں نہ آئے فاتحانہ انداز قائم رکھو اور آگے بڑھے چلو +

اگر کوئی جہاز تاریک کہر میں کسی ساحل سے ٹکرا جائے تو کوئی کپتان محض اس لئے کہ کہرے میں رستہ معلوم نہیں ہوتا، اپنے جہاز کو خطرہ سے نکالنے کی کوشش ترک نہیں کرتا۔ پس اسی طرح تم بھی اگر مشکلات میں پھنس جاؤ تو ہمت نہ ہارو۔ کپتان کے دِل میں منزلِ مقصود تک پہنچنے کے یقین کی صرف یہی صورت ہے کہ وہ "قطب نما" کی ہدایت پر کاربند رہے اور اُسی سمت میں جہاز کو لے جانے کی کوشش کرے جدھر اُس کی منزلِ مقصود کا پتہ چلتا ہے۔ کہرے میں اسے راستہ نہ دکھائی دے۔ لیکن وہ ہمت نہ ہارے اور برابر "قطب نما" سے مدد لئے جائے۔ ہمارے لئے فاتحانہ انداز "قطب نما" کا کام دے سکتا ہے اور ہمیں لازم ہے کہ خواہ کیسی ہی مشکل کیوں نہ درپیش ہو ہمت نہ ہاریں۔ کامیابی کی صورت صرف یہی ہے اِس کے علاوہ اور کچھ نہیں +

محمد یوسف سلیم

حشرِ جذبات

حقیقت کھل نہ جائے اب کہیں بیدادِ دلبر کی
نگاہیں اُٹھ رہی ہیں میری جانب اہلِ محشر کی

وہ آوازِ درا گم ہوگئی سعیِ سماعت میں
ضرورت ہے مجھے اے دوست آوازِ مکرر کی

ہر اک ذرّہ سراپا طُور ہو کر جلوہ آرا ہے
معاذ اللہ یہ کیف آفرینی ایک ساغر کی

اُڑا دے آشیاں کو خاک کر کے اپنے ہاتھوں سے
خوشامد کر رہا ہے کس لئے تُو بادِ صرصر کی

کہیں ایسا نہ ہو بنجائیں شاہد خونِ ناحق کے
یہ دھبّے تیرے دامن کے یہ سُرخی تیرے خنجر کی

وہیں پر تم سمجھ لینا کہ دنیا ختم ہوتی ہے
جہاں پر کھینچ لیجائیں مجھے موجیں سمندر کی

نہ نکلا کام جب دیر و حرم کی جبہ سائی سے
متاعِ دین و ایماں میں نے اپنی نذرِ ساغر کی

اِسی کے دم سے قائم ہے مری امید کی دُنیا
پشیماں ہو نہ جائے اب تمنّا قلبِ مُضطر کی

یہ کس عالم میں لے آئی ہے میری بیخودی مجھ کو
کہ حاجت ہے نہ منزل کی نہ پروا مجھکو رہبر کی

مکمل اب ہوئی ہیں عشق کی کیفیتیں ثاقب
کہ تشنہ رہ گئی ہے خوں سے میرے نوکِ نشتر کی

سیّد ابو محمد ثاقب کانپوری

کون!

"یا اللہ، ذرا جی نہیں لگتا، ہر طرف اُداسی چھائی ہے"۔ زہرہ خانم نے ایک کھنڈر کے کنگورے پر سے جھکتے ہوئے اپنے موتی کی طرح چمکنے والے دانتوں کی پوری جلوہ نمائی کرتے ہوئے اپنے دِل سے کہا "کیا یہ سہ پہر کبھی ختم نہ ہوگی"؟ اُس کی بے صبر نگاہیں ایک طویل سفید سڑک پر جمی ہوئی تھیں جو سبز پوش بلندیوں و پستیوں پر سے سانپ کی طرح رینگتی اور بل کھاتی ہوئی آفتابِ عالمتاب کی قدمبوسی کے لئے جا رہی تھی "دِن ڈھلتے ہی اُن کو یہاں سے گذرنا تھا" وہ بولی "یقیناً اب دِن ڈھل چکا ہے"؟ اس کی بڑی بڑی سیاہ چمکدار آنکھیں چیل کے درختوں کی نازک اور سبز چوٹیوں سے اُلجھتی ہوئی نیلگوں آسمان کے بحرِ ناپیدا کنار میں تیر رہی تھیں۔ وہ دور جنگل کے سیاہی مائل سبزہ زار کے دامن میں گرد کا ایک ہلکا سا ابر ابھرتا ہُوا دیکھنا چاہتی تھیں، جو لوہے کی جھنکار، پاؤں کی چاپ اور انسانوں کے شور و غل کا پیش خیمہ ہو +

صبح ایک رضاکار نے اعلان کیا تھا کہ آج بعد از دوپہر اُس کے گاؤں میں سے فوج کا گذر ہوگا۔ خوراک کی ضرورت ہوگی اور شاید رات کو آرام کے لئے بھی بندوبست کرنا پڑے۔ اِس آنے والی دردِسری سے زہرہ بچ نکلی تھی + گاؤں کی لڑکیوں کا اِدھر سے اُدھر، اُدھر سے اِدھر سیبوں اور نانہ روٹیوں کا اٹھا کر لانا، ماؤں کی جھڑکیاں اور تیز و تند باتیں اُسے ناپسند تھیں، وہ صرف فوجِ ظفر موج اور اُس کے پُرجلال ہلالی علم دیکھنے کی منتظر تھی۔ زندگی میں صرف تین چار بار اس نے دو دو تین تین چار چار سپاہی اپنے گھر کے آگے سے گذرتے دیکھے تھے، مگر اب وہ عساکر ملیہ کی اُودی گھٹائیں دیکھنے کی منتظر تھی جن کے خون کی موسلا دھار بارش سے نخلِ ملت پھر شاداب ہو رہا تھا۔ ابھی آفتاب نے بمشکل پہلی منزل طے ہوگی کہ وہ چپ چاپ چوری چوری تیس چالیس کھیت پار گاؤں سے چند میل دُور، عالمِ سکوت میں تنہا، کسی خار دار جھاڑی، کسی کھنڈر، یا کسی درخت کی اوٹ میں چھپ چھپا کر کوچ کرتی ہوئی فوج کے نظارہ سے لطف اندوز ہونے کے لئے چل کھڑی ہوئی +

آخر لمبی سفید سڑک سے گرد کا ایک ہلکا سا بادل اٹھا، مگر بجائے فوج کے معاً ایک چھوٹی سی موٹر گاڑی نمودار ہوئی۔ چھوٹی سی خاکی موٹر گاڑی، جس کے آگے ایک بالشت بھر کا ہلالی پرچم رقص کر رہا تھا اور خاکی وردی

پہنے ایک شکیل و جمیل نوجوان اُسے چلا رہا تھا۔ زہرہ کو دیکھتے ہی اس نے اپنی بادرفتار گاڑی کو کھڑا کر لیا۔ دوشیزہ کو ایسا محسوس ہُوا گویا اُس کے چہرہ پر رونق آگئی ہے۔ بجلی کی طرح لپک کر وہ گاڑی سے باہر آیا اور اُس درخت کے پاس پہنچا جس کے پیچھے زہرہ چھپی کھڑی تھی +

"بہن! ہزار معافی کا خواستگار ہوں"۔ اُس اجنبی نے زہرہ کو جھک کر سلام کرتے ہوئے اور متبسم نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ زہرہ کی سحر آفرین آنکھیں اور بلوریں رخسار ایسے نہ تھے کہ انہیں دیکھ کر کوئی شگفتہ خاطر نہ ہو جائے +

"بہن! معافی ——— ہزار معافی کا خواستگار ہوں۔ میں راستہ بھول گیا ہوں۔ پتہ نہیں صبح میں نے کس انداز سے نقشہ دیکھا تھا کہ مجھے اپنی جائے قیام تک بھول گئی ہے"۔

"تم کہاں جانا چاہتے ہو"؟ زہرہ نے اُس کے خوب صورت چہرے اور سیاہ مونچھوں کو دیکھتے ہوئے پوچھا اُس نے اپنے قوی کندھوں کو جنبش دیتے ہوئے جواب دیا "کسی جگہ ——— ہر جگہ بہن! تاکہ فوج سے میری مڈبھیڑ نہ ہو جائے"۔

"تم قومی افواج کو دیکھنا پسند نہیں کرتے"! زہرہ نے موسمِ خزاں کے سنہری پتّوں کے درمیان سے اسکی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں بہن! مجھے زمانۂ امن میں ترکی افواج کو دیکھ کر دلی مسرت ہوتی تھی مگر آج نہیں"۔

"میں نہیں سمجھی" زہرہ کے دِل میں ایک چھوٹا سا شبہ حرکت کرنے لگا۔ وہ لوگوں کو جاسوسوں کی بابت باتیں کرتے کئی بار سن چکی تھی +

"یہ لو سمجھاتا ہوں" اس سرِ دفد نوجوان نے محبّت آمیز نگاہوں سے اُسے گھورتے ہوئے کہا "میں اُن بدنصیب ہستیوں میں سے ہوں جو دورانِ جنگ میں خبر رسان کہلاتے ہیں"۔

"تم اخبارات کے نامہ نگار ہو"؟ وہ چھوٹا سا شبہ ساکن ہوگیا، اور زہرہ کی آنکھوں میں محبّت کی شراب چھلکنے لگی

"یا کم از کم اس کوشش میں ہوں" اجنبی نے قہقہہ لگا کر کہا "مگر دورانِ جنگ میں اخبارات مجھ سے بہت زیادہ قابل ادیبوں کی خدمات قوّتِ زر سے حاصل کر لیتے ہیں۔ میرے لئے وہاں گنجائش کہاں، میں تو آئے دن یہ دھمکیاں سنتا ہوں کہ مجھے تاریک زندان میں پھینکا جائے گا"۔

"زندان"! زہرہ کے دِل سے ترکی لشکر کی عظمت محو ہونے لگی۔ وہ سرنگوں ہوگئی "یہ کس قدر بے انصافی ہے"

"ہاں ایسے حالات میں ایسی مشکلات ناقابل برداشت ہوتی ہیں" اجنبی نے سگرٹ روشن کیا" اور تمہیں علم ہے ہمیں دورانِ جنگ میں فوج پر نکتہ چینی نہیں کرنی چاہیئے" +

"مجھے اس میں تامل ہے" زہرہ نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔ "تاہم ۔" وہ چلائی ۔ "میں بھول گئی ــــــ وہ ابھی یہاں آیا چاہتے ہیں"۔ +

"وہ! ــــــ کون"؟ نوجوان یکدم مستعد ہوگیا +

"ترکی عساکر" زہرہ نے کہا ۔ اور وہ حیران تھی کہ وہ کیوں خوف زدہ ہو رہی ہے ۔ "وہ غروبِ آفتاب کے قریب یہاں سے گذریں گے"۔

"احمق" یہ لفظ طمنچہ کی گولی کی طرح اجنبی کے منہ سے نکلا ، اور زہرہ اچھل کر پیچھے ہٹ گئی ۔ "مجھے تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا ! اور اس کی بجائے مجھ سے باتیں کرتی رہی ہو ؟ بتاؤ اب کس طرف جاؤں"؟ نوجوان کی حالت بالکل بدل گئی ۔ چہرہ زرد ہوگیا آنکھیں خوف زدہ نظر آنے لگیں +

ایک اَور یخ سے زیادہ سرد شبہ زہرہ کے سینے میں بل کھاتا ہوا رینگنے لگا +

"کون ــــــ کون ــــــ ہو ــــــ تم" اُس نے رُک رُک کر کہا ۔ پھر غور سے دیکھا تو اُس کے سینہ پر ایک خوفناک پستول لٹک رہا تھا ۔ اور اس کا دِل اونی قمیص کے نیچے دھک دھک کر رہا تھا وہ اب بھی تیز و تند آواز میں بول رہا تھا "بتاؤ جلدی بتاؤ ــــــ کس طرف جاؤں"۔

"تم کیا معلوم کرنا چاہتے ہو"؟ اس کے کانپتے ہوئے لبوں سے بمشکل یہ الفاظ نکلے +

"ننھی احمق" وہ غرّا کر بولا" مجھے صرف سلامتی کا راستہ درکار ہے" اُس کی آنکھیں سفید سڑک کی پیمائش کرنے لگیں ۔ ایک لمحے کے لیئے زہرہ کی آنکھیں بھی اُسی طرف اُٹھ گئیں ۔ پھر اُس نے انگلی سے اُس سڑک کی طرف اشارہ کیا جو اُس کے گاؤں کو جاتی تھی +

"اس طرف سے" اُس نے مستعدی سے کہا ۔" وہ آئیں گے" +

"بس" ایک لمحے کے لیئے اُس نے زہرہ کو کچھ اس طرح دیکھا ، گویا اس کی آنکھیں روح کی گہرائیوں تک جا رہی ہیں ۔ مگر وہ ان متجسس نگاہوں کے سامنے ذرا متزلزل نہ ہوئی +

آخر اجنبی نے آنکھیں جھکالیں ۔ گویا اُسے تشفی ہوگئی ہے ۔ "مجھے واپس جانا چاہیئے" وہ لپک کر اپنی گاڑی تک پہنچ گیا جس پر ترکی علم ہَوا سے تھرتھرا رہا تھا ۔ گاڑی فراٹے بھرتی ہوئی اس طرف روانہ ہوگئی جس

طرف زہرہ کی آنکھیں لگی تھیں۔ زہرہ کی سیاہ آنکھوں نے دُور تک اُس کا تعاقب کیا۔" اللہ جانے کیا ہوگا۔ یہ جاسوس فوج کے قابو آجائے گا۔ سپہ سالار کے پیش کیا جائے گا، اور وہ اُسے ــــــــــ" +

ننھی زہرہ کے دماغ میں کئی خیال گھوم رہے تھے مگر ابھی فوج نہ آئی تھی +

آفتاب سیاہ پہاڑوں کے پیچھے غائب ہوگیا اور خون آلود آسمان سے سیاہ سائے برسنے لگے۔ وہ گوری سڑک سانولی پڑگئی۔ زہرہ کے کانوں میں مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی سی خفیف آواز آئی۔ جنگل یا سے گرد کے چھوٹے چھوٹے بادل ابھرنے لگے۔ کچھ دیر کے بعد یہ بھنبھناہٹ پاؤں کی چاپ بن گئی اور پھر فوج زلفِ پیچاں کی طرح بل کھاتی ہوئی سامنے سے گذرنے لگی۔ اس کی آنکھیں گرد آلود سپاہیوں کو نہ دیکھتی تھیں نہ کان اُن کے ہنسی مذاق کو سنتے تھے۔ اس کے دِل میں صرف حسین اجنبی کا تصور تھا۔" انہوں نے اس سے کیا سلوک کیا ہوگا" اور ابھی یہ خیال اُس کے دِل میں چٹکیاں لے رہا تھا کہ وہ بھی اُس کے سامنے سے گذرا +

آنکھیں زمین میں گڑی ہوئی تھیں، اور چہرے پر موت کی سی مُردنی چھائی ہوئی تھی۔ دونوں ہاتھ پشت پر بندھے تھے، اور دونوں پہلوؤں پر مسلح پہرہ دار چل رہے تھے، پیچھے خالی موٹر کار بھی، زیرِ حراست تھکی ماندی مکھی کی طرح بمشکل رینگ رہی تھی۔

سب سامنے سے گذر گئے۔ یکایک زہرہ کی سیاہ آنکھوں سے آنسوؤں کا ایک دریا بہ نکلا" میری رائے میں جاسوس ایسے خوشرو نہیں ہونے چاہئیں"۔ زہرہ نے درخت کے سخت تنے پر اپنی نازک پیشانی رکھ کر روتے ہوئے جی میں کہا:-

اِس کے ایک سال بعد زہرہ اپنے مکان کے دروازے میں کھڑی اُسی سڑک کے دلفریب منظر سے لطف اندوز ہو رہی تھی کہ سامنے سے خط رسان نمودار ہوا ــــــــ زہرہ نے لرزتی ہوئی انگلیوں سے خط کھولا +

" اناطولیہ

میری بہن زہرہ۔

میں تمہیں اپنی چھوٹی بہن سمجھ کر ایک ہزار پونڈ کا نوٹ بھیجتا ہوں۔ مجھے امید ہے تم قبول کرلوگی۔ یہ تمہاری اُس قومی خدمت کا حقیر ترین انعام ہے جو تم نے ایک جاسوس کو گرفتار کراکے ادا کی تھی۔ اور وہ جاسوس میں ہی تھا +

تمہارا بھائی
مصطفےٰ کمال"

خواجہ عبدالکریم

سکوتِ نیم شب

گذر گئی نصف شب ستارے اُسی طرح جھلملا رہے ہیں
فلک کے زرّیں نگار خانے میں اپنے جلوے دکھا رہے ہیں

فضاؤں میں منجمد ہیں نغموں کے سیل آشوبِ حُسن بن کر
ہواؤں کے ٹھنڈے ٹھنڈے جھونکے بہارِ جنت لُٹا رہے ہیں

سکوت کی بے پناہ محویّتوں میں ڈوبی ہوئی ہے دُنیا
سکوت کے میٹھے میٹھے نغمے جہاں کو بے خود بنا رہے ہیں

یہ معرفت پردۂ طلسمِ جمال بن کر ڈھلک رہی ہے
کہ فرش پر عرش کے مکیں چاندنی کی نہریں بہا رہے ہیں

وہ چرخ کی نیلی نیلی جھلیوں میں چاند کا زر نگار بجرا
وہ چشمۂ نور جس کے سیلاب میں فرشتے نہا رہے ہیں

وطن سے دُور ایک اجنبی سرزمین میں یہ جمیل منظر
مری نگاہوں سے خواب کی مستیوں کا جادو اڑا رہے ہیں

خیال کی سحر کار کیفیتوں میں معدوم ہو گیا ہوں
خیال مضراب بن کے دِل کا حسین بربت بجا رہے ہیں

کوئی ستمگار یاد آ کے دِل میں نشتر چبھو رہا ہے
خبر نہیں جس کو یاد کرتا ہوں جاگتا ہے کہ سو رہا ہے

عدمؔ

گدھ

ایک گیہوں کے کھیت پر گدھوں کا ایک جھنڈ اُترا۔

میں اس غول کے سب سے بڑے اور بزرگ صورت گدھ کے پاس پہنچا اور ہمکلام ہوا۔ بدقسمتی سے یہ گدھ فلسفی نکلا۔ گول گول آنکھیں اس کے عمیق غور وفکر کا اظہار کر رہی تھیں۔ بڑا سا گنجا سر، پچکے ہوئے رخسار، بھدی اور نامطبوع خمیدہ چونچ اور لبوں پر تبسم کے فقدان نے مجھے اچھی طرح یقین دلا دیا کہ ایک روکھے فلسفی سے پالا پڑا ہے۔ متوقع طور پر اس فلسفی کی گفتگو بھی غیر دلچسپ اور اکتا دینے والی تھی +

میں نے مسکرا کر بوڑھے گدھ سے کہا: "کہتے ہیں کہ گدھوں کی عمریں بہت بڑی بڑی ہوتی ہیں۔ علماءِ تاریخِ طبعی نے آپ کی عمروں کے بڑے بڑے تخمینے لگائے ہیں۔ خدا تمہیں نظرِ بد سے بچائے اپنی عمر تو بتاؤ"؟

دانشمند گدھ نے مجھے اپنی گہری سنجیدہ نظروں سے بہت دیر تک دیکھا۔ پھر سر کو ایک فلسفیانہ جنبش دی اور حکیمانہ انداز میں کہا "میری عمر تین سو اسّی برس کی ہے!"

میں ہکا بکا ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگا، اور فرطِ تعجب سے بولا "تین سو اسّی برس! اوہ! پناہ بخدا! میں نے اتنی عمر کسی کی نہیں سنی! کاش یہ "عمرِ خضر" مجھے مل جاتی! میں ان چار صدیوں میں کیا کیا کچھ نہ کرتا! دنیا کو اپنی قابلیت سے مرعوب کر دیتا اور اتنا روپیہ کماتا کہ شمار میں نہ آ سکتا!

میں ذرا ٹھیر گیا۔ میرا سر چکرا رہا تھا +

"اے! گدھوں کے جدِ امجد! بتا تو نے اس طویل فرصت کا کیا کیا"؟

بوڑھے گدھ نے اپنے فطری استغنا اور سنجیدگی سے جواب دیا "حضرتِ انسان! میں نے اس مدت میں کچھ نہیں کیا! کھایا، پیا، سویا اور افزائشِ نسل میں مشغول رہا!

میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی اور چلایا۔ ہائے کمبخت تو نے کیا کیا! اتنا عرصہ دنیا میں رہا اور سوائے نفس پرستی کے تو نے کچھ نہیں کیا! افسوس! لعنت ہو تجھ پر! تو جیسا جاہل پیدا ہوا تھا ویسا ہی عمر بھر کندۂ ناتراش رہا!

میں چپ ہو گیا اور فرطِ غضب میں میرے گلے سے آواز تک نہ نکلتی تھی +

گدھ نے اپنے سر کو اٹھایا اور گوشت کے اس بھاری بھرکم لوتھڑے کو جنبش دے کر کہا "اے انسان!

عقل ودانش، و علم اور حکمت کا تعلق عمر سے نہیں تعلیم و تربیت سے ہے۔ دور کیوں جاؤ اسی چین کو دیکھو کتنے عرصہ سے دنیا میں ہے مجھ سے تو زیادہ عمر رسیدہ ہے۔ مگر کتنا جاہل ہے۔ آج تک کودن لوگوں کا مسکن ہے"

بوڑھے گدھ کا جواب معقولیت پر مبنی تھا، اور میرے خاموش کرنے کو کافی، مگر میں بیحد برافروختہ ہو رہا تھا اور جوش کی وجہ سے دماغ کو اس قدر سکون میسر نہ تھا کہ کسی غور طلب مسئلہ پر کچھ سوچ سکے، اس لئے میں نے بوڑھے گدھ کو حاسدانہ نظروں سے دیکھا، اور دانت پیس کر کہا "تین سو اسی" کاش میں تیری جگہ ہوتا! اتنی عمر کسے نصیب ہوتی ہے! ایک لامتناہی زندگی! عرفانی اور ارضی فردوس! میں اگر تیری عمر پاتا تو دنیا کے ہر علم و فن کا ماہر ہو جاتا۔ کم از کم تیس مرتبہ تو شادی کرتا۔ کوئی صنعت نہ ہوتی جس میں میرا دخل نہ ہوتا۔ کوئی وقیع اور بڑا عہدہ نہ ہوتا جسے میرے قدم سے شرف نصیب نہ ہوتا۔ غرض اتنی دولت کا مالک ہوتا کہ کسی کے خواب میں بھی نہیں آسکتی! بیوقوف و بدنصیب گدھ تیری حالت پر افسوس بلکہ تف ہے! تو بیٹھا ہوا سر کیا ہلا رہا ہے، احمق! اگر تو کسی بنک میں ایک روبل بھی جمع کرا دیتا اور اس پر سود در سود لیتا تو ۲۸۳ سال بعد تیرے پاس دس لاکھ روبل ہو جاتے! اُف! خیال کر ذرا، تیرے دماغ میں، معلوم ہوتا ہے، گوڈر بھرا ہوا ہے، ذرا زور نہیں ڈالتا، سوچ اگر اتنا روپیہ آج تیرے پاس ہوتا تو تُو کھیتوں میں دانے کے لئے نہ ترستا پھرتا۔ شرم ہے بڈھے احمق! "

مجھے گدھ کی چونچ کے گرد ایک ہلکی سی سُرخی دکھائی دی۔ میں سمجھ گیا کہ یہ غیرت کے غصّے کی سرخی ہے اور اسے میری بات بُری معلوم ہوئی ہے"

اُس نے سر ہلایا اور کہا "ہرگز نہیں! حضرتِ انسان! آپ ہم پر غلط الزام رکھتے ہیں۔ میں نے اپنی چار سو سال کی زندگی میں گدھوں میں حماقت کے اتنے مظاہرے نہیں دیکھے جتنے حضرتِ انسان اپنی ساٹھ سال کی عمر میں قدم قدم پر کرتے ہیں میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ گدھوں نے باہمی جنگ کی ٹھانی ہو، اور ایک دوسرے کے خلاف ریشہ دوانیاں یا اعلاناتِ جنگ کئے ہوں، فوجیں مرتب کی ہوں اور خون بہایا ہو ———

خون بہایا ہو اور اپنے ہم جنسوں کو غلام بنایا ہو! افسوس! تم ہی انصاف سے جواب دو کہ زندگی کا کونسا سال بغیر لڑے بھڑے چلا جاتا ہے! ہماری قوم میں نہ چور ہیں نہ ڈاکو نہ قاتل۔ ہم میں نہ حسد ہے نہ بغض و کینہ، اور نہ ہم نے شاعری، ادب اور انشا پردازی کا کبھی جھوٹا دعویٰ کیا ہے۔ ہم میں سے کوئی کسی کو دھوکا نہیں دیتا۔ اِس تین سو اسی برس کی عمر میں میں نے کبھی نہیں سنا کہ کسی کی بیوی نے اپنے شوہر سے بیوفائی کی ہو۔ خیانت

کی ہو، اور اُس کی زندگی تلخ کی ہو"!

لیکن تم انسانوں کا کیا حال ہے۔ گریبان میں منہ ڈال کر دیکھو۔ باوجود علم و حکمت کے ان بلند بانگ دعووں کے تم ظالم ہو جابر ہو اور اپنی نسل پر ایک لعنتِ پائدار، ایک ابدی سوز! دیکھو خدا نے ہمیں ان تمام برائیوں سے بچایا اور اپنے حفظ و امن میں رکھا۔ مگر تم ہمیشہ ان میں مبتلا ہو، ہماری قوم غداروں، جھوٹوں، منافقوں اور ظالموں سے یکسر خالی ہے۔ ہم میں کوئی مذہبی پیشوا نہیں۔ ہمارے درمیان خدا کے نام پر لڑائی نہیں ہوتی۔ ہم مراقبہ اور خدا ترسی میں اپنی زندگی چپ چاپ گذار دیتے ہیں۔ مگر تم........."

بوڑھا گدھا ابھی یہیں تک کہنے پایا تھا، کہ پشت پر سے ایک آواز آئی "دادا جان! ذرا یہاں آنا دادی اماں بُلا رہی ہیں"!

آواز سنتے ہی گدھا اُڑ گیا اور میں متحیر کھڑا رہ گیا +

(چیخوف)

ظفر قریشی دہلوی

زندگی

ایک دن میں زندگی سے دوچار ہوا
وادیٔ تاریک میں
"زندگی"! میں نے چلا کر کہا
"میں تجھ سے بیزار ہوں
اور تیرے ابدی شباب سے بھی۔
دیکھ!
تُو ابھی نوجوان اور حسین ہے
اور میں ——— میں ضعیف و بدشکل۔
سنگدل عمر نے اپنے بے رحم اور سخت گیر
ہاتھوں سے میرے چہرے پر غم کی جُھریاں ڈال دی ہیں
اور افکار کے بوجھ نے میری کمر خم کر دی ہے +

اے زندگی!
اب میں تیرے ساتھ ہرگز نہ چلوں گا
شوق کے پر لگے ہوئے قدموں سے ——— اُس رستے پر
جو کبھی "سنہری لمحوں" کے میدان سے ہو کر گزرتا تھا
جا!
کیوں کہ میں اب تجھ سے تنگ آ چکا ہوں،
اور موت کی ملاقات کا خواہشمند ہوں"
زندگی نے حیران آنکھوں سے میری طرف دیکھا
"میں موت ہوں" وہ بولی
اور میں اُس کے قدموں پر گر پڑا
اُس کی روشنی سے چندھیا کر۔

تنویر قریشی

نوائے مضطر

آج قصہ تمام کرتا ہوں | اُن سے قطعِ کلام کرتا ہوں
میری جانب بھی ہو نگاہِ کرم | بندہ پرور سلام کرتا ہوں
میں کہاں اور کہاں وصال اُن کا | آرزوہائے خام کرتا ہوں
اب وہ ملتے بھی ہیں تو میں مضطر | دُور ہی سے سلام کرتا ہوں

شکوۂ جور کا خیال نہ کر | عشق کی روح پائمال نہ کر
تو جو راضی ہے تو مجھے کیا غم | میرے غم کا ذرا ملال نہ کر
عرصۂ حشر میں ذلیل نہ ہو | اے گنہگار! انفعال نہ کر
بخدا ہم پہ ترکِ اُلفت کا | بھول کر بھی تو احتمال نہ کر
وہی حاجت روا ہے اے مضطر | تو کسی اور سے سوال نہ کر

رام رتن مضطر

نغمۂ انسانیت

تُو میرا بھائی ہے، چینی ہو یا عربی، بودی ہو یا یہودی، دوست ہو یا دشمن، نیک ہو یا شریر، صالح ہو یا طالح ....
تُو میرا بھائی ہے . . . . . اور میں تجھ سے محبت کرتا ہوں، تُو خوش ہو یا ناخوش! میں تیرا بھائی ہوں
۔ تُو میرا بھائی ہے، اگرچہ نہ میں نے تجھ کو دیکھا اور نہ تو نے مجھ کو . . . .
میرے دِل میں بہت کچھ بھرا ہے۔ جس کو میں تیرے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں، دُور ہوں یا نزدیک، کہنے کی باتیں میرے دِل میں موجزن ہیں، اگر وہ نکلنے کی کوئی راہ پائیں تو جس طرح نور فضا کے ہرگوشہ پر چھا جاتا ہے اسی طرح رے عالم پر چھا جائیں +
آہ! تُو میرا بھائی ہے۔ لیکن تو اس حقیقت کا اعتراف نہیں کرتا۔ تیرے دِل میں بغض و حسد کے آثار ہیں ....
تُو جب اپنی مطمئن اور آسودہ نیند میں آدھی رات کو مزیدار خواب دیکھتا ہے تو میں اُس وقت جاگتا ہوں تاکہ ے رات کی خاموش فضا میں یہ کہہ کر پکاروں کہ
تُو میرا بھائی ہے . . . .
لیکن آہ! یہ کثیف کثیف پردے ـــــ (مادۂ ع بیا کے پردے) ـــــ میرے دِل کی راہوں اور ے کانوں کے بیچ میں حائل ہو جاتے ہیں اور تُو میری اس آواز کو نہیں سُنتا +
اے بھائی! یہی وہ کثیف اور مظلم پردے ہیں جن کی وجہ سے نہ تو مجھ کو دیکھتا ہے اور نہ میرے وجود کو سوس کرتا ہے . . . . تو یہ خیال کرتا ہے کہ ہم لوگوں کے درمیان کوئی ایسی محدود مسافت نہیں ہے ی مشرق و مغرب کے بیچ میں . . . .

آہ! تو میرا بھائی ہے . . . . اور وہ سب جو اس راہ پر چلتے ہیں بھائی ہیں . . . .
جب ہم ناخوش و ناراض ہوتے ہیں . .
جب منقبض و جدا ہوتے ہیں . .

جب متبائن و متنافر ہوتے ہیں ..

تو زندگی ایک بلند ٹیلے پر چڑھ کر ہم کو عطف و مواساۃ، اخوت و محبت کی نگاہوں سے دیکھتی ہے اور ہماری حماقت پر ہنستی ہے . . . . .

ابتدا میں ہم ایک ہی اصل سے پیدا ہوئے . . . . .

ظہور کے وقت ایک ہی مظہر سے ظاہر ہوئے . . .

اور چلنے کے وقت ایک ہی راہ پر چلے . . . . .

لیکن آہ! ہم میں افتراق پیدا ہوگیا اور ہم خارجی مؤثرات سے متاثر ہو کر مختلف ہوگئے . . .

ایک ہی افق سے ہم سب اپنے ہاتھوں کا کنگن جوڑے ہوئے نکلے . . . .

اور ایک ہی ساتھ سب آفتاب کے گرد ایک چھوٹے سے تارے پر گھومے . . .

اور ایک ہی ساتھ مختلف اوقات میں موت کے دروازے پر رقص و سرود میں مصروف رہے . . . .

اور ایک ہی ساتھ ہم نے شعاعوں سے گرمی اور نور سے فرحت حاصل کی، اور ربیع کی نشاط انگیز بہاروں اور خریف کی مرطوب ہوا کے جھونکوں سے برابر برابر لذت یاب ہوئے . . .

اور عنقریب ہم سب ایک ہی دروازے سے یکے بعد دیگرے نکل جائیں گے . . .

اور مادرِ ارض کی گود میں ہمارے بدن پہلو بہ پہلو لٹا دیئے جائیں گے . . .

اے بھائی! میں تنہائی میں تجھ پر بہت رویا، اس لئے کہ میں نے تجھ کو دیکھا کہ تو ننگی تلوار لئے جا رہا ہے تاکہ اپنے پڑوسی سے جنگ کرے اور اپنے بھائی سے دشمنی . . .

رات کے سکون میں میری آنکھوں نے تجھ پر بہت آنسو بہائے اس لئے کہ میں نے دیکھا کہ تو چشموں میں گھٹنا اور ٹیلوں پر چڑھتا ہے تاکہ اپنے موطن کو ذبح کر ڈالے . . . . . . کیونکہ اس کا دین تیرے دین کے علاوہ اور اس کی رائے تیری رائے کے خلاف ہے . . . . .

اے بھائی! اندھا حسد، بہری عداوت، گونگی دشمنی، کھوکھلا غرور، باطل حقد یہ سب دنیا کے وہ بدترین مظاہر ہیں جن سے باز رہنے کی "انسانیت" تجھ کو ہدایت کرتی ہے . . . .

آہ! یہ حقیقت تو کب جانے گا کہ تمام بنی بشر تیرے "بھائی" ہیں؟

بدر اصلاحی

ہستی

میرے فرزند! یہ ہوگی تری سعیِ ناکام
کہ تو ثابت کرے ہستی کا وجود اور قیام

یہ بھی دشوار ہی کہنا کہ "یہ دنیا کیا ہے"
گامزن جس میں ہی تو صبح سے لیکر تا شام

"صرف اک جسم ہی" تو یہ بھی نہیں کہہ سکتا
یہ بھی ممکن نہیں ہرگز کہ "تو ہے روح تمام"

یہ بھی ثابت نہیں ہوتا کہ "جدا ہے ان سے"
دُور از فہم ہے "یہ تجھ میں ہی دونوں کا قیام"

کیونکہ جو بات کہ ثابت نہیں کی جا سکتی
اُسمیں کوشاں رہے کوئی تو یہ سودا ہی خام

ایسی حالت میں یہ لازم ہے بفتوائے یقیں
شبہ کے پہلوئے روشن پہ نگہ رکھ تو مدام

معتقد بلکہ تو اس ہستیِ بالا کا رہ
ہے عقیدوں کے مراسم سے اُدھر جس کا مقام

(ٹینی سن)

شادؔ عارفی رامپوری

طائرِ مہجور

سرمازدہ شاخ پر اکیلا
دیکھا اک غمزدہ پرندہ

تھی یاد کسی کی اُس کے دل میں
اور سر کو جھکائے چُپ تھا بیٹھا

چلتی تھی ہوائے سرد اوپر
نیچے اک بہ رہا تھا دریا

سُوکھے تھے درخت اور زمیں پر
سبزے کا نشان تک نہیں تھا

طاری تھا سکوت اک فضا پر
پن چکی کی وہ اُداس آواز

اس عالمِ خامشی میں گویا
لگتی تھی جگر پہ تیر بن کر

القصہ وہ غمزدہ پرندہ
بیٹھا تھا یونہی اداس تنہا

(شیلی)

حفیظ ہوشیارپوری

محفلِ ادب

شاعری

قدیم یونانی فلسفہ میں شاعری جزوِ پیغمبری خیال کی جاتی تھی۔ اسی لحاظ سے یونانی علمِ ادب میں شاعر اور پیغمبر دونوں کے لئے لفظ vate استعمال ہوتا تھا۔ یونانیوں کا خیال تھا کہ کائنات کی ہر شے خواہ وہ مرئی ہو یا غیر مرئی، مادی ہو یا غیر مادی اپنے وجود میں ایک راز رکھتی ہے جس کو کائنات کا مقدس راز کہا جاسکتا ہے، اور اس مقدس راز تک شاعر کی رسائی بھی ویسی ہی ہوتی ہے جیسے کہ پیغمبر کی۔ گوئٹے المانیہ کا مایۂ ناز فلسفی اور شاعر مستشرقین کا امام کائنات کے اس مقدس راز کو اپنی اصطلاح میں "رازِ آشکار" کہتا ہے۔ اس کی یہ اصطلاح اتنی مقبول ہوئی کہ تمام السنہ مغربیہ میں "رازِ آشکار" روزمرہ کا محاورہ بن گیا۔ ان دونوں لفظوں کی توضیح کرتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ کائنات کی ہر شے اپنے وجود میں ایک راز رکھتی ہے۔ راز تو اس وجہ سے کہ عام انسانی آنکھ اس تک پہنچنے سے قاصر ہے اور آشکار اس لئے کہ قدرت نے اُسکو چھپانے کی کوشش نہیں کی۔ اس راز تک پہنچنا فقط شاعر اور پیغمبر کا کام ہے۔ امرسن کے الفاظ میں موجوداتِ عالم کی ظاہری صورتوں سے گزر کر اس کی آفرینش کی علتِ غائی دریافت کرنا شاعر کا کام ہے۔ شاعر کی رسائی زندگی کی حقیقت تک ہوتی ہے وہ جانتا ہے کہ موجوداتِ عالم کی ظاہری صورتیں متغیر ہوتی رہیں مگر حقیقت تغیرات سے بالاتر ہے۔ شاعر موجوداتِ عالم کا مشاہدہ کرتا ہے اور اپنے مشاہدہ کو دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے۔ جس طرح شہد کی مکھی خوشنما پھولوں سے رس لے کر شہد کی صورت میں دنیا کے سامنے رکھتی ہے یا جس طرح ایک ماہرِ کیمیا آکسیجن اور ہائیڈروجن کو ملا کر پانی کی صورت میں دکھلاتا ہے ٹھیک اسی طرح شاعر دنیا کا مشاہدہ کرتا ہے مگر دنیا کے سامنے موجودات کی ظاہری صورت کو پیش نہیں کرتا بلکہ اُس نتیجہ کو جو خود اُس کے دماغ میں پیدا ہوتا ہے، موجوداتِ عالم کے تعلقات ان کے اسباب اور باہمی اثرات کا مطالعہ اُس کو تخلیقِ موجودات کے اُس راز تک پہنچا دیتا ہے جس کو کائنات کا مقدس راز کہا جاتا ہے یا یوں کہا جائے کہ موجوداتِ عالم کے حسن کے احساس اور اعتراف کا نام شاعری ہے۔

شاعری ایک انکشافِ حیات ہے، اور جس طرح زندگی اپنی نمود میں محدود نہیں شاعری بھی اپنے اظہار میں لاتعین ہے۔ ڈاکٹر بجنوری کا انسانی دماغ حسن کی صورت میں دنیا کا مطالعہ کرتا ہے۔ حسن اپنے انواع میں غیر متعین ہے، اور اُس کے انکشاف کی صورتیں مختلف۔ کبھی تو یہ انسانی جسم کے تناسب اور خدوخال کی صورت اختیار کر لیتا ہے، کبھی تہذیبِ اخلاق و اطوار کی صورت میں نمودار ہوتا ہے اور کبھی روح کی آرائش کرتا نظر آتا ہے۔ فی الحقیقت قوانینِ

ے راز کے اظہار کا ذریعہ حسن ہے اور گوئٹے کے بقول حسن اگر راز کو آشکار نہ کرتا تو یہ راز ہمیشہ کے لئے ہماری نظرو
پردہ رہتا۔ حسن وعشق لازم وملزوم ہیں۔ حسن کے احساس واعتراف کا دوسرا نام عشق ہے۔ جہاں حسن ہے وہاں عشق
شق کے مختلف مدارج ہیں اس کی ایک طرف تو جنون سے جا ملتی ہے اور دوسری طرف موانست اور ہمدردی سے یہ
یک بڑی تفصیل کا محتاج ہے مگر چونکہ موضوع سے یہ بات علیحدہ ہوتی جاتی ہے لہذا اس کو اسی مقام پر چھوڑ کر
بت کی طرف رجوع کرنا پڑا۔ نفسیات کا مسلمہ مسئلہ ہے کہ حقیقتِ شے کو سمجھنے کے لئے اس شے سے کم از کم موانست
مدردی لازمی ہے۔ شاعر کے جذبات اور احساسات نہایت لطیف ہوتے ہیں۔ دنیا کی ہر شے جو اس کے سامنے
ہے اس سے ہمدردی کا مطالبہ کرتی ہے اور اس کی طبعی فیاضی اس کو ہمدردی کرنے پر مجبور کرتی ہے +

رسکن کا قول ہے کہ احساس معیارِ شرافت ہے۔ انسانی طبیعت کی شرافت کا اندازہ اس کی قوتِ احساس سے
ہے۔ شاعر کے احساسات نہایت قوی مگر نہایت لطیف ہوتے ہیں، اور اس عالم کون وفساد میں ایک ذرہ کی جنبش بھی
نہیں ہوتی جو اس کے احساسات پر اثر نہ ڈالے۔ جب وہ کسی چیز کو دیکھتا ہے تو بغیر کسی خاص کوشش کے اس
ھ لیتا ہے اور کائنات کا ہر راز اُس کو بے حجاب نظر آتا ہے اور وہ اس کی حقیقت کو پہنچ جاتا ہے۔ اس حقیقت کو
دن الفاظ میں ادا کرنے کا دوسرا نام شعر ہے +

فلسفہ اور شعر میں یہ فرق ہے کہ حقیقتِ شے تک رسائی حاصل کرنا اور اُس کا اظہار کرنا فلسفی کا کام ہے مگر شاعر
لئے اظہارِ حقیقت کے ساتھ ساتھ سوز لازمی ہے۔ ہندوستان کے موجودہ مایۂ ناز شاعر اور فلسفی نے نہایت مؤثر
یہ میں شعر کی تعریف کی ہے +

حق اگر سوزے ندارد حکمت است   شعر میگردد چو سوز از دل گرفت

شاعر کے جذبات لطیف و نازک مگر نہایت قوی ہوتے ہیں۔ لطیف و نازک تو اس لحاظ سے کہ ہر چیز جو اُس کے
منے آتی ہے، اُس کے دل پر اثر ڈالتی ہے اور معمولی سے معمولی واقعہ بھی اس کے قلب کو متحرک کئے بغیر نہیں رہتا
قوی اس لئے کہ دنیا کی کوئی طاقت اس کو اظہار سے نہیں روک سکتی +

یہ شعر اور شاعری کا حقیقی تخیل ہے۔ عام اصطلاح کی رو سے بھی شعر فی الحقیقت انسان کے خیال یا جذبہ
اظہار کا نام ہے جو موزون الفاظ میں ادا کیا گیا ہو۔ شعر کے دو جزو ہیں ایک تخیل اور دوسرا تحریک۔ شاعر کے
[illegible] پیدا ہوتا ہے اور اس کے اظہار کے لئے وہ الفاظ کی تلاش کرتا ہے۔ خیال ایک سادی چیز
[illegible] کام اور بھی دشوار ہو جاتا ہے۔ خیالات کا لامتناہی سلسلہ، ایک خیال کا دوسرے سے

ن، متضاد کیفیتیں، ان متضاد کیفیتوں میں یگانگت کا ایک گہرا ربط، مختلف حالات کے فوری تغیرات جو کبھی محسوس ہوتے
اور کبھی غیر محسوس، غرض یہ کہ ان تمام نزاکتوں اور پیچیدگیوں کا اظہار کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ دوسری طرف الفاظ
بے بضاعتی، ان کی کمزوری۔ ان کی متعین قوتیں جن کو دیکھتے ہوئے شاعر کا کام اور بھی دشوار ہو جاتا ہے +

شاعری ایک قسم کی مصوری ہے جو کام مصور مختلف رنگوں کے باہم ربط و آمیزش سے لیتا ہے وہی کام شاعر
ملف الفاظ کی باہم ترکیب سے نکالتا ہے جس طرح رنگ کا انتخاب اور ایک رنگ کا دوسرے رنگ سے ربط، رنگ
حیثی توت تصویر میں جان ڈال دیتی ہے اسی طرح الفاظ کا انتخاب ایک لفظ کا دوسرے لفظ سے ربط، الفاظ
باہم ترکیبیں شعر کی خوبی میں اضافہ کر دیتی ہیں۔ بسا اوقات مصور کو مادی اشیاء سے گزر کر غیر مادی چیزوں کی
ویر کھینچنا ہوتی ہے۔ مثلاً طبیعت کی مختلف کیفیتیں، خوشی و رنج، رحم و غضب چیزیں بھی مصور کے قلم سے
نہیں پاتیں، اور ایک کامیاب مصور ان مختلف کیفیتوں کا اظہار بھی تصویر میں کر سکتا ہے لیکن اگر غور سے
بھا لیئے تو اس کا یہ کام بھی شاعر کے کام سے کہیں زیادہ آسان ہے۔ اول تو رنگ خود اپنی قسم میں غیر محدود ہے
ہر ایک رنگ کی دوسرے رنگ سے آمیزش ایک نیا رنگ پیدا کر دیتی ہے۔ اگر رنگ کو اس کی قوت اور کمزوری کے
اظ سے دیکھا جائے تو رنگ جو بظاہر ایک معلوم ہوتا ہے صدہا ہزارہا بلکہ غیر متعین اقسام اپنے اندر پوشیدہ رکھتا ہے
اس بنا پر یہ کہنا بالکل درست ہوگا کہ رنگ خود اپنے میں ایک قسم کی حرکت رکھتا ہے، مگر الفاظ بالکل قائم ہیں اور
لفظ کا حسن صورت ایک متعین چیز ہے اس میں شک نہیں کہ ایک لفظ کو دوسرے لفظ کے ساتھ ترکیب دینے سے
س کی موسیقیت میں فرق ضرور پیدا ہو جاتا ہے مگر لفظ بجائے خود تغیرات سے بالاتر ہے۔ قائم اور متعین الفاظ سے
متحرک اور متموج جذبات اور خیالات کی تصویر کھینچنا خود ایک طلسم ہے، اور یہ وہی شخص کر سکتا ہے جس کو فطرت نے
جوہر ودیعت کیا ہو +

فارلائس نے فنون لطیفہ میں شاعری کو فن تعمیر سے تشبیہ دی ہے۔ الفاظ وہ خشت و سنگ ہیں جن سے خیال
ی عالیشان عمارت بنائی جاتی ہے۔ لیکن اس پر بھی اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ سنگ و خشت میں بھی صورت
پذیری کا مادہ موجود ہے یعنی ایک معمار سنگ و خشت کو تراش کر عمارت کے لئے موزون بنا لیتا ہے مگر الفاظ میں یہ
ت ممکن نہیں یعنی سنگ و خشت بھی متحرک ہیں اور اُن کو جس قسم کی حرکت چاہیں دی جا سکتی ہے۔ مگر الفاظ میں
س کمی کو حسن انتخاب و باہمی ترکیب ہی سے پورا کر سکتے ہیں۔ اور اس بنا پر Aresto کا یہ دعویٰ کہ الفاظ
عل و جواہر سے گراں بہا ہیں بالکل درست ہے +

فطرت کے راز کے اظہار کا ذریعہ حسن ہے اور گوئٹے کے بقول حسن اگر راز کو آشکار نہ کرتا تو یہ راز ہمیشہ کے لئے ہماری نظروں سے پوشیدہ رہتا۔حسن وعشق لازم وملزوم ہیں۔حسن کے احساس واعتراف کا دوسرا نام عشق ہے۔جہاں حسن ہے وہاں عشق ہوگا۔عشق کے مختلف مدارج ہیں اس کی ایک طرف تو جنون سے جا ملتی ہے اور دوسری طرف موانست اور ہمدردی سے یہ اجمال ایک بڑی تفصیل کا محتاج ہے مگر چونکہ موضوع سے یہ بات علیحدہ ہوتی جاتی ہے لہذا اس کو اسی مقام پر چھوڑ کر اصل بحث کی طرف رجوع کرنا پڑا۔نفسیات کا مسلّمہ مسئلہ ہے کہ حقیقت شے کو سمجھنے کے لئے اس شے سے کم از کم موانست اور ہمدردی لازمی ہے۔شاعر کے جذبات اور احساسات نہایت لطیف ہوتے ہیں۔دنیا کی ہر شے جو اس کے سامنے آتی ہے اس سے ہمدردی کا مطالبہ کرتی ہے اور اس کی طبعی فیاضی اس کو ہمدردی کرنے پر مجبور کرتی ہے ؎

رسکن کا قول ہے کہ احساس معیار شرافت ہے۔انسانی طبیعت کی شرافت کا اندازہ اس کی قوتِ احساس سے ہوتا ہے۔شاعر کے احساسات نہایت قوی مگر نہایت لطیف ہوتے ہیں،اور اس عالم کون وفساد میں ایک ذرّہ کی جنبش بھی ایسی نہیں ہوتی جو اس کے احساسات پر اثر نہ ڈالے۔جب وہ کسی چیز کو دیکھتا ہے تو بغیر کسی خاص کوشش کے اس کو سمجھ لیتا ہے اور کائنات کا ہر راز اُس کو بے حجاب نظر آتا ہے اور وہ اس کی حقیقت کو پہنچ جاتا ہے۔اس حقیقت کو موزون الفاظ میں ادا کرنے کا دوسرا نام شعر ہے ؎

فلسفہ اور شعر میں یہ فرق ہے کہ حقیقتِ شے تک رسائی حاصل کرنا اور اُس کا اظہار کرنا فلسفی کا کام ہے مگر شاعر کے لئے اظہارِ حقیقت کے ساتھ ساتھ سوز لازمی ہے۔ہندوستان کے موجودہ مایۂ ناز شاعر اور فلسفی نے نہایت مؤثر پیرایہ میں شعر کی تعریف کی ہے ؎

شعر میگردد چو سوز از دل گرفت　　　حق اگر سوزے ندارد حکمت است

شاعر کے جذبات لطیف ونازک مگر نہایت قوی ہوتے ہیں۔لطیف ونازک تو اس لحاظ سے کہ ہر چیز جو اُس کے سامنے آتی ہے،اُس کے دل پر اثر ڈالتی ہے اور معمولی سے معمولی واقعہ بھی اس کے قلب کو متحرک کئے بغیر نہیں رہتا اور قوی اس لئے کہ دنیا کی کوئی طاقت اس کو اظہار سے نہیں روک سکتی ؎

یہ شعر اور شاعری کا حقیقی تخیل ہے۔عام اصطلاح کی رو سے بھی شعر فی الحقیقت انسان کے خیال یا جذبہ کے اظہار کا نام ہے جو موزون الفاظ میں ادا کیا گیا ہو۔شعر کے دو جزو ہیں ایک تخیل اور دوسرا تحریک۔شاعر کے دماغ میں پہلے خیال پیدا ہوتا ہے اور اس کے اظہار کے لئے وہ الفاظ کی تلاش کرتا ہے۔خیال ایک سماوی چیز ہے اور الفاظ ارضی۔اس لئے یہ کام اَور بھی دشوار ہو جاتا ہے۔خیالات کا لامتناہی سلسلہ،ایک خیال کا دوسرے سے

ق، متضاد کیفیتیں، ان متضاد کیفیتوں میں یگانگت کا ایک گہرا ربط، مختلف حالات کے فوری تغیرات جو کبھی محسوس ہوتے
ں اور کبھی غیر محسوس، غرض یہ کہ ان تمام نزاکتوں اور پیچیدگیوں کا اظہار کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ دوسری طرف الفاظ
بے بضاعتی، ان کی کمزوری، ان کی متعین قوتیں جن کو دیکھتے ہوئے شاعر کا کام اور بھی دشوار ہو جاتا ہے۔

شاعری ایک قسم کی مصوری ہے جو کام مصور مختلف رنگوں کے باہم ربط و آمیزش سے لیتا ہے وہی کام شاعر
ختلف الفاظ کی باہم ترکیب سے نکالتا ہے جس طرح رنگ کا انتخاب اور ایک رنگ کا دوسرے رنگ سے ربط، رنگ
نسبتی قوت تصویر میں جان ڈال دیتی ہے اسی طرح الفاظ کا انتخاب ایک لفظ کا دوسرے لفظ سے ربط، الفاظ
باہم ترکیبیں شعر کی خوبی میں اضافہ کر دیتی ہیں۔ بسا اوقات مصور کو مادی اشیاء سے گزر کر غیر مادی چیزوں کی
سویر کھینچنا ہوتی ہے، مثلاً طبیعت کی مختلف کیفیتیں، خوشی و رنج، رحم و غضب چیزیں بھی مصور کے قلم سے
نہیں بچتیں، اور ایک کامیاب مصور ان مختلف کیفیتوں کا اظہار بھی تصویر میں کر سکتا ہے لیکن اگر غور سے
دیکھا جائے تو اس کا یہ کام بھی شاعر کے کام سے کہیں زیادہ آسان ہے۔ اول تو رنگ خود اپنی قسم میں غیر محدود ہے
ہر ایک رنگ کی دوسرے رنگ سے آمیزش ایک نیا رنگ پیدا کر دیتی ہے۔ اگر رنگ کو اس کی قوت اور کمزوری کے
لحاظ سے دیکھا جائے تو رنگ جو بظاہر ایک معلوم ہوتا ہے صدہا ہزارہا بلکہ غیر متعین اقسام اپنے اندر پوشیدہ رکھتا ہے
اس بنا پر یہ کہنا بالکل درست ہوگا کہ رنگ خود اپنے میں ایک قسم کی حرکت رکھتا ہے، مگر الفاظ بالکل قائم ہیں اور
لفظ کا حسن صورت ایک متعین چیز ہے اس میں شک نہیں کہ ایک لفظ کو دوسرے لفظ کے ساتھ ترکیب دینے سے
ں کی موسیقیت میں فرق ضرور پیدا ہو جاتا ہے مگر لفظ بجائے خود تغیرات سے بالاتر ہے۔ قائم اور متعین الفاظ سے
متحرک اور متموج جذبات اور خیالات کی تصویر کھینچنا خود ایک طلسم ہے اور یہ وہی شخص کر سکتا ہے جس کو فطرت نے
جوہر ودیعت کیا ہو۔

کارلائل نے فنون لطیفہ میں شاعری کو فن تعمیر سے تشبیہ دی ہے، الفاظ وہ خشت و سنگ ہیں جن سے خیال
ی عالیشان عمارت بنائی جاتی ہے۔ لیکن اس پر بھی اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ سنگ و خشت میں بھی صورت
پذیری کا مادہ موجود ہے یعنی ایک معمار سنگ و خشت کو تراش کر عمارت کے لئے موزوں بنا لیتا ہے مگر الفاظ میں یہ
بات ممکن نہیں۔ یعنی سنگ و خشت بھی متحرک ہیں اور اُن کو جس قسم کی حرکت چاہیں دی جا سکتی ہے۔ مگر الفاظ میں
اس کمی کو حسن انتخاب و باہمی ترکیب ہی سے پورا کر سکتے ہیں۔ اور اس بنا پر Aresto کا یہ دعویٰ کہ الفاظ
لعل و جواہر سے گراں بہا ہیں بالکل درست ہے۔

عشق کا وہ وسیع اور وحشتناک میدان جو امید و یاس کے مناظر سے بھرا ہوا ہے جس میں کبھی تو ریگِ رواں آبِ شیریں بن کر رہ نوردانِ محبت کے دلوں میں امید کی جھلک پیدا کرتا ہے اور کبھی آبِ شیریں ریگِ رواں نظر آکر اُس کی مایوسی کو بڑھا دیتا ہے وہ میدان ہے جس کی منزل خود متحرک ہے یعنی رہ رو کی پیہم رہ نوردی پر بھی بُعدِ منزل کم نہیں ہوتا۔

حسن کی دلفریبیاں، اس کی مقناطیسیت جس کے اندفاع میں جذب اور جذب میں اندفاع ہے، حسن و عشق کا ربط، غرض یہ کہ ان دماغی بھول بھلیاں سے گزرنا شاعر کا کام ہے۔ "جامعہ"

انقلاب

میں اپنی روح کی صداقت کے ساتھ اِس حقیقت کی گواہی دیتا ہوں کہ جب خدائے قدوس اس عالم کائنات میں کوئی انقلاب برپا کرنا چاہتا ہے تو اس کے آثار نمایاں ہو جاتے ہیں۔

وہ دیکھو انقلاب کی بجلیاں چمک رہی ہیں لیکن تم نہیں دیکھ سکتے اور میں دیکھ رہا ہوں۔ اچھا! اگر انقلاب رونما ہونے والا نہیں ہے تو یہ آثار کیوں نمایاں ہیں۔

کیا تم نہیں سمجھتے کہ ہمیشہ پانی کے برسنے سے پہلے موسم بدلتا ہے اور اپنے آنے سے پہلے اپنی علامتوں کو بھیج دیتا ہے۔ کیا طوفان کے آنے سے پیشتر طوفانی ہوائیں نہیں چلتیں کیا برسات سے پہلے آسمان پر اُودی اُودی گھٹائیں نہیں چھا جاتیں۔ یہ سب کچھ ہوتا ہے۔ پھر تمہیں انقلاب کے آثار کیوں نظر نہیں آتے۔

آج دلوں کی اقلیم میں ایک طوفانِ اضطراب برپا ہے۔ اس کے سمندر تہ و بالا ہو رہے ہیں۔ موجوں اور طوفانوں کا زور ہے۔ اور میں دیکھ رہا ہوں کہ آج کائنات کی ہر شے اچھلنے اور ابھرنے کے لئے بیقرار ہے۔

یاد رکھو آج دنیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایک آخری انقلاب کے کنارے پر ہے اور وہ سب علامتیں ظاہر ہو چکی ہیں جن کا ظاہر ہونا ضروری تھا۔ پس تم انتظار کرو اور اہتمام کرو اس وقت کا جب کہ قوموں کی تاریخ اُلٹ جائے گی اور خشکی اور تری کی حدود تبدیل ہو جائیں گی۔

(شیخ محمد عبدہٗ مصری)

"نئی روشنی"

نئی کتابیں

تاریخ نثر اُردو، حصّہ اوّل، مرتبہ حضرت احسن مارہروی، اردو لیکچرار مسلم یونیورسٹی، علیگڈھ۔ اس کتاب میں اردو نثر کی ابتدا سے لے کر اب تک کے تاریخی حالات اور مختلف انداز و اسالیبِ بیان کے نمونے بلحاظ مختلف ادوار زیرِ ترتیب دیئے گئے ہیں۔ یہ نمونے ہر شعبہ کے مسلم الثبوت اور مشاہیر اہلِ قلم کی تحریروں سے اخذ کئے گئے ہیں اور کوشش کی گئی ہے کہ مذہبی، اخلاقی، سیاسی، قانونی، اخباری، تقریری، اشتہاری غرض وہ تمام نمونے اس میں جمع ہو جائیں جو ایک علمی اور زندہ زبان کو وقیع بنا سکتے ہیں۔ اس کتاب کو پڑھ کر معلوم ہو جاتا ہے کہ اب سے ساڑھے پانچ سو برس پہلے اردو تالیفات و تصنیفات کا اندازِ تحریر کیا تھا اور عہدِ حاضر تک کیا کیا ارتقائی شکلیں پیدا ہوئیں، اور یہ ایک ایسی خصوصیت ہے کہ اردو کی تاریخ کے متعلق اس وقت تک جتنی کتابیں لکھی جا چکی ہیں ان میں اس کتاب کو ممتاز کرتی ہے۔ یقیناً احسن صاحب نے اس کتاب پر بڑی محنت کی ہے اور اہلِ ذوق کو چاہیئے کہ اس کی پوری پوری قدر کریں۔ حجم پونے سات سو صفحات، قیمت کاغذ قسم اوّل مجلد پانچ روپے، کاغذ قسم دوم مجلد چار روپے۔ طلبہ سے قسم اوّل چار روپے، قسم دوم تین روپے۔ حضرت مصنف سے طلب فرمایئے +

گنجینۂ تحقیق — یہ جناب سید محمد احمد صاحب بیخود موہانی، ایم۔ اے پروفیسر شیعہ کالج لکھنؤ کے پانچ انتقادی مضامین کا مجموعہ ہے۔ ابتدا کے تین مضمون غالب کے متعلق ہیں۔ پہلے مضمون میں دیوانِ غالب کی نو شرحوں کے متعلق اجمالی رائے اور غالب کی ایک غزل کا حل ہے۔ دوسرے میں مذکورہ مضمون پر اودھ پنچ کے اعتراضات کا مدلل جواب دیا گیا ہے۔ تیسرے مضمون میں کسی نقاد کے اس خیال کی تردید کی گئی ہے کہ غالب نے اساتذۂ ایران و ہند کے مضامین کا سرقہ کیا۔ چوتھے مضمون میں شرحِ قصائدِ خاقانی نوشتۂ حضرت شادمان لکھنوی پر ایک نظر ڈالی گئی ہے اور شادمان لکھنوی اور رشادان بلگرامی کی شرحوں کا موازنہ کیا ہے۔ پانچویں مضمون میں "اصلاحِ سخن" مرتبہ حضرت شوق سندیلوی کی ایک غیر محتاط تنقید لکھنؤ کی تنقید کا جواب دیا ہے۔ پانچوں مضامین بڑی تحقیق اور بسط و تفصیل سے لکھے گئے ہیں۔ ہمارے خیال میں گنجینۂ تحقیق ایک بہترین علاج ہے۔ نہایت اچھی چھپی ہے۔ حجم ۳۴۵ صفحے۔ قیمت درج نہیں۔ جناب مصنف سے دستیاب ہوتی ہے +

گنجینۂ راز — مولانا ابوالفضل راز چاندپوری کی قدیم و جدید طرز کی منتخب نظموں کا مجموعہ ہے۔ حضرت راز کی ذات ناظرین ہمایوں کی محتاجِ تعارف نہیں۔ ان کی نظمیں اور غزلیں اس حلقے میں عام مقبولیت حاصل کر چکی ہیں۔ تاثیر، دلکشی اور روانی ان کا علاوہ حصول وغیرہ شاعری کی عام خصوصیت ہے۔ لیکن دنیائے راز جیسا منتخب مجموعہ اردو شاعری میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہے۔ حجم ۱۱۲ صفحے۔ ملنے کا پتہ، جناب طالب چاندپوری، بانس منڈی کانپور +

سالانہ چندہ بھی ...

لڑکے اور لڑکیوں کا مفید اخلاقی ورزشی رسالہ

یہ رسالہ آج کل کے مخرب اخلاق مشاغل مثلاً سینما۔ تھیٹر۔ ناچ گانوں کی شرکت اور مخرب اخلاق لٹریچر کے مطالعہ کے نقصانات اور بیڑی سگرٹ نوشی وغیرہ جیسی تباہ کن علامات کی برائیاں ظاہر کرتے ہوئے آپ کو صحیح معنوں میں حکیم بھی بنا دیتا ہے۔ اس کے مطالعہ سے وہ باتیں اور نکات معلوم ہوتے ہیں جو برسوں ڈاکٹروں اور اطبا کی خدمت کرنے سے بھی حاصل نہیں ہو سکتے۔ حکمت دواؤں میں نہیں ہے نہ اندھا دھند ٹانکوں کے استعمال کرانے میں ہے۔ حکمت صرف حکمت سے اصول حفظان صحت کے مدنظر ہوا۔ غذا۔ ورزش و دیگر قدرتی وسائل کے ذریعہ صحت حاصل کرنے اور دوسرے مریضوں کا علاج کرنے میں ہے۔ جن قیمتی معلومات کا یہ رسالہ خزینہ ہے ان کے لحاظ سے اس کا سالانہ عام چندہ جو تین روپیہ ہے کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ یہ رسالہ مقررہ تعداد میں شائع ہو کر تقسیم ہو جاتا ہے خواہشمند احباب قبل از قبل ترسیل چندہ اپنا نام رجسٹر کرا لیں تو آرڈر کی تعمیل ممکن ہے۔ سالانہ چندہ تین روپیہ طلبا سے عہ۲ر

مینیجر رسالہ "ورزش جسمانی" نارائن گوڑہ۔ حیدرآباد دکن

جذبات ہمایوں

دنیا کے بہترین افسانے
اسلامک لٹریچر کمپنی

جام صہبائی
قومی کتب خانہ

نقش جلال

جدید فہرست کارخانہ مفت طلب فرمائیے ؛

طبقۂ نسواں میں اس کارخانہ کا عطر سہاگ اور عطر عروس نہایت مقبول ہے ؛

یہ کارخانہ ۱۸۳۹ء سے نیک نامی کے ساتھ جاری ہے ؛

اعلیٰ طبقہ کی خواتین سر میں لگانے کیلئے اس کارخانہ کا تیار کردہ بانو ہیر آئیل استعمال کرتی ہیں ؛

اصغر علی محمد علی تاجران عطر لکھنؤ